

آنحضورؐ

(ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک)

وہاب اشرفی

جلد اوّل

ایک مشعل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

پاکستان میں اس کتاب کے جملہ حقوق ڈاکٹر جمیل جالبی کے پاس محفوظ ہیں
کوئی بھی ادارہ ان کی مرضی کے بغیر اس کتاب کو شائع نہ کرے۔

TAREEKH-E-ADAB-E-URDU

by

Wahab Ashrafi

Year of Edition 2007

ISBN 81-8223-225-0

(Three Vol. Set)

Price Rs. 1500.00

Price. USD \$ 60

تاریخ ادب اردو (ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک)

وہاب اشرفی

۲۰۰۷ء

۱۵۰۰ روپے — USD 60 \$ (تین جلدوں پر مشتمل)

کیا رہا

عمیف آفسیٹ پرنٹرز، دہلی۔

نام کتاب

مصنف

من اشاعت

قیمت

تعداد

مطبع

تاریخ ادب اردو

ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک

(جلد اول)

وہاب اشرفی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23218162, 23214465 Fax: 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

فہرست

- ☆ احوال واقعی: یہ تاریخ ادب اردو کیوں؟ دہاب اشرفی ۲۳ ۲۱۷
 ☆ اردو کے لسانی مباحث: مکتوی جائزہ ۲۹ ۲۵
 ☆ ابتداء سے سترہویں صدی عیسوی کا ادب ۶۲ ۳۱
 □ شہلی ہند میں اردو کی ابتداء ۳۳

ڈاکٹر جمیل جالبی

کے نام

- ☆ خواجہ مسعود سلطان ۳۲ • خواجہ معین الدین ہشتی (جمیری) ۳۵ • بابا فرید الدین گنج شکر ۳۶
 ☆ شیخ شرف الدین بڑی قندور ۳۸ • امیر خسرو ۳۸ • شیخ شرف الدین بکچہ منیری ۳۳
 ☆ کبیر ۳۵ • عبدالرحیم خاں خاں ۳۹ • حضرت نور محمد گنج بخش ۵۰ • فضل پانی پتی ۵۲
 ☆ فضل علی فضل ۶۰ • پندت پندت بھان برہمن ۶۱
 ☆ وکشیات اور اردو ادب ۶۳ ۲۵
 ☆ گنجری ادب ۶۶ ۷۳
 ☆ بھاؤ الدین باجن ۶۷ • قاضی محمود رانی ۶۹ • شاہ علی محمد جیو کام وطنی ۷۱ • خوب محمد ہشتی ۷۱
 ☆ بکمنی ادب ۷۳ ۸۷
 ☆ فردین نظامی ۷۵ • خواجہ بندہ نواز گیسو داز ۷۷ • لفظی ۸۰ • مشتاق ۸۱
 ☆ میراں جی مٹس الشاق ۸۱ • فیروز شاہ بکمنی ۸۳ • شاہ اشرف بیابانی ۸۶
 ☆ عادل شاہی ادب ۸۸ ۱۰۸
 ☆ برہان الدین جامی ۸۹ • ابن الدین اعلیٰ ۹۲ • عبدال ۹۵ • حسن شوقی ۹۶
 ☆ عادل شاہ شاہی ۱۰۱ • صنعتی ۱۰۳ • مکتبی اور قلم ۱۰۵
 ☆ قطب شاہی ادب ۱۰۹ ۱۳۳
 ☆ محمد علی قطب شاہ ۱۱۰ • ملا جی ۱۱۳ • غلامی ۱۲۰ • احمد گجراتی ۱۲۳
 ☆ ابن ابی ۱۲۷ • شعبی ۱۲۹ • ابوالحسن تانا شاہ ۱۳۱

ہزار شکر کہ دیدم بکام خویش باز
 ترا بکام خود و باتو خویش را دمساز
 (حافظ)

☆ دو ادبی و داستان

☆ اٹھارہویں صدی عیسوی کا ادب

□ اٹھارہویں صدی کاسیائی بحر ان

☆ ایہام گوئی کی روایت

• شاہ محمد مبارک آبادی ۱۳۶ • شاکر دہلی ۱۵۰ • قلیو الدین حاتم ۱۵۳

• سراج الدین علی خاں آرزو ۱۵۷ • شیخ شرف الدین مضمون ۱۶۰

• مصطفیٰ خاں بکرنگ ۱۶۲ • عبدالوہاب بکرو ۱۶۳ • صدر الدین خاں غازی دہلوی ۱۶۵

• سید عبدالولی عزت ۱۶۸ • محمد حسن ندوی ۱۶۸ • شاہ ولی اللہ شتیاقی ۱۶۹ • میر محمد سجاد ۱۷۱

☆ ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل

• مظہر جان جاناں ۱۷۲ • شاہ آیت اللہ جوہری ۱۷۵ • انعام اللہ خاں نقیض ۱۷۷

• میر عبدالحی تاباں ۱۷۹ • آندرام بھگت ۱۸۱ • میر اشرف علی خاں ۱۸۲

• قائم چاند پوری ۱۸۳ • شیخ محمد علی حزیں ۱۸۷

☆ زبلی، ولی اور سراج

• جعفر زبلی ۱۹۰ • ولی دکنی ۱۹۳ • سراج اورنگ آبادی ۱۹۹

☆ سودا، میر اور دوسرے شعراء

• مرزا فتح سودا ۲۰۷ • میر حسن ۲۱۸ • خواجہ میر درد ۲۲۰ • میر تقی میر ۲۲۲

• میر حسن ۲۲۷ • امیر اتر ۲۳۱ • مرزا جعفر علی حسرت ۲۳۲ • نظیر اکبر آبادی ۲۳۷

• غلام برہانی مصطفیٰ ۲۵۲ • بکلی مانی عزت ۲۵۶ • انکب اللہ خاں انک ۲۶۰ • سراج عظیم آبادی ۲۶۳

• مرزا فتح علی دکنی ۲۶۷ • شیخ انام بخش ناٹخ ۲۶۹ • سعادت یار خاں دکنی ۲۷۲

☆ انیسویں صدی عیسوی کا ادب

□ انیسویں صدی کاسیائی نظر نامہ

☆ غالب، ذوق، ظفر اور دیگر شعراء

• مرزا غالب ۲۸۹ • شیخ محمد اہم ذوق ۳۰۲ • بہادر شاہ ظفر ۳۰۷ • شاہد نصیر ۳۱۰

• خواجہ میر علی آتش ۳۱۲ • مرزا شوق کھنوی ۳۱۶ • نواب سید محمد خاں دکنی ۳۲۱

• سلیم حسن خاں مومن ۳۲۲ • اسیر کھنوی ۳۲۸ • فقیر محمد خاں گویا ۳۳۰

• مصطفیٰ خاں شینو ۳۳۲ • چندتاریک ظفر نسیم ۳۳۳ • حیر شوہر آبادی ۳۳۸

۱۳۶ تا ۱۳۷

۱۳۷ تا ۱۳۸

۱۳۸ تا ۱۳۹

۱۸۸ تا ۱۸۹

۲۰۳ تا ۱۸۹

۲۷۶ تا ۲۰۵

۲۸۶ تا ۲۷۷

۲۸۱ تا ۲۸۷

• محسن ناکوروی ۳۵۱ • میر میردی بخروغ ۳۵۲ • عبدالحمید پٹیل ۳۵۵ • داغ دہلوی ۳۵۷

• امیر اللہ سلیم ۳۶۱ • سفیر بنگالی ۳۶۲ • صوفی میری ۳۶۶ • اکبر دانا پوری ۳۶۸

• شاد عظیم آبادی ۳۷۰ • اکبر الہ آبادی ۳۷۹ • عبدالغفور سندھ ۳۸۲ • خواجہ محمد میر دکنی ۳۸۹

• اسد علی خاں قلندر ۳۹۱ • میر دین علی صبا ۳۹۵ • نظم طباطبائی ۳۹۳ • فضل حق آرزو ۳۹۶

• ریاض خیر آبادی ۳۹۹ • مظہر شیر آبادی ۴۰۳ • مرزا محمد خاں براق ۴۰۵

• غلام امام شہید ۴۰۷ • علی اسد رشک ۴۰۷ • میر انصور شہباز ۴۰۸ • تنویر دہلوی ۴۱۳

• شوق نبوی ۴۱۵ • سرور جهان آبادی ۴۱۹ • علی نقی مقلی کھنوی ۴۲۳ • ساکن دہلوی ۴۲۵

• جلیل نامک پوری ۴۲۷ • جلیلہ خاں بخش ۴۲۸ • قولہاں نقیب ۴۳۱ • مبارک عظیم آبادی ۴۳۳

• مرزا انظر علی خاں ۴۳۴ • آرزو کھنوی ۴۳۶ • شوق غلام پوری ۴۳۸

☆ مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء

• میر متحسن ظیق ۴۴۲ • میر مظہر حسین ضمیر ۴۴۵ • مرزا جعفر علی تصنیف ۴۴۶

• محمد غفر علی گجر ۴۴۸ • میر بہار علی انیس ۴۴۹ • مرزا سلامت علی دکنی ۴۵۲

• میر عشق ۴۵۷ • یارے صاحب رشید ۴۵۹ • بہار صمیم آبادی ۴۶۰

☆ فورٹ ولیم کالج

• ڈاکٹر جان گل کرست ۴۶۳ • میر اس دہلوی ۴۶۸ • میر بہار علی صوفی ۴۷۳

• شیر علی انیسویں ۴۷۴ • حیدر بخش حیدری ۴۷۵ • کاظم علی جہاں ۴۷۶ • مظہر علی دلا ۴۷۷

• لولال بی ۴۷۸ • نہال چلا ندوی ۴۷۸ • شیخ حفیظ الدین ۴۷۹ • بکلی نادران جہاں ۴۸۰

• مرزا علی الحک ۴۸۱ • محمد اکرام علی ۴۸۲ • مرزا جان طیش ۴۸۳ • مولوی امانت اللہ شیدا ۴۸۳

• حمید الدین بہاری ۴۸۵ • مرزا محمد فطرت ۴۸۵ • بکلی چمن مبرا ۴۸۵

☆ سر سید اور ان کا محمد

• سر سید محمد خاں ۴۸۷ • خواجہ غلام غوث بے غر ۴۹۳ • محمد صمیم آزاد ۴۹۵

• ذبلی ذبیحہ ۵۰۰ • خواجہ الطاف حسین حالی ۵۰۳ • نواب محسن الملک ۵۱۱

• عبدالحمید سائیک ۵۱۲ • دقار الملک ۵۱۳ • مولوی چراغ علی ۵۱۵ • مولانا امام اثر ۵۱۷

• وحید الدین سلیم ۵۲۰ • عبدالقادر سرداری ۵۲۲ • مہدی افادی ۵۲۴

☆ دلی کالج

• اسرار احمد ۵۲۸ • مولوی اکاٹھ ۵۳۱ • مولوی ملک علی ۵۳۳

۳۶۴ تا ۳۶۵

۳۸۶ تا ۳۸۳

۴۸۵ تا ۴۸۷

۵۳۵ تا ۵۳۶

☆ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تحقیق و تنقید ۵۵۵ تا ۵۳۷

• مولوی عبدالحق ۵۳۹ • نصیر حسین خیال ۵۳۱ • حافظ محمود شیرانی ۵۳۲
• فصیح الدین لکھنؤی ۵۳۷ • حامد حسن قادری ۵۳۹ • ابوالکلام آزاد ۵۵۲

☆ انیسویں اور بیسویں صدی کے ممتاز ڈرامہ نگار ۵۵۳ تا ۵۵۷

• امانت کھوسو ۵۵۹ • بداری لال ۵۶۳ • آغا عسکر کشمیری ۵۶۲ • حاجہ مسبین ۵۶۷
• انیسار علی تاج ۵۶۸ • محمد حبیب ۵۷۰ • ابراہیم ہوسف ۵۷۴ • اخلاق اثر ۵۷۴

☆ انیسویں اور بیسویں صدی میں طنز و مزاح ۶۳۰ تا ۵۷۷

• رحیب علی بیگ سرور ۵۷۷ • انجم بانجوری ۵۸۳ • مرزا فرحت اللہ بیگ ۵۸۶
• رشید احمد مدنی ۵۸۹ • عظیم بیگ چغتائی ۵۹۲ • ملا رمیزی ۵۹۵ • پطرس بخاری ۵۹۶
• شوکت خانوی ۵۹۹ • کنیا لال کپور ۶۰۱ • رضا خانوی داعی ۶۰۳ • فرحت کاکوری ۶۰۸
• گلرؤ نسوی ۶۱۰ • حسین عظیم آبادی ۶۱۲ • شکیل الرحمن ۶۱۳ • یوسف ناعم ۶۱۵
• مشتاق احمد چغتائی ۶۱۶ • دلاور بنگلہ ۶۲۰ • کرل بھر خاں ۶۲۳ • شفیقہ فرحت ۶۲۵
• احمد جمال پاشا ۶۲۶ • بختی مسین ۶۲۸

☆ انیسویں صدی کے اواخر میں اردو فکشن: داستان، ناول اور افسانہ ۶۵۶ تا ۶۳۷

• پنڈت دتھ ناتھ مرثاد ۶۳۹ • فقی جاد حسین ۶۳۲ • مرزا محمد ہادی رسوا ۶۳۳
• محمد سرور حسین ۶۳۵ • عبدالحلیم شرر ۶۳۶ • راشد الگھری ۶۳۸ • خواجہ حسن نظامی ۶۵۰
• نیاز فتح پوری ۶۵۲ • ایم اسلم ۶۵۳ • ل۔ اجمہا کبر آبادی ۶۵۵

☆ بیسویں صدی عیسوی کا ادب ۶۶۳ تا ۶۶۷

□ بیسویں صدی کا سیاسی منظر نامہ

☆ حلقہ ارباب ذوق اور اس کے اہم فنکار ۶۶۳ تا ۶۹۸

• غلام مصطفیٰ صوفی جسم ۶۶۷ • صدیق حسین خالد ۶۶۸ • محمد دین تاثیر ۶۷۰
• انام راشد ۶۷۳ • میراجی ۶۷۸ • حفیظ بوشہر پوری ۶۸۶ • یوسف ظفر ۶۸۸
• قیوم ظفر ۶۹۱ • منظور جالندھری ۶۹۳ • علامہ صدیقی ۶۹۵

☆ ترقی پسند ادب اور اس کے شعراء و ادباء ۶۹۹ تا ۷۰۸

☆ ترقی پسند شاعری ۷۰۸ تا ۸۲۵

• محمد نجی الدین ۷۰۰ • پرویز شامی ۷۳۵ • فیض احمد فیض ۷۳۸ • اسرار الحق مجاز ۷۳۹
• معین احسن بٹنی ۷۵۴ • علی سردار جعفری ۷۵۵ • واقعہ جونپوری ۷۷۰ • احسان دانش ۷۷۱
• جاں نثار اختر ۷۷۲ • غلام ربانی تاپا ۷۷۶ • اختر ایمان ۷۷۹ • مجروح سلطان پوری ۷۸۵
• علی جواد علی ۷۹۷ • کمالی امجدی ۷۹۹ • یحییٰ ناظم آزاد ۸۰۳ • قنیل شطانی ۸۰۶
• ساحر لدھیانوی ۸۱۱ • سلام بھٹی شہری ۸۱۷ • منظر شہاب ۸۱۹ • اویس احمد ویراں ۸۲۲

☆ ترقی پسند فکشن

۸۲۷ تا ۸۹۹

• پریم چند ۸۲۹ • سورجن ۸۳۶ • اعظم کرچی ۸۳۷ • علی عباس حسینی ۸۳۸ • جلالہ پیر ۸۳۹
• ذاکر رشید جہاں ۸۴۵ • راجندر ستیا رتی ۸۴۹ • اوچر ناتھ سنگھ ۸۵۰ • احمد علی ۸۵۳
• حیات اللہ انصاری ۸۵۶ • سکندر عظیم آبادی ۸۵۸ • سعادت حسن منٹو ۸۶۳ • کرشن چندر ۸۷۱
• راجندر سنگھ بیدی ۸۷۹ • عصمت چغتائی ۸۸۷ • احمد علی کاکا ۸۹۱ • رضیہ بانظیر ۸۹۶
(نوٹ: یہ سلسلہ دوسری لہرست میں الگ ذہن کے فکشن لکھنے والوں کے ساتھ جاری ہے)

☆ بیسویں صدی میں اردو تحقیق و تنقید: ترقی پسند اور دوسرے ۹۰۱ تا ۱۱۵۱

• بھٹو گورکھ پوری ۹۰۳ • آل احمد سرور ۹۰۷ • اختر حسین رائے پوری ۹۱۳
• احتشام حسین ۹۱۶ • عزیز احمد ۹۲۲ • ممتاز حسین ۹۲۵ • شبلی نعمانی ۹۳۰
• عبدالماجد ریاضی ۹۳۵ • مسعود حسن رضوی ادیب ۹۳۸ • غلام رسول میر ۹۳۱
• قاضی عبدالودود ۹۳۲ • رام پور سکینہ ۹۳۶ • سید اجاز حسین ۹۳۸ • نجیب الرحمن ندوی ۹۵۰
• یوسف حسین خاں ۹۵۱ • نجی الدین قادری زور ۹۵۳ • انیسار علی عرشی ۹۵۴
• خواجہ غلام السیدین ۹۵۷ • شوکت بھڑواری ۹۵۹ • سید عبداللہ ۹۶۰ • الگ نام ۹۶۳
• حکیم الدین احمد ۹۶۳ • شاہد احمد ہولوی ۹۶۶ • وقار عظیم ۹۶۸ • اختر اوریشی ۹۷۰
• نور الحسن ہاشمی ۹۷۳ • سید حسن ۹۷۴ • معین الدین بردائی ۹۷۵ • صابر الدین عبدالرحمن ۹۷۶
• احسن فاروقی ۹۷۸ • سید حسن ۹۷۹ • شاہد قیول احمد ۹۸۱ • خواجہ احمد فاروقی ۹۸۴
• عبداللطیف اعظمی ۹۸۳ • صدق الدین خٹاخی ۹۸۶ • مسعود حسین خاں ۹۸۸
• خورشید الاسلام ۹۹۰ • عبادت بریلوی ۹۹۲ • پرویز دشت ۹۹۳ • محمد حسن عسکری ۹۹۴
• وزیر آغا ۹۹۷ • بلال الزماں ۱۰۰۰ • گیان چند بھین ۱۰۰۲ • فخر احمد طلوی ۱۰۰۳
• راج بہادر گوز ۱۰۰۶ • محمد طفیل ۱۰۰۷ • انامری شمل ۱۰۰۹ • شبلی الحسن ٹوہرادی ۱۰۱۰
• مختار الدین احمد آزاد ۱۰۱۱ • کالی داس گپتا رشا ۱۰۱۳ • طاہر انصاری ۱۰۱۵
• مسیح الزماں ۱۰۱۷ • اسلوب احمد انصاری ۱۰۱۸ • فہیمہ تقی ۱۰۲۰ • شریا حسین ۱۰۲۲

• انور سید ۱۰۳۳ • دارت طوی ۱۰۳۶ • دلچ چدراسر ۱۰۳۰ • سید محمد عقیل رضوی ۱۰۳۱ •
 • جمیل جالبی ۱۰۳۳ • عبدالغفار کھیل ۱۰۳۷ • اکبر حیدری ۱۰۳۷ • مفتی نسیم ۱۰۳۹ •
 • محمود الہی ۱۰۵۰ • عبدالقوی دستوی ۱۰۵۱ • شائقی رحمن بھٹا چاریہ ۱۰۵۲ • نظیر صدیقی ۱۰۵۳ •
 • نادم ٹٹی ۱۰۵۷ • کھلی الرحمن ۱۰۶۰ • گوپی چند نارنگ ۱۰۶۲ • قمر بھنگ ۱۰۶۷ •
 • حامدی کاشمیری ۱۰۷۲ • سنج الحق ۱۰۷۷ • اسلم پرویز ۱۰۷۷ • اصبح شہر ۱۰۷۷ •
 • نور الحسن نقوی ۱۰۷۸ • ڈار احمد فاروقی ۱۰۷۹ • سلیم اختر ۱۰۸۲ • عابد رضا بیدار ۱۰۸۳ •
 • سیدہ منظر ۱۰۸۵ • خلیفہ کبھی ۱۰۸۶ • شمس الرحمن فاروقی ۱۰۸۹ • مشتاق خواجہ ۱۰۹۱ •
 • نظام صدیقی ۱۰۹۳ • شادب دہلوی ۱۰۹۳ • عظیم الشان صدیقی ۱۰۹۵ • خلیفہ انجم ۱۰۹۷ •
 • مظفر اقبال ۱۰۹۸ • یوسف سرست ۱۰۹۹ • کرامت علی کرامت ۱۱۰۰ • عبدالغنی ۱۱۰۱ •
 • انصار اللہ نظر ۱۱۰۳ • فضیل احمد جعفری ۱۱۰۳ • ابراہیم سحر ۱۱۰۵ • عابد پشاور ۱۱۰۷ •
 • انور رحمانی ۱۱۰۷ • عتیق بشتی ۱۱۰۸ • نجم الدین ۱۱۱۰ • شمس اختر ۱۱۱۲ • امیر اللہ خاں شاہین ۱۱۱۳ •
 • شمیم علی ۱۱۱۳ • جعفر رضا ۱۱۱۵ • احمد شاہ ۱۱۱۷ • عجم کاشمیری ۱۱۱۸ • واجدہ نسیم ۱۱۲۰ •
 • تاج جانی ۱۱۲۱ • قتیل اللہ ۱۱۲۳ • اکبر علی خاں عرش زادہ ۱۱۲۶ • عبدالواحد ۱۱۲۶ •
 • قیس رحمانی ۱۱۲۸ • طلسم میانوی ۱۱۳۸ • قمر اعظم باشی ۱۱۳۹ • مرزا غلیل اللہ بیک ۱۱۴۰ •
 • قدوس جاوید ۱۱۳۲ • مناظر عاشق برکاتوی ۱۱۳۳ • قاضی اقبال حسین ۱۱۳۴ •
 • مرزا عابد بیک ۱۱۳۶ • منصور عالم ۱۱۳۷ • ابوالکلام قاسمی ۱۱۳۹ • مولانا ابوالکلام قاسمی شمس ۱۱۴۰ •
 • تقی عابدی ۱۱۴۱ • مظہر اعجاز ۱۱۴۲ • صغیر انور ایم ۱۱۴۳ • علی احمد قاسمی ۱۱۴۴ • اعجاز علی ارشد ۱۱۴۵ •
 • سید محمد شرف ۱۱۴۶ • ارتضیٰ کریم ۱۱۴۷ • شمس بدایونی ۱۱۴۸ • شہاب ظفر عطیس ۱۱۴۹ •

بیسویں صدی میں اردو نگارین:

۱۱۵۷ تا ۱۳۷۳

رومان پسند، ترقی پسند، جدیدیت پسند اور مایعہ جدیدیت پسند

• مجاہد حیدر ۱۱۵۹ • سلطان حیدر خوش ۱۱۶۲ • قاضی عبدالغفار ۱۱۶۲ • نذر جاوید ۱۱۶۶ •
 • ممتاز مفتی ۱۱۶۸ • غلام عباس ۱۱۷۱ • حسن عظیم آبادی ۱۱۷۴ • صالحہ عابد حسین ۱۱۷۶ •
 • صالحہ کھنوی ۱۱۷۸ • الیاس اسلام پوری ۱۱۷۹ • خواجہ احمد عباس ۱۱۸۰ • جمیل احمد کاندھلوی ۱۱۸۳ •
 • سید انور ۱۱۸۳ • خلیل اختر ۱۱۸۶ • قدرت اللہ شہاب ۱۱۸۸ • شمس مظفر پوری ۱۱۹۰ •
 • محمود باشی ۱۱۹۳ • بہار رحیم ۱۱۹۳ • غلام الحقین نقوی ۱۱۹۵ • شوکت صدیقی ۱۱۹۷ •
 • رام لعل ۱۱۹۸ • مجلس احمدی ۱۲۰۳ • اعظم ترابی ۱۲۰۳ • ممتاز شیریں ۱۲۰۴ • انور عظیم ۱۲۰۷ •
 • ابراہیم عطیس ۱۲۱۰ • انتظار حسین ۱۲۱۲ • افتخار احمد ۱۲۱۷ • جگر محمد پال ۱۲۱۸ •

• غیاث احمد گدی ۱۲۳۳ • بانو قدسیہ ۱۲۳۸ • ہاجرہ سرور ۱۲۴۱ • اقبال حسین ۱۲۴۲ •
 • شفیق شہیدی ۱۲۴۳ • کورسین ۱۲۴۶ • ذکی انور ۱۲۴۷ • نذیر کٹورہ کرم ۱۲۵۰ •
 • انجمار اثر ۱۲۵۱ • صمیم شاہ ۱۲۵۲ • احمد یوسف ۱۲۵۳ • سرچرہ کاش ۱۲۵۶ •
 • حکام حیدری ۱۲۵۹ • سہرہ صدیقی ۱۲۶۳ • ستہ پال آند ۱۲۶۳ • عابد کھیل ۱۲۶۵ •
 • قاضی عبدالستار ۱۲۶۶ • شہزاد مظفر ۱۲۶۹ • محمود واجد ۱۲۷۱ • انور سجاد ۱۲۷۳ •
 • شمیم سہلی ۱۲۷۵ • اقبال مجید ۱۲۷۶ • گلزار ۱۲۷۸ • ہاراج شینا ۱۲۸۱ • شفیق جاوید ۱۲۸۳ •
 • احمد بخش ۱۲۸۸ • الیاس احمد گدی ۱۲۹۲ • گیان سنگھ شاطر ۱۲۹۵ • بیانی بانو ۱۲۹۷ •
 • قیصر گلشن ۱۳۰۱ • قمر مسعود ۱۳۰۲ • مظاہد ۱۳۰۵ • رشید امجد ۱۳۰۶ • خالدہ منظر ۱۳۰۷ •
 • مستنصر حسین تارڑ ۱۳۰۸ • حبیب حق ۱۳۰۹ • شہزادہ نام ۱۳۱۰ • ظفر اوچا نقوی ۱۳۱۱ •
 • مظہر کاشمی ۱۳۱۲ • سلام بن رزاق ۱۳۱۵ • انور خاں ۱۳۱۷ • اختر یوسف ۱۳۱۹ •
 • شہاب داندوی ۱۳۲۱ • آشا بولسن ۱۳۲۲ • ظہور الدین ۱۳۲۳ • علی حیدر ملک ۱۳۲۴ •
 • ذکیہ شہیدی ۱۳۲۵ • شام بارک پوری ۱۳۲۶ • شفق ۱۳۲۷ • انیس رفیع ۱۳۲۹ •
 • جاوید حسین ۱۳۳۱ • حمید بہروردی ۱۳۳۳ • رضوان احمد ۱۳۳۴ • قمر جہاں ۱۳۳۶ •
 • بیک احساس ۱۳۳۵ • عبید قر ۱۳۳۷ • کنگشاں انجم ۱۳۳۸ • مرزا عابد بیک ۱۳۳۸ •
 • سلیم خٹراو ۱۳۴۰ • حسین الحق ۱۳۴۳ • قرآن حسن ۱۳۴۷ • شوکت حیات ۱۳۴۸ •
 • شکیل احمد ۱۳۵۱ • محمد مظہر انراں خاں ۱۳۵۲ • مصطفیٰ احمد نوری ۱۳۵۷ • نظام عظیم ۱۳۵۸ •
 • عبدالصمد ۱۳۵۸ • علی نام ۱۳۶۱ • مختصر ۱۳۶۳ • نجم الحسن رضوی ۱۳۶۴ • ساجد رشید ۱۳۶۵ •
 • شرف عالم ذوقی ۱۳۶۷ • نظام آفاق ۱۳۷۰ • ابن کنول ۱۳۷۳ •

بیسویں صدی میں اردو شاعری: مشق و سخن و فکر کے فنکار

۱۳۷۵ تا ۱۸۰۸

• علامہ اقبال ۱۳۷۷ • مولانا محمد علی جوہر ۱۳۸۷ • قاضی بدایونی ۱۳۹۲ • نوح ناری ۱۳۹۵ •
 • نبیل سنہاروی ۱۳۹۷ • سیّد اکبر آبادی ۱۳۹۸ • عرش گیادی ۱۴۰۲ • عظیم الدین احمد ۱۴۰۳ •
 • حسرت مہتابی ۱۴۰۶ • بقا علی دشت ۱۴۱۱ • برج نائن پکچس ۱۴۱۵ • شوق قدوسی ۱۴۲۱ •
 • عزیز بکھنوی ۱۴۲۳ • حفیظ مہتابی ۱۴۲۵ • عبدالمنان بیول ۱۴۲۷ • میر زیاس بگتہ چنگیزی ۱۴۲۸ •
 • اصغر گوڈی ۱۴۳۷ • جوش ملیح آبادی ۱۴۴۰ • اقبال سہلی ۱۴۴۱ • جعفر علی خاں انکھنوی ۱۴۴۲ •
 • پنڈت برج موہن دتارے کھلی ۱۴۴۶ • گوک چند محروم ۱۴۴۹ • عفت اللہ خاں ۱۴۵۳ •
 • سرکار ی ۱۴۵۲ • قنات علی بھٹی ۱۴۵۹ • جگر مراد آبادی ۱۴۶۱ • عابد شادانی ۱۴۶۶ •
 • مسلم عظیم آبادی ۱۴۶۸ • زار عظیم آبادی ۱۴۷۰ • ثاقب عظیم آبادی ۱۴۷۱ •

- بہمن سعیدی ۱۳۸۳ • چذت ہری چند اختر ۱۳۸۷ • جمیل مظہری ۱۳۸۹ • اختر شیرانی ۱۳۹۳ •
 • ساغر نظامی ۱۳۹۸ • عبد المجید شمس ۱۵۰۰ • عطا کا کوئی ۱۵۰۱ • مظفر حسین ۱۵۰۲ •
 • عباس علی بیجو ۱۵۰۶ • گوپال محل ۱۵۰۹ • اجلی رضوی ۱۵۱۲ • ردش صدیقی ۱۵۱۳ •
 • گلگیر جٹا ۱۵۱۶ • فہیم کرپانی ۱۵۱۸ • انوس سہراوی ۱۵۲۰ • واقف عظیم آبادی ۱۵۲۳ •
 • مجید امجد ۱۵۲۵ • بھڑا ناٹھی ۱۵۲۷ • خورشید احمد جانی ۱۵۲۸ • اختر قادری ۱۵۳۰ •
 • قلیل بدایونی ۱۵۳۳ • شمس نواب انش ۱۵۳۶ • رمز عظیم آبادی ۱۵۳۷ • سیدتی احمد راشاد ۱۵۳۹ •
 • مظفر حیدری ۱۵۴۰ • نیاز حیدر ۱۵۴۱ • سلیمان باریب ۱۵۴۳ • احسان درہنگوی ۱۵۴۶ •
 • فطالہ نقیض ۱۵۴۷ • دقا ملک پوری ۱۵۴۹ • نیب الرحمن ۱۵۵۱ • حسن عظیم ۱۵۵۲ •
 • قیوم اختر ۱۵۵۸ • ناصر کاظمی ۱۵۵۹ • وقعت سروش ۱۵۶۳ • گلزار بلوخی ۱۵۶۷ • عظیم حاجز ۱۵۶۹ •
 • جمیل الدین عالی ۱۵۷۳ • ادا جعفری ۱۵۷۷ • جیلانی کامران ۱۵۸۰ • کمال احمد صدیقی ۱۵۸۳ •
 • راجی مصوم رضا ۱۵۸۵ • نریش کنارشار ۱۵۸۶ • لعل انشاء ۱۵۸۸ • محمد بلوخی ۱۵۹۳ •
 • سلیم احمد ۱۵۹۷ • قاضی سلیم ۱۶۰۰ • ناظر الحسنی ۱۶۰۳ • مظہر ام ۱۶۰۳ • حوسٹ الام کام ۱۶۰۸ •
 • بیکل آسای ۱۶۰۹ • کنور ہندو سنگھ پیدی ۱۶۱۱ • ہراج کوئل ۱۶۱۲ • مصیب جالب ۱۶۱۸ •
 • سیر نیازی ۱۶۲۰ • مینتی مٹی ۱۶۲۲ • ارشد کا کوئی ۱۶۲۵ • فرحت قادری ۱۶۲۸ •
 • پرکاش بھگتی ۱۶۳۰ • شفیق طاہر شعری ۱۶۳۳ • انجریانی ۱۶۳۵ • حمایت علی شاعر ۱۶۳۶ •
 • جلال آبادی ۱۶۳۲ • ہراج نرین راز ۱۶۳۲ • شمس عارف ماہر آبادی ۱۶۳۶ • صدیقی بھگتی ۱۶۳۸ •
 • نشتر خان نظامی ۱۶۵۱ • ہانی ۱۶۵۲ • مصور سزوری ۱۶۵۹ • عاشور کاظمی ۱۶۵۹ • ہانی انصاری ۱۶۶۱ •
 • وہاب انش ۱۶۶۳ • احمد فراز ۱۶۶۵ • شاد شکت ۱۶۷۰ • ہوک محمد پوری ۱۶۷۲ • صابر آبادی ۱۶۷۳ •
 • ممتاز احمد ۱۶۷۵ • حسن احسان ۱۶۷۷ • جون ایلیا ۱۶۷۹ • محمود سعیدی ۱۶۸۲ • شہاب جعفری ۱۶۸۶ •
 • بشیر بادر ۱۶۹۰ • وحید اختر ۱۶۹۳ • فخر محمد کیوری ۱۶۹۶ • بشر نواز ۱۶۹۸ • شہر یار ۱۷۰۰ •
 • ساتی فاروقی ۱۷۰۵ • مظفر حق ۱۷۰۸ • زہیر رضوی ۱۷۱۱ • اعجاز افضل ۱۷۱۵ • زہیر ننگ ۱۷۱۷ •
 • کشنور بھید ۱۷۱۹ • وکیل اختر ۱۷۲۲ • قیصر شمس ۱۷۲۴ • فخر محمدی ۱۷۲۴ • غلام رحمتی رائی ۱۷۲۸ •
 • ظہیر رضوی برق ۱۷۲۹ • اربان بھگتی ۱۷۳۱ • سیدولی شاہین ۱۷۳۳ • ظہیر صدیقی ۱۷۳۸ •
 • منظور بھگتی ۱۷۳۸ • فخر قرانی ۱۷۴۰ • زیب نوری ۱۷۴۲ • عطاء علی ۱۷۴۵ • عرفان صدیقی ۱۷۴۸ •
 • سید احمد شمس ۱۷۵۲ • ظہیر غازی پوری ۱۷۵۵ • سلطان اختر ۱۷۵۷ • انیس ناگی ۱۷۶۱ •
 • انکھار جالب ۱۷۶۳ • شاد احمد مصیب ۱۷۶۳ • گلگیر ایاز ۱۷۶۶ • حسن نواب ۱۷۶۷ •
 • عظیم بھگتی ۱۷۶۸ • لعل الرحمن ۱۷۶۹ • حنیف زین ۱۷۷۱ • شاد بانی ۱۷۷۲ • عظیم قادری ۱۷۷۳ •
 • صادق ۱۷۷۶ • افتخار عارف ۱۷۷۸ • اہلبہد ۱۷۸۲ • لہبہد ۱۷۸۳ • امیر آقا قزلباش ۱۷۸۸ •
 • مہار کام ۱۷۸۹ • انکار امام صدیقی ۱۷۹۱ • شمس کاف نظام ۱۷۹۲ • شجاع خاور ۱۷۹۳ •

- ۱۹۸۰ء کے آس پاس اور اس کے بعد کا منظر نامہ ۱۸۰۹ء تا ۱۹۱۲ء
 (ذیل کے تمام لوگ مابعد جدید دور کے حامی نہیں بلکہ بھی ان میں اکثر ۱۹۸۰ء کے آس پاس
 نمایاں ہوئے ہیں۔ جس فنکار کا جو خطہ نظر رہا ہے وہ اس کی بحث میں داخل ہے۔)
 • عبدالمنان طرزی ۱۸۱۳ • بلخ الزماں عمر ۱۸۱۶ • توس صدیقی ۱۸۱۷ • اکرام باگ ۱۸۱۸ •
 • عبداللہ سار ۱۸۱۹ • سجادہ ۱۸۲۰ • ایضاً کاک ۱۸۲۱ • شاد عظیم ۱۸۲۲ • شہباز ندیم شاہی ۱۸۲۵ •
 • منور احمد ۱۸۲۵ • صلاح الدین پرویز ۱۸۲۷ • فرحت احساس ۱۸۳۰ • فہیم طارق ۱۸۳۱ •
 • انجم علی ۱۸۳۳ • البراکام فریدی ۱۸۳۳ • طارق چشتی ۱۸۳۵ • سید احمد قادری ۱۸۳۷ •
 • فہیم بگٹی ۱۸۳۷ • راشد جمال فاروقی ۱۸۳۹ • منصور عمر ۱۸۴۰ • اقبال حسن آزاد ۱۸۴۱ •
 • منتاب حیدر نقوی ۱۸۴۲ • اسد علی ۱۸۴۳ • راشد طراز ۱۸۴۵ • ارشد عبدالحمید ۱۸۴۷ •
 • رکش الدین رکش ۱۸۴۹ • شہنازی ۱۸۵۰ • حفیلہ جہانی ۱۸۵۲ • مظفر جمیل ۱۸۵۳ • خورشید اکبر ۱۸۵۳ •
 • عالم خورشید ۱۸۵۸ • ظفر کمالی ۱۸۶۱ • شافع قدوائی ۱۸۶۱ • قاسم خورشید ۱۸۶۲ •
 • نگہناں پروین ۱۸۶۳ • ملک زادہ جانی ۱۸۶۵ • فاروقی اختر ۱۸۶۶ • شمس رمزی ۱۸۶۷ •
 • کلید جہانی ۱۸۶۸ • امام عظیم ۱۸۶۹ • عمران عظیم ۱۸۷۱ • عطا عابدی ۱۸۷۲ • جمال الزبکی ۱۸۷۳ •
 • سلیم انصاری ۱۸۷۷ • زہم ریاض ۱۸۷۸ • مولانا علی ۱۸۸۰ • ایچ اے اشرف ۱۸۸۰ •
 • سرور ساجد ۱۸۸۲ • ریاض لطیف ۱۸۸۳ • کوثر مظہری ۱۸۸۴ • عظیم احمد عظیم ۱۸۸۵ •
 • حسن رضا رضوی ۱۸۸۵ • محمد امام قادری ۱۸۸۷ • غزال عظیم ۱۸۸۸ • حقانی انصاری ۱۸۸۸ •
 • نعمان شوق ۱۸۸۹ • عالم شہباز علی ۱۸۹۱ • سراج بھٹی ۱۸۹۲ • احمد محفوظ ۱۸۹۳ • مشتاق احمد ۱۸۹۵ •
 • رسول ساتی ۱۸۹۶ • مشتاق صدف ۱۸۹۷ • نوشاد احمد کریمی ۱۸۹۹ • ظہیر رحمتی ۱۹۰۰ •
 • طارق متین ۱۹۰۱ • سرور الدہدی ۱۹۰۳ • خالد عبادی ۱۹۰۵ • راشد انور راشد ۱۹۰۶ •
 • کلید اعظمی ۱۹۰۸ • عادل حیات ۱۹۰۹ • انوری عظیم ۱۹۱۱ •

۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۳ء

۱۹۱۵ء تا ۱۹۵۲ء

- لاڈلے صاحب چاہ ۱۹۱۷ • امیر احسنی کنوری ۱۹۱۹ • نفروا احدی ۱۹۲۰ •
 • الطہر پرویز ۱۹۲۲ • حسن امام ورد ۱۹۲۳ • محمد شفی رضوی ۱۹۲۵ • رشید حسن خاں ۱۹۲۶ •
 • عاتق علی ۱۹۲۸ • احمد مشتاقی ۱۹۳۱ • ظفر اقبال ۱۹۳۵ • امین اشرف ۱۹۳۹ • محمد سالم ۱۹۳۱ •
 • حنیف نقوی ۱۹۳۳ • صدیق الرحمن قدوائی ۱۹۳۳ • شمیم کمالی ۱۹۳۵ • محمد حسن آزاد ۱۹۳۷ •
 • قاضی عتیہ الرحمن ہاشمی ۱۹۳۸ • عبدالقیوم بادلانی ۱۹۳۹ • حبشیہ قر ۱۹۵۰ • جمیل اختر ۱۹۵۱ •

۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۵ء

۱۹۶۷ء تا ۲۰۵۶ء

- ☆ افلاطون نامہ (جلد اول، جلد دوم، جلد سوم)
 ☆ اشاریہ اشخاص (جلد اول، جلد دوم، جلد سوم)

احوال واقعی: یہ تاریخ ادبِ اردو کیوں؟

اردو ادب کی مکمل تاریخ کی اشاعت کا مسئلہ شاید اب سلجھ سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ چھوٹی بڑی ادبی تاریخ کی کتابیں مسلسل شائع ہو رہی ہیں جن میں بعض علاقوں پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ یہ صورت اس لئے بھی الجھتی ہے کہ علاقائی سطح کا ادبی تحقیقی سرمایہ قابل لحاظ حد تک سامنے آ گیا ہے۔ گویا اب اردو ادب کی مکمل تاریخ کی طرف دڑتے ہوئے قدم کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جو چیز صرف نظر کی جارہی ہے وہ تاریخ نگاری کا ناقص تصور ہے جو پرانے طریق کار کو تکرار کرتا نہیں کرتا لیکن اس کے ابھار کی وجہ سے گہری نظر رکھنے پر زور دیتا نظر آتا ہے۔ یہ درست بھی ہے اس لئے ادب یا ادبی کہ کہ ہم تمام علوم سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتے دراصل کسی ادبی تخلیق کی بحث میں خالق کے کتنے جہات کی کا فرمائی، وقتی ہے یا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ پھر وہ جس سماجی نظام، ثقافتی سطح، نفسیاتی تہذیب، سیاسی ماحول، علاقائی اور ملکی پھر عالمی ماحول میں جیتا ہوتا ہے وہ انداز کسی نہ کسی سطح پر اس کی فکر کا حصہ ہے ہی۔ لہذا جدید و قدیم ثقافت اور فکر سے اس کا رشتہ ڈھونڈنا ہے۔ اس کے داخلی و خارجی احوال کی کیا ہی کسی لحاظ سے انکبری نہیں ہوتی، جو بھی نہیں تھکتی۔ اب ادبی تاریخ لکھنے والا بھی ان نکات کو تکرار نہیں کر سکتا ہے اس لئے کہ ایک ادبی تاریخ نویس بھی اپنے زمانے میں رہتا ہوتا ہے، ماضی کی بھی تہذیب کرتا ہے۔ گویا وہ ایک زمانے سے دوسرے زمانے کا وسیع جی تکرار میں سفر نہیں کرتا بلکہ زمانوں کے انعام کے ساتھ وہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ یعنی اب ادبی تاریخ لکھنے والوں کے سامنے بھی نئے

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدنی در دل کشا بہ چمن در آ
(بیدل)

جاسکتی ہے۔ اگر یہ تصور بھی چاہم رہے تو نئے مطالبات کی کچھ شقوں کے حوالے ہماری ادبی تاریخ کے جزو ہو سکتے ہیں۔

اردو کی ادبی تاریخ کے کچھ نئے مطالبات بھی ہیں جن کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو تاریخ نویسی کا کام کی نہیں رہتی۔

اگر موقف یہ رہے کہ آسانی سے جڑ واد حاصل ہو جائے تو کافی ہے۔ اس میں مطلب دیانیت کی چھان پھنگ کے لئے صحت مطلوب ہے، اگر ایسے معاملات میں ہی مورخ الجھ جائے تو پھر کام آگے کیسے ہو سکتا ہے۔ بات اہم کسی لیکن تسامحات، اطلاقات، دست فریب کاری، دیانات میں غلو، غلو، غلو کی طوائف، نئے حقیقی انکشافات سے بے خبری وغیرہ کسی بھی تاریخ کو نقص عارت کرنے کیلئے کافی ہیں۔ ہمیں احساس ہونا چاہئے کہ گزشتہ پچاس برسوں میں نئی تحقیقات کا ایک پیش بہا خزانہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ تذکرہوں کے اطلاقات کی تصحیح کا کام سرانجام پا رہا ہے۔ بعض بھداہم شاعروں کی زندگی کے احوال اور خردان کے کلام کے بہت سے صحیحہ مسائل حل ہو چکے ہیں اور بعض حل ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر آج کا ادبی مورخ ان سے صرف نظر کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ ایک دشواری ضرور ہے کہ ایک محقق دوسرے محقق کے کام کو رد کرتا بھی نظر آتا ہے کہ اس کے پاس اپنے دلائل ہوتے ہیں، اب تاریخ لکھنے والے کا کام ہے کہ وہ اپنی بصیرت، قوت تحلیل اور علمی ڈھن کو کام میں لائے اور کسی آخری فیصلے پر پہنچ جائے یا پھر بصورت دیگر متنازع امور کو اس طرح پیش کرے کہ پڑھنے والا اپنی بصیرت کا محرک رکھ سکے اور کسی نتیجے پر سرگرم ہو سکے۔ تحلیل جالی کے یہاں یہ شعور بدیہ اہم موجود ہے، گیان چند جیوں اور سید ہاشم کی تاریخوں میں بھی یہ کیفیت نمایاں ہے۔ قسم کا خمیری کے یہاں عقلی اور تجرباتی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ پہلے جوتار نہیں قلمبندی گئی ہیں دوسرے سے ایسے ”شعور“ سے پیچھے ہیں۔ دور اصل قصہ شعور کو زیادہ متحرک اور فعال رکھنے کا ہے اور نہ ایک ہی تاریخ ہیئت کے لئے کافی وراثی ہو سکتی ہے، جواز مذکور حکومت کی علامت ہوگی۔

ادبی تاریخ نویسی کے باب میں یہ بحث بھی چلی آتی ہے کہ سوانح کے حصے کی طوائف کیا ہوں، کسی ادیب یا شاعر کی زندگی کے حقائق، اس کی تعلیمات، انکار وراثت کی تنظیم میں کس حد تک معاون ہو سکتے ہیں، یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ اب تو مختلف کی موت کا اعلان ہو گیا ہے تو پھر سوانح کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے گہری مباحث میں فی الحال پڑھ نہیں چاہتا لیکن اگر کسی شاعر یا ادیب کی زندگی اس کی تنظیم میں معاون نہ بھی ہو تب بھی اس کی زندگی کے حقائق سے غافل رہنے کا جواز نہیں پیدا ہوتا۔ ایک معنوی ہی مثال دینی جاسکتی ہے کہ غالب تو طرح طرح کے ”عیوب“ میں مبتلا تھے لیکن ان کی شاعری؟۔۔۔ گویا ایسی صورت میں زندگی کے احوال اور بھی اہم ہو جاتے ہیں۔ دور اصل تنقید قاسب کی ہونی چاہئے کہ زندگی کے حقائق اسے خطی نہ ہو جائیں کہ فن اور فکر پر تنقید سرسری ہو جائے۔ سوانح اور فکر و فن کے مباحث میں خوشگوار ہم آہنگی اور تسلسل کا اپنا حسن ہے جسے ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے اردو ادب کی تاریخ لکھنے والا جانتا ہے کہ سوانحی اثبات کا حصول بھی آسان نہیں۔ ہمارے یہاں اب تک ادبی و فکری اعتبار سے معتد معاون کتابیں بے حد کمیاب ہیں، ان کا کچھ حصول آج بھی کار مشکل ہے۔ جوتار یہ ہے کہ یہاں افسانہ اور موت کے دن تاریخ کی تلاش میں آج بھی ہفت خواں

دوسرے لوگوں نے شدت سے اس کی کا احساس کیا تھا، اپنے خود پران ادب کے جاں نثاروں نے مکمل بھی کی لیکن جنور کام مکمل ہے۔۔۔ ادبی تاریخ لکھنے والوں کو اس باب میں اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے، تاریخی عظمت ہوئی اور سارا کیا دھار عارت ہوا، اس کی ایک مہر خاک مثالی گڑھ تاریخ اردو ادب کا پھل پڑ چکے ہیں، جس کی پہلی جلد اطلاقات و پینار و عارت ہوئی اور وہ بھی سوانحی معاملات میں، حالانکہ آج بھی اس میں بعضوں کی تحریریں کی اہم نکات سے آگاہ کرتی ہیں۔ گویا سوانحی امور کچھ زیادہ کچھ کچھ جاتے ہیں، جس کا احساس ہر ادبی تاریخ لکھنے والے کو ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی ہوا ہے۔ ایک اور مسئلہ جو ادبی مورخ کے سامنے ہوتا ہے وہ تذکاروں کے در انتخاب سے متعلق ہے، ہزاروں لکھنے والے تذکاروں اور رسالوں کے اوراق کی زبانت ہیں۔ ایک مسئلہ تو ان اہم اور نامور شاعروں اور ادیبوں کا ہے جو زمانے کی گرد سے پرے ہو چکے ہیں اور اپنے اپنے دور میں اپنے مخصوص جوتار وراثت کی وجہ سے ادبی تاریخ کا ٹوٹ حصہ ہیں، لیکن مسئلہ کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ بعضوں پر سے اچانک گرد و غبار جھڑ جاتے ہیں اور کسی محقق، ادیب، دانشور یا نقاد کی نگاہ میں آج بھی انہیں نئی زندگی دیتی ہیں اور وہ بھی تاریخ کا ورق بننے کا جواز تن جاتے ہیں۔ مورخ کو ایسے فراموش شدہ ناموں کی تجدید سے خاکہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ انہیں اپنے وقت پر پرکھنا چاہئے کہ کہاں تک بیاد و کار تحقیق و انکشاف اس وقت ہے کہ اس پر توجہ کی جائے۔ خود ادبی تاریخ کے مورخ کو اپنے خود پر بعض فراموش شدہ و گمراہ تذکاروں کی تلاش کرنی چاہئے جو وقت اور حالات کی اہم طریق، لیکن، تعصب وغیرہ کے شکار رہے ہیں اور ادب کی تاریخ سے ت ہا پر کدے گئے ہیں۔ اگر کوئی مورخ ایسی چھان پھنگ کرنا ہے اور اس کے پاس تجدید حیات کے لئے جواز اور مکمل موجود ہے تو اسے امت کرنی چاہئے اور اپنے تذکاروں کو آگے بڑھ کر نگاہ لگانا چاہئے۔ ادبیات کی تاریخ میں ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں کہ مورخ کا ذاتی تعصب رنگ لایا ہے اور اگر انقدر شخصیت اس کے احاطہ تحریر سے باہر رہ گئی ہے۔ ایک کھانسی مثال مومن کے بارے میں دی جاتی رہی ہے کہ کس طرح محمد حسین آزاد کی ”آب حیات“ کا پہلا ایڈیشن مومن کے ذکر سے غالی رہا۔ پھر ممکن ہے وہاں کے تحت بعد میں انہیں شریک کرنا پڑا، محمد حسین آزاد بھی انہیں شعور ادب کے باوقار نقاد ایسے عمل سے غمزدہ رہے ہیں۔ ”اردو شاعری پر ایک نظر“ از: علیم الدین احمد پر ایک نظر ڈالئے، شاد علیم آبادی کہیں نہیں ملیں گے۔ لیکن جب ایک اہم ادارے نے علیم الدین احمد کو شاد علیم آبادی کے درجہ ان کو ایڈٹ کرنے کا کام مروت کیا تو اب مروت کی نگاہ میں شاد اور غالب کے ساتھ غریب کوئی میں شہیت جاتے ہیں۔ یہ بے لگشی شاد علیم آبادی کی نہیں علیم الدین احمد کی ہے جنہوں نے فائیت تعصب سے کام لیتے ہوئے شاد کو نظر انداز کیا، پھر اپنے گمراہ کی پاداش بھی خود ہی کی یعنی ان کا دیوان مرتب کیا۔ وجہ اور تفصیل میں چاہا ہے سوز ہے۔ اس لئے کہ بہت سے تذکار و واقعات سامنے لانے پڑیں گے۔

ادبی مورخ کی اپنی پسند یا پسند اپنی جگہ لیکن علاقائی تعصب بھی کسی کے یہاں لگنے کی چھان رہا ہے۔ اپنے علاقے کے ہر کہ وہب کو اشتاد لکھا، انہیں پانس پر چڑھانا اور دوسرے علاقوں کے ممتاز فنکاروں کے بارے میں بے مروت ہونا عام ہی بات ہے۔ یہاں سے دو مثالیں دیتا ہوں۔ ادارہ امام اثر کی ”کاشف الحقائق“ حالی کی ”مقدمہ شعور و

شاعری کے آس پاس شائع ہوئی۔ "کاشف المحجوب" کا کیوں بڑا اقتباس میں بعض عالمی ادیبوں اور شاعروں سے بھی روشناس کرانے کی سعی ملتی ہے۔ شعر و شاعری کے مباحث اپنی جگہ پر لیکن کیا کیجئے کہ ایک مرتبے تک یہ کتاب سرخانے میں ہی رہی، کچھ لوگوں نے توجہ بھی کی تو غایت و درجہ سرسری اصد تو یہ ہے کہ عظیم الدین احمد نے "اردو تنقید پر ایک نظر" میں امداد امام اثر کا نام تک نہیں لیا، یہاں تو علاؤ الدین صاحب کا سوال نہیں تھا پھر بھی ایسا ہوا۔ دوسری شکوہ کے کتبے والوں نے امداد امام اثر کے ساتھ زیادتی کی بلکہ یہ کہتا درست ہوگا کہ اردو تنقید کے ساتھ علم کیا۔ خیر سے "کاشف المحجوب" اب زندہ اور تابندہ تنقیدی کتاب ہے۔ راقم الحروف نے محتاط کتاب کے باب میں جو کام کیا اس کا اظہار یہاں مقصود نہیں۔ بلکہ واضح کرنا ہے کہ ادبی بے اہلیاں کیسے کیسے رنگ اختیار کرتی ہیں؟ اب دیکھئے کہ ابھی بھی انجم مانجوری ادبی تاریخ کے صفحات سے غائب ہیں۔ طرز مزاج کی ایک سے تاریخیں مرتب کی گئی ہیں لیکن اس نام سے دامن کشاں گزرتا زمانے کی ریت بن گئی۔ ہمارے یہاں طرز و مزاج کتبے والوں نے کی اہم کردار تخلیق کئے ہیں جو جائز طور پر تحقیقی مطالعے میں رہے ہیں۔ لیکن عظیم آباد کا قابل فخر فنکار قمر گماںی میں ہے، میرے خیال میں "میر گز" جیسے جامداداں کردار بہت کم مزاج نگاروں کے یہاں ہے، لیکن ادبی مورخ "میر کھوئی گواہی" "کرائے کی ٹشم" اور کئی شاہکار فن پارے سے بے خبر ہے یا اطلاق ہے۔ ایسی روش کو کیا کہا جائے؟

ان مسائل سے الگ ایک اہم مسئلہ معاصرین کو تاریخ میں مثال کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ہے۔ اکثر تاریخی کتابیں ایک منزل پر آ کر رک جاتی ہیں اور معاصرین سے ایک طرح کی حد فاصل قائم کر لی جاتی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں، ادبی مورخ یہ موقف اختیار کر سکتا ہے کہ معاصرین ابھی اپنے کام میں لگے ہیں، ان کے بارے میں ادبی تاریخ میں جگہ متعین کرنا دشوار ہے، نئی تحریریں ان کی زد و درہمیکسگی، سیاسی اہم پہلو سے اور بحث کا ایک دروازہ بھی ہے جو مرگئی گئے ان پر لکھنا بھی آسان نہیں اس لئے کہ جو اس دنیا سے رخصت ہوئے ہر حال میں قابل احترام ہیں۔ ایسے میں ان پر ٹھکر کر بحث کرنا آسان نہیں، بجز ایک الجھن یہ بھی ہے کہ کسے شریک کیا جائے اور کسے رو کر دیا جائے۔ لہذا چھوٹی چھوٹی بعض تاریخوں میں چند جیلے کسی معاصر نگار کے بارے میں مل جاتے ہیں۔ لیکن سنجیدگی سے لکھی جانے والی تفصیلی تاریخیں ایسے جو ستم سے گریز کرتی ہیں۔ میں مغرب کے حوالے سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ وہاں کی ادبی تاریخیں بعد up to date ہوتی ہیں۔ مغربی ادبی مورخ کسی بھی فنکار کے بارے میں چاہے وہ اس کا معاصرین کیوں نہ ہو ایک واسطے قائم کر لیتا ہے۔ اردو انتخاب اس کے صواب دینے پر منحصر ہوتا ہے۔ لیکن اردو میں ایسے نگاہرے سے بچنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں اس رجحان کو بدلنا چاہئے۔ جن معاصرین کے نام کسی تفصیلی ادبی تاریخ میں نہیں آئیں ان کی طرف سے بھرا آسکتے ہیں۔ جس کے لئے تیار رہنا چاہئے، اردو ادبی تاریخ معاصرین کے حوالے کے بغیر ہمیشہ مکمل رہے گی۔ اگرچہ کتبہ بھی جاری طور پر "تاریخ ادب اردو" کا جزو بنائے گئے تو کوئی نقصان نہیں۔ اگر ان میں

اردو ادب کی تاریخ ایک اور مسئلے میں ہمیشہ گرفتار رہی ہے، وہ ادبی اسکول یا دبستانوں کا معاملہ ہے۔ بعض تسلیم شدہ دبستان مثلاً ادبی یا کھنڈ کے بارے میں شاید اختلافی پہلو بہت کم ہو سکتے ہیں لیکن رام پور کا دبستان، دبستان عظیم آباد اور ایسے کہتے ہی دبستانوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ بھلا بھولی جواز دینی صاحب کا کہ انہوں نے "ادبی اسکول" لکھ کر لکھو اور ادبی کے دبستانوں کا تہہ پاک کرنا چاہا ہے۔ مجھے دبستانوں سے بچ نہیں ہے، لیکن کوئی ضروری نہیں کہ کسی فنکار کو کسی اسکول سے وابستہ کر کے ہی جھنگڑی جائے۔ دراصل وقت، حالات، کوائف، مسامحت اور پھل لین دین سے جلد تھوڑی رات پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ لکھنؤ کا ہر شاعر شیخ و شہرت کے ہی پائے اتنی شاعری میں استعمال کرتا رہے۔ دراصل رہنمائی و مسامحت اپنے خاص اھل کی وجہ سے ایک اسکول یا نظریے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان کے خود خیال کو اہل سمجھنا کسی فنکار کی انفرادیت کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ اجماعی نقطہ نظر سے کچھ باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن یہ خود تحفظات کے ساتھ اور فنکاروں کی الگ الگ شکلوں کی شناخت کا سوال ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ میں نے اپنے طور پر ان دبستانوں کا سرسری ذکر کیا ہے، لیکن ان میں اسیر نہیں رہا۔ باتیں آئے گل گل گئیں تو دوسرے لئے فطری بھی ہیں اور میرے وقت کے مطابق بھی۔

مجھے احساس ہے کہ میری یہ تاریخ بھی مکمل نہیں ہے، نہ مجھے اس کا دعویٰ ہے کہ میں نے جو کام کیا ہے وہ آخری سطح کا ہے۔ بہت سے پہلو ہیں جو شاید نشان زد نہ ہو سکے ہوں۔ لیکن یہ بعض قابل لحاظ شخصیتیں میری نگاہوں سے اوجھل رہی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے بعض امور میں مغالطہ ہوا ہو۔ لیکن ایک بات واضح کر چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے طور پر اندراج کے معاملہ میں کسی قسم کے تعصب سے کام نہیں لیا ہے۔ عظیم آباد کے حوالے میں بھی نہیں۔ لیکن یہ چند نئے لوگوں کے ذکر سے بعض اردوؤں پر مل پڑ جائیں، لیکن میں ایسی صورتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ میں مابعد جدید صورت و انداز سے متاثر ضرور ہوں لیکن تاریخ نویسی میں کوئی دائرہ مجھے گھیر نہیں سکا ہے۔ میں نے یہ کام بعد کھئے ذہن سے کیا ہے۔ میری آرزو اتنا رہی ہے کہ حال کے ادب یا عصری ادب کی بھی پھر پورا نمائندگی ہو۔ اگرچہ جوان ادیب بھی تاریخ میں جگہ پا جائیں تو نقصان کیا ہے؟ ضروری نہیں کہ ہر مورخ کسی شاعر یا ادیب یا کسی فنکار کی موت کا انتظار کرے یا یہ دیکھے کہ اس کے ادب نے جو پائیں یا آگے نہیں متاثر ہوئی ہیں یا نہیں۔

اس تاریخ کی تکمیل میں میں نے شائع شدہ چھوٹی بڑی اردو کی ادبی تاریخوں پر نگاہ رکھی ہے اور ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔ اس معاملے میں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے میں نے حلقے میں یا بعض جگہ متن میں تفصیل دے دی ہے۔ میری ذاتی لائبریری نے مجھے بہت سہارا دیا ہے۔ بعض اوقات یہ احساس ہوتا تھا کہ کتب خانہ غیر ضروری کتابوں سے تنگ ہو گیا ہے لیکن بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں تحقیق و تجسس کے حوصلے میں بعد و گارانت ہو گئیں۔

خیر سے خدا بخش اور فیض پبلک لائبریری اور گورنمنٹ اردو لائبریری میرے شہر ہی میں ہیں۔ ہر مشکل مرحلے

رہا اور وہ کہا ہے مستعدی سے میری ضرورتیں پوری کرتے رہے، میں ان کا سیدھ منوان ہوں اور ان کی دہراؤی عمر کے لئے دست بہ دعا ہوں۔ اسی طرح گورنمنٹ اردو لائبریری کے لائبریریئن حسن احمد بھی مختلف ضروری کتابوں اور رسالوں سے میری تشکیں مل کرتے رہے۔ میں ان کا بھی سپاس گزار ہوں۔

میں نے بعض نکات کے باب میں کئی لوگوں کو خط لکھے۔ کسی نے جواب دیا، کسی نے خاموشی اختیار کی۔ ایسے خطوط زیادہ تر حالات زندگی کے حصول کے بارے میں تھے۔ لوگوں کا اس ضمن میں لا تعلق ہونا حیرت کی بات تھی، اس لئے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کوئی پروچسٹ شروع کیا وہ نہ کھل رہا۔ خاموشی اور لا تعلق کے رد یہ کو متعلقہ اشخاص کی آنکھیں پریشان بخور ہوں۔ بعض زندہ ادیبوں کا سوانحی حصہ کمزور ہے تو اس کی بھی وجہ ہے جس کی طرح تفصیل غیر ضروری ہے مگر میں ایسے تمام لوگوں کا ممنون ہوں جنہوں نے اس باب میں میرے ساتھ تعاون کیا ہے۔

میں نے اپنا حالیہ کتابوں کے باب میں لکھا ہے کہ میں زیادہ تر مواد املہ کرنا ہوں۔ یہ صورت اس کتاب میں بھی رہی ہے۔ اس کتاب کے چالیس فیصد حصے کا Dictation عزیز نے یہ صوبہ پرہیز نے لیا، گھنٹوں یہ کام ہوتا رہا اور وہ بڑی یکسوئی سے مصروف کار رہا، جب ان کی شادی نہیں ہوئی تھی، لیکن اسی دوران یہ خوشگوار واقعہ بھی ہوا کہ دوست اردو ادب سے بہت ہونگئیں۔ چھوڑوں کے لئے کام ٹھپ رہا، لیکن حسن احمد لائبریریئن، گورنمنٹ اردو لائبریری میری معاونت کے لئے سدا بہر ہو گئے۔ کتاب کا بقید Dictation انہوں نے لیا۔ میں ان کا تشکر ہوں۔

تاریخ ادبیات عالم کی متعدد جلدوں کا Dictation ڈاکٹر حسن رضا رضوی نے لیا تھا، لیکن جب وہ کچھ ہوئے تو بعد مصروف ہو گئے، لیکن کچھ دنوں کا کام بھی ان ہی کے سر پر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پڑھے گھر کی بی بی بھی پڑھی ہوتی ہے۔ مجھے کیونڈنگ کی فکر تھی کہ یہ مرحلہ کیسے طے ہو۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب محسن بی کی چھوٹی بیٹی عزیز نے یہ رشیدہ رضوی (گڑیا) نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ ماشاء اللہ عزیز نے بالکل سائنس میں ایم اے کی ہیں اور اردو سے تو رہا خاص ہے۔ گھر کی بہو بیٹیوں میں Talent چھاپا رہا ہے، زیادہ تر ان کے اختیار و فروغ کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ یہ بڑکی یار کی الفاظ پر کس حد تک قدرت رکھتی ہے اور کتنی جلدی سے مشین (Key board) پر اس کی انگلیاں چلتی ہیں۔ اس طرح اس بچی کے سہارے میرا کام ایک منزل پر آ گیا۔ خدا عز کریم اس کے مستقبل کو رشیدہ دہا جاکہ جائے آمین۔

میں نے ادباء، شعراء اور دوسرے فنکاروں کی ترمیم میں تاریخ عیدائش کا خیال رکھا ہے۔ یعنی کسی فنکار کی عظمت کا لحاظ کیے بغیر جگہ متعین کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے شہرت یا معیار کے اعتبار سے ترمیم کا کام سر انجام نہیں پایا۔ کہیں کہیں اشتباہی صورت پیدا ہوئی ہوگی۔ اسے نظر انداز کیا جائے۔

کسی ایک فنکار کا ایک ہی جگہ چار مرتبہ لکھا حالانکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا بھی ہو جو مختلف جگہوں سے

احاطہ کئے گئے۔

میں نے اس تاریخ کی تکمیل میں عالم فاضل لوگوں کا سہارا نہیں لیا ہے۔ ہر شخص کا Ego ہے، میں اس سے بچنا چاہتا تھا۔ رسالے اور کتابیں میری معاونت بھی تھیں اور آج بھی ہیں۔ اگر یہ کام بطریق احسن انجام پایا ہے تو ان شکلوں کتابوں کی دین ہے جن سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں ایچ کیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی کے مالکان الحاج محمد یحییٰ خان اور ان کے صاحبزادے الحاج مصطفیٰ کمال پاشا نے خصوصی دلچسپی لی، میں ان کا ممنون اور تشکر ہوں، ساتھ ہی ساتھ محمد بھوان اور عزیز پاشا جن انجم کا بھی، جن کا تعلق اسی ادارے سے ہے۔

وہاب اشرفی



اُردو کے لسانی مباحث: عمومی جائزہ

ہمیشہ یہ سوال اٹھایا جاتا رہا ہے کہ اردو ہندی یا ہندوستانی ہے کون کی زبان یا بولی مراد ہے۔ مگر یہ سن کے مطابق کھڑی بولی کی دو واضح تقسیمیں ہیں۔ ایک فطری اردو ہے اور دوسری ہندی۔ ظاہر ہے اردو زیادہ تر فارسی، عربی الفاظ سے مرکب ہے اور اس کا رسم الخط بھی فارسی ہے۔ جبکہ ہندی سنسکرت، آریہ زبان ہے اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مگر یہ سن نے دونوں زبانوں کے لئے ”ہندوستانی“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ایسے انہوں نے بولیکوں کی جس طرح تقسیم کی ہے وہ غلط ہے۔ دراصل یہ چیز زبانیں ہیں۔ یہ نقشہ ملاحظہ ہو۔

مغربی ہندی

مشرقی ہندی

چھتیس گڑھی اودھی بھجیلی بھلی قوی برج کھڑی برہانی

اردو ادب کھڑی بولی ہندی ادب

بھاری

راجستھانی

میشل نکھیسی ہونچوری

ڈاکٹر منشی کمار چٹرجی گریس کی ایسی جھیم کو نکلا تصور نہیں کرتے۔ لیکن وہ ہندی کے تین روپ پر زور دیتے ہیں۔ یعنی اردو اور ہندی کے علاوہ چارہری ہندوستانی اس پر بھی وہ قانع نہیں بلکہ آتش اس کی پانچ شکلیں سامنے لاتے ہیں۔ یعنی اردو دوسری ہندی (پانچاگری ہندی)، تیسری ہندی جس میں دونوں کے سادہ الفاظ مشترک ہیں اور چارہری ہندوستانی جو درجہ اول کا ہندوستانی اور دلی کی علاقائی زبان ہے، ہونیات ہندی جسے انگریزی میں اوہندی کہتے ہیں یہ ملک کے عوام کی ایسی مستعد ہوتی ہے جو میڈیاری نہیں کہی جاسکتی۔ جبکہ ڈاکٹر گرامس بیلا ہندی میں اور دلی کے علاوہ راجستھانی، راج اور ہندی کو شامل کرتے ہیں اور جسے اعلیٰ ہندی کہا جاتا ہے۔ نیلا دلی، مہاراجپور اور ال آباد کے بچے کے علاوہ کوہندی کے صحیح علاقے تسلیم کرتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک جہاں کھڑی کی نصیبت ہے، وہاں راج اور کوئی کی بھی ہے۔ شیا م سندھو اس بھی گریس اور ڈاکٹر چٹرجی کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے مسفرینی کو ہندی مانتے ہیں۔ جو محلوں کا خیال ہے کہ معمولی ہندی الفاظ راجستھانی اور دلی کھڑی ہوتی ہے جس کا تعلق راجستھانی، بہار، مہاراجپور اور مدھیہ پردیش تک ہے۔

بعض ماہر لسانیات نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو یا ہندی کا رشتہ پنجابی سے ملتا ہے۔ بھو نے اس بات کی تردید کی ہے کہ پنجابی کا ذخیرہ ہندی اردو سے بالکل مختلف ہے کہ ایک ہی طرح کی زبانیں انہیں سمجھنا دشوار ہے۔

گویا ہندی یا اردو کے تین مختلف نام سامنے آتے ہیں: (۱) کھڑی بولی (۲) ہندی، مغربی ہندی اور مشرقی ہندی (۳) مسفرینی ہندی، مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر پرکاش منس لکھتے ہیں:-

”ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ راج بھاشا بولی ہندی بلکہ بہاری اور راجستھانی لانے والوں نے بھی خود کو ہندی کو تسلیم کیا ہے۔ اس باب میں اگر گراں لٹ ہے بھی تو اس کی آواز بہت نجف ہے۔ اردو، بہار اور راجستھانی میں مختلف مکوشیں اپنی خوشی سے اپنی زبان کو ہندی کہتی ہیں۔ وہاں کے لوگ اپنی تہذیبی اور علمی زبان کے طور پر ہندی کو ہی استعمال کرتے ہیں۔ ان زبانوں میں بالخصوص راج اور اوڑھی کی ادبیات بالکل ہندی کی ادبیات ہیں۔ ہندی ادب سے راج اور اوڑھی کو الگ کرنے کی کوشش گوشت کو ٹائمن سے جدا کرنے کے مترادف ہے۔ کھڑی بولی راج اور اوڑھی کا ایک اعلیٰ ادبی سلسلہ ہے۔ اس وجہ سے ہم اس مقالے میں کھڑی بولی، راج اور اوڑھی ادب کو ہندی ادب کے ذیل میں شامل کر رہے ہیں۔“

یہاں پھر کہ اردو کے بعض نظریات کا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک سوال تو قدیم دلی اردو کا ہے جسے آج قدیم اردو یا اردو کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔ ڈاکٹر بخاری اپنے ایک مضمون ”قدیم دلی اور اردو کا تقابلی مطالعہ“ میں دکن اور

اردو کے اختلافات کو سامنے لاتے ہوئے انہیں الگ الگ زبانیں قرار دیتے ہیں لیکن اس نظریے کو آج کوئی قبول نہیں کرتا۔ ان کے مقابلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے زبانوں کے ساتھ یہ قول کیا ہے کہ دونوں زبانیں بیکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دلی یا بھاشا، چارہری اور اختلافات مختلف سلاطین دلی کے عہد کی اردو کے قدیم کے سوا اور کچھ نہیں۔ اردو کے قدیم ناموں میں دکن تو ہے ہی کھڑی بھی ہے۔ جس کا تعلق بھارت والا اور بھارت، پنجاب سے ہے۔ خوب محققین اور محرمین اپنی زبان کو گھڑی ہی کہتے ہیں لیکن ڈاکٹر زور بخاری کو کسی سے علیحدہ کر کے نظر آتے ہیں۔ لیکن آج اس بات کو کوئی نہیں مان سکتا۔ اس طرح ہریانائی کو بھی کوئی علیحدہ بولی قرار دے کر اردو سے الگ کرنا درست نہیں ہے۔ ہریانائی میں پنجابی کی آوازیں بھی ہیں۔

اردو کے آغاز کے جو نظریے پیش کئے گئے ہیں ان میں ایک بات مشترک ہے کہ اردو کھڑی بولی کا ایک پیچیدہ روپ ہے۔ یعنی اردو ہر طرح سے کھڑی بولی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں متعدد نظریات سامنے آئے ہیں۔ میراسی نے اس کا اظہار کیا ہے کہ جب شاہ جہاں آباد آیا تو اسے اردو کے سنی کا خطاب بھی دیا۔ گلکرسٹ جوہر کے سلسلے کے بعد اردو کی بنیاد تلاش کرتا ہے۔ گویا جب جوہر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت اردو کی بنیاد پڑی۔ سر سید نے اپنی کتاب ”آثارِ مضامین“ میں اس کا اظہار کیا ہے کہ شاہ جہاں آباد میں دلی آباد کی اس وقت سے اردو زبان سامنے آئی اور ۱۶۸۸ء کے قریب اس میں شعر گوئی شروع ہوئی۔ امام بخش سیہانی نے اپنے رسالہ ”آثارِ اردو“ میں بخاری کے اظہار اور ہندی کے محققوں کے استعمال اور تغیر قبول سے اردو کے وجود پر گفتگو کی ہے۔ سید سلیمان ندوی مسلمان اور قدیم ہندوستانیوں کے سبب جوں کے توہیں میں اردو کے وجود کی بات کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں بہت سے پہلے پہل جوں مکان سے لے کر ٹھیک سندھ میں اور پھر یہاں سے بھارت اور کالیا دار تک ایک سلسلہ قائم کرتے ہیں۔ جب کہ ہون سنے اردو کو بارہویں صدی میں اعلیٰ کے نواز میں بڑے اہمیت دیا ہے۔ لیکن بات محمد حسین آزاد نے کہی ہے کہ اردو زبان راج بھاشا سے نکلی ہے۔ مولانا خٹک بخاری بھی لکھتے ہیں لیکن پروفیسر محمود شیرانی نے اپنے دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی سب سے قریب زبان پنجابی ہے جہاں سے اردو نکلی جبکہ ڈاکٹر زور نے اردو کو پنجابی کی زبان کہا ہے۔ ڈاکٹر سید مسعود حسین خان اردو کو کھڑی بولی مانا کرتا ہے خود بخاری اور کھڑی سے قریب لکھتے ہیں۔ ان تمام مباحث پر روشنی ڈالتے ہوئے پرکاش منس نے یہ وضاحت کی ہے کہ اصل میں اردو ہو یا ہندی دونوں کی تہ میں کھڑی بولی یا ہندوستانی پوشیدہ ہے۔ اس کے ارتقا کی تاریخ لکھی جائے تو دونوں زبانوں کے ادبیات میں سے نمونے لینے ہوں گے۔ لیکن یہاں موصوف نے ہندی تعلق ڈاکٹر احمد زور دیا کی سمجھ ہا جس میں اس طرح باتیں ہیں:-

”(الف) — تاریخی نقطہ نظر سے اوڑھی کھڑی بولی (ہندی) کی نسبت کھڑی بولی اردو کا چلن پہلے ہوئے گا تھا۔

(ب) — قہیم اردو مٹلی عہد (ابتداء سے ۱۸۰۰ء تک) میں کٹری بولی کا وجود ایسا ہے تھا مگر چہ اس بولی کا استعمال ہندو کوئی اور لکھنے ادیب میں کوئی خاص ذکر کرتے تھے یہ مسلمانوں کی بولی سمجھی جاتی تھی۔

(ج) — کٹری بولی ہندی کا دراج تہری ادیب میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا اور نظم میں شیسویں صدی میں۔

اس مسئلے کو سیاسی رنگ دینا بڑا غلط ہوگا۔ امرت رائے نے اپنی کتاب A House Divided میں اس امر پر زور دیا ہے کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مسلمانوں کو اپنی شہادت کا مسئلہ درپیش تھا لہذا انہوں نے اردو زبان وضع کر لی۔ یہ تو ایک سیاسی بیان ہے جس کی کوئی ادبی اور لسانی اہمیت نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اردو میں ہونے اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا زوال بھی سمجھی سے شروع ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فارسی کا بھی انحطاط سامنے آیا اور دو طاقت چکڑنے لگی۔ اب ادیبوں اور شاعروں نے اردو کو باضابطہ طور پر برحق شروع کیا اس لئے کہ لاری قبائلی زبان اب پیش نظر نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر تارا چند نے یہ بات لکھی ہے کہ۔

”سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک لسانی احتجاج وجود میں آیا۔ مسلمانوں نے اپنی ترکی اور فارسی

ترک کر دی اور ہندوؤں کی زبان اختیار کر لی۔“

لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اردو ہی کا پرانا نام ہندی اور ہندوی تھا۔ اس لئے اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں تھی، ہندوؤں کا بھی اس کی تہذیب و ادب سے امتیاز اہم درجہ رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اردو کی تلاش و جستجو میں مسلمانوں کی آمد پر بڑا زور دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن سے غلط فہمیں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ مسلمانوں نے زبان کو جس شکل کرنے میں نمایاں درجہ اہم دیا ہے لیکن ان کے ساتھ ہندو بھی شائد بیٹہ نہ رہے ہیں۔ ہندی کے غلبے نے اردو کو ہندوؤں سے تقریباً چھین لیا ہے۔ حالانکہ ایک دور وہ بھی تھا کہ گھر گھر میں اردو کی تعلیم ہوا کرتی تھی جس میں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہ تھی۔ گو اردو کو ہندوستان کی زبان لکھا جاتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی بحث میں ہندو مسلم مساوی کی یکساں حقیقت ہے۔ دیے ہوئے خبر گمان چند محققین نے بھی کٹری بولی کو اردو کی اصل قرار دینے میں کوئی قدامت محسوس نہیں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”مجھے یہ سامنے میں کوئی چل نہیں کہ کٹری بولی ہندی نسبتاً ایک پچھلی بولی تھی جلد زبان تھی۔ ہندی مسلمانوں کی سرپرستی اور نوک چک ستوارنے کے بعد یہ اردو کے پیرایہ نگار کی شکل لے لی

خاور سے جس پچھلی بولی کا ہر بولی۔ لکھت کو تہذیب و رہنے کے لئے بیرونی لین دین کے کوئی پرہیز نہیں تھا۔ اسلامی دور میں ہندوستان نے قانون لطیف اور تہذیب میں بہت کچھ اضافے کئے۔ حدوتہ ہے کہ ہندی بولی نے رہنے والی انگریزی حکومت کی وجہ سے مغربی اور تہذیب سے صراحت سلامت ہوئی۔“

سب سے پہلے فطری طور پر مجھے پچھلی اردو کے قہیم نمونوں سے بحث کرنی چاہئے۔ اس کی ابتدا اسعود سلطان سے کی جا رہی ہے۔ بھران صوفیہ سے اردو کی ابتدائی چھٹی صدی میں کسی طرح اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ دوسرا اصل اردو زبان ادیب کی ابتدائی اشوفا میں صوفیہ کے کام اور پچھتروں کے ردی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں ایک طرف تو شاہان تھے جنہیں حکومت اور اقتدار سے مطلب تھا، انہیں زبان کی ترویج و ادب و صنعت کی کوئی ایسی فکر نہ تھی۔ دوسری طرف مسلمانوں کا کام سرانجام دینا تھا۔ دراصل اس زمانے کے صوفیہ اپنے طور پر ایسے اہم کام سرانجام دینے کی سعی میں مصروف رہے تھے۔ لیکن ایک لسانی مسئلہ ان کے پیش نظر ضرور رہا ہوگا، اس لئے کہ کسی بھی صوبہ کا اردو بولی کے لئے متعلق بولی بولی یا زبان سے واقفیت یا قہیم و اقلیت ضروری تھی۔ سبھی صوفیہ کے ساتھ بھی ہوا۔ دراصل ان کے تنظیمی وظیفے مسئلے میں اخوت، بھائی چارگی، امن و امان، اتحاد و غیرہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ اسلامی تصورات سے باخبر ہوں۔ انہیں جاودہ حشمت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ یہ دنیا پرست نہ تھے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی فقہر لیکن سچہ اہم تعریف ”اردو کی ابتدائی اشوفا میں صوفیہ کے گرام کا حصہ“ میں ایسے امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے بعض صوفیہ کی ابتدائی مقامی بولچوں سے دلچسپی کا حال روشن کیا ہے۔ بعض جگہ اس کتاب سے استفادے کی صورت ملے گی۔ دوسرے حصہ دکھائی دے گا کہ ایسے مسائل پر بھی شائع ہو چکی ہیں، لیکن مسئلہ اس کا ہے لہذا ناگزیر صورتوں میں دوسرے مصادر کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ آگے کے صفحات سے از خود پتا مسودوں ہو جائیں گے۔ لیکن ایسے معاملات میں ہر جگہ غایت اقتصاد سے کام لینا ضروری ظہر الہذا اس کی پابندی کی گئی۔ آگے کے صفحات کی طرف توجہ کرنے کی گزارش کر رہوں۔



ابتداء سے سترہویں صدی عیسوی کا ادب

شمالی ہند میں اردو کی ابتداء

شمالی ہند میں اردو کی ابتدا کی تلاش کا مسئلہ اتنا آسان نہیں کہ چند سلی ٹوٹے کی بنا پر کوئی آخری فیصلہ کر دیا جائے۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ ہندوستان میں مسکرتے کے علاوہ مقامی بولیاں ایک خاص درجہ تکھی تھیں۔ انہیں کی ارتقائی صورت سے اور کھڑی بولی کے حوالے سے اردو اور ہندی کی نئی شکلیں نمودار ہوئیں، لیکن زبان کے قدیم و عاصی ہنگامہ کی جاسکتے تو ایسا محسوس ہوگا کہ ایسے الفاظ کی کثرت ہے جن کا رشتہ جدید اردو سے دور درگب نہیں ملتا۔ جہاں اردو زبان کی بنیادیں سے گفتگو کی گئی ہے وہاں مختلف نظریات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ لیکن قدیم زبان کھڑی بولی تک آتے آتے ایک واضح رخ ضرور اختیار کر لیتی ہے جسے ہم اپنی سہولت کے لئے ہندوستانی کہہ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد فارسی عربی زبانوں کا اختلاط ایک اسلامی عمل ہے، جس سے کوئی اختلاف شاید ہی کر سکتا ہے۔ اب کھڑی بولی کا روپ بھی نیا ڈھنگ اختیار کر سنے لگا۔ نتیجے میں ہندو کی ظہور پذیر ہوئی جس کا رشتہ بعد میں دکن سے قائم ہوا، جہاں ایک الگ نچ پر اردو زبان کی ارتقا پذیر ہوئی، ساتھ ہی ساتھ شعر و ادب بھی۔ بڑا یہ بات غلط نہیں ہے کہ صوفیائے اپنے طور پر تبلیغ اسلام کے لئے مقامی بولیوں کو کسی نہ کسی طرح برتاؤ شروع کیا۔ ظاہر ہے ان کی اپنی زبان بھی تھی جس میں عربی الفاظ کی کثرت رہی ہوگی، پھر فارسی کی نئی صورت بھی ابھری۔ نتیجے میں ایک مخلوط بولی جسے قدیم اردو بھی کہہ سکتے ہیں، ابھرنی لگی تھی۔ یہی تہذیب کے اتصال کی صورت کو جمیل چالیں اس طرح بیان کرتے ہیں:-

”نئی تہذیب کے اتصال نے رفتہ رفتہ اس زبان کے کینڈے، رنگ، ڈھنگ اور ساخت و حرائج کو

”نیک ہم جانسی“ معروف ہے کہ یہ قول مولوی عبدالحق نے نقل کیا ہے۔

”تمکان نہ کنکہ کہ بیچ اولیا اللہ بڑا بن ہندی نظم کردہ و نہی کہ اول از جمیع اولیا اللہ قلب انقلاب خویہ بزرگ صحن الحق واصلت والدین مذکورہ ہیں زبان سخن فرمودہ۔“

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضرت صحن الدین بخشی اجمیری مقامی زبان یعنی ہندی سے واقف ہوں گے۔ اور یہ اقلیت ہی اس خیال کو مضبوط کرتی ہے کہ زبان کا ایسا استعمال ابتدائی اردو کی نشوونما میں اہم ثابت ہوا ہوگا۔

بابا فرید الدین گنج شکر

(۱۱۷۳ء۔۱۲۶۶ء)

خوہ فرید الدین گنج شکر بابا فرید کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا پورا نام شیخ فرید الدین مسعود تھا۔ خواص (عوام) میں گنج شکر یا شکر گنج کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت خواہ قلب الدین اختیار کاکی کے مرید بھی تھے اور غلیظ بھی۔ ان کا تعلق خواہ بزرگ یعنی حضرت صحن الدین بخشی اجمیری سے بھی تھا۔

خوہ فرید الدین گنج شکر فرخ شاہ کالی کی نسل سے تھے۔ ان کے دادا کا نام قاضی شعیب تھا، جو چنگیزی فتنے کے سبب اپنے تین صاحبزادوں اور چھ متعلقین کے ساتھ لاہور آ گئے تھے۔ لاہور لاہور سے قصور آئے اور قصور سے تھان چلے گئے اور اسی کے فوار میں سکونت اول میں آباد ہوئے۔

بابا فرید الدین گنج شکر کے والد جمال الدین بانسوی تھے۔ یہ بھی قاضی شعیب کے ساتھ تھان کے فوار میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کی شادی سلطان دادہ الدین مہادی کی لڑکی سے ہوئی۔ انہیں کے بطن سے ۱۷۷۷ء میں فرید الدین گنج شکر پیدا ہوئے۔ موصوف کو حصول علم کا بڑا شوق تھا اور اس کے لئے روز روز کا سفر کیا۔ وطن اور بانسوی میں بھی اسی فرض سے ایک عرصے تک رہے۔ لیکن جب حضرت کی عمر ۵۹ سال کی ہوئی تو اجودھن یعنی پاک پٹن میں جو خجاب کا علاقہ ہے، سکونت اختیار کر لی۔ یہیں انہوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام سر انجام دیا۔ انہوں نے ۹۳ برس کی عمر میں ۱۲۶۶ء میں انتقال کیا۔

مختلف زبانانہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابا فرید کو سرائے سے بڑی دلچسپی تھی۔ خود قاری اشعار بر محل پڑھتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے موصوف کی ایک قاری رباعی نقل کی ہے۔ ان کے ہندی ملفوظات دفتر سے درود ہے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ اسی قیاد پر سید سلیمان ندوی اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو کا سراغ حضرت فرید گنج شکر کے عہد سے ملنا شروع ہوتا ہے۔ صورت و انداز جو بھی ہو حضرت کے حالات پختہ نہیں کہ انہیں پائی ہیں ان میں ہندی اقوال اور ملفوظات کی کمی نہیں ہے۔

بابا فرید کے شعری مذاق کا حال بھی بعض کتابوں میں درج ہے۔ ان کی ہندی دانی مسلم ہے۔ اس میں کوئی کام

نہیں کہ انہوں نے ہندی اور ہے کہے ہوں گے۔ ”سیر الاولیا“ میں بھی ایک دربار درج ہے۔

کست تھیں کار دی ہکاں ست ستائے

بس کندھی مدھن گرجوریں سہائے

دیئے بعض محققوں نے بابا فرید کے رختے کے نمونے بھی دریافت کئے ہیں۔ عکاس مرزا نے ایک عیاض کے حوالے سے بابا فرید کے رختے کا نمونہ پیش کیا ہے:

راستا دی ہے گویہ ہکا ہکا ہے گویہ

در دل بھی ضرب کند ہراستا لہیا تو گویہ

مولوی عبدالحق نے رختے کی جو مثال دی ہے وہ یہ ہے:

وقت سر وقت سادھات ہے

خیر دواں وقت کہ برکات ہے

یاد رہے کہ بابا فرید کا کام سکھوں کی مذہبی کتاب ”گرور گتھ“ میں بھی ہے۔ جس زمانے میں یہ کتاب مرتب ہوئی تب سے آج تک جو بھی کام اس میں درج ہے وہ اصلی صورت میں ہے۔ یعنی الحاقی امور کی جب بھی بات آئے گی تو ”گرور گتھ“ کی اشاعت سے پہلے کی ہوگی۔ اتنی بات مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ بابا فرید ہندی جانتے تھے اور ہندی گو بھی تھے۔ لہذا انہوں نے تبلیغ و اشاعت کا جو بھی کام سر انجام دیا ہوگا اس میں ہندی حراج کا دخل عمل ضرور ہوگا۔ بابا فرید کے کام کا ایک نمونہ ملاحظہ ہوا۔

فرید ہے توں عقل لطیف چن کالے گتھ نہ گتھ

آپڑے گرجوان میں سرخاں کر کے وکچے

فرید کالے سینڈے کپڑے کالا مینڈا دیس

گھن بھر یا میں بھراں لوک گھن درویش

لوک فرید لوک جیوں داکھا جور

جنت لگ لگا نہ گرے جب لگ لوک پکار

فرید کن مصلی صوف گل دل کاتی عزوات

بہر دے چاٹاں دل اندھیری دات

لیکن ایسے تمام اشعار جو بڑے مشکل کے دائرے میں رہے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ انہیں یکسر رد کر دیا جائے یا بغیر تحقیق کے قبول کر لیا جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ تحقیق کی کوئی نئی اسالی صورت اب تک سامنے نہیں آئی لہذا ایسے اشعار کا ذکر کرنا ہونا چاہئے۔

شیخ شرف الدین یعلی قلندر

(۱۳۲۳ء۔)

شیخ یعلی قلندر کے سلسلے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ یہ صاحب تصنیف تو ہیں لیکن ان کا تعلق فارسی سے ہے۔ ان کی فارسی مثنویاں بھی اشاعت پزیر ہو چکی ہیں اور ان بھی لہذا یہ کیا جاتا مناسب ہے کہ وہ فارسی طور پر فارسی کے شاعر ہیں۔ لیکن بھری یا بھڑی سے ان کی دلچسپی بھی عجیب ہوتی ہے۔ شاید یہ وہ ہی جو ہمیں آگے لکھا آیا۔ مولوی عبدالحق نے بھی اپنی تذکرہ کتاب میں ان کے سلسلے میں اس طرح لکھا ہے:-

”سہارا خانانے ازاد سفر کیا تو ان کی زبان مبارک سے یہ دہرایا:

بگنی سکا سے جا نیما گے اور نین مر یں گے رو سے

بدھلے ایک دین کو۔ بھور کوشی نہ ہوئے۔“

لیکن آج یہ کہنا بڑے مشکل ہے کہ وہ اچھا یا بالفاظ انہیں کے ہیں اور اگر انہیں کے ہیں تو پھر ہندی سے یا مقامی زبان سے ان کا تعلق ثابت ہوتا ہے۔

امیر خسرو

(۱۱۶۳-۱۲۳۵ء)

امیر خسرو ایک ناخدا دربار شخصیت تھے۔ ان کے اوصاف اور تقریر میں ان کا ایک مشکل امر ہے۔ یہ عرصہ صرف موصوف تھے۔ انہوں نے زندگی کی دلچسپ رنگ گھٹتوں کو جس طرح بے ستھ کی کوشش کی۔ وہ اپنی جدوں میں بے حد اعتبار کا باہور تھے۔ لیکن امیر خسرو کے بارے میں عجیب اور دلچسپ سلسلہ ہے۔ حدوتہ یہ ہے کہ ان کے والد کے ہم نام ان کی جائے پیدائش اور ان کے قبیلے کے بارے میں سارے پورے خیالات باطلی ہو رہے ہیں۔ بھران کے کام کی چھان چھنگ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نام سے منسوب سارا کا کام ان کا اپنا نہیں ہے۔

پہلے یہ کیا جاتا تھا کہ امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین بھیرہ کوں کے لاجپن قبیلے کے سردار تھے اور اپنے وطن

میں سے انہیں کے عہد حکومت میں حدود خان آئے تھے۔ امیر خسرو چٹائی طلع ارد میں ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۵ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔ لیکن اب ان میں اکثر باتوں کی تردید ہو چکی ہے۔ ممتاز حسین نے اپنی کتاب میں امیر خسرو دہلوی کے سوانحی امور سے بحث کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کی باتیں جو ان کے بارے میں مشہور ہیں وہ درست نہیں۔ امیر خسرو کے والد کا نام سیف الدین جس تھا اور ”لا جپن“ قبیلے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ نام کا ایک خڑو ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:-

”جیسا کہ گئے وہ اپنا نام خسرو لکھتے وہاں اس کی رعایت سے اپنے والد کا نام لاجپن ہی لکھتے۔

(جس کے ایک بھائی معنی غلام کے ہیں) اور جہاں یہ محل نہیں ہوتا وہاں سیف جس یا سیفی کہہ

کر یاد کرتے ہیں۔“

ممتاز حسین یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کے نانا راجپوت اور تو مسلم تھے اور ان کی جائے پیدائش چٹائی نہیں بلکہ دلی ہے۔ یہ سب امور خسرو کی مثنوی ”نہد سیر“ سے ثابت ہے۔ خسرو نے اس مثنوی میں اپنے بھڑستانی ہونے پر غور کیا ہے۔

امیر خسرو کے والد کی شادی قنار الملک کی دختر سے ہوئی تھی اور یہی امیر خسرو کی والدہ تھیں۔ ان کے والد ان کے عہد طفلی ہی میں مار ڈالے گئے اور یہ اپنے نانا کے ماتحت دلی میں رہتے گئے۔

امیر خسرو نے متعدد بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ مثلاً غیاث الدین بلبن، اقبال، جلال الدین فیروز، علاؤ الدین خلجی، شہاب الدین عمر، قطب الدین مبارک، نصیر الدین خسرو اور غیاث الدین تغلق۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ امیر خسرو نے ان مختلف المرائع بادشاہوں کے عہد میں اپنا پہلا ان سے اظہارِ حق اسن رکھا، جبکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ بات بات پر لوگ قتل کروے جاتے تھے۔ ایسے میں خسرو کی زبان شناسی اور مردم شناسی کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی حکمت عملی سے برجہد کے تنکراتوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور اپنے لئے جبکہ جانتے رہے۔

امیر خسرو کی ذہانت، لطافت اور سیاسی شعور کی تعریف کرنی چاہئے اور یہ بھی کہ ایسے مادی اور پرخطر حالات میں وہ تصوف کی طرف بھی مائل رہتے اور اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں مسلسل حاضری دیتے رہے۔ بلکہ یہ کہنا شاید بے جا ہو گا کہ تنکراتوں کی محنتوں کا تقاریر مرشد کے قدموں میں گر کر ادا کرتے۔ اس طرح وہ پادشہوں میں داخلہ پائی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

شاعری امیر خسرو کی اولین ترجیح تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایہات خود امیں ڈھائی اڑکھتے ہیں اور ان کی تصانیف نہانوے ڈھائی تھیں۔ لیکن یہ امور مبالغے سے خالی نہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ امیر خسرو کوئی زبانوں پر دسترس تھی، مثلاً عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت وغیرہ سے بھی ان کی واقفیت کا پتہ ملتا ہے۔ خارجی مائٹائی زبانوں سے بھی۔ مثنوی ”نہد سیر“ اس کی گواہ ہے کہ انہوں نے متعدد زبانوں کا ذکر کیا ہے جن سے گریہ سن نے بھی استفادہ کیا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق امیر خسرو کی زبان ہندوئی رہی ہوگی۔ ایک ہندی تعلق ڈاکٹر برج بھوشن گلشنے

اپنے ایک مضمون میں اس کا اظہار کیا ہے کہ خسرو کی ماں راجپوت تھیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہ امیر غلام الملک کی دختر کیسے ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہ ڈاکٹر پرکاش موہن نے خسرو کی مائی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ راجپوت تھیں ہو سکتی ہیں۔ اس ذکر سے مفہوم اس کتاب ہے کہ خسرو کی مائی اور معدومہ کچھ سے زیادہ راستہ آشنائی تھیں۔ اس تو وہ فارسی کے شاعر تھے لیکن ان کے ہندی کلام کا جو نمونہ ہے اس سے مقامی زبان سے ان کے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مشہور شعر جو خسرو کا ملتا ہے وہ ملکہ و مہی کی ”سب دس“ میں ہے:

چکھا ہو کر میں ذلی ساقی حیرا جاؤ
میرے ملتی ختم کیا میرے لعلیں ہاؤ

افضل کی ”یکٹ کہانی“ میں بھی ایک دو بار خسرو کا ہے اور وہ اس طرح ہے:

گوری سوئے سچ پر کھ پر ڈارے کیس

چل خسرو گھر اپنے رہیں بھی چو دس

اس سلسلے میں پرکاش موہن رقمطراز ہیں:-

”اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وہ افضل ہی نے شامل کیا تھا یا کاتب مخطوط نے۔ کہتے ہیں کہ جب

حضرت نظام الدین اولیا کا انتقال ہوا تو امیر خسرو بنگال گئے ہوئے تھے۔ مرشد کے وصال کی خبر مئی

توروتے پہنچے دہلی پہنچے۔ مرشد کی قبر تک بھی تو ہیں وہ اپڑھا اور بیہوش ہو گئے۔ یہ وہ باعام طور سے

اس طرح ملتا ہے:

گوری سوئی سچ پر اور کھ پر ڈارے کیس

چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھی چو دس

اس دوہے کی شان نزول دل میں ڈرا لکھ پیدا کرتی ہے۔ مرشد کو سونپا میں چلایا شوہر مانے کی

روایت تو ملتی ہے لیکن گوری یا محبوب کے روپ میں مرشد کو پہنچنے کی مثال نہیں ملتی۔ یہ صحیح ہے کہ

سلطان الشارح کا عرس آج بھی خسرو کے دہی دوہے سے شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلہ روایت کی

بتاؤ خسرو کے اس دوہے کا مستند نہ کیسے کی کوئی وجہ بتا دے پاس موجود نہیں ہے۔ ”سب دس“ میں منقول

دوہا بھی ہر حال مستند مانا جاتا ہے۔“

لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جو آسانی سے خسرو کی کہی جاسکتی ہیں۔ مثلاً:

گفت کہ رودیست درین گل خیلے

ہر گاہ گویا کہ دی لیوہ دلی

نظر

زور مگر پیرے چہ ماہ پارہ

کچھ گھڑے سنوارے پکارا

نقد دل میں گرفت و بھگت

پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

میر کی ”کلیات الشعر“ میں ہے اور امیر خسرو کے منسوب ہے۔

امیر خسرو کی ایک غزل بہت معروف ہے، جو ذیل میں درج کر رہا ہوں:

ز حال مستکین کن تغافل دورائے نیاں مانے بقیاں

چو تاب بھراں نازم اسے جاں نہ لہو گاہے لگائے چھتیاں

شان افراں دراز چوں زلف زمان و صلت چو عمر کویت

سکھی چا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کالوں اندھیری دجیاں

یہاں ایک از دل وہ چشم جاوہر بعد فرہم ہر حسرتیں

کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی سے تار کی بقیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ تیراں ہمیشہ گریاں حلق آں نہ

نہ نیند نیاں نہ انگ چھیاں نہ آپ آویں نہ بھیجے چچاں

بق آں نہ کہ روز محشر بدامدا فریب خسرو

سجود من کی دورا ہے راکھوں جو جائے پاؤں چاکے کھتیاں

اس غزل کے باب میں بھی شک و شبہ کی گنجائش ہے بلکہ بعض لوگ صاف طریقے سے کہتے ہیں کہ یہ امیر خسرو

کی تخلیق نہیں ہے۔ لیکن اکثریت خسرو کے مزاج کو سمجھنے ہوئے اسے انہیں سے منسوب کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مکی اور

چیزیں جو خسرو کے نام سے منسوب ہیں، شک کے دائرے میں ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی مشہور غزل: ”خالق باری“ کو بھی

مشہور سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:-

”بہشتیت شاعر امیر خسرو کی قبولیت کی انتہا یہ ہے کہ زبان زہرام ہو کر اشعار کو رکھتے

کا حصہ بن گئے جس کے نتیجہ میں ان سے بہت کچھ منسوب بھی کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ شمار کہ

مکرمناں، اطمیناں، بن بوجھ پہیلیاں اور وہ ہے، خستیں، دھوکے، خستے، گیت اور بوجھ

..... سب کچھ ان سے منسوب ہو کر رہ گیا۔ جس کے نتیجے میں اب خسرو شامی کے لئے اردو ادب پانی کو الگ کرنے کے لئے لسانی، تاریخی اور تہذیبی امور کی چھان بینکے لازم ہو گئی ہے۔ بعض کو داخلی شہادتوں کی بنا پر مسترد کیا گیا تو بعض کو تاریخی اور لسانی حقائق کی بنا پر ساقط قرار دیا گیا۔ بہر حال یہ سرور تو محققین کا ہے لیکن درحقیقت کیا ہے گیت.....

"گاہے کو پانی بدلیں سن باطن مورے....." آج بھی سن کو بھاتا ہے، غواء محققین اس کے بارے میں کچھ بھی کیوں نہ کہیں۔ ابھی عالم ان کی پہیلیوں وغیرہ کا بھی ہے، جنہیں آج بھی بچے بڑے پڑھتے ہیں۔

لیکن کوئی چند تاریک اپنی کتاب "امیر خسرو کا بعدی کام" (نیشنل بک ڈپارٹمنٹ) میں لکھتے ہیں:-

"امیر خسرو سے منسوب بعدی کام کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) بعدی کے دو کلمے یا مصرعے جو فارسی سے نقل ہو کر امیر خسرو کے فارسی کام میں آئے اور جو بنگالی طور پر امیر خسرو کی تعریف ہیں اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہیں۔

(۲) امیر خسرو سے منسوب وہ بعدی کام جس کا ذکر بعد میں آنے والے تذکرہ نویسوں، شاعروں یا محققین نے کیا ہے۔

(۳) امیر خسرو سے منسوب وہ بعدی کام جنہیں مختلف ماخذ سے جمع کر کے مولانا محمد امین عسکری نے چاکوٹی نے اسی نامی موسومہ جواہر خسروانی میں غلطی گڑھ سے شائع کیا تھا، جس میں پہیلیاں، کہے، ٹکڑیاں، دو نسخے، انشے، روئے، گیت وغیرہ شامل ہیں۔"

امیر خسرو کی مبتدائی پر مہارت کے سلسلے میں تمام محققین و بالذکرین نے اتفاق کیا ہے۔ غلط و ستار نہیں کی ایجاد ہے۔ خیال کی ایجاد کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ اگر آراگ کا موجود نہیں کو بھٹا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کام میں موضوعیت خاصی پائی جاتی ہے، خصوصاً ان کے گیت، ہنری وغیرہ میں۔ شجاعت علی سندیلوی نے ایک گیت جس کا کلمہ ہے:-

"حضرت غلامی سنگ کیلے رحال"۔

کو خسرو کی تخلیق بتایا ہے، لیکن یہ شک ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ ان کا گیت ہے کہ نہیں۔ البتہ اس میں موضوعیت نہ مٹی پائی جاتی ہے۔ بعض پہیلیاں خسرو سے منسوب ہیں بلکہ اردو میں پہیلیوں کی روایت انہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں وثوقی سے نہیں کہہ سکتے کہ کون سی پہیلی خسرو کی ہے اور کون سی اور کی۔ شجاعت علی سندیلوی نے ان کی بہت ساری پہیلیاں "خسرو اور ان کی شاعری" میں جمع کر دی ہیں۔ لیکن ساری پہیلیوں کو خسرو سے نام سے منسوب کرنا شاید درست نہیں۔

اور اصل خسرو کے نام سے منسوب بہت سارے کلام کو اس لئے مشتبہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں بڑی صاف زبان کا استعمال ہوا ہے جبکہ زمانے کے لحاظ سے یہ صورت نکلاں ہوئی چاہئے تھی۔ اردو شعروادب میں خسرو کی ایک اہم جگہ ہے۔ ان کا تعلق بعدی مزاج سے بہت زیادہ واضح اور روشن ہے۔ ان کے کلام پر خصوصاً اردو بول، کجیوں اور خسرووں پر برج بھاشا کا اثر پایا جاتا ہے۔ پہیلیوں اور کہانوں میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ عام بول چال کی زبان ہے۔ یعنی وہی زبان جو اس وقت دہلی میں بولی اور کجی جاتی تھی۔

امیر خسرو سے منسوب بعض پہیلیوں میں ہندو، احمد یا شہا کو کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن یہ بات یہ ہے کہ ان کے زمانے میں احمد شہا کو سلیم، ہندو، گولی وغیرہ ناپاب تھیں۔ لہذا ایسی پہیلیاں یا کہ کہانیاں از خود رد ہو جاتی ہیں یا ہو سکتا ہے کہ بعضوں نے یہ الفاظ بعد میں اپنی طرف سے جوڑ دیے ہوں یا بڑھا دیے ہوں۔ خسرو کے کلام کے مختلف دھاروں کی تعظیم کے لئے چند نمونے پیش ہیں:

حیام رن چچہر کا سرے مرلی دھرتی ہوئے

بن مرلی دو جاو کرت ہے برا ہو جسے کوئے (پھونکا)

اہل رن، آڈھیاں تن، ایک چیت دو دھیان

دیکھت میں تو سادہ ہیں پر ہمت کی پاپ کی کھان (لکھا)

ز نداری کی جوڑی ڈھکی

ایک قحطے ایک تاجین ہارا

دو ارے مورے اکھ جگاوے

سنگی چوکت بھرے پیوگی

اوچی اتاری چنگ بچھاو

کھل مٹی اگھیاں بھتی اند

سگری رین پھنسی پ رانگا

بھور بھتی جب دیا اتار

جب بولے جب لائے مٹھی

پل خسرو کر کوچ نقادہ

بھیموت برہ کے انگ لگاوے

اے نکھی ساہن تا نکھی جوی

میں سوئی مرے سر پر ایو

اے نکھی ساہن تا نکھی چند

رنگ روپ سب دا کا چاکھا

اے نکھی ساہن تا نکھی ہار

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

(۱۲۶۲ء - ۱۳۸۰ء)

یہ پیشہ سلسلے کے اہم بزرگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا نام شیخ شرف الدین احمد تھا اور یحییٰ منیری کے بچے تھے۔ شعبان کی ۲۶ یا ۲۷ تاریخ کو ۶۶۱ھ مطابق ۱۲۶۲ء کو مصر میں پیدا ہوئے۔ جو چلنے کے قریب ایک علاقہ ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر ہی پر ہوئی۔ اس کے بعد حضرت نجیب الدین فردوسی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ حضرت شیخ کا سلسلہ نسب حضرت امام جعفر صادق تک پہنچتا ہے۔ آپ کثیر تصانیف تھے۔ ”بزم صوفیہ“ کے مطابق تصانیف کی تعداد ۷۰۰ تک بتائی جاتی ہے۔ لیکن میرزا خیال یہ ہے کہ یہ سب محض رسالے ہوں گے۔ سب سے زیادہ شہرت ان کے کتبوبات کو حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان خطوط کی اہمیت اور نگ ذہب کی نگاہ میں بھی تھی۔ حضرت کے مکاتیب ہر جگہ ملتے ہیں۔ ان کے ملفوظات میں ”معدن العافی“ بھی ہے۔ جو شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے ملفوظات ”نفاذ الگنی“ کے نام سے زبور مہانت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات میں ایسے اقوال اور فقرے موجود ہیں جنہیں ریختہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مصنف الدین وردائی نے اپنی کتاب ”بہار میں اردو شاعری“ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ حضرت کی زبان اردو اور مکملی کے ارقام سے مرتب ہوئی ہے۔

موصوف کی دلچسپی سماع سے بھی تھی جس کا ذکر جہان الدین مبد الرحمن نے ”بزم صوفیہ“ میں کیا ہے۔ آپ کے ملفوظات سے کچھ مندرجہ نقل اور طلسمات قدیم اردو میں ملتے ہیں۔ ”تکلم“ (گہما) کے ”بہار فرس“ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک مضمون ان کے ملفوظات سے اور ہندی الفاظ کے حوالے سے قلمبند کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں کس طرح قدیم اردو سے دلچسپی تھی۔ ان کے بعض دو بے گنی ملتے ہیں۔ ریختاں اور دہلی کا ایک مشہور مضمون ہے ”اردو نثر کے ارتقا میں اردو اب بہار کا حصہ“۔ یہ مضمون رسالہ ”تکلم“ کے ”بہار فرس“ جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ان کے بعض چٹکے جن کا تعلق فقیری سے ہے درج ہیں۔ یہ چٹکے منظوم ہیں۔ ہندو شیعہ بھی ہیں، جن کا تعلق قدیم اردو یا ہندی سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ملفوظات بھی ہیں۔ ذیل میں ان کے کلام کے نمونے درج کئے جاتے ہیں، جن سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ایک حیثیت شاعری بھی رہی ہے:

کالا جہا تر ملا جیسے سمندر تیر جگہ پیارے بک بک برے نزل کرتے سرے

دور رہے نہ تیر

کبیر

(۱۳۹۸ء - ۱۵۷۵ء)

ہندوستان کے قدیم ادیب رہنماؤں میں کبیر کی نہ صرف حیثیت مسلم ہے بلکہ ہندو بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کاشی کے نزدیک گہر تار میں تیرا اور اس کی بیوی کا کوئی ایک بچہ ملا جو تازہ پیدا ہوا تھا۔ دونوں اسے دیکھ کر متاثر ہوئے اور پرورش کے لئے اٹھائے گئے۔ کاشی کا ایک محلہ کبیر پورہ نام سے مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ یہی مکان تیر کا ہے۔ جذبات کا جولا ہوا تھا۔ آج کل اس مقام کو تیر وطن کہتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ تیر نے قاضی کو بلا یا کہ کوئی اسلامی نام رکھا جائے۔ چنانچہ اس نے قرآن سے نام نکالنے کی کوشش کی تو اس میں کبیر، کبیرا اور کبیر جیسے الفاظ ملے۔ بچے کا نام کبیر رکھ دیا گیا جو بعد میں کبیر ہو گیا۔

کبیر کی پیدائش کب ہوئی اس سلسلے میں مختلف تاریخی مصنفین کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن زیادہ لوگوں کا اتفاق سبت ۱۳۵۵ بکر کی مطابق ۱۳۹۸ء پر ہے۔ کبیر کی پیدائش کے بارے میں کئی محیر العقول کہانیاں سامنے آئی ہیں لیکن سب کی سب اختراقی معلوم ہوتی ہیں اس لئے کہ انکی قیام کہانیاں کبیر کی موت کے بعد ہی رائج ہوئیں۔ کبیر تپتی کہوں میں یہ درج ہے کہ تیر پورہ نہا کہیں ختم میں سدھن نامی مٹی کے گاہ پاپ تھے۔ یہ لوگ مٹکی کا جسم چھوڑ کر نئے جسم میں رہ گئے اور برہمنی ہو گئے۔ کبیر نے ان ہی کے گھر جنم لیا تھا۔ لیکن ایسی قیام کہانیاں کبیر میں آنے والی نہیں ہیں اور اعتبار دینی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبیر کے اردو طوالت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے بھر بھی شمع کا جلا جاتا تھا۔ یہ بھی حیرت میں ڈالنے والی باتیں ہیں کہ بولا ہے خاندان میں پرورش کے باوجود کبیر رام گوند، بیری وغیرہ کے نام پند کرتے تھے۔

ان کی شادی کے سلسلے میں بعض محققین یہ کہتے ہیں کہ کبیر کی شادی ہوئی۔ ان کی اولاد میں ان کا نام دھیاں بنے دھیاں بھی کہتے ہیں اور دوسری اولاد۔

چندتہ منو ہر والی دیتی اپنی کتاب ”کبیر صاحب“ میں لکھتے ہیں کہ:-

”مسلمان کبیر پختھیوں کا خیال ہے کہ کبیر شیخ تپتی کے مرے تھے اور ہندو کہتے ہیں کہ شیخ تپتی اور کبیر

سے خدا بنے مباحثہ ہوا کرتا تھا۔“

کبیر پختھیوں کے علاوہ دیگر فرقوں کے لوگ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کبیر کے گرو سوانی رامانند تھے اور وہ اپنے وقت کے بڑے اہم رہنما تھے۔ لیکن پارس چھتہ جی اری لکھتے ہیں کہ کبیر صاحب کی پانی ان کی اصلی پانی معلوم ہوئی ہے۔ ان

کے لئے ڈاکٹر پارس چھتہ جی اری کی کتاب ”کبیر“ مسٹر جم رام کے ہدایتی کتب خانہ دہلی

کی بانی میں کسی ایسے آدمی کا نام نہیں ملتا جو ان کے دور کا ہو۔ ان کا ٹھکانہ ایک چھایا ہے جس میں مٹی سحر دہی کسی مہاتما کا ذکر آیا ہے:

مہری مٹی بگڑی میں نے رام سالیہ کہہ دو مٹی ڈالنی دھواے
مٹی دھت میں نہیں بیکھوں۔ یہ دکھ کا سون کہہ دے
کہے کبیر سونو مٹی سندن رانا رام رسول دے
"کبیر چٹاؤلی" میں بڑی اودھ لکھتے ہیں کہ:-

"کبیر داس نے جس جولاہے خانوادے میں پرورش پائی تھی اس میں ایک طرف تو تانہہ جتنی
یوگیوں کے اعتقادات تھے دوسری طرف وہ اسلام کے زیر اثر بھی تھا۔ میں نے اپنی کبیر نام
کی کتاب میں اس جولاہے قوم کی ماقی صورت کا مفصل مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی
پارچہ بالہ اقوام اسلام کی ترویج کے قائل نہ تھے (ذاتاً بے صفات کی سمجھ) تانہہ جتنی
یوگیوں کے زیر اثر تھیں۔ ترویج اسلام سے انہیں ایک بے مشغول مذہب کا سہارا ملا اور وہ فقرو
مسلمان بن گئیں اور کچھ بعد تک تانہہ فرقے کے اثر میں ہی رہیں۔ پاداس کے جس جولاہے
خانہ میں کبیر کی پداخت ہوئی تھی وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ لیکن اس پر تانہہ جتنی یوگیوں کا اثر
پائی تھا۔ کبیر کو بچپن ہی سے نہ گن پٹو کی روحانی روایت کا سیدھا تجربہ ہو گیا تھا۔ ان پر اسلام
جیسے عظیم اور توسعہ پذیر مذہب کا بھی اثر پڑا۔ جس سے ان کی شخصیت میں زبردست جراثیم اور
خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ اچار یہ داند کے قریب میں آنے کے بعد انہیں یوگ کی دھوکا بخشی اور
بھگتی کے راستے کی مانند کاساس ہول ان کے عقائد کی مثال ایک دہی شکل سے دی جاسکتی
ہے جو یوگ کی زمین پر بھگتی کا بیج پڑنے پر پائی تھی۔"

بقول چند متوجہ جلال دہی کبیر صاحب جیسا کہ وہ خود اقرار کرتے ہیں، پہلے سے لکھتے تھے۔ انہوں نے لوگوں
کے دلوں کو فتح کرنا ان سے تغییر کیا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے پیروں اور پیلوں نے ان کا کام چلایا اور اب ان
کے نام سے بہت سی تصانیف چھپ گئی ہیں۔ دستک صاحب نے ۸۲ کتابوں کی فہرست چھاپی ہے۔ اس میں نئی اور پرانی
کئی کتابیں ہیں اور بعض کتابوں کے نام ایک سے زیادہ مرتب آگئے ہیں۔ اور دھیا سنگھ جی اپنا بیان لے کی "کبیر چٹاؤلی"
میں ذیل کی گیس کتابوں کی فہرست درج ہے:

[۱] سکھ جانا [۲] گورو گورو کی موشی [۳] کبیر پانی [۴] مٹی کی ریتی [۵] آئندہ رسام

[۶] رانا نندی موشی [۷] شہد اول [۸] سنگل [۹] ہست [۱۰] ہولی [۱۱] ریتی [۱۲] جھان
[۱۳] گورو [۱۴] جٹ رانا [۱۵] پادو ماس [۱۶] پانی پت [۱۷] پانی پت [۱۸] الف پادو [۱۹] پانی
[۲۰] ماسکی [۲۱] پانی پت۔

کبیر کے پیغام پر ذرا غور کیجئے تو محسوس ہوگا کہ وہ سادہ، یوگی، چند مت، شیخ اور کاشی سبھی کا ذوق اڑاتے ہیں۔
چند مت اور شیخ ان کے لئے کوئی مشیت نہیں رکھتے اس لئے کہ دونوں ہی ظاہر ہیں جبکہ چند مت کا شیعہ پر جوت کرتے
ہوئے کبیر کو مسئلہ درجے ہیں اور یہی ان کا مرکزی تصور عشق الہی ہے اور عشق الہی تک پہنچنے کے لئے وید مت، ستر، پران،
بالا، دستور، مسجد، ادکار، وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ نہ وہ انہیں کو کماہیت دیتے ہیں نہ تیرتھ یا تراکھ۔ یہ وہ بدھ متوں، فاضلہ،
لماؤں، ذریعہ جاذب اور برہمنوں وغیرہ سے عقیدت کا مظاہرہ کرتے ہیں ایسے لوگ بھی ان کی نگاہ میں سطح کا شکار ہیں وہ
اللہ اور رام دونوں ہی کو دور سے سلام کرتے ہیں۔ گویا وہ مذہبی رسوم کو ہر طرح سے رد کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں
عبودیت مصلحتی ہے کہ کام ہے۔ انعام و اکرام سے باہر جس میں موت کا خوف جاتا رہتا ہے اور دنیا کی نظر آتی ہے۔
ظاہر ہے کبیر ایک ایسے انقلابی مذہبی پیشوا ہیں جن کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ ہندوستان کی عوامی اور سماجی
احوال و کوائف سے متاثر ہے۔ ان کا فلسفہ دے دے عوامی ہے لیکن اس میں ان کی انفرادیت کی چھاپ ہے۔ انہوں نے
طوق الی غلام کی کٹ چھنی کی ہے اور ذات پات کے طمس کو توڑنے کی سعی میں نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کی مذہبی ظاہر داریوں
پر ہلے کرتے ہیں اور ایک ایسا سماج چاہتے ہیں جس میں کسی قسم کا ہمید بھاد یا تعزیر نہ ہو۔ ان کے یہاں محبت و مصلحت ایک
ایسا جذبہ ہے جو خدا سے ہم رشتہ کر دیتا ہے۔ جس میں کسی عمارتی عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔ سب سے بڑی ذات اللہ کی
ہے اس کے علاوہ کوئی اور ذات نہیں ہے۔ اگر خوف کی وجہ سے عبادت کی جاتی ہے تو یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ عبادت تو
محبت کا دوسرا نام ہے۔ ایسے تمام تر افکار کی وجہ سے وہ ہندو اور مسلمان کی نظروں میں کالے کی طرح چھپے تھے ہیں۔ لیکن
یہ بیک ہے کہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی گہر پر رکشش کی اور اپنا فلسفہ محبت اسی پس منظر میں مرتب کیا۔

میں ذیل میں "کبیر چٹاؤلی" سے صرف پانچ جملے نقل کرتا ہوں۔ معنی کے ساتھ جس طرح بڑی اور سنے جی
کیا ہے۔

شیخ (چال)

ساجی برابر چپ نہیں جھوٹا برابر پاپ

جا کے ہر دے ساجی ہے تا ہر دے گورو آپ

(ساج کے برابر کوئی ریاضت نہیں اور جھوٹ جیسا کوئی گناہ نہیں۔ جس کے دل میں چال ہے اس

کے دل میں غور و شد و خداسو جو رہتا ہے)

دھیریر (مستقل مزاجی)

دھیر سے دھیر سے نہ اوجھڑے سب کچھ ہوئے

مالی بچے سہ گھڑا دست آوے بھل ہوئے

(اسے دل ہر کام دھیر سے دھیر سے ہی ہوتا ہے۔ مالی درست میں سو گھڑے پائی دیتا ہے لیکن موسم آنے ہی پر بھل لگتا ہے)

پاست برست (دلفائے زوجگی)

پست برتا میلی بھلی کالی کچھ کر پ

پست برتا کئے روپ پر واروں کوٹ مر پ

(شوہر کی وفاداری نہ کر کالی، بے عقلی اور ہر صورت ہوتی بھی اچھی، ایسی با وفا بیوی کی صورت ہی کروڑوں مستیوں کو قربان کر دیتا ہے)

سنت جن (نیک طینت لوگ)

سارہ بڑے پر مارتی لیکن جیوں پر میں آئے

تین بچاویں دور کی اچھ پائس لائے

(سارہ یعنی نیک طینت لوگ دوسروں کے محسن ہوتے ہیں، بادل کی طرح آنکر برس جاتے ہیں۔

دو اپنا حصہ بھی دے کر دوسروں کی ضرورت پوری کرتے ہیں)

سیوک اور واس (خادم اور غلام)

دور دہنی کے پڑ رہے دھکا دھن کا کھائے

بیرا دہنی بخا دہنی ہو رہا چھاتہ نہ جائے

(غلام کو چاہئے کہ وہ مالک کے دھکے کھا کر بھی اس کے دروازے پر پڑا رہے، اگر دور کو چھوڑ کر نہیں جائے گا تو کبھی نہ کبھی تو مالک اس پر صبر یاقین ہوگا)

ان تمام باتوں کے باوجود مجھے یہ کہنے دیجئے کہ کثیر ذمہ اسلامی تصورات سے کلی طور پر آگاہ تھے اور نہ ہی انہوں نے چند مدت کے سارے عیب و اذی کو مجھ کو قمار کی وجہ سے کہ بعض جگہ دیکھی باتیں کہتے ہوئے نظر آتے تھے جن کی کوئی تاویل میں نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً ان کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں کہ کیا بھگوان مہرہ ہے، گویا ان اللہ کو

باتیں بھی نشان زد کی جا سکتی ہیں۔

کبیر کی شاعری چودھویں صدی کے ہندوستان کی روحانی اور فکری فضا سے محلو ہے۔ بھنگی اور پریم کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ کبیر نے ایسی ہی بھنگی کا سبق دیا ہے جس میں اپنے جسم و جان کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ اس دنیا کی۔ گویا ان کا عشق پریم لایا ہے جہاں مہمت ہی اذنی اور اپدنی ہے۔ جس کے ذریعے سے حقیقی خدا تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

کبیر کے وہ ہے کہ اگر انیس کا کام مان لیا جائے تو ائمہ ازہر کا کہ جو زبان انہوں نے استعمال کی ہے وہ صرف بھاشا اور بھونچہ دلی سے دور ہے۔ اس کا صاف و شفاف رنگ حیرت زا طور پر چھوٹی سے قریب ہے۔ ممکن ہے ایسے قلم جسے الجائی ہوں۔

کبیر کی موت کا بھی قصہ کچھ عجیب و غریب ہے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو کاشی کے رہنے والے بھگوان نے انہیں چند دست کے قصہ کے مطابق ان کی کرنا چاہا، گویا ایک جھگڑے کی کیفیت پیدا ہو گئی، اسی وقت ایک آواز آسمان سے آئی۔

”تم لوگ ناحق ایک دوسرے کا خون مت کرو، دنیا کا روز بکھول کر دیکھو تو سمجھیں۔“

جب دنیا کا روز بکھولا گیا تو پاں اش کی جگہ بھول اور چار چنگی۔ چنے چنے دونوں نے نصف تقسیم کر کے اپنی اپنی رسم ادا کی۔ پارس ناتھ تیرہری لکھتے ہیں کہ:-

”باہوبہا سنگھ نامی ایک کبیر جتنی کے کبیر کوئی نام کی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ماگھ شد فی ایکاری

برہم بدھ ۱۵۵۵ بکری کو کبیر صاحب نے مگر کوکوچ کیا اور اسی روز وہاں پہنچا چلا چھوڑا تھا“

لیکن وہ دن بدھ نہیں ہے بلکہ شگل ہے۔ دیکھئے بعض شائع کے دریا نے مانی کے معامل پر ایک راجہ ہے جو ۱۳۵۰ یا ۱۵۰۰ بکری میں بتایا گیا تھا۔ اسے کبیر صاحب کا راجہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی وفات کا سن بکری ۱۵۰۵ ہے۔

عبدالمجید صاحب خاٹناں

(۱۶۶۶ء)

خاٹناں انگریز دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے باپ جرم خاں اپنے وقت کے مشہور امیر تھے۔ ان کی شاعری ادب نوازی اور طبعی و فنی معروف ہے۔ ”تذکرہ جنتی“ میں ایک حوالہ دیا ہے جس سے اندازہ ہے کہ یہ فارسی اور ترکی کے علاوہ ہندوئی سے بھی رہنمائی رکھتے تھے۔ بدلی میں ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ان میں ”سہ سنی“ اور ”سنگھار و سرور“ نمایاں مشہور ہیں۔ بقول اعظم کرپوری ان کی ہندی شاعری کی اہم کتابیں ہیں۔ ”رحیم دہلوی“ کا ذکر کرنا سن کے کیا ہے۔ چودھری جے کرشن نے عبدالمجید صاحب خاٹناں پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں تصانیف کے علاوہ ”کروئے“ کا نام بھی دیا ہے۔ ”نوراس“ بچا دھانی شریکا“ کو بھی ان کی ہندی تصانیف کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ شاید انہی اور بادشاہ کبیر کی

ہندی میں شعر کہا کرتے تھے۔ بہر حال، یہ تو بھی جانتے ہیں کہ خانقاہاں ہندی کے شاعر ہیں۔ "غریب اک آصفیہ" میں سید احمد دہلوی نے ان کے اشعار کی مثالیں پیش کی ہیں جو درج ذیل ہیں۔ ظاہر ہے اس کا تعلق صاف طریقے پر قدیم اردو سے ہے جبکہ اردو اور ہندی بھی بھلاؤ نہیں تھا:

رجمن دعا کا پریم کا مست توڑا پنکائے

لوٹنے سے بھرتے، لے لے لکھ پڑ جائے

بانگے فکر نہ کیوں کر نہ چھانچو ساتھ

ماخت آگے سکھ بیہوتے رجم دھو ہاتھ

مٹا کر گر پور کر جا تک زسخر ہوئے

اب تو پھر دیم جل کھل پڑے بٹھ ہوئے

عبد الرحیم خانقاہاں کی وفات کی تاریخ ۱۲۶۹ء ہے۔

حضرت نوشہ گنج بخش

(۱۵۶۳ء تا ۱۶۵۲ء)

عالمی محمد نوشہ کا خطاب گنج بخش تھا۔ ان کا ذکر واجد علی شاہ نے بھی کیا ہے۔ ان کا تعلق بغداد سے تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور اپنے وقت کے اہم صوفیوں میں شمار ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جناب کے مصلح کے نوشاہیہ کے بھی اپنی ہیں جن کا رسالہ "گنج الاسرار" بہت مشہور ہے۔ معرفت و ریاضت سے متعلق اس کے مشقعات زیر بحث رہے ہیں۔

نوشہ گنج بخش اپنی کتاب "گنج الاسرار" کی وجہ سے اردو ادب میں بحث کا موضوع رہے ہیں۔ صوفیوں کا ایک سلسلہ نوشہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی سے وابستہ ایک ہفتی شرافت حسین نوشہ نے مشرقی "گنج الاسرار" شائع کی، جب سے اس کتاب کے مصلح میں اور خود نوشہ گنج بخش کے بارے میں مباحث کا سلسلہ جاری ہے۔ "انتخاب گنج شریف" کے باب میں منسل جاتی کو بھی تاں ہے کہ اسے عالمی محمد نوشہ کی تصنیف قرار دیا جائے۔ انہیں اس کے زبان و بیان کی صفائی دلچسپ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ کسی مرید نے اپنے مرشد کے نام سے اس کی تصنیف کی ہے۔ "مقامات جالبی بادشاہ" (۱۶۹۵ء) "نواقب المناقب" (۱۷۱۳ء) "ذکر و نوشاہیہ" (۱۷۲۶ء) اور "تھانف قدسیہ" (۱۷۷۷ء) میں عالمی محمد نوشہ کی نفس تصنیف کا ذکر نہیں ملتا اور یہ کہ ان کی زبان و دھاریں صدی چہری کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

خود شہد احمد خاں کے مقالہ نوشہ گنج بخش میں بھی اس خیال کو رد کیا گیا ہے کہ یہ حضرت نوشہ کی تقلید ہے۔ انہوں نے مزید اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ ۱۰۰۹ اشعار میں سے ساتھو سے زیادہ اشعار "گلزار فقیر" سے اخذ کئے گئے ہیں اور مشرقی "گلزار فقیر" نظام علی الدین کی تصنیف ہے۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند جین اسے تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

بہر حال صورت حال جو بھی ہو "گنج الاسرار" کی اہمیت اپنی جگہ پر برقرار ہے اور اسے اردو کی ادبی تاریخ کے لئے ایک نئی صورت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جیم کا شیرنی لکھتے ہیں:-

"حضرت نوشہ گنج بخش کے کام کی اسانی سادگی کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد ہما گیر کے جناب

میں انہی روال اور صاف زبان کا کھاجا تاکن تھا۔ اس کام کے افعال اور محاورے واضح طور پر

انیسویں صدی کے آغاز یا اواخر بیسویں صدی کے آخری حصے کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اشعار

ملاحظہ ہوں:

بہت ریاضت محنت طاعت دل حاضر مانگے ہر ساعت

فضل خدا کا از تو فیض جب سائیک کون ہواے رفیق

جب پیچھے اس داد سعادت علم موافق کرے مہارت

طاعت جو ہو فرما دے اپنا کیا کچھ کام نہ آت

دارو دو جو دیوے حکیم آپ دارو کیا کرے سقیم

جو آویں ہدیوں کے کام دین دنیا میں ہوویں قلام

سب قرآن مجید میں آئے حق تعالیٰ نے آپ فرمائے

حضرت نوشہ گنج بخش سے منسوب اردو کلام کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے میں نے دوسرا کام اپنے دس دوسرے مسافر کو جو ہر خوشالی کی خدمت میں ایک حریفہ ارسال کیا تھا۔ جس کے جواب میں ازراہ دلائل انہوں نے ایک مفصل مکتوب ارسال کیا تھا۔ اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود شہد احمد خاں کی تحقیق کو رد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خود شہد احمد خاں ایک کم استعداد، ناقص معلومات رکھنے والا اور تحقیق بصیرت سے عاری شخص تھے۔ جب کہ ڈاکٹر گیان چند نے خود شہد احمد خاں کے کام کو اردو تحقیق کی تاریخ کا ایک درجہ باب قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اس بات کو الاشعوری طور پر الٹ قبول بھی کرتے ہیں کہ "گنج الاسرار" کے دس اشعار ایسے ہیں جن کا اقتساب حضرت نوشہ گنج بخش کے علاوہ کسی سے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر نوشہ صاحب نے دس شعر بھی

کہے ہوں تو "خجلا سرا" کو نصیب دی پہلی قرار میں دیا جاسکتا۔"

واضح ہو کہ ساری بحث اس بات پر غلبہ کرتی ہے کہ "خجلا سرا" کی زبان بہت حد تک ہندی آمیز ہے اور ایک طرح سے قیرور اور اضرک کی جو زبان رہی ہے اسی زبان کا مظاہرہ یہاں بھی ہے۔

افضل پانی پتی

(۱۶۱۵ء۔)

افضل پانی پتی اپنے عہد کا سب سے اہم شاعر ہے۔ اس کی تصنیف "بکت کہانی" ہارہ ماس کی روایت میں ہے جو ایک "نثری زبان" سے چاہے کہ وہ اس میں رہے اور ہجر و فراق کی نگین کیفیت کے اظہار سے متعلق ہے۔ چند مثالیں مختلف جگہوں سے نقل کر رہے ہیں۔

یہاں ایک غزل اور اپنی سکھوں سے خطاب ہو کر چاروں دول بیان کر رہی ہے:

مٹ سکھو بکت مہر کی کہانی
بجی ہوں عشق کے غم سوں روانی
نہ مجھ کو بھوکہ دن نہ نیند رات
رو کے درد میں جیت چکا
اسے یہ معلوم ہے یا کیا بلا ہے
کہ جس کی آگ سے سب جگہ جلا ہے

ایسا جان آگے بڑھاتے ہوئے دیکھتی ہے:

گلی رہا نہ رہے کھرا تھک سب
نی دھم کہ ماضی گھر بھر میں کب
جوانی نہ تھی کبھی رگوں رنی
ستم ہو پر ستم کیسے سبوں رنی

آگے چل کر وہ سکھوں کو اپنے خواب کا حال سناتی ہے:

چہ می خیم غنای آہ ہے
چہ شمشادہ را شربادہ ہے

کیا ہے ان لباس و عفرانی
بجی ہوں دیکھ کر اس کو روانی

اروی میں اور کر پاؤں پڑی جائے
جیانے کر کچل لکٹی گلے لائے

جنب اسے ہجر کے طوٹے کجالت کے بعد وصال میسر ہوتا ہے تو وہ اپنی سکھوں کے سامنے اپنے عشق پر یوں نازاں ہوتی ہے:

اروی اسے یاد نہیں، یو عشق بازی
نہ جانو چوچ و شطرنج بازی
اروی آساں نہ جانو عشق کرنا
تھیں اس آگ میں ہرگز نہ چرنا

ظاہر ہے کہ "بکت کہانی" میں اردو زبان کی پوری کیفیت نمایاں ہے۔ اردو الفاظ خوب خوب استعمال ہوئے ہیں۔ چند جگہ جج گرامر کی بھی کچھ صورت ملتی ہے۔ "بکت کہانی" کی بحث ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر تمیل چائی و قہر از ہیں۔

"بکت کہانی" کے زبان و بیان میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں مختلف پالیوں کے اثرات نے مل جل کر اب اپنی ایک شکل بنائی ہے۔ یہ شکل دکنی اردو کے معیاری ادبی روپ سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش ہے۔ فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اثرات بھی ایک چان ہو کر زبان کے مزاج کا حصہ بن گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب "تحدہ وار میں اورنگ زیب عالمگیر" (م ۱۷۰۷ء) کی فوجات دکن کے ساتھ شمال اور جنوب مل کر ایک ہو جاتے ہیں تو دکن کی ادبی روایت زبان کے اسی معیار کو قبول کر کے پہلی بار دکن کی شاعری میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔"

لیکن اس سے پہلے یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ افضل پانی پتی کی "بکت کہانی" اردو میں خاصا نازع کا باعث رہی ہے اور محققوں نے کئی سوالات کو مزے کئے ہیں جو جن کو کئی طرح کے شکوک میں مبتلا کر رہے ہیں۔ اس باب میں مختلف لوگوں کی کیا رائے ہے اس کی تفصیل انہیں کی زبانی آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں تاکہ پوری بات واضح ہو جائے۔

افضل پانی پتی کے بارے میں پروفیسر محمود شیرانی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"افضل پانی پتی ہندو متاں کی صورت و معنوی سے آراستہ تھے۔ شعر ہندی و فارسی لطافت خوب کہتے تھے۔ معلم پیشہ تھے۔ کثیر و جم غفیر ان کے حلقہ درس میں حاضر رہتا تھا۔ گاما ایک ہندو

عورت پر عاشق ہو گئے اور انہوں نے صفت و افتاد فرمایاں کھینے لگے۔ وہ حیدران کی نظروں سے غفلت ہو گئی۔ سولاہ کو چھوڑ کر بازاریں گھومنے لگے۔ ان کے رشتہ داروں نے سوچا کہ اس بلائے جاں کو دور معطر میں بھیج دیں۔ یہ عاشق علت جبری و ضعف قوی کے سبب اتنی سزا دے لے نہیں کر سکتا۔ آخر ایک رات خاموشی سے اس عورت کو معطر ادا کر دیا۔

سولاہ نے جب کئی دن تک اسے نہ دیکھا تو غصے کا اور معلوم ہونے پر خود بھی معطر ادا ہو گئے۔ ایک دن دیکھتے ہیں کہ وہ ماہر و مہرئی حسینوں کے ساتھ میر کر رہی ہے۔ انہوں نے اس کے سامنے جا کر شعر پڑھا:

خوشا رسوائی و حال تا ہے
سر را ہے وہ آہے و نگاہ ہے

وہ شعر قویا خاک کھینچی ہوئی لیکن اس نے کچھ سے کہا تھے مفید و لاغی کے باوجود مر نہیں آتی کہ مجھ جیسی جو ان عورت کے عشق کا سودا میں دیکھتا ہے۔

سولاہ نے ایک ڈھونگ بچا۔ لڑکی ترش کر بنا کر بچن کر رہیوں کے لباس میں ایک مندر کے مرشد کا سر پہنوا کر اور معلوم ہندوئی کی تحصیل کرنے لگا۔ اس بچاری کی وفات کے بعد انہیں مندر کا بچاری (مرشد) ستر کیا گیا۔ وہاں پدم تھی کہ سال میں ایک بار عورتیں اس مندر میں آکر خیرات کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ہندو عورتیں جن کی زیادت کے لئے آکر تہم لای کرے لگیں۔ جب وہ منجھوچ پاؤں چھسنے کے لئے نکلی تو سولاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے ملتا شروع کر دیا اور کہا کہ مجھے پہچانی ہو وہ عورت دیکھ کر حیران ہو گئی اور کہا کہ آپ نے مجھ جیسی ناکس کے لئے لگائی نگاہیں اٹھا لیں۔ جو آپ کی رضا ہے وہی میری رضا ہے اس کے بعد وہ عورت مسلمان ہو جاتی ہے اور سولاہ سے شادی کر لیتی ہے۔ بعد میں دونوں اپنے دیار کو واپس ہو جاتے ہیں اور مدت حیات باہم بسر کرتے ہیں۔

اس واقعے یا قصے سے ڈاکٹر غلام احمد غلامی «خفا» نہیں کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں جو شکوک و شبہات ہیں

اور انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:-

”افضل کے اس افسانہ صحت کا تعلق اس کی دلچسپیوں سے نصف انداز کی یاد دہر بعض قابلی انجمنوں سے وہ چار دیتا ہے۔ ترجمہ نگار نے ایک سے زیادہ مرتبہ افضل کو ضعیف و اعرج اور

علت جبری میں گرفتار کیا ہر کہا ہے۔ کیا اس زمانہ عمر تک افضل مجرور عدلی گزار رہے تھے؟ اس لئے کہ ان کے معاملات عشق میں کہیں ذہن و فہم و اندوختاں کا ذکر نہیں ہے اور کیا اس عمر میں وہ تمام ہنگامہ آرائی ممکن تھی جو اس داستان میں ملتی ہے۔ ان کے جذبہ عشق کے رالہانہ پن اور ان کی ہم پند اندیش ضعف قوی اور علت جبری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ عاودہ بریں وہ جوان العصر و عورت جسے افضل کی کوچہ گردی کے پیش نظر رسوائی و بدنامی سے بچانے کے لئے دو تہہ معطر میں بھیجا گیا تھا اسے افضل کے تلاش محبوب میں روپوش ہو جانے کے باوجود اس دیار غیر میں کیوں چھوڑا گیا؟ اور اس داستان میں اس کے عزیزوں اور نزدیکوں کا اس کی شادی کر دینے کا خیال کیوں نہ آیا؟ یہ کہ ہندوؤں میں جوان لڑکیاں اسے دہائی تک نہیں بیٹھی رہتیں۔ پوچھا کہ ہر جمع میں افضل کو مندر کا بڑا پر دہت ہوتے ہوئے ایک لڑیہ جا کے لئے آنے والی عورت کا ہاتھ چومنے اور اس سے اظہار دعا کرنے کی جرات کیسے ہوئی اور یہ بات بھیجی کیسے رہی؟ اور غیر و اخیر۔ اس سے کبھی کبھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہاں تو نہیں ہے کہ افضل کی اس پریم کہانی میں کچھ باتیں زہیب داستان کے طور پر بھی شامل ہوں۔ واللہ نے اس قصے کے آخر کا حوالہ بھی نہیں دیا و غرض افضل کا ماضی نہیں ہے۔

اس باب میں ڈاکٹر پرکاش سنس کا دو کج بیان ہے:-

”والہ کی اس داستان پر یقین کرنے سے پہلے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ داستان اس زمانے کی ہے جب کوئی ہندو غلطی سے مسلمان کے ہاتھ کا پانی پی لیتا تو وہ پیشے کے لئے براہری سے خارج کر دیا جاتا تھا اور بچاریوں کا مذہبی کلرین تو اس زمانے میں فقط عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بوڑھا مسلمان عظیم جرمی قاری کا جدید عالم ہو ایک ہندو کا سوا لگ ہر مرشد میں رہے اور اس کے عادات و اطوار روزمرہ مجاورہ سے کبھی کبھی ہما نظر نہ پھوٹے کہ یہ ہندو نہیں بلکہ مسلمان ہے پھر اس زمانے میں معطر ایسے تیرتھ کے کسی مندر کے بچاری کا ایک مسلمان کو چپلا جا کر اس کے ساتھ گھٹا چپلا اور بعد میں گرد کی وصیت کے مطابق چپلے کو بچاری بنا دیا جانا اور عورتوں کا بچاری کی قدم بوقت کرنا اس و ہذا غرضالات ہیں کہ ان پر یقین کرنے کے لئے شیعہ الی صاحب کی ہی قیادت درکار ہے۔

اس بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یو پی کے مندروں میں کوئی چودہ مرشد نہیں ہوتے اور بچاری خاندانوں کے سوا وہ غلطیوں کی طرح مرنے والے کی مرضی یا وصیت کے مطابق

مقرر نہیں کئے جاتے۔ نہ بچاری کو کوئی ایسا معزز مقام حاصل ہوتا ہے کہ پہلے میں آنے والا ہر شخص اس کی خدمت ہی کرے۔ بچاری تو ایک معمولی تختہ لکھنوار ملازم ہوتا ہے۔ اصل میں والدین و معززوں کے بچاویوں اور سطحوں کے بیٹوں میں امتیاز نہ کر سکے اور نہ اس طرف ان کی نظر گئی کہ سحر و تو کیا سارے برج میں اس زمانے میں کئی بہت کم مصلح نہ ہوگا۔ کہیں کہیں سحر و معززوں کا شعر ہے۔ پھر یہ بھی واضح ہو کہ بعد وائیں میں دست بوسی یا قدم بوسی کا رواج نہیں۔ مرید اور مستفید مسلم بچاویوں کے ہاتھ جوستے تو دیکھتے تھے کہیں نہیں بندہ وائیں میں اصل دین کی جسمانی پاکیزگی ملے چھوڑا چھوڑا نکال دیا ہے کہ کوئی شخص کسی دینی چٹیا کے جسم کو ہاتھ لگانے کی بات بھی نہیں سوچ سکتا۔ نہیں اور سے ہی ذلت کی جاتی ہے۔

اصل میں قدم اور دستوں کے یہاں داستانوں میں مسلمان عاشقوں کے پیچھے بندہ وائیں کی جدید ذلت و سب کی ایک مسلسل اور مستقل درایت چلی آتی ہے۔ میرامن کی بارغ و بہار میں خدیجہ سنگ پرست کو نواز پڑھتا دیکھ کر ملک نہ پاؤں کی راہنمائی اور بعد میں سراندیپ کی شادی صرف پانچ پانچ سطروں کا وہ قصاں کہ مسلمان ہو جاتی ہیں۔ ان کو گھوٹلی چند نارنگ نے ایسی سولہ مشعوپوں کے نام کتابے ہیں جن میں بندہ وائیں آخر میں شرف بہ اسلام ہو جاتی ہیں۔ یہ نو ذلت زمانے کے قصوں اور داستانوں کی بات ہے، اڑھائی سو صدی میں خود حافظ شیرازی کی تاریخی واقعہ نگاری کا نمونہ دیکھئے۔ آپ شیخ الفیض لاہوری حنفی ۳۳۹ھ ہجری کے بارے میں رقمطراز ہیں: "آپ کی محاسن و عطا میں غلوں کی کثرت سے متبع ہوتی تھی۔ بندہ وائیں کی تعداد میں وہ عطا میں نہ کہ غلوں میں اسلام ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے پہلے بعد میں ذلتی سو سو سرے بعد میں پانچ سو سو سرے میں ایک ہزار بندہ وائیں بہ اسلام کئے۔" صاحب کا لفظ شاید تھا کہ چھ تھے بعد میں ہزار ہا چار پانچ سو بندہ وائیں کو دولت ایمان عطا کی جانی چاہئے تھی اور اگر یوں کہنا چاہیں ہزار سال پہلے بھی جانتا تو تقسیم ملک کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ مندرجہ بالا اقتباس کسی نہ کسی رسالے یا تفسیل و تفسیر کی رد وائیں بلکہ ایک تاریخی ادب یعنی پنجاب میں اردو سے چل کر کیا گیا ہے۔ جب شیرانی صاحب دوسروں سے غرور اسلام کی اس داستان پر یقین کرنے کی امید رکھتے ہیں تو پھر خردان کے لئے والہ کی جان کر دواستان کی محنت میں شک و شبہ کی کیا گنجائش تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس دل خوش کن داستان کے بعد افضل پانی پتی کو "بکت کہانی" کا ہیرو بنا دیا اور محنت میں "بکت کہانی" کا آخری شعر:

.....

پیش کر کے اپنی طرف سے یہ مذاق فرمایا کہ گویا افضل کا اٹا دو نام ہے جو انہوں نے مندر کے بچاوی بننے پر اختیار کیا تھا کہ حالانکہ والد کے لسانے میں دو دور تک اس کا ذکر نہیں۔

راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون "بکت کہانی اور افضل لاہوری زبان" یکم جولائی ۱۹۷۱ء میں جب یہ عرض کیا کہ والد کی داستان میں "بکت کہانی" کا اور "بکت کہانی" میں والد کی داستان کا کوئی اشارہ نہ ملتا تو میرامن نے تو اس کے جواب میں ڈاکٹر ٹیکل نے فرمایا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ والد کو ذکرہ لکھتے وقت "بکت کہانی" کے بارے میں کچھ مظلوم بن نہ تھا۔ میں نہایت لجاجت کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ والد کے ذکرہ لکھتے وقت نہیں بلکہ اس سے پیش برس پہلے سے "بکت کہانی" اس دور مشہور تھی کہ مصنفین اس کے متبع میں پوری پوری کتابیں لکھ دیتے تھے۔ والد کا ذکرہ ریاض الشریعہ ۱۱۶۱ھ (۱۷۷۷ء) میں لکھا گیا۔ اس سال شاد آیت اللہ جوہری نے دو ہزار تین سو چار آیات پر محیط اپنی مشہور مخطوط "گوہر جوہری" "بکت کہانی" کو مونس مان کر لکھی۔ گوہر جوہری کا ہندو ماہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ وہ "بکت کہانی" کی نقل ہے۔

مشکوٰی کی دہیت نمبر ۱۵۶۰ میں تو شاد صاحب نے اس کے نام کے اجزا بھی باعوض ہیں:

زبانی کہہ بکھ میری کہانی
چا سیں جا کے تو میری زبانی

اگر غور کیا جائے تو ان کہانہ کے مصداق یہ کہا جائے کہ پانی پت کے شاعر کی تصنیف بہار میں تو مشہور تھی لیکن ہر زمانہ میں اس سے کوئی واقف نہ تھا تو اکرم تعلیمی جہد جنگ کا ساکن تھا اور جس نے "مذکرہ ریاض الشریعہ" سے بھی تیس سال پہلے یعنی ۱۱۳۳ھ میں اپنا حیرت انگیز ماہ لکھا اس اعتراض کی تکذیب کے لئے کافی ہے۔ سچہ ماہ کے آخری اعداد میں غریب انداز میں اسے افضل کی "بکت کہانی" کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی جا رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ "بکت کہانی" والد کی تصنیف ہوتی جن کی داستان بہت سے والدین اور والدین کے واقف ہیں تو یہ ممکن تھا کہ انہیں "بکت کہانی" کا علم نہ ہو اور وہ فضل پانی پتی کے بیان میں اس کا ذکر نہ کرتے۔ اور حقیقت کے دامن پر یہ تاریخی غلطی ہمیشہ ایک بدنامی و داغ کی صورت سے نمایاں رہے گی کہ کسی شہادت کے بغیر "بکت کہانی" کا مصنف ایک غیر متعلق شخصیت کو قرار دے دیا گیا اور ایک کے بعد دوسرے حلقہ بغیر کسی جانچ پڑتال کے اسی مفروضے کو حقیقت سمجھ کر ویرانہ آباد و کھنڈر وادہ تھے ہیں، جنہوں نے خود کو پادشہ میں چا عراض کیا تھا کہ والد نے جس افضل پانی پتی کا ذکر کیا ہے اس

حیرت یہ ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے بھی 'بکت کہانی' کے دیباچے میں شیرانی کے قیاس کو بے کم و کاست قبول و منظور کر لیا۔ خود ڈاکٹر خورشید طلوی نے والد کی داستان کی خامیوں کے باوجود اس کے ہیرو کو 'بکت کہانی' سے منسوب کرنے میں کوئی جامل نہیں کیا۔ حالانکہ والد نے اشارے یا کنایے بھی کئی یہ بات نہیں لکھی کہ افضل پانی پتی نے 'بکت کہانی' یا 'بارہ ماہ' نام کی اس طرز کی کوئی مشق نہیں کی یا افضل سے متعارف ہوا کہ گویا نام اختیار کیا تھا۔

افضل نے اس واقعے کے عالم میں عرصہ اشتغال نہیں لکھی تھیں ان کے بہت سے اشعار والد نے نقل کئے ہیں۔ لیکن ان میں ایک مصرع بھی 'بکت کہانی' کا نہیں ہے جب کہ 'بکت کہانی' میں فارسی مصرعوں کے گھرے چھینٹے کے علاوہ کم از کم آٹھ اشعار مشکوٰۃ فارسی کے موجود ہیں۔ اگر افضل کے متعلق والد کے اس بیان کو کہ 'شعر ہندی و فارسی، اجماعاً بہ خوبلی گنت' کوئی دلیل بنایا جائے تو ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ غلام محمد سلطان سے ملے کر امیر خسرو دکن اور بھٹو دہلی سے ملے کر شاد آیت اللہ جوہری تک نہ معلوم کتنے شاعروں کے بارے میں ہم جی بات سنتے چلے آ رہے ہیں اس لئے یہ کوئی ایسی تخصیص نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے بغیر کسی حرج و مرج کے افضل پانی پتی کو 'بکت کہانی' کا مصنف تسلیم کر لیا جائے۔ نہ افضل کوئی ایسا بارہ ماہ نام ہے کہ پانی پت کے علاوہ کئی اور نظریں نہیں آسکتا۔

اگر بھول میر حسن افضل نے حسب حال خود بارہ ماہ عرف 'بکت کہانی' لکھی تو 'بکت کہانی' کی داخلی شہادت سے والد کی داستان کی صریحاً تخطیب ہوئی ہے۔ کیوں کہ 'بکت کہانی' سے تو یہاں صریحاً یہ ہے کہ افضل جہر و فراق سے پہلے وصال محبوب سے محظوظ و شاد کام تھے۔ بارہ ماہ شریع ہوئے سے پہلے یا اشعار ملاحظہ کیجئے:

جانے کر پھر جب سر گئی

نہی آگے تن من کی بھائی

ہر دم مت چا کے ساتھ رہتے

خون با یک دگر کیجئے دہنتے

جو جلد عشق نے دے کر اٹھایا

فلک دگر دگر دگر دگر دگر

مرا شکم دیکھ اس کو حیرت آئی

لہارو ۛ الم داغ چوئی

بکت قصہ بہت مشکل کہانی

دوانی کی سنو سنکھیں کہانی

لمن ہائے مہمرا ۛ ۛ سنکھیں ہے

کیو اب زندگی کا کیا جینا ہے

والد کی داستان میں 'لمن ہائے مہمرا' کہاں۔ وہاں تو سوادنا ڈراے کے پہلے تمن سے ہی خوشامدوالی و حال تباہی ہے۔ سراپے دے دکا ہے کاروانا دے نظر آتے ہیں۔

پتہ ممکن ہے کہ زبائن شعرا کے افضل کی کسی بعد و حیرت سے شادی ہوئی ہو لیکن اس سے متعلق جوہریت جان کی گئی ہے وہ ایسی ہیبت انگیز ہے کہ روایت کی کوئی پرتکریب نہیں آتی۔

افضل سے متعلق ڈاکٹر عبداللہ نظر، ڈاکٹر خورشید طلوی، ڈاکٹر عبدالقادر نجیل اور ڈاکٹر احمد ادری کے مضامین میں بعض اور تذکروں کا حوالہ بھی دیا ہے جن میں افضل کا وطن چھپانہ، غازی پور، پانی پت، قہر بھر یا الدہ آباد یا گیا ہے۔ چونکہ ان تذکروں تک میری رسائی نہ ہو سکی اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں افضل کے ساتھ 'بکت کہانی' کا ذکر بھی ہے یا نہیں۔ لیکن قیاس کی بجائے یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ تحقیق ضرور اس کا ذکر کرتے۔

'بکت کہانی' کے مصنف کی حیثیت سے افضل کا سب سے قدیم تذکرہ اگر ہم دیکھی قلمی کے تیرہ ماہ سے ملتا ہے۔ اس تیرہ ماہ کے ذکر محمود شیرانی نے اپنے مضمون 'ہیریانی زبان میں تالیفات' میں کیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نظر فقہانے بھی اپنی تصنیف 'حضرت شاد آیت اللہ جوہری: ان کی حیات اور شاعری' میں اس بارے میں لکھا ہے لیکن کسی نے یہ صراحت نہیں کی تھی کہ اس میں 'بکت کہانی' اور افضل کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس کی طرف سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالقادر نجیل نے اپنے مضمون 'بکت کہانی کا مصنف اور اس کا وطن' میں قہر لائی۔

گویا افضل اور گویاں کا قہر لے لے ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس باب میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے

فضل علی فضلی

(۱۱-۱۸۷۰ء-۱۹۰۰ء)

ان کے بارے میں زیادہ اطلاعات فراہم نہیں ہیں لیکن ان کا اصلی نام فضل علی خاں فضل بنایا جاتا ہے۔ جن کے نام سے "سرمل کتھا" منسوب ہے۔ ان کی پیدائش کا سال ۱۱۰۰ھ متعین کیا جاتا ہے۔ کیا جاتا کہ ان کے خاندان کے لوگ فضل دربار سے وابستہ۔ ان کے والد کا نام قباب شریف علی خاں تھا۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا ہے کہ ایک شریف خاندان کے فرد ہیں اور انہیں علمی کمال بھی حاصل ہے۔ انہیں دربار سے خاندانی اطاعت کا خطاب ملا۔

فعلی شہید تھے اور حضرت امام حسین سے ان کی عقیدت بہت واضح ہے۔ انہوں نے علامہ حسین دہلوی کا فنی کی فارسی کتاب "روفا الشہد کا ترجمہ کا کام ۱۹۳۲ء سے شروع کیا اور یہ سلسلہ ۱۹۵۸ء تک جاری رہا۔ اسے تنگ نے جرمی کی ایک لائبریری میں اسے تلاش کیا۔ علی خاں والد علی آزاد اور ایک رام کے ذریعے یہ کتاب متعارف ہوئی۔

آمنہ اردو کی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ "سارے" ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ جب سے اب تک انی افسانے جو شائع ہو چکے ہیں اور ڈال بھی 'کہانی' (۱۹۶۵ء)، 'باقی فوکل' 'شیاد سرخ سفید' اور "تم کون ہو" یہ چار افسانوی مجموعے ہیں۔ انہوں نے چند ناول بھی لکھے جیسے "راہیں" "آواز ہنس" "میں" اور "دشمن"۔ آخری انہوں کی کئی کہانیاں بے حد مستاز بھی جاتی ہیں ان میں "چاپ" اور "فعلی تاحسن" ہیں۔

آمنہ لیکن کا فین ان چھوٹے چھوٹے مشاہدوں اور تجربوں سے جو اطراف پر نگاہ رکھنے کی وجہ سے نمایاں ہے۔ حیدر آباد کا ماحول وہاں کی زندگی ارٹھے، طے طریقے، آداب، کے تضادات پر اور اس طرح کے ماحول ان کے افسانے کے تاثر پر دیتا ہے۔ لیکن اپنے تجربے اور مشاہدے کو افسانوی رنگ دینے میں ان کا کمال یہ ہے کہ ایک حد سے آگے نہیں نکلتیں مثلاً واحد ہضم وہاں کی زندگی کی جنسی تصویر کشی میں حد اعتدال سے دور ہو جاتی ہیں؟ مزدور صورت اختیار نہیں کرتیں۔ حالانکہ ان کے افسانوی میں حیدر آباد اور نواح کی حیرتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

آمنہ اپنا لکھن کے کردار حسن موعول سے قطع کرکے ہیں، اتفاق ہے کہ معلوم ہوتے ہیں، چاہے وہ کردار افسانے میں ایسا دے جائیں یا ناول میں، دونوں ہی صورتوں میں فنی زندگی بھٹک جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محترمہ ان کے تاریخی اور ادبی احوال سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انہیں فنی دیکر دیکر لایا جاسکتی ہیں۔

آمنہ لیکن کے یہاں، اجرام ساری میں بھی نگاہ کا احساس ہوتا ہے، واقعات کو غیر ضروری طریقے پر طویل

آخر فنی اعتبار سے (لیکن کو بہت دور نہیں لے جاتیں زندگی میں ان کا کوئی واضح مسئلہ ہے لیکن زندگی کے شیبہ و فراز کو برتنے کا ایک خاص انداز ہے۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ آمنہ فنی پر فنی کی فانی نہیں دیتے بلکہ جس طرح ماحول انسان نگاری کی طرف راجع ہو گئے آمنہ میں وہ روش اختیار کرتی ہیں جس سے انہوں نے ایسا نہیں کیا اور جانیے کہ وہ فنی انداز سے پابند تھا۔ اس لئے ان کی کہانیوں میں ایک غیر فنیاتی تشکیل کا احساس ہوتا ہے۔

ہزبات نگاری بھی ان کے یہاں ایک خاص دستک سے آتی ہے جس میں دل کشی بھی ہوتی ہے افسانہ نگاروں سے ایک اقتباس دیکھئے:

"ماں کا یوں جواب میں کر میرے من میں گھٹکی ہوئی تو کی مٹھاس ایک دم کمزوریت میں بدل گئی۔ میرے اندر کوئی چیز نوٹ نہ کر بھرنے لگی۔ میں اپنی نگاہ سے ہاتھ صاف کرتا ہوا یاد دل خواہت پھر باہر والے مختصر کمرے میں جا کر اپنی مقررہ جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دھڑکے کی بار بار یہ خواہش ابھری کہ پھر گئی میں نکلوں۔ نکلے کے ساتھیوں کے ساتھ میدان میں جا کر جی بھر کھیلوں، خوب خوب پھلتاؤں لگاؤں۔ من مانی شرار میں کروں۔ اور زور سے فیسوں۔ مگر میں ایسا کچھ نہیں کر سکا۔ پھر کبھی گئی میں نہیں نکلا۔ کبھی میدان کا رخ نہیں کیا۔ کوئی شرارت کوئی من مانی نہیں کی۔ سر جھکائے فنی کھڑوں اور سوئی دھماکے میں الجھ گیا۔ رنگ برنگے کپڑے میرے سامنے یوں پھیلے رہے جیسے میری ناکام مایوس تمنائیں جنہیں منوارے جمیل تک پہنچانے کی میرے سامنے کوٹھل بھی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں رنگ برنگے کپڑوں کے ساتھ اپنی سوچی اور خواہش کو فنی سے کاٹے رہنا میرا فرض ضرور ٹھہرا گیا تھا۔"

(ہر روزہ ستارہ ہے) (انتقالی امرتین، رشید، رانی، سین احمد ص ۱۹۱) (نچر کیشن پبلیکیشن ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء)۔
جان کا اقتباس اعلیٰ مرتبہ لکھن ہے کہ الفاظ میں زیادہ باتیں کہی گئی ہیں اور یہ اس لیے ہے کہ آمنہ کی فنی بھر مندلی ہے۔

پنڈت چندر بھان برہمن

(۱۹۲۲ء-)

پنڈت چندر بھان برہمن کا تعلق شاہجہاں کے نجد سے ہے۔ یہ مشہور نثر پرداز کی حیثیت سے بھی معروف ہیں اور شاعری کی حیثیت سے بھی۔ فارسی کے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ خوشبو نہیں تھی تھے۔ ان کی نظارہ رازی کے باب میں "منقذات" سے (بہر مشہور ہے۔ حبیب الرحمن شیرانی نے "رسالہ" "معارف" کے جلد ۱۹۷۲ء کے شمارے میں ان کے بعض نادر نکتوں کا تعارف کر دیا ہے۔ اس میں "بہار بھن" کو بھی ذکر ہے جس کا موضوع تاریخ ہے۔ امیر حسن نورانی کے قول

تھی کہ امیرانِ صدر کی خوردشوں کی وجہ سے کن پر سلطنتِ دہلی کا اقتدار اور زبردست کم ہونے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں امیرانِ صدر میں سے ایک میر علا الدین خلجی شانہ نے ۱۲۹۴ء میں گھر میں قتل کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے ظہیر گد میں ایک خرافاتی سلطنت کے قیام کا اعلان کر دیا جو پہلی سلطنت کہلائی۔ بعد میں یہ سلطنت بیدر خلجی ہو گئی۔ علا الدین خلجی شانہ کو تمام امیرانِ صدر کی حمایت حاصل تھی۔ اسے نئی سلطنت کا بادشاہ و مصل انھیں امیروں نے ہلایا تھا۔ بقول جیل جانی اب دکن کی سلطنت میں لوگوں کے ہاتھ میں آگئی تھی جو شمال کے ترک ہونے کے باوجود خود کو دکنی کہتے ہیں مگر عیسوی کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی سلطنت کی بنیاد میں اقتدار کی بیوں کے علاوہ شمال دہشی کے جذبات بھی شامل تھے۔ جیل جانی نے دکن کی اس نئی صورت حال کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا: "اس نئی سلطنت کی بنیاد میں شمال دہشی کے جذبات شامل تھے۔ شمال دہشی کے جوش میں انہوں نے سیاسی لائحہ عمل کے طور پر ان تمام عناصر کو بھارا جو شمال سے منتخب اور خصوصیت کے ساتھ سرزمینِ دکن سے متصل رکھتے تھے۔ ایک موثر لہجائی حربے کے طور پر کنگوں نے دلی کو ال کر مٹائی۔ روایات کی جو عملہ افواہی کی، دہلی کی رسوم اور رواج، مٹیوں، ٹھیلوں اور تہواروں کو ترقی دی۔ باہمی درجہ و ضبط، میل جول اور معاشرت و تہذیب کو گہرا کر لے کے لئے اس زبان کی سرپرستی کی..... جسے آج ہم اردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس قبل نے جنوب میں شمال کے خلاف ایک تہذیبی و روحانی جدوجہد کھڑی کر دی اور برہمنوں کے یہ دونوں حصے ایک طویل عرصے کے لئے ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ۱۲۹۸ء سے ۱۳۲۷ء کے لئے کرشنچیا تین سو سال سے زیادہ عرصے تک یہ زبان جو شمالی ہند سے آئی تھی سرزمینِ دکن کے لسانی و تہذیبی اثرات قبول کرتی ہوئی آزادانہ طور پر نشوونما پاتی رہی۔ تہذیب و ثقافت کی یہی وہ زبان ہے جسے ہم دکنی اردو کے نام سے پکارتے ہیں اور جس کا ادب اردو زبان کی تاریخ میں ایک ابدی نشانِ رومی کی حیثیت سے رہتا ہے۔"

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دکن کی خود مختار سلطنتوں نے اردو کی ترویج و اشاعت میں خوب خوب حصہ لیا۔ واضح ہو کہ ۱۳۱۷ء میں پہلی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ چھٹی سے اردو میں تصنیف و تالیف کا ایک حویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعد کی حکومتوں نے اس امر میں کوئی کمی نہیں کی اور یہ بالکل سچ ہے کہ عادل شاہی اور قلی شاہی سلطنتیں مستقل اردو کا دھار برعاقب رہیں۔

در اصل دکن میں فارسی کی نسبت مقامی زبانوں پر زیادہ زور تھا بلکہ فارسی کے اثرات بہت کم تھے۔ اب سب اردو زبان بچتی تو گویا یہ وہاں کے لیے ٹیکہ ٹال ثابت ہوئی، علاقائی روایتیں اردو میں زیادہ بے خطر طریقے پر سامنے آ سکتی تھیں۔ مگر دکن میں پہلے ہی سے اردو بولنے والے اور لکھنے والے موجود تھے۔ پروفیسر عبدالقادر سہروردی کا یہ خیال درست ہے کہ:-

"دکن میں اس زبان کے چلن و نشوونما پانے اور ادبی بولی کے اختیار کر جانے کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ جو نئی ہند کے مختلف المان علاقوں میں شمال سے آنے والوں کے لئے اتحاد کا واحد سہارا بنی زبان تھی۔"

یہی وجہ ہے کہ اردو کے اولین نمونے بعض دورانی سے ملنا شروع ہو گئے اور اس زبان کا خیر پوری طرح تیار ہو گیا جس میں پھر پور توانائی تھی۔ صوفیائے اپنے طور پر اسے اپنی ارشد و ہدایت کے لئے منتخب کیا۔

شمالی ہند میں ابتدائی زبان و ادب کا مختصر تعارف ہو چکا۔ اس تعارف کے بعد اس کا احساس ہوتا ہے کہ دنیا کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور کئی علاقے کے شعراء ادب قدیم اردو ادب کا جزو خاص ہو جاتے ہیں۔ مثلاً گجراتی ادب کے نوکار، یعنی حیدر کے شعراء و پاداس کے بعد نئی خود مختار ریاستوں کے قیام کے بعد بھاپور، عادل شاہی دور، اس کے بعد کا مجدد یعنی گونکنڈہ اور قلی شاہی دور۔ مگر دکنی روایات کے اثرات کا رائج ہونا اور بھاپور اور گونکنڈہ کے سقوط کے بعد نئی روایات کا آجانا۔ لہذا مسعود سعد سلمان کے بعد اہم صوفیائے ذکر کرے پر یہ بحث ختم ہوتی ہے اور دکنی ادبیات کا باضابطہ مجدد شروع ہو جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں چھٹی سرخیوں کے ساتھ الگ الگ علاقے کے شعراء ادب پر روشنی ڈال رہا ہوں۔



یہی صورت گجری میں ہوئی۔ دہلی کی زبان کے اثرات گجری پر بھی پڑنے لگے۔ یہ اور بات ہے کہ علاء الدین خلجی کے زمانے سے ہی دونوں بھیموں میں آمدورفت تھی۔ اس کی وجہ صوفیائے کرام کا اسلام کی اشاعت کا کام تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود بعض گجراتی صوفیائے محسوس کرنے لگے تھے کہ دہلی کی زبان کے اثرات کی وجہ سے گجراتی زبان ایک خاص رنگ اختیار کر رہی ہے۔ محمود شیرانی نے اس امر کا احساس دلایا ہے کہ صوفی شاعر بہاؤ الدین باجن ہند کی اور دہلی کو ایک ہی چیز قرار کرتے تھے۔ چنانچہ گجری کو ہندی یا ہندی بھی کہا جانے لگا۔

ابن سبکت سے الگ گجرات سے تعلق رکھنے والا قدیم ادب گجری ادب کے نام سے موسوم ہوا۔ اس ضمن میں ایک اہم امر کی طرف اذکار قسم کا تیسری یا اس قریب دلاتے ہیں:-

”معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کے صوفیاء اور ادیبوں کے شعور میں یہ بات پختہ حد تک موجود تھی کہ وہ زبان کے معاملے میں گجراتی زبان کے ادیبوں سے جدا گانہ لسانی شائستہ رکھتے ہیں۔ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ جس زبان میں وہ ادب تخلیق کر رہے ہیں وہ شمالی ہند سے لے کر گجرات اور دکن تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے وہ ایک وسیع تر لسانی روایت کے شاعر تھے۔ اس روایت کی تفصیل کے لئے ”گجری“ یا ”گجرجی“ کی یہ اصطلاح اس خطے کے ادیبوں کی قدیم اور گجراتی سے متاثرہ چیز کرتی تھی۔ چنانچہ شیخ علی محمد جی گاموہی کی تصنیف ”بہاؤ الدین باجن کے دیباچہ میں جو ۳۱-۱۵۳۸ء سے پہلے کی تحریر ہے۔ یہ اصطلاح موجود ہے۔“

بہر حال گجری ادب اپنے زمانے میں خاصی ترقی کرتا ہے اور اس کی تاریخ تک جگہ ۱۴۰۰ء سے شروع ہوتی ہے اور ۱۵۰۰ء پر ختم ہوتی ہے۔ ذیل میں گجری ادب کے چند قابل لحاظ شعرا کے بارے میں اچھائی اختصار سے چند امور کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

بہاؤ الدین باجن

(۱۳۸۸ء - ۱۵۰۶ء)

شاعر بہاؤ الدین باجن کے سلسلے میں پروفیسر محمود شیرانی کے مقالے کے علاوہ شیخ فرید کے تحقیقی مقالہ ”شاعر بہاؤ الدین باجن: حیات اور گجری گام“ سے مصنف کی زندگی بھر شاعری پر چند اہم روشنی پڑتی ہے۔ یہ احساس ہونا چاہئے کہ خوب گم ہونے والی گجری گام و جہنی اور فارسی محمود شیرانی کے علاوہ شیخ باجن گجری ادب کی تاریخ میں اس لئے اہم سمجھے جاتے ہیں کہ انہوں نے اس بولی کو ادبی و شاعرانہ بنانے میں بڑے اہم رول انجام دئے اور گجری بولی زبان کی سطح تک پہنچانے کی طرف توانائی کے ساتھ ادبی معیار حاصل کر سکتے ہیں اس کی گنجائش میں نہیں۔ باجن ۱۳۸۸ء میں احمد آباد میں پیدا ہوئے۔

گجری ادب

تیسری سلسلے کے اثرات اور زبان ادب پر دور رس رہے ہیں۔ سمجھی جانتے ہیں اس مسئلے سے دہلی اور نواحی علاقے خاص طور سے متاثر ہوئے۔ اہالیان دہلی کو کئی طرح کے قصائدات حاصلے پڑے۔ اعلیٰ انتظام پر بھی بری طرح متاثر ہوئے۔ اس بات کی خود اذکار تھی۔ انکسروں کی ایک بڑی تعداد شہر پہنچ کر دی گئی، خاص طور خاص ہی ہیں، عوامی سطح پر یہ طور پر متاثر ہوئے۔ اشتیاق کا عالم طاری ہو گیا۔ ادب دہلی میں کوئی ایسی صورت پائی تھی کہ تمام زندہ رہیں۔ عدم تنہا کا یہ احساس اتنا شدید اور مرکز کی گزروں کی اٹنی نمایاں تھی کہ ذیلی حالتیں مثلاً صوبہ دار خود قاری کا اعلان کرنے لگے۔ ایسے ہی لوگوں میں گجرات کا صوبہ دار بھی تھا۔ ۱۴۰۰ء میں گجرات کا خود مختار رہن بیٹھا اور مظفر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مظفر شاہ کو حضرت خدوم نے کبھی بتا دیا کہ وہ سلاطین گجرات کا حکمران ہو گا یا یہی بتا پانے سے صوفیوں سے بڑی محبت تھی اور اس کے یہاں ان کو ایک خاص درجہ عطا ہو گیا۔ کئی مشہور صوفیائے مثلاً قطب عالم میر، بہاؤ الدین گجراتی، عظیم الدین داؤد متائی، محمد امجد، سراج شاہ عالم محبوب عالم، شیخ حسام الدین، قاضی غلام الدین گجراتی اور حضرت شاد علیہ السلام کی دوسرے بادشاہ کی تقریبیں مسجد اہم ظہیر سے۔ دہلی والوں کی بھی انظار اب گجرات سے پڑنے لگی۔ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ گجرات ہی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں امن اور سکون ہے۔ چنانچہ دہلی سے ہجرت کا سلسلہ قائم ہو گیا اور اہل جوہن کی آمد تیز ہو گئی۔ ان صورت کی تفصیلی تحریر احمدی نہیں درج ہے۔

قاضی محمود ریاضی

”موسیقی کی یہ روح انشکوں کی ہے طوائف، جذبے کی یہ حرارت، جو باجن کے کلام میں اس مہموشی سے آج بھی نہیں اس لئے متاثر کرتی ہے کہ یہ موسیقی آج بھی زندہ ہے۔ شیخ باجن کا کام گانے بجانے کے لئے مخصوص سروں کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں ہندوستانی تصوف کا مزاج سراپت کھٹے ہوئے ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ باجن کے کلام میں حراج کی ٹھنڈک اور نرمی، فقیرانہ صدا کا کالوچ اور لہجے کی مٹھاسا نہیں آج بھی بھلی گنتی ہے۔ شاہ باجن کے کلام میں اوزن سب ہندوی ہیں۔ قاریں و عارفین انشکوں کو بھی اسی حراج میں ڈھالا گیا ہے۔ نتیجہ

آگ کی میرے ادا کیلے ہو کھلے لاگو دیھاؤ
 باندا جزا سر سے جھونتا تب ہو رنگ نہ پاؤ
 جس کھ دیکھ شہر مٹاوا تب ہو انگ تاناؤ
 پاؤں تھوڑا یا تو چورا پھر پھر باندا لو راؤ اندا
 مانجھن مینا مجھ پانچھن آسے ہوں کچھ نہ ہوا
 ہاتا ہوا سے پھولا ہیرہ کیسے جس پاس نہ پھولا
 محرو سائی کی قربانی ہے اے بہت چھپائی
 آج سری جن ہم گھر آیا کوئی نہ کر مر پائی

ان اشعار کے بعض الفاظ کچھ میں نہیں آتے لیکن جو کچھ میں آتا ہے وہ صاف طور سے ہندی سے متاثر ہے۔ ان کے کلام پر ہندی اثرات کا سب سے بڑا ثبوت تو وہ اعتراض ہے جو آپ کے کلام پر وارد کیا گیا تھا۔

وہ ہے کی ہندی، حرف تہذیب اور شعرا میں عموماً قبول رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اردو نظم کے اولین اور قدیم ترین نمونے وہیوں کی شکل میں ملتے ہیں۔ لیکن قاضی محمود کے یہاں وہ ہے کے علاوہ چو پائی بھی ملتی ہے۔ ہندی ادب میں صوفی شاعروں کی جتنی کلیقات بھی ملتی ہیں ان میں اکثر و بیشتر وہ ہے میں چو پائی کی بحر میں استعمال کی گئی ہیں۔ قطب کی مرگوتی انجمن کی مذہبیاتی حلقوں کی چتراولی عالم کی کام کندھانور محمد کی اندراولی چائسی کی پادشاہت اور قاسم شاہ کی انیس جواہر سب وہ ہے چو پائی کی بحر میں بھی ملتے ہیں۔

یہاں قاضی محمود ریاضی کی جگر چوں کا بھی اظہار ہونا چاہئے۔ سلطان اور سے جگری صوفیاد طرز انجھار کے لئے ایک موزوں صنف ان کا بھری تھی۔ بزرگان طریقت نے اسے صوفیاد اظہار کے لئے ہے دلچسپیت جانا تھا۔ قاضی محمود ریاضی بھی اسی صنف سے کام لیتے رہے اور ان کی جگر باں ان کے سرور وں اور عوام کے لئے کشش کا باعث رہیں۔ ان کے لفظ عشق کو جگر چوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے قول بھی اس صنف میں ہیں۔ ظاہر ہے یہ ہندی ہی روایت کا ایک حصہ ہے۔ جگر چوں میں جس طرح قند رسول اور اولیاء اللہ اور بزرگان دین کو بے بحث لایا گیا وہ ریاضی ہے حالانکہ جگر کی اپنی مثالی حیثیت بھی رہی ہے لیکن اس سے ایک وسیع تر و وسیعی پیغام و شاعری سے بھی کام لیا جاتا رہا ہے۔ گویا قاضی محمود ریاضی اپنی انفرادی کوششوں سے زبانِ ادب کی سطح پر بھی اسے وسعت دیتے رہے ہیں۔

شاہ علی محمد جیو گام دہشتی

(۱۳۷۹ء — ۱۵۶۵ء)

شاہ علی محمد جیو گام دہشتی کی پیدائش ۱۳۷۹ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام شاہزادہ ایم تھا۔ ان کا نہیں سلسلہ پاپ کی طرف سے سید احمد کبیرہ فی اور باں کی جانب سے حضرت عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ آپ کا خاندانی لقب معشوق اللہ تھا لیکن اس میں اتفاق رائے نہیں۔ ان کی وفات ۱۵۶۵ء میں ہوئی اور رائے کبیر احمد آہ میں دفن ہوئے۔ جیو گام دہشتی بھی ایک صوفی شاعر تھے۔ ہندی روایت سے ان کو بھی ایک رشتہ تھا لیکن ان کے یہاں عربی و فارسی الفاظ کے استعمال کی بھی صورتیں ملتی ہیں۔

جیو گام دہشتی کا دیوان "جواہر اسرار الحق" ہے۔ دیوان کے ایک سرمد شاعر حبیب اللہ نے دیوان کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے بیٹے شاہزادہ ایم معرفت اللہ نے بھی ان کا دیوان مرتب کیا تھا۔ یہ تحریر روایت کا ہی ایک سلسلہ ہے۔ لیکن "اسرار الحق" میں اس دیوان کو ہندی زبان میں کہا گیا ہے۔ اس سلسلہ کا جیو گام دہشتی کی ہندی ادب سے قربت بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے بھی عام طور سے ہندی بحر میں استعمال نہیں۔ لیکن فارسی الفاظ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ایک نظم سید احمد کبیر کی شان میں ملتی ہے اس میں ہندی اور فارسی دونوں طرح کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک مثال دیکھئے:

اوجھر چھائی چکے دکھائی جی ہاسک اور گل کھل
 ایہ جہ آگس ہویں دانی
 جو جیوڑا بیسوں لاگا بیٹے جس نیہ کی آکا
 جہوں کا لوبھ سب بھاگا

علی جیو گام دہشتی کے وہ ہے بھی قابل مطالعہ ہیں جن میں کہیں کہیں ہندی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے پرکشش مہل کی رائے ہے کہ یہ وہ ہے ہندی کے قدیم دوروں کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں کہیں کہیں بعض ناخوش الفاظ آجاتے ہیں۔ ورنہ جیو گام دہشتی کے کلام میں کافی تعداد میں وہ ہیں جو پاکیزہ، دلکش، دلچسپ و جگرو کی ہے جن پر ہندی کی گہری چھاپ لگ ہوئی ہے۔ آپ کے لقب گام دہشتی سے بھی شاہ صاحب کے ہندی سے شغف کا ثبوت ملتا ہے۔

خوب محمد چشتی

(۱۵۳۸ء — ۱۶۱۳ء)

شیخ خوب محمد چشتی تحفہ اربعہ کے اہم صوفی میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ ۱۵۳۸ء بتائی جاتی ہے۔ پورا انتقال ۱۶۱۳ء میں ہوا۔ جب سے آپ تک ان کے نام اور کاسک ایسی پرورشئی زالی جاتی رہی ہے۔ چشتی زوال محمد

"خوب ترنگ" کی ایک اور کیفیت اس میں شامل نکلیات سے نمایاں ہوتی ہے۔ شاید چشتی کے ذہن میں شہسوی سولہ باروم ہوں۔ ایسی حکایتوں میں جیشیل راہ پا گیا ہے، جولا ترانہ یعنی فیروز پور لہجہ ہے۔ چشتی کی دوسری کتاب "چند چند اس" ہے، جس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

بسم اللہ کرتا ہوں دھر چند چند الہ
پنگل اور عروض اور نال اوریا عیا جیہ آں

واضح ضرور پر اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا ہندی عروض سے وابستہ ہے اور دوسرے میں عربی، لاری اور اردو عروض کو جگہ دی گئی ہے۔ دراصل یہ کتاب ہندی کے تعارف کے سلسلے کی ہی ہے۔ لہذا اسے ہنگامہ خیز اٹھاپا سے تعبیر کرنا بھی بیکھلا نہیں ہے۔ محمود شیرانی نے لکھی ہندی اور اٹھاپا کی کتاب کے بارے میں بڑی قیمتی رائے دی ہے اور اس رائے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اسی راہ پر چل نکلا چنا تھا اس کی نکلیات میں اردو زبان، اوزان و بحر و غیرہ فارسی زبان کے زیر اثر استعمال ہوئے ہیں۔ گویا "چند چند اس" نے اولیٰ نظر رائے میں ایک خوشگوار تجربہ ملی پیدا کر دی ہے جس سے سنہ روپ کی تشکیل کا سامان مہیا ہو گیا اور فارسی اوزان و بحر مقامی روایت میں داخل ہو گئے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مہرات کی نگہری فارسی سے ہم آہم ہو گئی اور اس کی صنفوں کے لئے اسی کے مزاج کی پیروی کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

شیخ خوب محمد چشتی کی اولیٰ اہمیت کے باب میں پروفیسر سید جعفر اور گیان چند جیناں اس نظر اڑ ہیں:-

"خوب محمد چشتی ماہر فن تھے انہوں نے 'خوب ترنگ' اور 'اسواج خوب' کی کئی کئی تاریخیں لکھی ہیں، اردو میں پہلی بار نظم پر کتاب لکھی، پہلی بار ہندی پنگل اور اردو عروض پر رسالہ لکھا۔ ان کی یہی مہارت فن اور استاد 'خوب ترنگ' میں ظاہر ہوتی ہے جہاں دوسراں کی جان کرنے پر تو چہرہ کوڑ کرتے ہیں، اعلیٰ شعر سے سروکار نہیں رکھتے۔ ان سے پہلے کھائی دکنی نے اپنی شہسوی میں فارسی اوزان استعمال کیا ہے ورنہ ان کے دوسرے شیش رو اور یہ خود ہندی اوزان ہی میں لکھتے ہیں۔ اردو عروض کی کتاب لکھتے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا اردو اوزان کا استعمال کرنے لگے تھے۔ مہرات و دکن میں یہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اردو زبان اور دکن شعر کو ہندی سے کچھ بٹھا کر فارسی کی طرف موڑا۔ لیکن ابھی ہندی روایت اس حد تک غالب ہے کہ پہلے اردو عروض کی کتابوں کا نام بھاد پید اور چند چند اس رکھا جاتا ہے۔"



سہیلانی کے مزید تھے۔ تصوف کی تاریخ میں ان کی خصوصیت جگہ ہے لیکن ان کی عظمت کی ایک اور وجہ فارسی زبان و بیان پر ان کی قدرت ہے۔ "اسواج خوب" فارسی انداز کا ایک خوب صورت نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ "مختصر الاکرام" جلد اول صفحہ ۶۷ میں ہے کہ "میاں خوب محمد چشتی دہلیش کامل و صاحب فن بودند در تصوف دست رس داشتند و بر جامع جهان نما شرح نوشت، اسواج خوبی و خوب ترنگ نیز از ایشان یادگار مشہور معروف است۔۔۔۔۔۔ تاریخ وصال "خوب تھے" "مختصر است"۔ "خوب تھے" سے تاریخ وفات ۱۰۴۳ھ یعنی ۱۶۱۴ء برآورد ہوتی ہے۔ لیکن سید جعفر نے تاریخ وفات ۱۰۷۹ھ کو ہی تسلیم کیا ہے۔

خوب محمد چشتی کی اردو ادب میں اہمیت ان کی شہسوی "خوب ترنگ" کے باعث ہے، جو ۱۵۷۸ء میں تصنیف ہوئی۔ پھر انہوں نے ۱۵۹۱ء میں "اسواج خوبی" کے نام سے فارسی میں اس کی شرح لکھ دی۔ خوب محمد چشتی اس زمانے کے مصنف ہیں جب مہرات کی سلطنت ذوالی سے نکلا رہا ہو چکی تھی۔ امتکار کا ایک عالم تھا۔ ادب اکبر نے ۱۵۷۲ء میں اسے شائع کر لیا۔ "خوب ترنگ" ۱۵۷۸ء میں تالیف کی گئی۔ گویا امتکار کے زمانے کی کتاب ہے، جب ہر جگہ بے یقینی کی فضا تھی اور عدم تحفظ کا احساس لوگوں کو مسلسل ستا رہا تھا۔

"خوب ترنگ" میں ایسے امتکار کی کوئی کیفیت نہیں ملتی بلکہ چشتی نے تصوف کے بعض مسائل کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے اور ایسے مباحث میں اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں لیکن ایک خاص بات جو اس سلسلے میں کہی جاسکتی ہے خود چشتی کے قول کے مطابق مہرات کی بولی میں عرب اور عجم کی بات شامل کی گئی ہے۔ متعلقہ شعر ہے:

جیوں دل عرب عجم کی بات
من بولی بولی مہرات

گویا جو رجحان مہری ادب سے بہت کر معیاری اردو کی طرف قائم ہو رہا تھا اس کے اولین معیاروں میں چشتی کا نام از خود سامنے آ جاتا ہے۔ چنانچہ اکثر ابوالیث صدیقی کا بیان ہے کہ:-

"یہ نظم انسانی اختیار سے نہایت اہم ہے۔ پراگرت اور جدید ہندوستانی زبانوں کے درمیان اس کی زبان کو ایک عبوری نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ سرسری مطالعے سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں وہی انسانی خصوصیات پائی جاتی ہے جو قدیم بھجانی، قدیم براج، قدیم دکنی اور قدیم عربی میں بھی ملتی ہیں۔ یہ خصوصیات دراصل پراگرت کی اب پرنش شکلوں میں مشترک معلوم ہوتی ہیں اور اس سے پرے اس نظر سے کی تائید ہوتی ہے کہ عوامی بولی جو اس وقت برصغیر کے ایک بڑے حصے میں بولی جاتی تھی، بہت سے عناصر مشترک رکھتی ہے۔ قدیم بھجانی اور قدیم دکنی کے مختلف عناصر سے بعض ماہرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہ زبان و خطاب سے دہلی اور بعد ازاں مہرات اور دکن میں پھیلی۔"

کہ اس وقت امیرانِ صمدہ جہاں کہیں گئے تھے پر یہ ان تھے ہر لمحہ انہیں موت کا خطرہ تھا۔ ان میں کوئی تعداد میں آؤگے جب قتل ہو گئے تو اس کی خبر سلطان کو ملی اس نے ایک سٹے فرمان کے ساتھ عزیز خاں سلطان کو خطبے سے بھی نوازا لیکن امیرانِ صمدہ تک کچھ باقی بھی ہو گئے اور بعض امیروں کو قتل کر دیا۔ اب دکن میں بغاوت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ دلی کی حکومت انہیں کسی حال میں قابل قبول نہ تھی چنانچہ حسن کا گھوڑے ۱۳۳۷ء میں دولت آباد میں بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح کئی سرحدوں کے بعد گجراتی ریاست علاء الدین حسن بھٹائی کے ہاتھوں آ گئی۔ یہ ایک جری مجلس تھا اور منصوبہ بندی میں ماہر بھی تھا۔ لہذا اس نے ایک مضبوط ریاست قائم کی جو ایک دو سال نہیں ایک سو نوے برس قائم رہی۔ وہ ہر مجلس کو دوست بنائے رکھتا اور اس کے ساتھ چلنے والے سرداروں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ سلطان تاج الدین فیروز جو ۱۳۹۷ء میں تخت نشین ہوا ایک قوی بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کے دور میں بھٹی سلطنت کو بہت عروج ہوا۔

ایسے تمام امور سے صرف سیاست ہی نہیں انسانی کیف و کم میں بھی تغیر تبدیل پیدا ہوا۔ چونکہ بھٹی سلطنت ایک مستحکم نظام کے ذریعہ قائم تھی لہذا دکنی زبان کا ایک شخص بھی پیدا ہوا جو اثرات دلی کے تھے وہ تقریباً ختم ہو چکے تھے اور دکنی زبان کی اپنی خصوصیت کے شروع کے امکانات بڑھ گئے اور ایک طرح سے بھٹی نظام نے ایسے خاص دکنی لسانی ڈھانچہ کو مزید مضبوط کر ڈالا۔ قاری اثرات نام کو دیکھئے۔ دروازہ قند باب اپنے رنگ و آجگ میں ڈھلنے لگی۔ صرف زبان کی حد تک نہیں بلکہ تعلیمی سطح پر بھی ایک امتیاز قائم ہو گیا لیکن ایسی سازگاریوں سے بغیر شاہانہ سرپرستی سے فنونِ لطیفہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ صوفیانہ روایات نے بھی اپنا کردار نبھایا۔ صوفی تو محبت و عقیدت کے پیکر تھے ہی، یہ صورت عام ہو گئی۔ دکنی زبان و ادب خصوصاً بھٹی دور میں کیا کچھ تھی اس کا اندازہ اس دور کے بھٹی شعرا سے بخوبی ہوتا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

فخر دین نظامی

فخر دین نظامی کے حالات زندگی آج بھی پر اوٹا نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی بھی تفصیل نہیں ملتی۔ دکنی ادب کے محققین نے یہ کچھ لکھا ہے وہ قیاس پر مبنی ہے۔ دیکھئے ان کا حراز چلری مریم پور بتایا جاتا ہے۔ یہ پورے سولہ گلو میٹر پر واقع ہے۔ دروازے پر یہ تحریر ہے۔

حضرت خلیفہ سید شاہ مولانا فخر دین صاحب قدس سرہ

لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اسی مجلس کا حراز ہے جس نے ”کدم راؤ پدم راؤ“ تصنیف کی ہے۔ فخر دین نظامی آجی مشہور ”کدم راؤ پدم راؤ“ کی وجہ سے ہی محققین کی تحقیق کا موضوع بنے ہیں۔ اس مشہور کے بارے میں سب سے پہلی تحقیق نصیر الدین باغی کی ہے انہوں نے رسالہ ”معارف“ ۱۹۳۲ء میں اس کا تعارف پیش کیا تھا۔ اس مشہور کا نام ”کدم راؤ پدم راؤ“ بھی شاعر کا تہجیز کر دیا نہیں ہے۔ لیکن کوئی چند تاریخ نگار نصیر الدین باغی کے علاوہ دکنی دوسرے لوگ

بھٹی ادب

ادب ادب کا بھٹی دور اس لئے اہم ہے کہ اردو نے قدیم کی تاریخ اسی عہد سے شروع ہوتی ہے۔ گو یا اردو ادب کی پہلی اشاعت ہے جس پر بعد میں علامہ قنبر ہوئی رہی۔ کہہ سکتے ہیں کہ دکنی ادب کا جڑ بھی مرہٹہ ہے اس کی شروعات بھٹی دور ہی سے ہوتی ہے۔ یہ دور جو دہویں صدی کے تقریباً نصف سے شروع ہوتا ہے اور سولہویں صدی کے اولین پچیس سال پر محیط ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جو تعلق نے جس طرح دکن کو اپنی نگاہ میں رکھا تھا اس کے اثرات دور رس پڑے تھے اور اس بادشاہ کے مزاج کی اثراتی و تبدیلی یہاں کی سیاست کو مسلسل متاثر کرتی رہی تھی۔ عہد تعلق میں امیرانِ صمدہ کی انتظامی صلاحیتوں کو تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان امیران نے ناممکنہ حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا تھا۔ علاء الدین بھٹی نے ہی امیرانِ صمدہ کا نظام قائم کیا تھا جس میں ہر گاؤں پر ایک ٹک سردار امیر کی طرح سے انتظام و انصرام کرتا تھا۔ بعد میں تعلق مسلمانوں نے بھی امیرانِ صمدہ کے کام کو مستحسن قرار کیا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ جو تعلق کے دور حکومت میں انکسار و محبت پڑا تھا۔ سیاسی حالات اثر ہونے لگے۔ تعلق کی خاندان اور سلطان کا یہ حرکتوں سے مدام و خاص خوف زدہ رہتے اور ہر گزری وہ علوم و فنون کا کچھ نہ معلوم ہوتے۔ یہاں تک کہ تعلق نے ۱۳۳۳ء میں عزیز الدین خاں کو تھرات اور مالوہ کی سرداری عطا کی وہ نے امیرانِ صمدہ کے خاتمے کا حکم دیا۔ یہ سب کے سب نکل کر دئے گئے۔ جس کی تفصیل شیا الدین کی کتاب ”مارٹیا“

ہے۔ گوئی چند رنگ نے اپنی کتاب "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو افسانوں" میں لکھا ہے کہ "نوسر باز" جدید تحقیق کے مطابق اردو کی ایک قدیم مشہور ہے "قصائد مرزا نے بھی مشہور "کدم راؤ پدم راؤ" کی بابت رسالہ "اردو ادب" ۱۹۶۶ء میں اس مشہور کی بعض تفصیلی چیزیں کی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اور عبدالحق کے مطابق اس کی تصنیف کا زمانہ ۸۶۵ء اور ۸۶۷ء کے درمیان ہے جب کہ نسر امرہوی اسے ۸۴۵ء اور ۸۳۸ء کے درمیان قاتے ہیں۔ لیکن اس مسئلے میں جمل جالبی کے مباحث خاصے اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ نکھائی نے اسے ۸۳۳ء اور ۸۳۹ء کے درمیان تصنیف کیا یعنی ۱۳۳۰ء اور ۱۳۴۵ء کے درمیان اور اسے احمد شاہ دہلی نے اپنی کتاب "تاریخ ہندوستان" میں اس کے لکھائی نے اس کا ذکر کیا ہے اور شہزادے احمد شاہ دہلی نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ لیکن ان تمام امور پر روشنی ڈالتے ہوئے سید جعفر لکھنوی ہیں کہ مشہور "کدم راؤ پدم راؤ" غلام الدین احمد شاہ دہلی (۱۳۳۵ء تا ۱۳۵۸ء) کے دور حکومت میں لکھی گئی جیسا کہ مشہور کی داخلی شہادت اور اشعار کے تعلیم سے ظاہر ہوتا ہے۔

جمل جالبی کی عبارت مشہور "کدم راؤ پدم راؤ" کے اشعار کی تعداد ۱۰۰۳۴ ہے جب کہ امرہوی نے ۱۱۰۲۹ اشعار نصیر الدین ہاشمی نے ۱۸۴۵ اشعار اور شہزادے مرزا نے ۹۹۴ اشعار کی تعداد درج کی ہے۔ ظاہر ہے اب یہ مشہور جوہر کما حقہ ماننے لگتی ہے تو جمل جالبی ہی کی تعداد کو صحیح ماننا چاہیے۔

بہر حال "اردو مشہور" کے متن سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا آغاز کوئی قدیم کتاب ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی مستحکم کہ قصہ نکھائی کے قریبی فکر رہا ہو۔ شہزادے مرزا نے لکھا ہے کہ یہ "سنگھاسن تیشی" سے ماخوذ ہے، اس لئے کہ اس میں ایک لفظ "سنگھاسن" آیا ہے لیکن سید جعفر لکھنوی ہیں کہ شہزادے مرزا کو تاریخ ہو ہے۔ "سنگھاسن تیشی" مشہور تصنیف ہے اور اس سے "کدم راؤ پدم راؤ" کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ "کدم راؤ پدم راؤ" کا قصہ ہندوستانی لوگ قصوں کے رنگ میں ڈبایا ہوا ہے۔ ہندوستانی معاشرت اور ہندوستانی طرز فکر کا اثر نمایاں ہے۔ اس کے حوالے سے وہ لکھتی ہیں کہ "کدم راؤ پدم راؤ" میں استعمال ہونے والے بارہ ہزار الفاظ میں سے دس ہزار مستحکم کے ہیں اور عربی فارسی کے لگ بھگ دو سو۔ جو شیخ متھ نے قصے کی بنیاد بھارتیہ پر ایک انکھیاں پر رکھی ہے۔ یہ بھی کہ یہ مشہور فی جمل ہندوستانی تہذیب کی مظہر ہے جس میں حضرت ابوبکر، نورج، حضرت محمد کے چہار بار اور حاتم طائی کا ذکر ہے وہیں بھگن، جنومان، شیخ باڑ اور شری رام کے نام بھی ہیں۔

مشہور "کدم راؤ پدم راؤ" کا قصہ اس طرح ہے کہ راجہ کدم راؤ ایک جوگی اکرہ ہتھ نے طالب ہلنے کا کس سکھایا۔ راجا کدم راؤ ایک مرتے میں ایک خٹے کے طالب میں آگیا تو جوگی کمال، بھارتی اور چالاک سے راجا کدم راؤ کے طالب میں داخل ہو گیا اور اس طرح وہ راجہ بن بیٹھا۔ راجہ کا وزیر پدم راؤ جو گویاں اور سنیہ سنیوں کی محبت کو ابھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا، اہلہ بادشاہ کو اس سے دور رہنے کی ہدایت کرتا تھا لیکن بادشاہ اسے قبول نہیں کرتا تھا اب جبکہ جوگی راجہ

معلوم ہو گئی اور یہ بھی کہ یہ مرکز راجہ نہیں ہے۔ اب وزیر کی عد سے لیا ایک ہار پھر اپنے طالب میں آگیا اور اس طرح اس کی زندگی از سر نو شروع ہوئی۔

ڈاکٹر پرکاش موہن نے "کدم راؤ پدم راؤ" کے اصل نگار کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ احساس دلایا ہے کہ سرور کے "قصائد عجیب" کا آغاز صاف طور سے منگن اور وکرم کی نگہاں کی وہ شکل ہے جو سرگیدھ کی تصنیف پر کم بختی میں بیان کی گئی ہے۔ دونوں میں شہزادے کے جسم میں دغا بازی سے داخل ہونے والا خود اس کا وزیر زادہ ہے۔ جدیدی طالب کا قصہ اصل میں ہندو مت پر مبنی ہے۔ ماخوذ ہے۔ مشہور "کدم راؤ پدم راؤ" میں شہزادے کے جسم میں دغا بازی ہو گئی داخل ہو جاتا ہے جس نے شہزادے کو یہ فن سکھایا تھا۔ وکرم کی کھول والا اصل نگار میں بھی جوگی ہی شہزادے کے جسم میں اپنی روح لے جاتا ہے۔ "کدم راؤ پدم راؤ" کا آغاز وکرم کی کھانہ کھرتی ہے۔ اس طرح اردو کی اس قدیم ترین مشہور کا مرکزی تصور قدیم ہندو افسانوی ادب سے متاثر نہیں رہا ہے۔

ڈاکٹر پرکاش موہن کا یہ خیال دلی ہے۔ یہاں مجھے صرف اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ قدیم ہندو ادب یا کوئی ادب ہندو مسلم تہذیب کے اختلاف کا محض منظر نامہ پیش کرتا ہے لہذا اردو کے بارے میں یہ کہنا کہ ہندوستان کی مٹی سے اس کا تعلق کم رہا ہے، کچھ نہیں۔ اس کی بھرپور مثال نکھائی کی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

(۱۳۳۱ء - ۱۳۴۴ء)

آپ کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ سید محمد نام اور کنیت ابو الفتح تھی۔ آپ سادہ تہذیب تھے۔ جد اعلیٰ کا نام ابو الحسن جعفری تھا جو ہرات سے دلی آئے تھے۔ ان کا شہر و نسب اس طرح ہے: "سید محمد گیسو دراز، ابن سید یوسف حسینی، راجا اہمچور، راجہ جمال، ابن علی، ابن محمد، ابن یوسف، ابن حسین، ابن محمد، ابن علی، ابن خوار، ابن داؤد، ابن زید، ابن ابو الحسن الحنفی، ابن حسین ابن عبد اللہ، ابن امام زید شہید، ابن زین العابدین، ابن سید الشہید امام حسین، ابن علی۔"

خواجہ بندہ نواز کے اسلاف غلام الدین مسعود شاہ کے مہد میں عرب سے ہندوستان آئے اور دلی کو سکون پایا۔ آپ کے والد کا نام سید یوسف حسینی تھا۔ لیکن شاہ راجہ جمال کے نام سے معروف تھے۔ سلطان محمد تغلق نے جب دلی سے دہلی کی کوچی سلطنت بنایا تو غلام اور غلام زین بھی دولت قیاد آ گئے۔ ان کے ساتھ راجہ جمال بھی آئے جب ان کی عمر (بندہ نواز کی) چار سال تھی اور وہ دہلی کے ساتھ تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم والد اور نانا کے زیر سایہ ہوئی۔ دولت قیاد قیام میں سید محمد حسینی نے اپنے والد اور ان کی وفات کے بعد نانا سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابتدائی تعلیم غلام آہو میں ہوئی اور ایک بزرگ شیخ بابو نے آپ کو کتب میں پڑھایا۔ حدیث و فقہ کی تعلیم بھی دی۔ سات برس میں قرآن حفظ کر لیا اور مولہ برس کی عمر میں ظاہری تعلیم مکمل کر لی۔ اس کے بعد حضرت نصیر الدین چراغ دہلی جو حضرت نظام

الدرین اولیا کے خلیفہ تھے، ان سے مرید ہو گئے۔ مرشدی کے حکم سے آپ دکن سے واپس آئے اور شہرہ آبادت کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا حوالہ گبرگ میں ہے، جو سرینچ خاص دہانہ ہے۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کثیر القادحیف بزرگ تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد متعین نہیں۔ مختلف لوگوں نے مختلف تعداد لکھی ہے۔ ابھی جو کتابیں دستاویز ہیں ان کی تعداد چالیس (۴۰) کے قریب ہے۔ لیکن بعض عربوں کے ہارسے میں اختلاف ہے کہ وہ بندہ نواز کی تصنیف ہے کہ نہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب ”معراج العاشقین“ ہے۔ کئی لوگوں نے اس کتاب کو مرتب کیا اور ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ ایسے لوگوں میں مولوی عبدالحق اور گوپی چند رائے اہم ہیں۔ دوسرے دس سال کے نام ”ہدایت نامہ“، ”مشتق نامہ“، ”تلاوت الوجوہ“، ”دارالاسرار“، ”حکایت نامہ“، ”التشکیل چارہ“ وغیرہ ہیں۔

حضرت خواجہ گیسو دراز کے ہارسے میں بعض معلومات مولوی عبدالحق نے ہم پہنچائی ہے اور کئی دوسروں نے بھی۔ کیا جاتا ہے کہ خواجہ بندہ نواز نے دکنی زبان میں سات اپنے مقولے اشاعت فرمائے تھے جنہیں ان کے مرید نے شرح لکھ کر عام کیا۔ جس کا نام ”بغت اسرار“ ہے۔ گیسو دراز کی اہمیت کیا کہو تو یہی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے انہیں چوتھے طبقے کا سلطان القہم کہا ہے۔

بندہ نواز گیسو دراز ایک شاعر بھی تھے۔ ان کے کھمبے کے ہارسے میں اختلاف ہے کہ اسناد کیا تھا شہباز یا بندہ۔ بہر حال انہوں نے یا تو شہباز یا بندہ کھمبے کیا ہوگا۔

خواجہ بندہ نواز کی شاعری مسیحتی سے زیادہ تر وابستہ ہے۔ داک رانگیاں ان کی شاعری کی حدیں متعین کرتی ہیں۔ چنانچہ انہیں ماہر مسیحتی بھی سمجھا جاتا ہے۔

خواجہ کے شعر بیحد صوفیانہ طرز میں لکھے جاتے ہیں اور یہ سید بہ چہ متعلق ہوتے رہے ہیں۔ جیسے:

اللہ سہاگن سبھا سے تیرا حال نہ جاگے

ایک اور شعر جس میں شہباز کھمبے ہے، اس طرح ہے:

مٹھی دانوں مستحق رکھ ظاہر شہباز کہلائے

مشتق کے مٹھی بند اپنی آپ کہلائے

اس شعر میں بھی لوگوں نے مسیحتی کے سر حال کاٹش کئے ہیں۔ واضح ہو کہ سلطان ابراہیم عادل شاد نے اپنی کتاب ”تواریخ“ میں داک رانگیاں سے بحث کرتے ہوئے خواجہ کو فراتہ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ فراتہ عقیدہ جس طرح پیش کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس باب میں حضرت کو یہ طوطی حاصل تھا۔

اب ”معراج العاشقین“ کی طرف واپس آئیے تو چھ طروہی نکات واضح ہو جائیں گے۔ میں نے بہت دنوں

دیکھا تھا کہ ”معراج العاشقین“ کی زبان قدیم تر دکنی مستقوں کے مقابلے میں سہل ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ایک چونکہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دکن میں گزرا، چنانچہ قدیم دکنی لسانیات کی شقیں حضرت کی مذکورہ تصنیف پر منطقی نہیں ہوں گی۔ لہذا ”معراج العاشقین“ کو حضرت گیسو دراز کی کتاب ہوا کرتے ہیں انہیں کوئی قباحت نظر نہ آئی..... مگر جو کچھ شاہد کہ انہوں نے حسی طور پر ”معراج العاشقین“ کے مصنف کا تعقیب حل کر دیا ہے۔ ان کا بیان ملاحظہ ہو:-

”معراج العاشقین کو ابھی تک خواجہ بندہ نواز کی تصنیف اور اردو کا پہلا شاعری رسالہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ کسی نے اس کی زبان، مضامین، ناقص ترتیب، الجھی ہوئی اور بے ربط عبارتوں پر توجہ نہیں دی۔ اس رسالے کی صرف تعلیمات پر ہی غور کر لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بندہ نواز سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ حضرت امین الدین علی کا اجتہاد ہے جس کو ان کے خانوادے اور ان کے سلسلے کے چرآن طریقہ نے اپنا نظم و نثر کے رسالے میں اہتمام پیش کیا ہے یعنی اس رسالے کے مصنف سید شاد محمد دوم تھے۔“

سید شاد محمد دوم جسکی کو میر تقی میر سے بدلت و ملاقت حاصل تھی اور میر تقی میر اس کی خدا لہاں کے مرید اور خلیفہ تھے۔ لہذا ”معراج العاشقین“ ۱۰۶۶ھ کی تصنیف نہیں ہے۔

ڈاکٹر پکاش مونس نے بھی لکھا ہے کہ ”معراج العاشقین“ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف نہیں بلکہ ایک اور بزرگ شاعر جسکی کے رسالے ”تلاوت الوجوہ“ کی ناقص تکمیل ہے۔ دراصل یہ بیان ڈاکٹر حفیظ حفیل کا ہے جسے مونس نے اقتباس کیا ہے۔ کہہ اور امور بھی قابل ذکر ہیں جس سے ”معراج العاشقین“ خواجہ صاحب کے انتقال کے تقریباً اعلانیٰ سو سال بعد کی تصنیف ظہور کرتی ہے۔ دوسری تصانیف کے ہارسے میں بھی کچھ ایسی ہی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً خواجہ صاحب کی ایک مٹھی ہے جس کے آخری اشعار یہ ہیں:

مائی پائی ہور بارا خالی اند کیا تھا

پانچ عناصر بھجوں بندہ مٹھی کا اب تو تھمر سن

اس کا انتساب بھی خواجہ صاحب کے نام ملا ہے۔ رسالہ ”تلاوت الوجوہ“ بھی آپ سے منسوب ہے۔ لیکن یہ ”معراج العاشقین“ ہی کی تکمیل ہے۔

لطیفی کے حالات زندگی پر وہ قلم اٹھا کر ہیں۔ لیکن نصیر الدین باغی "دکن میں اردو" کے صفحے ۷۴ پر نظر آ رہا ہے کہ اس کا ایک قصیدہ ہے جس میں شاہ محمد کی مدح ہے اور شاہ محمد کا تعلق، ظہیر الدین بختیار خاں کے گھرانے سے تھا۔ لطیفی کا نام مشتاق کے ساتھ ساتھ آتا ہے یہ دونوں ہی بعض دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلاطین ہند پر ان کے اثرات بتائے جاتے ہیں۔ ان کا ایک مرید ابو الحسن محمد بن غزالی تھا جس کے قصیدے معروف ہیں۔ کرائی سے لطیفی اقتساب کرتا رہا تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی لطیفی پر ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان "قدیم اردو شاعر لطیفی کے زمانے کا تعین" ہے۔ اس میں انہوں نے اسے سترہویں صدی کا شاعر بتایا ہے۔ ہر طور لطیفی کو قصیدے سے خصوصی ربط تھا۔ اس کی زبان مستقیم قصیدے کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ جس میں ایک طرح کی جھلکت پائی جاتی ہے۔ قصیدے کی خصوصیات میں شوکت الفاظ کی ایک جگہ ہے۔ لطیفی کا قصیدہ ایسے الفاظ سے بھری نہیں۔ "تاریخ ادب اردو" سید وحید محمد گیلانی چوہدری میں لطیفی کا قصیدہ درج ہے، جو "چرخ ادبیات مسلمانان پاکستان دہلی" سے ماخوذ ہے۔ میں اس کے چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

صبح ہوا یا صفا دین کا کھلا کوا
چوڑ چمن کی ہوا غیب ہوا بازمن
سور سحر سرگ کے گودھے ظاہر ہوا
نہیں لگا دین کے بیس جلایا آئین
کرن کی جھادو بھادوین کی کالک چرا
فرش طبع بچھا خسرو روی پہ فن
چہار پہر بہ قرار بوچھا دنیا تھا منہار
غرب کے کوئے سے ڈول لایا دین
نہیں سورج جہان سے لعل جوئے سرک کے
دین کا کھیل مٹا تین میں کھپا انجمن
سرک سے لکھن چھو لعل لہو کے سحر
سور چھپایا خنجر چند دکھایا کہن
چندر کا ہاتھ بچا دین کی دانی اچھا
نکھ و خنجر میں چھپا جھانک کے راکے چمن

نصیر الدین باغی نے لطیفی کی ایک غزل بھی درج کی ہے۔ یوں تو محض ایک غزل سے غزل میں اس کے بیان کا قہقہہ ٹھیک ہے۔ دھواں ہے پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کئی غزلوں میں عام طور سے محبوب مت کی رنگ و آجنگ دکھتا ہے۔ غزل کا مولیٰ مزاج نکال دیتا ہے کچھ صورت لطیفی کی غزل میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ گویا اس وقت تک وہ غزل حسن و یاس سے سروکار نہیں رکھتی، چاہے وہ حسن دور کی بھی غزل ہو۔ یہ صورت تو بہت بعد میں دلی کے یہاں پیدا ہوئی ہے۔

مشتاق

نہیں پر مشتاق کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ اس کی اب تک پانچ غزلیں دستیاب ہیں۔ لیکن ان غزلوں میں بھی کوئی معنوی تہ ذرا ہی نہیں ہے اور ان کا احساس ہوتا ہے کہ سطحی معنی کا جو سلسلہ عام طور سے غزلوں کا مزاج رہا ہے وہ انداز ہی سے رنگ و ہار بھیا رہا ہے۔ فکر کی چھاپ کبھی نہیں ملتی اور نہ زندگی اور کائنات کے اسرار و رموز سے کوئی رشتہ قائم ہوتا ہے۔ لیکن حسن و جمال مرکزی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جن کی تصویر کشی مقامی رنگ و آجنگ کی وجہ سے دکھائی دیتی جاتی ہے۔ مشتاق کی یہ کچھ غزلوں کے نمونے تھم کا ضمیر نے بھی درج کئے ہیں وہ ہیں سے میں چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

او کیونٹ کسری کرتے چمن مہانے چنی ہے آ
رہے کھلنے کو تیناں دتی او چہنے کی کچی ہے آ
سورج سرہاں میں جیوں دنا نظروں کا بچی خرقہ
جوانت جیواں بھری سر تھے اور رخ او پہ دخلی ہے آ
سورج کے گل میں چاند جیوں میں گچ لگے تھک دے
قربان اس کے ہاتھ پر جن اسے تری لکھن گزری
آپ دیات اور لب ترے جاں بخش دجاں پرور ہے
مشتاق یارے سول بیا امرت بھری اوکل گزری

میراں جی شمس العشاق

(۱۶۱۳ء - ۱۶۹۷ء)

شمس العشاق دکنی صوفیوں میں اپنی نگارشات کی وجہ سے سید احمد قصور کے جاتے ہیں لیکن ان کے حالات زندگی بھی اب تک صحیح طور پر سامنے نہیں آئے بہت کچھ تو اساتذہ ہی ہیں لیکن انہوں نے اپنی خود نوشت میں اپنے والد کا

میں محفوظ ہے۔ میراں جی کے مرشد کا نام کمال الدین بیانی تھا۔

”تاریخ ادب اردو“ پہلی کڑھ (جلد اول) میں ان کی تاریخ و وفات مختلف طریقے سے درج کی گئی ہے جو ایک دوسرے کو رد کرتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے ان کا سن وفات ۹۰۲ھ یعنی ۱۳۹۷ء متعین کیا ہے۔ لیکن ۹۰۲ھ کے مطابق سن ۱۳۹۷ء ہونا چاہئے۔ شاید کتابت کی غلطی ہے۔ نصیر الدین باغی نے اسی تاریخ کو صحیح بتایا ہے۔ حیرت ادا امر یہ ہے کہ میراں جی کا ہزار تاریخ وفات جس العشق بتایا جاتا ہے اور یہ بھی کہ یہی تاریخ وفات ان کے نام کا جزو ہے۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہزار تاریخ وفات پر کوئی بحث نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن بحث کا سلسلہ اور رد و قبول کی کیفیتیں آج بھی نمایاں ہیں۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ مادہ تاریخ وفات کسی شخص کے نام کا جزو کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر اگر یہ سچ ہے کہ یہی تاریخ دور ست ہے تو پھر اختلاف کا پیکلہ کہاں پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ مادہ تاریخ وفات نہیں بلکہ تاریخ پیدائش ہے اور اسے مان لینے میں کوئی فائدہ اس لئے نہیں ہے کہ نام کا جزو ہونا اسی وقت ممکن ہے اگر یہ پیدائش کی تاریخ ہے۔ ہندانی حالات میں اسے ہی تسلیم کرتا ہوں۔

ڈاکٹر پرکاش موہن نے ایک ہندی محقق پرشاد رتھہ سے تحفہ کے ایک مضمون کا ذکر کیا ہے جس میں شاد پیراں جی کی تاریخ پیدائش ۹۰۲ھ بتائی گئی ہے جو ۹۰۲ھ کے مطابق ہے اور یہ کہ وہ کہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ جس العشق یعنی میراں جی کے نام میں پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن یہ ہندوستان آگئے اور یہاں تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی کتابوں پر ہندی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ گوہر سلویں صدی عیسوی تک اردو اور فارسی کی ملاپ کی ”تکلم صورت نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہزاروں نے تبلیغ و اشاعت کے لئے وہ الفاظ استعمال کئے ہوں گے جو انگریز کے لئے قابل توجہ اور قابل تعظیم ہوں۔ لہذا ہندی کے الفاظ استعمال کرنا ان کے لئے ناگزیر تھا۔“ بلکہ یہ صدی عیسوی میں تبلیغ و اشاعت کا کام کرنے میں ہندوؤں کی ہندی زبان قابل لحاظ ہو چکی تھی لہذا میراں جی نے بھی صورت اپنی ہو گئی۔

میراں جی کی سب سے مشہور تصنیف ”غزل نامہ“ ہے جس کا ایک کردار یا مرکزی کردار خوشنودی یا خوشی نامی ایک لڑکی ہے۔ راجیپ بات یہ ہے کہ ”غزل نامہ“ جس سوال و جواب کی صورت پیدا کی گئی ہے اور معرفت کی یا محبت کی ہندی میں بیان کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ اگر اردو اور فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے جاتے تو جس آبادی سے مخاطب تھا اس پر اثرات مرتب نہیں ہو سکتے تھے۔ ہندی الفاظ کے استعمال کا جواز یہی ہے۔

عبدالحق نے ”غزل نامہ“ میں ۱۷۰۱ء کے نام کی تعداد بتائی ہے۔ خود میراں جی نے بھی ایک طرح سے اس طرح

لکھا ہے:

”اس غزل نامہ دھر یا نام دوید ایک سو ستر“

عبدالحق کے پاس تھا۔ ”غزل نامہ“ میں ہندی الفاظ کی کثرت کی وجہ سے ہندی کے ادیب اس کی تحقیق اور تجزیے کی طرف ناگہاں ہوتے ہیں۔ جن میں رتھہ راج کی اہمیت مسلم ہے۔

غزل کا کردار جس طرح سامنے آیا ہے اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ مختلف قسم کے صفات کا پیکر ہے اور ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن ستر برس جی کی عمر میں اس کا اعتقاد ہو جاتا ہے۔ اس نظم کی بحر بھی ہندی ہے۔ اس ضمن میں پرکاش موہن لکھتے ہیں:-

”یہاں غزل کا ہر اس صفت سے مصنف نظر آتی ہے جو قدیم ہندی ادب میں ایک شریف گھرانے کی دو بیڑہ کی خصوصیت ہے۔ اس کی تعریف میں بانی بھولی، جیو بھول، اہم بادی، سات سنگاتی (صوم و منقش) ستیا و فانی (منس کی سی چال والی) سو بھائی (خوبصورت آنکھوں والی) گورو رتن (صید) کرکری، مچی اور ستی جیسے ہندی تصورات اور ان کے اظہار کے لئے شیریں اور سبک ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسے ہندی اور بھولوں سے واسطہ نہ رہا۔ اس نے دانستہ نہ نہ گئے ہندو پر ہندی کا اعتقاد نہ لگا۔ اسے تو میراں جی کی طرح اللہ کا سہاگ چڑھا کر کسی دوسرے سے کام ہی کیا رہا۔ اس کی ساری اسی محبوب حقیقی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کی بوس میں وہ بھی ہوئی ہے۔ وہ گن دہی ایسا باغیں کرتی ہے جس سے بے وقوف بھی عقلمند ہو جاتے ہیں۔ کیا اس تصویرت کو اور اس اسلوب بیان کو کوئی بھی قدیم ہندی کے اظہار کی صف میں جگہ دینے پر اعتراض کر سکتا ہے۔“

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ قصول و معرفت کے بہت سے سورتوں سے خطاب کر کے واضح کئے گئے ہیں۔ دراصل یہاں یہ بھی نکتہ ہے کہ مذہبی امور سے غور سے زیادہ انی متاثر ہوتی ہیں۔ جس العشق میراں جی نے انسانی خواہشات کے سلسلے میں اہم باتیں درج کی ہیں اور ایک بڑے طے کوستا کرنے کی کوشش کی۔

میراں جی جس العشق کی ایک دوسری کتاب ”شہادۃ الحقیقت“ کی بھی اہمیت ہے۔ اس کا ایک نام ”شہادۃ الحقیق“ بھی ہے۔ ویسے باغی علی نے ”مغز غروب“ اور ”شہادۃ الحقیقت“ ہی تحریر کیا ہے جبکہ جس اللہ قادری نے ”شہادۃ الحقیق“ لکھا ہے۔ اس میں کل پانچ سو تیرے اشعار ہیں۔ یہ نظم چھوٹی بحر میں ہے اور کافی رواں ہے۔ اس نظم کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں شاعری کے حوالے سے زبان و معنی کی کیفیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بعض تشبیہوں سے اس کی اہمیت کو واضح کرنے کی سعی ملتی ہے۔ اس نظم کی بحر بھی ہندی ہے۔ تصوف کے سلسلے میں جو نکتہ اہم تھا وہ یہ کہ اس کے سر اور روز کی تعظیم کے لئے بیحد مرشد کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ عشق اور عقل کے موازنے کے چند اشعار ملے۔

جس جن سے نظم کی Spirit کا پتہ چلتا ہے:

عشق کے سن عقل پریشاں اگست اچھے راج
مادریں کھرا باز بکادے ہاندی کھرا کاج
عقل کے بنا کریں سنگھار رہے گیسو کار
عشق کے دن پریم چا کی تو اچھے ساز
بودہ کے تو پریم چا کا بے تو اچھے ساز
عشق کے تو پریم چا امیر کہنے بار
بودہ کے کی کلیا گوزیں باجیں اسی بات
عشق کے یہ کیلیا کھا: سبھی اسی کے ہاتھ
بودہ کے یوں تسلیم ہوتا تو کچھ بات رہے
عشق کے بنو دینا بھر رات یہ کون ہے

میراں کی ایک اور نظم "خوش فخر" بھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے۔ اس میں مکالمے ہیں اور یہ مکالمہ خوش اور میراں کی کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کی ایک اور نظم "مظہر غوب" ہے۔ جس میں صرف تین اشعار ہیں۔ یہ بھی سالار جنگ کے کتب خانے کی زینت ہے۔ جس کا ذکر ذرا بعد کرنے "عارف ادب اور" علی گڑھ میں کیا ہے۔ واضح ہو کہ باشم علی نے "مظہر غوب" اور "چہار شہادت" کی تفصیلات پیش کی ہیں اور ان کی کیفیت پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔

فیروز شاہ بھمنی

بھمنی سلطنت کا آخروں حکمران تھا۔ جس کا عہد حکومت نومبر ۱۳۹۷ء تا ۱۳۴۲ء تک تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بھمنی سلطنت کے عروج کا بھی زمانہ ہے۔ فیروز کا روحانی سلسلہ علم و شیخ محمد متانی سے ملتا ہے۔ اس کا لقب تاج الدین تھا جاتا ہے۔ تاریخ نگاروں میں اس کا ذکر بھی ہوا ہے کہ ایک طرف تو اسے سیاسی تدبیر حاصل تھا تو دوسری طرف علمی شغف بھی ہے اور وہ تھا۔ فیروز کو فضل اللہ علم کا شاعر بتایا جاتا ہے جو بعد ازاں تھوڑی دیر کے شاگرد تھے۔ اسے فیروز بیداری بھی کہتے ہیں جس کی تخلیق "پرست نامہ" معروف ہے، اس میں ایک شعر یوں ہے:

مجھے ہنس ہے قلب دین چہری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

فیروز نے اپنے ہم دم کی ہر ہمدرد کی ہے۔ ایک طرح سے دونوں کو سزا دی رکھا ہے جس سے ہر ہمدرد ہم ملی سے اس کی عقیدت عارف بھگت کی ہے۔ اس لئے بھی کہ ہم دم کی کی وفات ۱۵۶۵ء میں ہوئی تھیں "پرست نامہ" اس سے پہلے لکھی جاتھیں تھیں۔

واضح ہو کہ لادجی نے اپنی شہری "قلب مشغری" میں فیروز اور محمود کو گہوارات احرام سے یاد کیا ہے۔ مختلف اشعار دیکھئے:

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں
دعا دے کے چہرے سرے بات کوں
کہ فیروز محمود اپنے جو آج
تو اس شعر کوں بہت ہوتا روان
اور دیکھ علی نے "پھول بننا" میں اسے یوں یاد کیا ہے:

نہیں وہ کیا کردوں فیروز استاد
جو دیتے شاعری کا کچھ میرے داد

فیروز شاہ بھمنی فارسی کا بھی شاعر تھا۔ اس کا فارسی حکم کچھ حاصل ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے فارسی سے خاص دلچسپی تھی۔ سید احمد اور گیان چند بھی لکھتے ہیں۔

"فیروز کی غزلوں میں ہندوئی اور فارسی روایات کا ایک نیا استخراج نظر آتا ہے۔ جس میں غزلوں کا دس اور سٹاس بھی ہے اور غزل کی روایات کی جھلک بھی۔"

یوں تو فیروز کی ادبی شہرت کا "اد" پرست نامہ" ہی پر ہے لیکن ذرا بعد احمد اور مسعود حسین خاں اس کے ادبی وقار کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ بھی اس سے دکن کے لسانی مزاج کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ "پرست نامہ" میں شہرت زبان کے اثرات صاف طریقے پر نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ فارسی الاطالع بھی استعمال ہوتے ہیں۔ لہذا یہ ایک لحاظ سے سحر و اسلوب کی حامل نظم ہے جس میں مقامی اثرات تو ہیں لیکن ایک اعتبار سے ساتھ۔ یہی وہ زبان و بیان ہے جو عارفی قلب شاعر کے یہاں زیادہ گہر کر سامنے آیا۔

فیروز ایک ایسا شاعر ہے جس کے یہاں ایک عظیم خاص طریقے سے ملے ہیں۔ اس کی محبوب کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ بھی مقامی نوعیت کی ہے۔ فیروز کی غزلوں میں جنس کیفیت بھی ملتا ہے جس میں ایک طرح کے ترفیع کا احساس ہے۔ لہذا اس کے یہاں محمود یا ایک مثالی کردار بھی ہے۔ جس میں وہ مقام و اسلاف ہیں جو بعد میں اردو میں غزل کے معشوق کی ادا کیے ٹھہرتی ہیں۔ یوں بھی وہ اپنے محل میں مختلف زبان بولنے والی عورتوں کو قیامت جاکر رکھتا ہے کہ

بہر مندوں کا تعلق اس کی سلطنت میں وارد ہو گیا۔ ان تمام امور کے باوجود عسکری نظام سے خالص نہیں رہا۔ دوسرے سلطانین بھی اس کے لفظی قدم پر چلتے رہے اور تقریباً ایک صدی تک بھاپو، علم و شکست کا چھ اہم مرکز رہا۔ مصوری کو بھی فروغ ہوا۔ اس زمانے میں دسے گھراپے مصوروں پر بہت بازار تھا۔ ایرانی اور ترکی مصوری نے ان کے فن پر بھی اثرات ڈالے اور دونوں جگہ کے ادغام سے ایک نئی جمالیات نے راہ پائی۔ معماروں نے اپنی بھرپوری کوششیں کیا جس سے نئے طرح کی آرائش اور فنکاری ابھر گئی۔ گویا بھاپوری تہذیب اپنے آپ میں جھپٹ کے سرچلے میں رہی، جس پر اس زمانے کے لوگ بازار چلتے تھے تو وہ کچھ غلط نہ تھا۔

عادل شاہی یا بھاپوری تہذیب ۱۳۸۹ء سے ۱۶۸۵ء تک تو اس دور رہی لیکن پھر ۱۰ روپے ڈال ہوئے گی۔ ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے بھاپو کو فتح کر لیا اور اس سے دو درجن ہتیار کا سامان لے آئے۔ اب وہ قبضہ علی اور لکھنؤ کی صورت باقی نہیں رہی جس کے خاصہ انھیں بھاپو رکھنا ہی تھا۔ مگر یہ بھی ہوا کہ ۷۰ عام میں اورنگ زیب اس دارقذنی سے کوئی کر لیا۔ اب انگار کا ایک دور پھر شروع ہوا۔ مرتبے سر اٹھانے لگے بلکہ ان کا باغیانہ رویہ شدہ اور بیز ہو گیا۔ ابتدا میں انہوں نے بھاپو کی تمام تہذیبی صورتوں کو مٹانے کی غرض سے اور سلطنت کو تاراج اور بے باک کرنے کی تمام تر سیاسی چالیں سوڑ بنائی گئیں۔ ظاہر ہے یہ راجا علاقہ متاثر ہوا۔ جب ہی یہ احساس ہوا کہ اب یہ تہذیب بے پروا دونوں ملک قائم نہیں رہ سکے گی۔

لیکن اسی دور میں ۱۶۰۰ء کے آس پاس فن موسیقی کی ایک معیاری کتاب "کتاب نورس" سامنے آئی۔ اس کا مصنف ابراہیم عادل شاہ ثانی ہے، جس کا عہد ۱۵۸۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۶۲۵ء تک قائم رہتا ہے۔ جلال شاہی دور کے علمی امور اور ادبیات عرفیہ و حکم کے مباحثہ آگے آتے ہیں۔ ایسے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ "کتاب نورس" ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے نزدیک یہ امر ہے اس کا تفصیلی تعارف بھی کرایا ہے۔ اس کتاب کی تفصیل علی گڑھ کی تاریخ ادب اردو، جلد اول میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ابراہیم عادل شاہی دور میں موسیقی نے اپنی ترقی کی کہ اس کے مختلف طبقے پیدا ہو گئے، ہر ایک دوسرے سے بہت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ "کتاب نورس" کا امتیاز اس لئے ہے کہ اس میں منکرت اور رنج بھاشا کے الفاظ کل سے استعمال ہوئے ہیں۔ پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی تک آتے آتے دکنی ادب استحسان کی روایت میں ملتا ہے، جن میں اس کی اہم شعرا ابھرتے ہیں۔

برہان الدین جامنم

(۱۵۵۳ء - ۱۵۹۹ء)

جیراں جی حسن المثنوی کے فرزند کا نام برہان الدین جامنم تھا۔ یہ بھی صوفی تھے اور ان کے لطیف بھی۔ جامنم کے دادا نے اکبر الدین صدیقی (مصدقہ حلیہ المثنوی) کے قول کے مطابق چغتائی خاندان میں شاعری کی تھی۔ محمد حسین مظہری نے

عادل شاہی ادب

بھپتی دور کی پچاسویں اور انگار نے کئی طرح کے رد عمل پیدا کئے۔ ۱۳۹۰ء میں دوسری جنگوں لگے۔ چوں کہا جائے کہ غیر ملکوں نے اس کے انگار سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ ان کی نگاہ میں اس عہد کا آئینہ یوسف عادل تھا۔ مصوری کیا گیا کہ اگر اس کی مدد کی جائے، یہاں تک کہ اسے عکسراں باد یا جائے تو پھر بھپتی سلطنت کی رہی سہی سادہ کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ ترکوں نے اس کیفیت کو شدت سے محسوس کیا اور یوسف عادل کی بھپتی میں بچا ہو گئے۔ بھپتی سلطنت کی بعض ریاستیں یا قبائلی برہمنی تھیں یا ہذاوت کے قریب تھیں۔ ایسے میں یہاں کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا تو فوجی قوت کمزور پڑ گئی۔ نتیجے میں عادل شاہ اپنے آپ کو عکسراں بھگت لگا، یہاں تک کہ اس نے ایک طرح سے بادشاہت کا اعلان کر دیا اور جب وہ عکسراں ہو گیا تو پھر ضابطے کے مطابق اس نے اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھوانا شروع کیا۔ اب وہ "خان" بنائی نہیں رہا تھا بادشاہ ہو گیا تھا۔ مختصر یہ کہ ۱۳۸۹ء سے اس کی خیراتی ہو گئی۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ یوسف عادل شاہ فنون لطیفہ کا چھوٹا دلہا تھا اور احساس برہان سے بہرہ ور۔ اس نے اپنی سلطنت میں ایسے لوگوں کی بڑی قربانی شروع کی جو فنون لطیفہ سے وابستہ تھے۔ شعر ادب سے اس کا شغف شعرا و شاعری کے لئے اور بھپتی سبب ہوا۔ اس کی عکسراں میں شاعروں کی بڑی بڑی قربانی ہوئی۔ ان کا بھی نہیں اس سے اسے نظم ادب کا اتنا شہ و احساس ہوا کہ اپنی سلطنت کو اس باب میں مرکزیت دینی چاہی۔ دوسرا اس سے اس فن دانے جانے لگے۔ اسلامی

ان کے والد کے مرشد کی چشمتیں گوئی قلمبندی ہے کہ ان کے یہاں ایک خدا پرست لڑکا پیدا ہوگا جسے قطب القنطاری کہا جائے گا اور یہ کہ لوح چاچا جانی پر اس کا نام محمد کر لیا جاتا ہے۔ بہر طور ابو بان الدین کی جب عمر پندرہ برس ہوئی تو علوم ظاہری کو تعلیم کیا۔ اس کے بعد اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت کی اور سب علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے اسلامی علوم کے اکتساب کے بعد ہندو فلسفے کی طرف بھی رجوع کیا اور یہاں کی طرف مائل ہوئے۔ اکبر الدین صدیقی "مقدمہ ارشاد نامہ" میں رقمطراز ہیں کہ انہیں منکریت پر قہر دست نامہ حاصل تھی۔ "تذکرہ اولیائے دکن" پیچاچاری میں ان کا سال وفات (۹۵۰ھ) ۱۵۳۳ء درج ہے اور یہی سال عبدالجبار نظام پوری نے "تذکرہ اولیائے دکن" میں درج کیا ہے۔ لیکن دونوں میں بیسے کا فرق ہے۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے لوگوں نے دوسری تاریخ درج کی ہے۔ اس کی تفصیل سیدہ جعفر نے رقم کی ہے۔

"علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں تذکرہ احمد لکھتے ہیں ان کا سال ارشاد نامہ ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء کی

تصنیف ہے جو آٹھ سو دو سو کے بقول ان کی آخری کتاب ہے اور اسی بنا پر یہ کیا جاتا ہے کہ اسی سن کے قریب ان کا انتقال ہوا ہوگا۔ اکبر الدین صدیقی نے اپنے "مطبوعات اکبرنامہ" میں درجہ عیاچاری میں لکھا ہے کہ عبدالحق کے بیان کے برخلاف جامی نے ۹۹۰ھ کے بہت بعد انتقال کیا اور تحریر کرتے ہیں "کتب خاندان کی کل عیاچاری کی ایک بیاض میں کئی بزرگوں کی وفات اور اہم واقعات کی تاریخیں درج ہیں اس میں حضرت جامی کی تاریخ وفات معززہ اچھا پیشاں جامی لکھی ہے جس سے ۱۰۰۰ھ اعداد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر اسے صحیح تسلیم کیا جائے تو یہاں الدین جامی کی وفات ۱۰۰۰ھ میں واقع ہوئی لیکن ارشاد نامہ کے مقدمے میں اسی بار تاریخ کو اکبر الدین صدیقی نے معززہ جہاں چشتیاں جامی تحریر کیا ہے یعنی ۹۹۲ھ کے بجائے ۹۹۰ھ لکھا ہے اور اہل کتب کا ایک عدد کم کر کے ۱۰۰۶ھ تاریخ نکالی ہے۔ انہوں نے ایک اور تاریخ یہاں غلطی سے لکھی ذکر کیا ہے جس سے جامی کی تاریخ وفات ۹۹۲ھ اخذ کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "لوگوں ہندوؤں کے درمیان چودہ سال کا فرق ہے۔ دو مختلف تاریخوں نے شہر میں ڈال دیا۔ اگر ۹۹۲ھ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو وفات کے وقت آپ کا سن ۱۰۰۸ء ہوگا اور ۱۰۰۹ھ کو تسلیم کیا جائے تو ۱۲۲ سال کا۔"

جامی کی تصنیف دراصل رشید و ہدایت کے انوٹ سلسلے سے متعلق ہیں۔ گویا رشید و ہدایت ان کی کتابوں کی بھی عقلی زمین ہے۔ انہوں نے چھوٹے بڑے متعدد رسالے لکھ کر رکھے۔ لیکن مظلوم رسالوں میں ارشاد نامہ "یا سکھ سہیل" کی بڑی اہمیت ہے۔ ان رسالوں کا موضوع بھی تصوف اور سلوک ہی ہے لیکن ایسا احساس ہوتا ہے کہ جامی بھی یہاں جا رہے تھے کہ ان کا بیچا مابا ایمان وطن تک بآسانی پہنچ جائے۔ قیادہ بندی اور منکرت کی طرف ان کی بھی توجہ ہے بلکہ

یہ کہا جائے تو بچا نہ ہوگا کہ ان کے یہاں گہری اسالیب کا بھی استعمال ملتا ہے۔ ویسے ہر اکبرتی اور منکرت روایت جو اس وقت موجود تھی وہ بھی ان کے انہیں میں تھی جسے انہوں نے ازراہ استعمال کیا ہے۔ لکھنی دور کے یہ صوفی شاعریوں تو اپنے والد سے متاثر ہیں لیکن کئی کئی صدیوں کے فارسی کے اسالیب کی طرف بھی مائل نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی ایک لکھ جگہ ملنا جاتی ہے۔ یہ کہانہ بھی درست ہوگا کہ بعد کی صمیمیات اور بعض اصطلاحات سے انہوں نے اپنے رسالوں کو اس طرح مزین کیا ہے کہ وہ عصری خوانے ہو گئے ہیں۔ وہ ہندی اصطلاحات جو عام طور سے ملت شاعرانہ میں درج ہیں وہ ان کے رسالوں میں نظر آتے ہیں۔ "ارشاد نامہ" کے یہ اشعار دیکھئے:

| | | |
|----------------------|-----------------------|------------------------|
| اللہ سنوڑوں | پلیس آج | نکلتی جن یہ دکھ بک کاج |
| چیت کر توں کرنا | سکھوں کیرا سرجن بار | |
| زلوک رنج سرن فی | نت بھانے ہو گل گل | |
| سچ سندور بیاغا بھری | سب روکھ کھلے علم بھری | |
| دھرتی اکاس کیے چر | لیکن بیٹھے کریں چر | |
| قیامت لگ بے کریں بڑھ | تاج قدرت ہوئے کھٹ | |
| اللہ داد سرجن بار | دو بک رچا رہی اپار | |

ان کی نظم "سکھ سہیل" مشہور ہے۔ اس میں چار چار مصرعوں کے اٹھائیس بند ہیں۔ اس پر بھی بعد کی اثرات تلاش کے جاسکتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

| | |
|-----------------------|---------------------|
| سولہ میں گوبین کا بار | پال برم تو چاری |
| یو دیکھ بھوک ابھوکی | ہوٹا لوزے گیان چاری |
| ہوٹا گاٹاں | یو ایک دیک |
| سولہ تیر | آہیں ایک |
| سب سوں بھوک کریں | پاس |
| آہیں تو | کس کے پاس |
| پال برم تو | آچاری ہے |
| سولہ سحر | ناری ہے |

گویا یہاں سولہ بڑے گوبین کا ذکر ہے۔ ایک بند دو چار لائن کی تصور ہے کہ اگر بڑے گوبین کا ذکر ہر عاقل نہیں اور ان کے فراق میں حشر بربا کرتی تھیں پھر فرق کی ساری کیفیات محبت کی زبان سے اسی ظاہر کی گئی ہے جو ہندی کا۔

الوجود، ممکن الوجود، مجتمع الوجود اور عارف الوجود دہے بھی "ارشادِ نامہ" میں جو سوالات کا نام کئے گئے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر مذہبی امور سے ہے۔ جن میں کچھ فلسفیانہ امور پائے جاتے ہیں۔ جنہیں چاہیے نے عالم کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اس کا احساس دلایا ہے کہ اخلاق، تصوف اور شریعت و طریقت یہ سارے جزوِ الدن کی تعلیم و تہذیب کا قوام ہیں۔ ان کی دوسری اہم مہم "حجۃ البقا"، "وصیت الہادی"، "مصلحہ اہل ایمان"، "تہذیب کلام"، "تکلیف واحد" اور "مشکوٰۃ ریح الواصلین" اور مشکوٰۃ "کفر نامہ" اور "مساہرات خاں میان" و "بیان خلاصہ" وغیرہ اہم سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی منظوم و سائے ہیں جن کا ذکر دہلوات سے خالی نہیں۔

دراصل یہ سب کی سب تحقیقات و رشداہیات ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور بنیادی طور پر محض شعر گوئی یا نظم نہیں ہے۔ سادگی و نظم میں موسیقیت کا بھی احساس ہوتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف و مبتدعی سے خاصیت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جہم کا شمیری احساس دلاتا ہے کہ:-

"سنائی اعتبار سے جاہل گہری روایت کے بہت قریب ہیں چنانچہ وہ اپنے کلام کو گہری سے تعبیر بھی کرتے ہیں اور یہ کہ ان کی زبان واضح طور پر فارسی اسالیب کی طرف مائل نظر آتی ہے جس میں سلاست اور سادگی ہے۔"

لیکن میرزا قلی خیال یہ ہے کہ ہندی اثرات ان کے کلام پر بہت حاوی نظر آتے ہیں انہیں کسی حال میں بھی نظریات و خیالات نہیں کیا جاسکتا۔

ابن الدین علی

(۱۵۸۲ء - ۱۶۴۵ء)

شمس الدین شاہ میران دہی کے پوتے اور شاہ برہان الدین چاہم کے بیٹے ابن الدین علی بھی ایک صوفی بزرگ تھے جنہوں نے رشد و ہدایت کا خاندانی ورثہ مستحق طریقے سے سنبھالا اور اپنی چوری زندگی صوفیانہ مسلک کی تردید میں بسر کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ اسی حوالے سے قدیم اردو کی خدمات بھی انجام دیں۔

ابن الدین علی کے والد برہان الدین چاہم کا انتقال اس وقت ہوا جب یہ قسم مار میں تھے لیکن ان کی پرورش و پرورش اتنی طور پر ہوئی جس طور پر ان کے خاندان کے دوسرے افراد کی ہوئی رہی تھی۔ خصوصاً اس زمانے کے ایک بزرگ محمود غزنوی دہان نے ان کی تعلیم مکمل کی۔ چاہم کی وفات ۱۵۸۲ء میں ہوئی۔ گویا علی کی پیدائش کا سال بھی یہی ہے۔ ان کا انتقال ۱۶۴۵ء میں ہوا۔ اس باب میں محسن چاہی بد نظر از ہیں:-

"شاہ ابن الدین علی دہی ان چند بزرگ و بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کا فیض آج بھی

جاہلی ہے۔ یہاں میں شاہ برہان دہی سے دو میل کے فاصلے پر ایک بلند گہری پرستید براق گنبد کوسوں دور سے چمکتا آج بھی دعوتِ بشارت دیتا ہے۔ جس کے لیے امین الدین علی عالم ہے خودی میں جو خواب ہیں۔ اہل اپنے والد برہان الدین چاہم کی وفات کے چند ماہ بعد پیدا ہوئے۔ خوش زبان سے تعلیم و تربیت پا کر مستہ خلافت پر بیٹھے اور اس خاندانی روایت کو آگے بڑھایا جو باپ دادا سے ہوئی ہوئی خلافت کے ساتھ انہیں ورثے میں ملی تھی۔

امین الدین علی کی کلی کتابیں اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ وہ کم از کم ایک خاص نچ دینے میں شعوری کوشش کر رہے تھے۔ گویا ان کے زمانے سے قدیم تہذیب و تہذیب لہذا چاہی تھی جس میں سادگی کا مہل نیز ہو گیا تھا۔ ان کی متعدد کتابیں مثلاً رسالہ "وجود ہے"، "تکلیف واحد"، "مہجور نامہ"، "کلی نامہ"، "دوسل چہرہ"، "محبت چہرہ"، "جمع کلی"، "شرح کلامِ حبیب"، "نور نامہ" اور "رموز السالکین" وغیرہ اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی غایت ایسا تہذیبی اسلوب اختیار کرنا ہے جو لازماً زیادہ تفہیم کی صورت پیدا کر سکے۔ یہ بھی ہے کہ ایسا طرز عمل، سمجھتی اور صحتی کے یہاں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ خصوصاً تنقیدی کی "چند بدن مہیار" جو بھاپوری روایت کے حلقے کی تخلیق ہے اس کی تہذیبی اثرات علی کی "کلی الاسرار" کی مشرورہ، کمال اختیار رکھتی ہے جسے غایت تفہیم کہہ سکتے ہیں اہل علم کی صورت زیادہ چینی ہو کر سامنے آتی ہے۔ کچھ فارسی اثرات کا نام ہوتے ہیں۔

اہل سنہ و قریب اختیار کی جس میں تہذیب اور خدمات زیادہ ہے۔ ایسی تہذیب اور خدمات میں مختلف الفاظ کی کوئی تنوع نہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ امین الدین علی اپنے والد کی تہذیب کے مقابلے میں زیادہ سلاست اور دہانی کی طرف مائل ہیں۔ اس باب میں برہان الدین چاہم اور امین الدین علی کی تہذیب کا تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد حسینی نے ایسے مطالعے پر اپنی متعدد جہدیں تجویز پیش کیا ہے:-

"شاہ برہان الدین چاہم کے رسالہ 'کلیہ الحقائق' سے حضرت امین کے اس تہذیبی رسالے کا مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ حضرت امین کو مربوط تہذیب کا کس درجہ حلیہ تھا اور انہیں اپنے باپ کے مقابلے میں زبان اور اظہار پر کتنی قدرت حاصل تھی۔ کلیہ الحقائق کی زبان اکڑی و اکڑی، کاواک اور ابھری ہوئی ہے۔ جملے، کھلم، لاجورے اور غیر مربوط ہیں اور مہارتیں بیان کے تسلسل اور خیالات کی ترتیب سے عادی ہیں۔ بجز بیان کا یہ عالم ہے کہ مصنف کو قدم قدم پر اشعار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت امین کی زبان سلیجی ہوئی ہے۔ جملے چست اور فقرے درست ہیں۔ زیادہ تسلسل و شراعی سے قرینہ کا نام رہتا ہے اور وہ انتہائی ادبی و مضمون اور پیچیدہ منسلک کو نہ صرف سیدھی سادی اور مربوط تہذیبی بیان کر

تھے ہیں بلکہ معانی و مفاد ہم کے مستند کو گونے میں بند کرنے پر بھی قادر ہیں۔ چنانچہ زیر نظر رسالہ اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہنگاموں و مصلحت سیادہ کئے جا سکتے تھے۔ لیکن حضرت اشین نے اس عمل کی گہراں کو رد مصلحت کے اندر سمو کر رکھ دیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ گیارہویں صدی ہجری کے کامیاب مترنگاروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

لیکن ایسے تجربے کے بعد بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاہ اشین الدین اعلیٰ کے کام پر ہندو کی اثرات قطعی قطع ہو گئے۔ سلاست اور روانی کے باوجود ہندو اسطور کا جابجا استعمال ملتا ہے۔ لیکن ان کا مزاج وہ نہیں ہے جو ہندو عقیدے سے متصف ہے۔

یہاں اس کا بھی اظہار ہونا چاہئے کہ متر میں موصوف نے اپنا ایک مزاج پایا تو شاعری میں بھی کچھ ایسی ہی صورت پیدا کی یعنی ہر جگہ محال اور شفاف سلوک کا مظاہرہ کیا۔ میں ان کی مختلف نظموں سے صرف دو اشعار نقل کرتا ہوں جن سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو کس طرح زراں سیر نہ رکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ مسائل تصوف کے تھے یا مذہبی و مر کے لیکن اعلیٰ کمال فن سے اپنے موضوعات کو اس طرح رستے ہیں کہ معنی کا ٹیک بالکل واضح ہو جاتا ہے:

دندان مثال بھلیاں دشتاں کام کر نہیں
زیرہ دھرے نہ دیدہ غریب نہ چھوٹے کون
چاہہ زنگ کا تیرا ہاتھ خوش کوڑ
مستقل نہیں جو تیرے انگارے قتل کون
(محب نامہ)

اکمل ولایت آج مظاہرات ثانی خطا
خیر یمن حق دیگر نہ تھا یہاں بن میراں ام
علم لدن مقدور آج کئے قلی کھونف آج
اشکال مشکل حل کیا یہاں بن میراں ام
(مدح بہاؤ الدین چاٹم)

نہیں ہے غلط دوجا کوئے
اللہ سوں دیک سب کچھ ہوئے

سب سوں بنا سب ہر دیک پاس
مطلق بنا شام خاص
(تکھارا میں اعلیٰ)

نور دہی ہے جسے مطلق نور
قید و قید تھی وہ دور
نور مشاہدہ ہے جمال
برجسے نور ہے کا ہی حال
(رموز الساکین)

عبدل

ابراہیم عادل شاہ دہلوی کے عہد کے ایک دکنی شاعر عبدل کی بھی اہمیت مسلم ہے۔ جس کی "ابراہیم نامہ" ایک ایسی مشہور ہے جس میں ابراہیم کو موضوع پایا اور انہیں دارچمن دی گئی۔

عبدل کے نام کے بارے میں خاصا اختلاف ہے۔ کوئی اسے عبدالحق کہتا ہے تو کوئی عبدالحق کوئی عبدالحق، لیکن اس ضمن میں دیے دلائل سامنے نہیں آتے ہیں جس سے نام کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ ہو سکے لیکن جس بات پر اتفاق ہے وہ یہ کہ اس کا تخلص عبدل تھا۔

عبدل کے حالات زندگی بھی پر وہ غماض ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی قاطع ذکر تحقیق سامنے نہیں آتی جس سے اس کے حالات کا صحیح طریقہ پر اندازہ ہو سکے۔ ڈاکٹر "سعود حسین خاں" ذکر کرتے ہیں کہ بیجاپوری شعرا اسے جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو بولی کہتا تھا اور اپنی زبان دکنی کے بجائے ہندی قرار دیتا تھا۔ لیکن ایسی تمام باتیں بہت دور تک نہیں لے جاسکتیں۔ اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ دہلی میں گزارا ہوگا۔ دہلی کی "قطب شہری" ۱۹۰۹ء میں سامنے آئی تھی۔ عبدل نے اپنی شہری "ابراہیم نامہ" ۱۹۰۷ء میں لکھی۔ لیکن دونوں ہی مشعروں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دکنی زبان کی کر دت لے رہی ہے اور دہلی سے قریب ہو رہی ہے۔ جسے ہم ہندو بھی کہہ سکتے ہیں۔ ویسے عبدل دہستان بیجاپور کے اولین شاعروں میں ایک ہیں۔ لیکن کے بارے میں اس کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ بیجاپور میں تھا۔ دہلی ابراہیم کی دعوت پر آیا تھا۔

"ابراہیم نامہ" کی نگاشت کے وقت عبدل کے دہلی میں ایک نواہیم کی شخصیت تھی تو دوسرے پہ بھی تھا کہ وہ ایک ایسی شخصیت اس کے سامنے پیش کرے کہ اسے انعام و اکرام حاصل ہو سکے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کوئی اہم اور یادگار جزو قرار دے۔ "ابراہیم نامہ" میں دیکھو ہندو غرضتہ ہو رہے ہیں، گیسو دار کا تعارف ہے، مجھ اشعار جو رہے، کے ہیں

اس دنیا کا کوئی عجیب و غریب واقعہ نہیں ہے۔ مثلاً شاہ باجن نے ۱۲۴ سال کی عمر پائی۔ باجن کے والد ۲۰ سال تک زندہ رہے۔ گیسو سوار نے ۱۵۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس طرح حسن شوقی کا سن ۱۶۷ سال تک رہتا ہے اور اس کی وفات کا سن ۱۰۲۳ء اور ۱۰۵۰ء کے درمیان متعین کیا جاسکتا ہے۔

اس اقتباس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شوقی کی "فتح نامہ" جگت گروہ کی "نورس" (۱۰۰۶ء) اور عبدال کی "تیرا تیر نامہ" (۱۰۱۲ء) سے قدر بہتر ہے۔ لہذا حسن شوقی کی تخلیقات کو اس جگہ منظر میں رکھنا چاہئے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نظام شاہی سلطنت تک اور کس حد تک ارتقاء پذیر ہو چکی تھی اور اس کا کیا رنگ تھا۔

حسن شوقی کی دو مشیتیں ہیں ایک مشق نگار کی اور ایک غزل گوئی۔ اس کی مشق "فتح نامہ" نظام شاہ میں ۶۲۰ اشعار ہیں جسے دکن کی چلی کوٹ نے ۱۵۶۲ء کی فتح پر اس نے مرتب کیا۔ واضح ہو کہ حسن نظام شاہ شوقی کا سرئی تھا۔ نیچے میں وہ اس سے قاریابی کوٹ قرار دیتا ہے۔ حسن شوقی نے یہ مشق حسین نظام شاہ کے حضور میں پیش بھی کی۔ گو کہ اس مشق سے وہ شاہ کی مزے مٹا دیں گا خواہاں غمیرا۔ اس مشق میں دکن کے بادشاہوں کی بیادری کے علاوہ ان کے مزاج کی افکار، سخاوت، انصاف وغیرہ کو منظوم کیا ہے۔ دراصل چلی کوٹ کی جگہ رام راج کے خلاف غمیرتی ہے جسے شوقی نے غزلوں، شہزاد اور راجوں وغیرہ بتایا ہے۔

اس مشق میں غازی کے اثرات کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ بجا پوری اسلوب غازی سے اس قدر قریب ہو جاتا ہے کہ ایک طرح سے دکن کے ادبی اسلوب سے الگ ایک واضح مزاج پیدا کرتا ہے۔ حسن شوقی نے اپنے شاعرانہ کمال کے کئی ثبوت فراہم کئے ہیں۔ اس کے یہاں تہذیبیت و استعداد کا جال بچھا ہوا ہے جس سے شاعرانہ اسلوب نکھر جاتا ہے اور سخی آفرینی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کی شاعری عام طور سے رواں ہے فصاحت و فصاحت مشق میں ایک رواں اور تنگ اسلوب کا انداز سامنے آتا ہے، جو کئی طرح کے اعتبارات سے دیکھا جائے تو یہ بھی صورت ملتی ہے کہ کس حد تک ایسی شاعری اردو کے کلاسیک اسلوب کے مزاج سے آہنگ ہو رہی ہے۔

رام راج جب قتل کر دیا جاتا ہے تو قصوں ہوتا ہے کہ دیباہ غرض کے مصائب سے آزاد ہو گئی اور واقعہ ہے کہ حسن شوقی کے اشعار نے وہاں پیدا کر دیا ہے کہ حالات کی تبدیلی پر یک نظر نگاہوں میں آ جاتی ہے۔ جیل جانی نے اس صورت واقعہ کو اپنے انداز میں اس طرح لکھا ہے:-

"جب رام راج سنگھاس میں بیٹھا، اشرافیوں اور سوتے کے ڈھیر رکھے نظر آتا ہے تو مشق نگار کے جیس سے چہ چہنے والے کے اندر پہنچتا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ اس سے سخت نظر کا

الغبار کرے اور جب جنگی ہاتھی اسے اپنی اسلحہ میں لپیٹ کر سوار کے پاس بٹھاتا ہے تو اس کے دل کی کلی کلل جاتی ہے۔ موقع مل کے مطابق حسن شوقی شعری طور پر ایسے اظہار نگار ہے کہ وہ اثر پیدا ہو جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ عمل وہ پوری مشق میں کرتا نظر آتا ہے مثلاً رام راج وادہ اپنے کامد کو حسن نظام شاہ کے پاس برداشت کرتا ہے تو اس خطا میں وہ خود اس کے منہ سے ایسے شعر کہلاتا ہے۔

سو شہر دام و جال کوں اصل ہوں
سو شہر امن ماد کی نسل ہوں •

حجرت انجیز طور پر اس مشق میں ۷۰ نیات پر نظر رکھی گئی ہے۔ جنگ و جدال کی منظر کشی میں ایسے مرتل آتے ہیں جنہیں منظوم کرنا آسان نہیں لیکن شوقی ایسی منزلوں سے بھی کام لیا اور کامران گزرا جاتا ہے۔ جنگی معاملات پر اس کی نظر بعد گہری معلوم ہوتی ہے۔ فوجوں کے ملن و ہٹن اور دوسرے ذرائع جو جنگ میں استعمال کئے جاتے ہیں اس کی تفصیل اس مشق میں ملتی ہے اتنا ہی نہیں وہ جذبات کی مگائی کو یوں پیش نہیں کرتا اور کوشش کرتا ہے کہ جو احساس دلوں میں بکاتا جاتا ہے وہ بطریق حسن عمل پذیر ہو جائیں۔ بعض اشعار کی روشنی میں فردوسی کے "شہنامہ" سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ شاہ پیر راج کا راجات ہوئی لیکن میراثی خیال ہے کہ کہیں کہیں اثرات کی شدت جو فردوسی کے یہاں ہیں وہ اس مشق میں کم مل جاتی ہیں۔ اپنے اسامیہ کو منظوم کرنے میں وہ شاعری کے اعلیٰ تقاضوں کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کرتا چنانچہ تہذیب و استعداد کے علاوہ دوسری خصوصیات شوقی نے کھڑے سے خوب خوب استعمال کی ہیں۔ گو کہ شاعرانہ حواس میں وہ اپنے وقت کے ممتاز لوگوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شوقی دکنی اور غازی رواں کے درمیان ایک پلی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جہاں "فتح نامہ" غازی اسلوب کی طرف مائل نظر آتی ہے وہاں اس کی دوسری مشق "میر بائی نامہ" میں اس کی شدت ہو گئی ہے۔ دونوں کے فرق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ شوقی ایک وقت دونوں اسالیب پر کارور ہے اور دکنی اسالیب سے بھی یہ فخر نہیں ہے اور دکنی سے اس کی ایک اہم دلیل یہ ہے کہ اس نے دونوں مشقوں کا مقابلہ اور موازنہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "فتح نامہ" کسی حد تک غازی اسلوب کی طرف رواں ہے تو "میر بائی نامہ" میں دکنی تہذیب کا بھی سمیٹنے کی کوشش ملتی ہے۔

حسن شوقی نے "میر بائی نامہ" میں سلطان محمد عادل شاہ کی شادی کو مرکز نگاہ رکھا ہے۔ واضح ہو کہ یہ شادی نوابہ نظر خان کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس میں ۱۶۴ اشعار ہیں اور اس کے چار حصے ہیں۔ اس مشق میں عادل شاہ کی شادی سے غیر نکاح کر لیا گیا ہے۔ جاوید شاہ کی تصویر بھی پیش کی گئی ہے مگر دوسری مضمون کا بھی ذکر ہے۔ رسم روانی کی صورتوں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ سکھانے پینے کے طریقے سے لے کر ہیرہ خیرہ کے امور بھی سامنے آئے ہیں۔ واضح ہو کہ اس مشق

میں یہ شوق فراہم ہوتا ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کی تہذیب و تمدن یا عذبی تہذیب سے ہم درشت ہو رہی ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن سے جو کہ شاد و راحت میں ہوتا ہے اسے وہ کیا جاسکتا ہے لیکن ہماری ثقافتی زندگی میں ایسے تمام ممنوعہ مظاہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔ ہندوستانی طور طریقے غیر شادی کے مراحل میں جنس طبع داخل ہو کر تاریخ اختیار کر لیا ہے وہ دیکھائی ہے۔ آج اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے لیکن شوقی نے بہت پہلے ایسے سادے رنگ و رنگ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔

حسن شوقی نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ اس کی غزلوں میں ایک طرح کی شیرینی ہے اور یہ شیرینی ہی اس کے کلام پر جاری نظر آتی ہے۔ جہاں غزلوں میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ آج کے معیار کے لحاظ سے دور از کار معلوم ہوں گے لیکن پھر بھی اثرات میں کمی نہیں، اس کے بیان کا چارہ ہے۔ اس کی غزلیں عشق مجازی کی کیفیت سے سرشار نظر آتی ہیں۔ ان میں تصور و سالی اپنی تمام تر ایک کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی غزلوں میں واضح طور پر محبوب عورت ہے اور عاشق مرد۔ یہی وہ اہمیت غزل میں پروان چڑھتی رہتی ہے۔ اس کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو ہوں سوں تو سہارے لگے جو دھن اکھن میں
وہ پھول پرپاں سوں دھاتی دھن ہے فیدہ چمن میں
جب دھن اکھن کھڑی ہے تن ایساں پر کی ہے
تخت حسن کا چڑی ہے دل مل رہا دین میں
خوش نامک لا ستوارے سوئی دیکھ ہوتا رہے
جیوں چاند سوں ستارے دگھے ہیں سیام گھن میں
راستے تین سرنگ ہیں راستہ جوں ترنگ ہیں
کرتے ایساں میں جنگ ہیں فکھ نور کے چمن میں
مجھ شکھ دے فرماں لوچن دے ہندوستان
راستے ادھر بدشتان ستائیں دن میں
سنا الگ سو کا لا دیتا ہو تک ہوا
تھا رہے بنگالہ تیرے نین کے انجمن میں
عاشق جو مجھ پہلو پر سو یہ لکھ جو کھو دیں
میںوں فریاد رو دیں یہ باز کھن میں
رہتا ہے تجھ الٹی چاروں کی یاد شاہی

شوقی کی یہ پیاری غزلیں ہنس کے سو رہی
انگل غزل تمہاری جو سو رہے گلن میں
و اگر قصہ کا خمیری کی یہ بات حلیم کی جاسکتی ہے کہ۔

”شوقی نے غزل کا ہونے کا بیان اس میں ایسا ہی سے فارسی غزل کی دیوے کا اور نظر آنے لگتا ہے۔
لہجی بھون بھون شراب و عشق بازی زلف و رخسار قامت، ناز و اداسی شراب پیالہ مومن، کا فر،
زادہ، صبح اور زرخیز وغیرہ کے تلازمات اور تصورات اس کی غزل میں مسلسل ظاہر ہوتے
ہیں۔ اس کے یہاں غزل کا مذہب عشق بھی ہے۔ مذہب عشق کی دیکھیں روایات اور تصورات اس کی
غزل میں موجود ہیں۔“

عادل شاہ شاہی

(۱۶۳۸ء۔)

علی عادل شاہ دہلوی شاہی نسل کے تھے۔ سلطان محمد عادل شاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی پیدائش ۱۶۳۸ء میں ہوئی۔
اس کی تربیت شاہی خاندان کی روایت کے مطابق ہوئی۔ وہ شاہی خاندان کا انصاف و ارشاد بھی تھا۔ اسے استعارہ عالم بھی
کہتے تھے۔ شعرا و علم سے اس کا تعلق ابتدا ہی سے تھا اور اس سلسلے میں اس نے کافی واقفیت کم پونجائی۔ فارسی میں بھی شعر
کہتا لیکن وہ کسی کا بھی شاعر تھا۔ ۱۶۵۹ء سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس وقت سلطنت سازش کا شکار تھی۔ مغل اور مرہٹے الگ
دکن کی زمین پر قبائل ہونا چاہ رہے تھے۔ جبریت انگیز طور پر اس نے ان سب کا مقابلہ کیا اور فتح پاب ہوا۔ حالات ایسے
تھے کہ وہ علم و ادب کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ اپنے وقت کے چہ عالم و اہم شخصیات کا مل لیا شعر اور نثر و صورت کو جمع کر
دیا۔ اس کے دربار سے بھرتی ہونے والے بھی ادیب تھے۔

شاہی کسی ایک منت میں بند نہیں تھا۔ اس نے قصیدے کے بہت سی غزلیں، امرالہ کیمت اور دوسرے وغیرہ
تخلیق کئے۔ صرف اگر قصیدوں کی طرف توجہ دیتے تو اس کے یہ قصیدے اس کے دیوان میں ہیں۔ چونکہ شاہی فارسی شعرا
ادب سے آگاہ تھا لہذا اس کے قصائد کی وہی اہمیت ہے جو فارسی قصیدوں میں پائی جاتی ہے۔ قصیدہ گوئی کا انماں یہ ہے کہ
ادب پر شکر و ادب کا شکر دیکھتا ہو اور اس میں مستحق بھی ہو۔ یہ سب صورتیں شاہی کے قصیدوں میں ملتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ شاہی کے قصیدوں پر بھرتی کے اثرات ہیں۔ وہ شیعہ نہیں کرتا لیکن بھرتی کے قصیدوں سے بہت باکمیٹھا ہے۔ اس
کے قصیدوں کی غزلیں وہاں ہیں جہاں میں الفاظ ضرورت کے مطابق آتے ہیں۔ اس کا لہجہ عیسائی شکر و دہنا ہے اور وہ
شاہی دیگر دکن کو محسوس کرنے میں بڑی بھرپور کامیاب ثابت دیتا ہے۔ یوں تو اس کی شاعری کا مزاج بھی فارسی آئینہ ہے لیکن وہ
ہندوئی رنگ کو بھی کبھی فراموش نہیں کرتا۔ اس کے قصائد کے اندازہ غزلیں اور مرہٹے بھی یہ جوت فراہم کرتے ہیں۔

شاعری بنیادی طور پر مثبت رجحان رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں ایک سرشاری کی کیفیت نمایاں ہے۔ وہ ایسا ہیے پہلوؤں کی تلاش کرتا ہے جن میں طریقہ خاص ہوں۔ جمیل جانی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

”اس کی شاعری میں ایک روشن، ایک طرب اور ایک سرسستی کی کیفیت کا احساس ہوتا

ہے۔ سہلست، بہار، موسیقی، سیر، سوتا، چاندنی، رنگ، سادہ شراب و ساقی، محبوب و مہل

کے گھماپے، شاعری کی فضا میں خوشی کا رنگ بھرتے ہیں۔ یہ شاعری کا مزاج اور اس کی خاندانی

روایت کا حصہ ہے۔ اس کے دادا بھٹت گردنے کہا تھا کہ اس دنیا میں دو چیزوں کی ضرورت

ہے۔ ایک ظہور اور دوسری خوبصورت صورت۔ یہی طرز عمل شاعری کی زندگی میں رنگ بکھیرتا

ہے۔ وہ بھی حسن پرست، رنگ و شرب، موسیقی کا دلدادہ، طرب و نشاط، آرائش کا پرستار، شراب

اور عورت کا دیبا ہے۔ یہی اسے اور مشرق کی شاعری میں روشن اور طرب کا احساس چمکاتے

ہیں جو اس کی زندگی کی طرح اس کے دھڑکنے والے، اس کی تسلیات و تخیلات میں بھی ظاہر

ہوتے ہیں۔ یہاں اگلیا لیاں ہیں، رنگ و لیاں ہیں، محبوب کے ناز و انار کے جلوے اور حسن و

جمال کی دلربائیاں ہیں، یہ بھی ہے اور اصل بھی لیکن زد و کوبان، مہل کی لذت و حاصلے کے

لئے ہے۔ یہ وہی آگے میں شاعر گھس، عورت، مہل، دہی ہے اور مہل کے لئے ہجر اور ہے۔ موسم

کی بھرا کا جام شراب سے لے کر عورت کے جسم میں بچا سے ہو جاتی ہے۔ یہی شاعری کی شاعری

کا مزاج ہے۔ یہی اس کی منزل ہے اور یہی وہ طرز ہے جسے اس نے طرز شاعری کا نام دیا ہے:

پرست کی ریت سوں موبن کہے جس جس منو شاعری

نہی شہرت ہوئی بھگت میں ہماری عشق بازی کی“

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے ذہنی قصیدے میں بھی ایسا طرح کی باتیں معلوم ہوئی ہیں جو عقل سے باہر معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً قصیدہ در منسبت نامی ہیں تو حضرت علیؑ پر ہیں لیکن ان کا دیدار شاعر شراب پی کر کرتا ہے۔ اتنا ہی ہوتا ہے بھی پریشانی کی بات تھی لیکن ان کے ساتھ صرف شراب پینے بھی چاہتا ہے۔ لیکن ہے کہ یہ شراب شراب ظہور و دور اور بھی تعمیر ممکن ہے۔ سادگی تمام کیفیات کو صوفیوں کو کہا جاسکتا ہے۔ سادگی طرز قصیدہ چاروں چاروں میں خواہ مہل و مہل جو معلوم۔ دراصل شاعری کے یہاں محبوب اپنی شیرگی کے باوجود ایک ہے اور جب وہ محبوب کا ذکر کرتا ہے تو سرشاری کی ہی ہوتا ہے لیکن الفاظ ایسے استعمال ہوتے ہیں مثلاً ہے، سستی، اگلیاں، چھاپاں، پیلا، ساقی، غار ہے کہ یہ الفاظ اگر ان میں لے جائیں تو بڑی سلی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے اپنے تمام دور کو صوفیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سادگی کے دور کا ذکر ہوتا ہے۔ ”کیا شاعری“ کہتے سادہ دینے اور دکانی، حیدر آباد، شائع کر دیا ہے۔ اس کے

ملکہ و سید مبارز الدین رحمت نے بھی انجمن ترقی اردو سے ”کلیات شاعری“ شائع کیا ہے۔ ”کلیات شاعری“ مرحب رحمت ساجدہ میں چھ قصیدے ہیں۔ گنگا، تین چوٹی چوٹی شہواں ہیں، ایک گھس، ایک منمن، ایک قلعہ، ایک ربانی، ایک کھلی، تین غزوات کے علاوہ جس فرانس ہیں۔ کلیات میں مرثی، گیت اور جملہ بھی ہیں۔ جمیل جانی نے ایک قدیم بیاض کا ذکر کیا ہے جو انجمن ترقی اردو پاکستان کی ملکیت ہے۔ اس میں چھابیوں، رباعیاں ہیں جو شاعر کے کلیات میں نہیں ہیں۔

ان تمام صنفوں میں فارسی اثرات محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ غالب شاعری حکومت شاعری کے زمانے تک پونے دو سو سال پورے کر چکی تھی۔ ابتدا میں جو ہندی رنگ تھا وہ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا اور اس کی جگہ فارسی اسلوب زور پکڑنے لگا۔ دراصل اب تک اقتدار بھی بدل رہا تھا۔ لہذا کوئی کا قدیم مزاج آہستہ آہستہ جدید طرز کی طرف مائل ہو رہا تھا جس کی شہرت بعد کے شعرا میں اور بھی نمایاں ہو گئی۔ خصوصاً انصاری نے دوسرے شعرا کے یہاں۔

شاعری کے مزاج میں موسیقی ہے۔ موسیقی اس کا خاص علم ہے۔ اس کا احساس ہر جگہ ہوتا ہے۔ اس کا کام پرکشش ہوتی کیفیت دکھتا ہے، جس سے اس کی شاعری دل میں اتر جاتی ہے۔ اس کے یہاں روایتی گہما گہما ہے۔ جیسے میں پورا کلیات کا نظر مطالعہ ہو جاتا ہے۔ چند اشعار کے مطالعے سے ہی یہ ہماری کلیات سامنے آ جاتی ہیں:

آرے گاہل رخ کوں پیلا پیا کیا

تا مست ہو کے دیکھوں نکرو علی کیا

جو بن پھڑک کہتے ہیں بچا سے ہو نہیں گئے

آگے دل رجون اب بند کھول اگلیا کا

رخ دیکھ بچ پھرتا، سن مست کی بقیوں

جادے سدا بیا بچ، حسرت سوں دوتا کا

تن کے دن پودن میں بیج کی بھرا دو رائی

نہ گیا ہے بھوک بیٹھا دو دولہ بچا کا

بچا سے رات چانوں بچا بیاسوں بچوں

پیلا سچا وہی ہے بچا بات کے دیا کا

سے چور کر پیلا بچ سچ میں پادے

لہو گئی من بھلا کر اس سدا بھو گیا کا

صنعتی

حالاتِ زندگی اب تک سامنے نہیں آئے۔ لیکن ”تصویرِ تعمیر“ میں ایک باب سلطان محمد اول شاہ سے متعلق ہے اس نے یہ کچھ جاسکتا ہے کہ وہ اس کے دربار سے وابستہ رہا تھا۔

صحتی نے "فہم" میں ایک مقامی حضرت قسیم انصاری کے حالات رقم کئے ہیں۔ ان سے منسوب عجیب و غریب واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کا پاس رکھا ہے کہ روایات ساتھ نہ رہیں۔ ویسے یہ قصہ مربوط اور متوازن ہے۔ ان میں مہربانیت، مہربانیت، تعریف، عن، تعریف، محمدا علیہ السلام اور بہت تالیف کے بعد ۳۸ اشعار حضرت قسیم انصاری سے وابستہ واقعات کے سلسلے میں ہیں۔ مشنری ایک ڈرامائی انداز سے شروع کرتی ہے۔

قصہ یوں ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے سامنے ایک قانون آئی ہے اور بیان کرتی ہے کہ اس کا شوہر چار سال سے غائب ہے۔ اس کی خورش پادش کا کوئی انتظام نہیں چنانچہ اسے اجازت دے دی جائے کہ وہ عقد ثانی کرے۔ حضرت عمرؓ نے مزید تین سال انتظار کرنے کے لئے کہا۔ جب یہ مدت گزر گئی تب حضرت عمرؓ نے چار ماہ مزید انتظار کرنے کے لئے کہا۔ یہ وقت گزر کر دو عورت حاضر ہوئی تب حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی اور ایک نوجوان سے نکاح بھی بہ حرم دیا۔ نوجوان اس سے ٹھہر گیا لیکن شب بیاہت میں گمراہے کا تھپیہ کیا۔ جب وہ عورت وضو کرنے کے لئے اٹھیں جس آئی تو ایک کنیز اور دو ترائیں اٹھیں کنیز اٹھا اور اپنا نام حمیم انصاری بتایا۔ اب یہ مقدمہ مجھے سر سے ہے حضرت عمرؓ کے سامنے آیا۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ بات حضرت علیؓ کو بتائی تو انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات ان سے پہلے کہی تھی تب حمیم انصاری کو ایک دو چارٹھا کر کے لیا اور پانچویں طبق پر پہنچا دیا۔ وہ مسلسل مصائب کا شکار ہے لیکن حضرت الیاس اور حضرت خضرؑ کی مدد سے سات سال چار مہینے بعد مدینہ گئے۔ اس کے بعد حضرت حمیم انصاری کو قتل کر دیا گیا اور عورت اسے واپس کر دی گئی۔

اس قصے میں جو مافوق الفطرت عناصر ہیں ان کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ حقیقی نے کوشش کی ہے کہ واقعات منطقی طریقے پر سامنے آئیں اس طرح کہ اس پر یقین ہو۔ کردار بھی معجزہ اور محترم قسم کے ہیں مثلاً حضرت الیاسؑ، حضرت ابراہیمؑ حضرت عزراؑ اور حضرت عیسیٰؑ ان کے بعد وصال۔

قصداً لکھا ہے اور مشغولی بھی لکھتا ہے۔ اپنے خزانے کے اعتبار سے یہ مذہبی مشغولی کہی جا سکتی ہے۔

لیکن یہاں بھی اس بات کا احساس کیا جا سکتا ہے کہ دکن میں فارسی اسلوب اثر چاہے میں ہو یا نہ ہو تھا اور نیا معیار خوشی
 ابھر رہا تھا۔ یہ سلسلہ ”انرا نظام نامہ“ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ راز ہوتا جا رہا تھا۔ صنعتی نے فارسی اسلوب کو اپنا کرا لیا۔ خاص
 معیار اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے انداز میں ہے سہانگی اور برجستگی بھی ہے۔

قیسے میں عمارتیں، مناظر اور طرح طرح کی چیزیں دکھائی گئی ہیں۔ جذبات، احساسات کی بھی خوب خوب تر عمارتیں کی گئی ہیں۔

شما بول لوں توں سمجھتا کا جو خلاق ہے ظن و احساس کا

اللہ، عشقِ مولیٰ کو پیدا کیا سو اپنی محبتِ مولیٰ شیرہ کیا

زمین پر شیائیں کویا خود کر
رکھا نسل آدم کویا گزار کر

لوہا پتھر اکٹھا ہے سو مری گزریوں کیا غرق پانی میں فرعون جیروں

تخلیٰ متبع سے عالم الغیب کا تخلیٰ موعود زن ملک الاربع کا

غرض کہ مصحفی بھی ایک ایسا شاعر ہے جو اپنے اسلوب بیان کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس نے اس روایت کو بے غلطی کی کوشش کی جو آہستہ آہستہ معیارِ اردو سے قریب آرہی تھی!

نہ کہیں بہت نصیحت نہ کہیں بہت بات نہ لہجہ خدا کوئی میرے سنگات

یہ ہم جنس والوں کوئی ننگوں لے چتر سور اسراہ میرے چلے

پندرہ سو سو سوچ حال میں زکیم کر
 کلاہے خلاءے عینک کے اور

مفتی اور مفتی

$$(\|_r\|^{2r+2} - \|_r\|^{2r+4})$$

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مقیم اور متحلی ایک شاعر کے دو نام ہیں یا یہ کہ مقیم نام ہے اور متحلی تخلص۔ اس مسئلے میں دکنی ادیب کے محققین کی رائیں مختلف ہیں۔ سیدہ جعفر مرزا مقیم اور متحلی کو دو مختلف شخصیتیں سمجھتی ہیں بلکہ اکبر الدین صدیقی سمجھتے ہیں کہ مرزا مقیم نے فارسی میں اپنا تخلص مقیم استعمال کیا اور دکنی میں مثلی اور بھی "چندر دکن وسپار" کا مصنف ہے۔ ڈاکٹر محمد کمال کا یہ اعتراض ہے کہ شاعر کا تخلص مقیم ہے نہ کہ متحلی اور یہ ممکن کہ مثلی کو "چندر دکن وسپار" کا نام سے قلم کمال ہوئی ہوگی اس زمانے میں مقیم بجا میں تھا لیکن کوئی اور قلم نویس جس سے "م" "چندر دکن وسپار" کا شاعر اسے قرار دے سکیں۔ جبکہ اکبر الدین صدیقی کا خیال ہے کہ چار منہ اور دکن میں کوئی اور شاعر متحلی تخلص رکھتے ہوئے نہیں پایا جا چاور قصے کے مرزا مقیم اور متحلی کے نام سے شہرت پائی ہے۔

بہر حال، مرزا محمد تقی اور مفتی اگر ایک ہی شاعر نہیں تھا تو اس سے بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ "چندہ بدین و میاں" ہر لحاظ سے مفتی کی تخلیق ہے، جس کی زندگی کے احوال پر وہ تھاغی ہیں۔ یہ جیسے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تقی خان کی کامیابی شاعرانہ نہیں ہے "خجاندہ" اس وقت مرتب کی تھی جب تلخ بھیری کی طرف تھاغی۔

”چند روزوں میں ہمارے کاتھہ بھائیوں نے تمہیں دیکھا ہے۔ فاسم کر یہاں ایک علاقہ گودری کوٹا ہے۔ اسے اب تک۔“

نیکایک دھان ہوا صبر باں
دیا اس کوں معشوق کا دیریا نکال

ذیل میں مقبلی کے بعض اشعار نقل کر رہا ہوں جس میں معشوق کی تعریف بھی ہے اور حسن و جوانی کے کیف کا

اظہار بھی:

علائے میں سب کے پرت ہے اول
پرت عین نہیں کوئی درجا قفل

پرت بن معشوق نہیں اپنا نہیں
کہ مرنا و چیتا سمجھتا نہیں

پرت کی نئی نیت اپنی ہے
پرت سوچنے دینا جو چلتی ہے

پرت کی بھی پر کہ جس تھا ہے
وہ کے صدر کا دھڑکا ہے



قطب شاہی ادب

گوکلتھ و دور کے قطب شاہی مسلمانوں کی دلچسپ داستان ہے۔ دراصل ایک قبیلہ ترکستان کا تھا جسے قراقرم کو کیا جاتا تھا۔ اس قبیلے کے سلطان گلی کے حالات اسے خراب ہو گئے کہ اس نے اپنا وطن ترک کر دیا اور کسی طرح ہندوستان پہنچ گیا۔ اس کی قسمت نے یامونی کی اوروہ بعد میں اکن کی قطب شاہی سلطنت کا بانی ہو گیا۔ واضح ہو کہ ہماری بادشاہ سلطان محمود کو ذرا مال ہو چکا تھا اور اب چھوڑ دیا تیس وجود میں آ چکی تھیں۔ سلطان محمود کے انتقال کے بعد گوکلتھ ویش قطب شاہی ریاست قائم ہو گئی۔ یہ ۱۵۱۸ء کی بات ہے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی انقلاب ضرور ملکہ اور ریاست کیلئے بہتر ہوتا ہے بلکہ شعراء ادب میں بھی اس سے نئی روح آ جاتی ہے۔ قطب شاہی دور میں کچھ ایسا ہی ہوا۔ سلطان گلی قطب شاہ کا زمانہ ۱۵۱۸ء سے ۱۵۳۳ء تک محیط ہے۔ اس کی پچیس سالہ حکومت ایک طرح سے یادگار ثابت ہوئی۔ ایسے اس قبیلے کے چار حکمرانوں نے ۱۵۸۰ء تک حکومت کی۔

سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ استحکام سے عبارت ہے۔ ریاستوں کو فروغ ہوا، امن و امان کی افواہ قائم ہوئی۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ علوم و فنون کو کاش لکھنا حد تک فروغ ہوا۔ قطب شاہی دور کے دکنی ادب نے استقامت اختیار کی اور ایسے ادب کے گیارہ اور تھاپے ہوئے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا دور علوم و فنون کے لئے ذریعہ ثابت ہوا۔ سب سے دلچسپ امر بانی کوٹ کی جنگ ہے۔ جس کے بعد دکنی ریاستیں نہ صرف متحد ہو گئیں بلکہ ان کی قوت بھی خاصی بڑھ گئی۔ واضح ہو کہ مسلم تہذیب اور ثقافت ہمیشہ دور دراز سے ارتقا پذیر ہونے لگی تھی۔ قطب شاہی دور میں اس کا فروغ و پیدائش تھا اور اب یہ بھی ہوا کہ شمالی اور جنوبی ادیبانہ بات کے ادغام کی صورت میں بھی نکلتے تھیں۔ شاہانہ سر پرستی سے مجموعی طور پر قدیم

محمد قلی قطب شاہ

(۱۵۶۶ء - ۱۶۱۲ء)

نظیر اکبر آبادی سے بہت پہلے محمد قلی قطب شاہ نے اردو شاعری میں ہندوستانی نظری جوت چکانی تھی، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

قلی قطب شاہ کی پیدائش ۱۵۶۶ء میں ہوئی اور وفات ۱۶۱۲ء میں۔ دراصل ہو کہ جسکی سلطنت جب زوال پذیر ہوئی تو بکے بعد دکن کے دکن میں پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ظاہر ہے ان میں گونکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتیں ایسی ہیں جن پر اردو کے حوائے سے نگاہ پڑتی رہی ہے۔ گونکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کی بنیاد سلطان قلی نے ڈالی تھی، جو ترکستانی قبیلے قراتو کو کا ایک فرد تھا۔ پھر اس کے بعد جمشید گئی، سیمان قلی اور ابراہیم قلی کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ یہ سب کے سب علم دوست تھے۔ جمشید قلی فارسی کا ایک مستیر شاعر تھا۔ ابراہیم قلی جو اس کا چھوٹا بھائی تھا علم و فن سے بڑی رغبت رکھتا تھا۔ ابراہیم نے فخری ہندو سلطنت میں تقریباً سات سال تک پناہ گزین رہا تھا اور اچانک مدد سے ہی دو گونکنڈہ پر قابض ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی جو سائنسی تھی اس میں ہندوؤں سے ہمدردی کی کیفیت نمایاں ہے جس کی وجہ سے جوڑ ہے۔ مذہب کے معاملے میں بھی اسے بالآخر بی کی تائید اس کے سبب ازغدی سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی سلطنت کو Funeral فتح کیف عطا کرنے میں ایک اہم رول ا انجام دیتا ہے۔ اس نے دکنی زبانوں کے شاعروں کی پذیرائی کی اور انہیں بڑی نصرت دی۔ اس کے دو باری شاعروں میں شلو کا ایک شاعر قلی گنگا دھر تھا۔ اس کے علاوہ چنگا گئی گنگا کوئی رور اور شلو کے شاعروں کو اس کی سرپرستی حاصل تھی۔

ایسے تمام افسر سے چند ازادگان مشکل نہیں ہے کہ اس زمانے میں گونکنڈہ شعر و ادب کے لئے ایک خاص مرکز بن گیا تھا۔

قلی قطب شاہ سلطان ابراہیم کا بیٹا تھا اس کے دو دوسرے بھائی بھی تھے عبداللہ اور حسین قلی۔ قلی قطب کی ماں ثنائی عورت تھی۔ یہ کافی اثر رکھنے والی خاتون تھی۔ قلی قطب پندرہ سال کی عمر ۱۵۸۹ء میں گونکنڈہ کا تخت نشین ہوا۔ جس کی ایک مجموعہ یہاں تھا کہ قصہ بہت مشہور ہے جو ثنائی کی روح سے تھی۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب "قطب مشق" اور اس کا تنقیدی جائزہ "میں قلی قطب اور اس کا قصہ کے مشق کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے۔ ان دونوں کا مشق یقیناً تاریخی واقعہ ہے جو دکن کی مشق "قطب مشق" کا موضوع ہے۔ اسی مشق کی بدولت حیدر آباد شہر تعمیر ہو گیا۔ دراصل یہاں مشق و شاعری کی رو سے ڈالی تھی۔ قطب قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا تو حیدر آباد کا نام یہاں لگا دیا گیا۔ چار چار ہے جو حیدر آباد کی خاص چیز ہے۔ یہاں قلی کو حیدر آباد کا خطاب ملا اور اسی سبب یہاں لگا دیا گیا۔

لیکن اس کے متعلقہ اشعار محدود ہیں۔

اوپر جو حالات بیان کئے گئے ہیں اس سے خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے کہ قلی قطب شاہ سے خاصا اثر قطب شاہ کی شاعری میں مشق کی نظر کی جو خصوصیت نمایاں ہے اس کا اس میں سمجھنے سے کیا ہے۔ وہ ہندوستان کی تہذیب کا ایک ایسا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے جس کے یہاں ہندوستانی رنگ ہمیشہ حیز ہے۔ غرض اردو زبان میں وہ کبھی بھی اپنی مٹی کو نہیں چھوٹا تھی۔ دستاورد سے میں اپنی مٹی کی غور پر آکر آتا ہے۔ لہذا ہندی کی چھاپ پر چنگ نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر زور گنگے ہیں:-

"قلی قطب شاہ نے حیدر آباد میں ایک بین قومی لٹریچر میں بڑا حصہ لیا تھا اور ملک کے ہندو طبقوں کا دل میں مود بخشنے کے سلسلے میں خود اپنے باپ سلطان ابراہیم سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ اس کا لباس، وضع قطع اور معاشرت بالکل ہندوستانی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر ابراہیم کے بعد محمد قلی جیسا عسکران تخت نشین نہ ہوتا تو گونکنڈہ کا بین قومی تہذیب اس انتہائی عروج کو نہ پہنچ سکتا جس کی وجہ سے سرزمین دکن اب تک مشہور ہے۔

اس بین قومی تہذیب کے پیدا کرنے کے لئے محمد قلی نے مذکورہ خاص اسلامی عیدوں کے علاوہ اردو بھی تقریبوں اور مناسبتوں میں نوروز، ہسنت اور برسات کی تقریبوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔"

قلی قطب شاہ کے یہاں گزل، سوز، چیتے جیسے پرندے بعض نظموں میں فطری طور پر در آتے ہیں۔ لہذا اس کے کی نظمیں اپنے پرندوں کے نغمے کے بغیر نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس کی مجموعہ انہیں بھی ہندی کیف و کیم رکھتی ہیں بلکہ ہندو کی حال ہیں۔ لٹاکوئی، چپاری، جھیل، سندھ، سانولی۔ اس کی بارہ چاروں اسی طرح کے نام کے ساتھ سامنے آتی ہیں جو سب کی سب اس کی مجموعہ انہیں ہیں۔ اس کی غزلوں میں بھی سانولی، سندھ، چپاری، چٹیل، بار، چندر، گھو، سندھ، گھو، پھول، بہاری جیسے نام سامنے آتے ہیں۔ گویا قلی قطب شاہ کے یہاں ہندو اور ہندی تصورات پیش از پیش ملتے ہیں۔ محاورے، گزل یا الفاظ سب اسی رنگ میں ملے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مشہور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بہشت گھٹیاں عشق کا آ بیار
ہمیں ہے چاہہ میں ہوں جوں ستار
چٹیل کنڈن کے چاروں اٹھ چھوٹا
ہندی ہوں چھتہ بندہ سوں کر ستار

بیابان پر ملا کر لپائی پیاری
بست تھکی ہوا آگ آگ سجرا
بیکل چولی میں بھٹیں نس زینتی
عجب سورج میں ہے کیوں نس کوں خدار
بست دنت محمد سو کنڈن کمال اوپر
بجولا یا آگ کھمر کی بھارا

میں نے محمد علی قطب شاہ کے سلسلے میں "قطب مثنوی اور اس کا تنقیدی جائزہ" میں کچھ امور تصحیح کئے تھے جن کا اعادہ ذیل میں کر رہا ہوں۔

محمد علی قطب شاہ قطب شاعری سلسلہ کا چوتھا بادشاہ تھا۔ اس نے گولکنڈہ پر انھیں برس حکومت کی۔ اپنی تخت نشینی کے نو سال بعد اس نے شہر حیدر آباد کی بنیاد ڈالی۔ شیر علی بن احمد دہلوی نے اپنی کتاب "واقعات مملکت بیجا پور" میں لکھا ہے "جب سلطان نے دارالسلطنت محمد نگر گولکنڈہ کو اپنی جاہ و منزلت کے موافق نہ پایا اور اس کے حصار میں امرا و سپاہ کی سکونت کے لئے کافی مٹھی انگلی نہیں پائی تو اس میدان میں جدید شہر کی بنیاد ڈالنے کا حکم دیا، جہاں اب حیدر آباد واقع ہے۔ تھوڑے عرصے میں شہر کے علاوہ قمارات، دولت خانہ، شاہی دروازہ عالی و دارالافتادہ، خانقاہ، چاکیزہ و جلوہ خانہ، دارالخاندانہ و مسکن ہائے کارخانہ، جات و قصر ہائے اہل خدایات و جارس خانہ و جمیل خانہ و سلمہ خانہ و مطیع و مسجد جامع و عاشرہ خانہ عالی سب تعمیر ہو گئے۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد علی قطب شاہ ایک اولوالعزم بادشاہ تھا جسے تعمیرات سے خاص دلچسپی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے دربار میں علماء و فضلا، شعرا و مصنفین کی ایک بڑی تعداد تھی۔ بادشاہ نہ صرف شعر و شاعری کا دلدادہ تھا بلکہ اس ضمن میں وہ دوسروں کی رہبری کرتا تھا۔ اپنی ذاتی تخلیقات کے علاوہ اس نے فارسی اور کھنڑی زبان میں متعدد کتابیں لکھوائیں۔ اس کی موت کے بعد اس کے جانشین بھی محمد قطب شاہ نے اس کی تمام تصانیف شمع کر کے مرتب کیں۔ ۱۶۱۲ء میں اس کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب کیا گیا، چار ہزار و سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر ذرو نے یہ مجموعہ ترتیب دے کر شائع کر دیا ہے۔

محمد علی قطب شاہ نے بڑی قہدار شخصیت پائی تھی۔ اس لئے اس کا کلام بے حد درنگ اور متوجہ ہے۔ اس نے مختلف اور کثیر عنوانات پر شعر کہے ہیں۔ اس لئے اس کے کلام کا سب سے بڑا وصف خیالات کی وسعت ہے۔ جہاں اس نے قصیدہ، غزل، مثنوی اور مرعے لکھے وہیں کئی شیخی مذہبی نظمیں بھی لکھیں۔ ان کی تعداد کافی ہے اور ان کی نظمیں بھی مضامین کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔

محمد علی قطب شاہ کے کلام کا سب سے بڑا وصف خیالات کی وسعت ہے۔ جہاں اس نے قصیدہ، غزل، مثنوی اور مرعے لکھے وہیں کئی شیخی مذہبی نظمیں بھی لکھیں۔ ان کی تعداد کافی ہے اور ان کی نظمیں بھی مضامین کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔

فارسی ادب کی زندگی، حتیٰ کہ بیویوں، بچوں اور کاروبار پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ اس لحاظ سے سواد اور کھیر اکبر آبادی دراصل قلمی شہسوار کی روایت کے طور پر ہیں۔ انھوں نے اپنے بھی خیال ہے کہ قلمی قطب شاہ کو شعر نگاری میں جو کمال حاصل ہے وہ سواد اور کھیر کے پس کی بات نہیں ہے۔ یہ دونوں کی زندگی کے عرصے میں قلمی قطب شاہ کا زلیخا و نظیر اکبر آبادی سے ملتی ملندہ ہے۔ واقعی جو حیرت کی بات ہے کہ اردو کا پہلا قلمی لحاظ شاعر اس دور کے شاعر ہی کا نمونہ بن کر رہا ہے۔

محمد علی قطب شاہ کا کمال کلمات بکس اشاعت و قلمی مخطوطات کی طرف سے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد وہی کئی کے بارے میں رائے چلی پڑتی ہے اور پائے ریت کا لقب محمد علی قطب شاہ کے لئے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کلام لی سے زیادہ رنگ اور دلچسپ ہے۔ پھر اس کی غزلوں کی تعداد بھی دلی کی غزلوں سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے کلام میں جدید طرز شاعری کے مطابق نظمیں کے اسے نظیر مٹوانے موجود ہیں کہ شاید اقبال سے قبل کسی شاعر کے کلمات یا دین ان میں نظر آئیں۔ ان نظمیں میں محمد علی قطب شاہ نے اپنے عہد کی زندگی کو محسوس کر دیا ہے۔

محمد علی کارنامہ دلی سے دیر چند سال پہلے کا ہے۔ اس لئے اس کی زبان دلی کی زبان کے مقابلے میں فارسی اور ترکی ہے اس لئے انھیں یہ قلمی کا کلام اتنا پسند نہ کیا جائے جس قدر دلی کا کلام مقبول ہے لیکن قلمی کے کلام میں جدید الفاظ اور دلی مثنویات کی سطر یا چاشنی ہے اس لئے اس کی شاعری جدید شاعری کا بہترین نمونہ بن سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ جو خاصا نظم نگار اکبر آبادی کے یہاں تلاش کئے گئے ہیں وہ پیش از پیش قلمی قطب شاہ کے کلام میں ملتے ہیں۔

ملاو جی

(۱۵۵۵ء۔)

دہلی کے اصل نام کے بارے میں فیصلہ کن تحقیق سامنے آ چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کا نام اسد غلہ اور ملاو جی تھیں۔ ڈاکٹر نور الدین اختر لکھتے ہیں:-

"حال ہی میں میرے مخلص دوست اختر حسین اور ایلینز نے اس کی تحقیق کر لکھا ہے اور وہی کے فارسی دیوان کا مطالعہ کر کے ان کے منہج نام کا سراغ لگا دیا ہے۔ میرا حال اب یہ ہے کہ "شعبہ" گئی ہے کہ وہی کا نام وہی الدین یا محمد وہی الدین نہیں تھا بلکہ وہی کے دیوان فارسی کے رانیف نام کے ایک شعر:

اسم اسد اللہ جی است
آرامش و کاخہ بازار حکام است

محمد علی قطب شاہ کے کلام کا سب سے بڑا وصف خیالات کی وسعت ہے۔ جہاں اس نے قصیدہ، غزل، مثنوی اور مرعے لکھے وہیں کئی شیخی مذہبی نظمیں بھی لکھیں۔ ان کی تعداد کافی ہے اور ان کی نظمیں بھی مضامین کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔

اب مشرقی کی محاکمات نہیں۔"

وجہی نے ایک بڑی عمر پائی تھی اور اپنی زندگی چار بادشاہوں کے عہد میں گزری۔ "سب دس" مہدی خضر قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۳۵ھ میں لکھی گئی۔ اس طرح اس نے ابراہیم خلیفہ قطب شاہ، محمد قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ چنانچہ نصیر الدین باقی صاحب کا خیال ہے کہ اگر ۹۸۸ھ میں وہ بھی کی عمر ۲۵ برس فرض کر لی جائے تو "قطب مشرقی" لکھتے وقت یعنی ۱۰۱۸ھ میں ۵۵ برس اور ۱۰۳۵ھ میں یعنی "سب دس" لکھتے وقت ۸۲ سال عمر ہوتی ہے اور یہ کوئی ایسی عمر نہیں جو غیر ممکن ہو۔ اس مندرجہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لکھی کی پیدائش ۹۶۳ھ کے آس پاس ہوئی ہوگی۔

"قطب مشرقی" کا وہ بھی کی ایک گراںمایہ تخلیق ہے۔ اس کتاب کو مرتب کرتے ہوئے مولوی مہدی خضر نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:-

"ایک قیاس اس مشق کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس ملک پر دو سلطان محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے مشہور مشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ وہ واقعہ بھی عالم شہزادگی کا ہے۔ لیکن ہے ایسا جو کچھ کتاب سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔"

لیکن اگر کوئی یہ تصور رکھتا ہے کہ یہ واقعہ انسانی زندگی میں پیش آئے ہیں وہ محمد قلی کی عاشق مزاجی کے تین مظاہر ہیں اور ان کا رد پر دو متعلق محمد قلی اور بھاگ متی کے تاریخی مشق سے ہے۔"

خان رشید نے اپنی کتاب "تین مشقوں" میں بھاگ متی پر میر حاصل بھٹے کی ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ اس مشق کی بیرونی بلاشبہ بھاگ متی ہے لیکن اسے اصل نام کی جگہ اس کے خطاب مشرقی سے یاد کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں چند اسباب کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:-

(۱) چونکہ بھاگ متی یا بھاگ دینی محمد قلی قطب شاہ کی ماں کا اصل نام تھا اور وہ بھاگ متی سے مناسبت لیا اس لئے احترام اس اصل نام کو متبادل نہیں کیا۔

(۲) خرد قلی قطب شاہ بھاگ متی کے اصل نام کی جگہ اس کے خطاب مشرقی اور حیدر گل کو ترجیح دیتا تھا۔

(۳) قطب کی نام نہایت سے مشرقی زبانہ قریب ہے۔ بھاگ متی میں وہ بات چیت نہیں ہوئی۔

(۴) افراد مشق عطاوار، زہیر، مہتاب، عمر لکھنؤ وغیرہ سب سادوں کے نام ہیں۔ اس لئے قطب کے ساتھ مشرقی کا ذکر زیادہ موزوں رہا ہے۔

یہ سارے دلائل وزنی ہیں۔ اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ مشرقی کے پردہ میں بھاگ متی ہی ہے۔ اردو کی اکثر مشقوں کی ابتدا خراب کے احوال سے ہوتی ہے لیکن مشق "قطب مشرقی" میں قلی قطب شاہ کو خواب۔ وقت کی راسخی معلوم ہوتا ہے۔ خواب کے بعد ہی قصہ آگے بڑھتا ہے۔ جس کا خلاصہ مولوی مہدی خضر کی زبانی یہ ہے:-

".....محمد قلی قطب شاہ کے باپ ابراہیم قطب شاہ کے کوئی بیٹا نہ رہا تھا۔ آخر چاہا ہوا۔

بڑی غرضیاں منائی گئیں۔ داد و دخل کی محنتی زمانے کے رواج کے موافق تعلیم دی گئی۔

شہزادے نے ایک روز خواب میں ایک ناز میں کو دیکھا اس پر عاشق ہو گئے۔ اب جو کچھ کہی

تو نظروں میں وہی ماں تھا۔ روز بروز حالت خراب ہونے لگی۔ بہت کچھ کھایا کیا کچھ اڑت

ہوا۔ آخر ان کے ایک خیر معور عطاوار پر سے سارے سامان کے ساتھ اس ناز میں کی حفاظت میں

نگاہ راستہ میں بڑی بڑی مصیبتوں اور آفتوں کا سامنا ہوا۔ غرض ایک بہت خواں طے کر

کے نکال پھینچا۔ جہاں کی وہ رہنے والی تھی۔ وہاں میں بہت ہو جاتی ہے اور شہزادے صاحب

اسے لے کر گھڑا آتے ہیں۔ جہاں بڑی اصرار و محنت سے شادی ہوتی ہے۔"

مشق "قطب مشرقی" میں ایک مرکزی شخصیت ہے اور کی ایک طرح شخصیتیں بھی ہیں۔ لیکن وہ بھی کوئی اور نگاہی پردہ میں نہیں ہے۔ مشق کے اکثر کردار ایڈز ہیں اور برجہ ہر حال میں یکساں رہتے ہیں۔ ماحول کے تغیر و تبدل کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے یہ چند وسعت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت چکرا نہیں ہے۔ اس لئے یہ کردار غیر قطری اور مہموی بھی ہیں۔ واقعات و حادثات ان پر اثر قائم نہیں کرتے بلکہ یہ خود ماحول اور فضا پر مسلط ہونا چاہتے ہیں۔

مشرق کی کا کردار بھی بڑا اعلیٰ معلوم ہوتا ہے۔ وہ شہزادی ہے لیکن جوانی کی دیوانی انگلیں اس پر طاری ہیں۔

مشرق کی کے کردار کا روشن پہلو ملازم سے اس کا حسن سلوک ہے۔ یہ ملازم بہت وقت اس کی سبکی، اس کے

نگہ نگار ہے۔ وہ مشرقی کے سارے راز سے آگاہ ہے اور اسے وقت ضرورت سے نصیحت کرتے سے باز نہیں آتی۔ مشرقی

یہاں بڑی حمید و معلوم ہوتی ہے۔ ملازم کے دل کو نہیں لگا۔ اس کا شیوہ نہیں لگتا۔ اس کا راز دہنے سے پرہیز ہے۔

لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے ملازم کی کے امتیازات نمایاں ہیں۔ وہ بھی نے اپنی مشق میں تکیہ کیا ہے۔ استدعا سے

کا کائنات جال بچھا دیا ہے۔ اس کے یہاں تعلیمات و استعدادات کے استعمال میں بڑی کامیابی ہے۔ وہ بھی نے بھی چیزوں

میں ممانعت کے لئے اپنے ذہن کی غیر معمولی قوت اور متراع سے کام لیا ہے۔ مطلق اور غیر مرزوما خیالات کو ہم آہنگ

کرتے ہوئے وہ بڑی لڑکا رانہ صفائی سے کام لیتا ہے۔ ذہن کی پلیدی فکر کی کیرائی اور جوانی کے مطلق اور سب کا امتیاز میں

بھی کوئی دکانی کھانا سلاک پیدا کر لیا ہے اور یہ کھانا سلاک شعر کے پیکر میں آتی خوبی سے پیدا کیا گیا ہے کہ ان کی بے بدلی کا کوئی احساس تک نہیں ہوتا۔ مثلاً:

چھٹا مین اس کہیں کالے سے

کہ کھنڈیاں دو سبزیاں ہیں جالے سے

یہاں بھری زلفیں شاعر کے ذہن میں جال کا تصور پیدا کرتی ہیں۔ جن میں دو آنکھیں اسیر ہیں اور یہ آنکھیں زلفوں میں پھنس کر جال کی کھنڈیاں معلوم ہوتی ہیں، یعنی کالے بالوں میں دو آنکھیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے دو پھلیاں جال میں پھنس گئی ہوں۔ یا پھر:

دسے چنگی یوں تازی اکھ میں

کہ بیٹھا بھنورا ب کی پھنک میں

معتوق کی آنکھ وہی کے لئے ہم کی چھانک ہے اور چنگی اسے بھنورے کا تصور دیتی ہے۔ گویا محبوب کی آنکھ کی تکیا لگی گئی ہے جیسے ہم کی چھانک پر بھنورا بیٹھا ہو۔ خیال کی فراغت کی جس قدر بھی داد دیں کم ہے۔ ایسے ہی موقع پر دہی کا قہار درست معلوم ہوتا ہے کہ:

بھر مدد اس کو کہیا جائے گا

جو کوئی اپنے دل سے نوا لے گا

دہی کی تشبیہات کی دہا پر چنگی بھری ہوئی ہے۔ اس کی عقلی صلاحیت تمام گوشوں سے اپنے بولے لئے آب و گل تلاش کر سکتی ہے۔ چاہے وہ جبریل کا معنی ہو کہ اسرافیل کی تسبیح کے دانے دہی کے لئے تمام تراشیاں شاعری کے حدود کے اندر ہیں۔ جنہیں وہ اپنی پلندہ کے مطابق استعمال کر سکتا ہے:

دلچل اس مصلے ہے جبریل کا

سے مل تو جو سراپاں کا

معتوق کے تقدس کے اظہار کیلئے اچھی تھی یہ کسی پلندہ کا شاعر کے ہی پس کی بات ہے۔ بحر لطف کی بات تو یہ ہے کہ ایسی دور از کار تشبیہات اشعار میں استعمال ہو کر مزید کشش بخشتی ہیں۔ دہی نے اپنی قوت اقتراض سے انہیں نہ صرف قابل قول بنا دیا ہے بلکہ یہ بات کو یاد ہے کہ ذہن اگر ساتھ دے تو غیر شاخراہ امور دہی اشعار کے پیکر میں دلچسپ بن سکتے ہیں۔ دہی کی کامیابی اس بات کی دلیل ہے کہ تقدس مضمون بذات خود اچھی اہمیت کی چیز نہیں تھا اس کے حسن ادا کا پہلا اہمیت رکھتا ہے۔ دہی کی نئی جہتیں شاعری کی حدود کو وسعت دیتی ہیں اور شاعر کے احاطہ اظہار کو وسیع بناتی ہیں۔

۱۱۷ آریاں یوں سو من گال ہے
کہ سسلی کی چوہ چھاؤں گال ہے
آنکھ کے دوہے بھنوریں لگی گئی ہیں جیسے قوت کے سر پر طرہ

انگلیاں پر بھنوریں چھند سوں چھائے ہیں
کہ نکالیں سرال پہ طرے گالے ہیں
چوہ شمیم سے زلفیں ہے۔ بلکہ پھولوں نے گلاب سے مزہ جوئے ہیں:

چمن تر د شمیم کے ہے آب سوں
کہ سوں دھوئے ہیں پھول گلاب سوں
پینچ پر چوٹی نہیں ہے، بلکہ تختی پر خدائیت کا اللہ ہے:

رہی چوٹی یوں بیٹ پر صہب سوں ؟
پٹی پر اچھے نیوں الف ٹٹ کا
معتوق کھڑے پر سوار ہوتی ہے تو اس کی کئی تشبیہیں دی ہیں۔ جیسے دھونکی میں روٹی یا رنگہ رنگ کا گے سر پر من باجیسے کوئے پر مور بیٹھا ہو یا جیسے اندھیری رات میں مغل:

ہوئی سار شہرگ رنگ ہر دو پار
دھونکی میں اچھی جیوں ٹھٹٹا اچھا
ہم جھنگے جھت سوں ناگ
کہ طاؤں بیٹھا، مگر کاگ ہے
سو شہرگ رنگ ہے اچھے ناروں
کہ مغل : سے رات اندھاری میں جیوں
مرد و عمار سے اتنی جار یک جگہ گواہوں کا مسکن تصور کر لیا ہے:

دیکھی گرد اند کا ہے ہے غار
کہے جو اچھا اس اپنے کا ہے غار
شیر اور ہر شکاری کے ملاپ کو دور سعد ساعتر کا گانا گایا ہے:

ایدرنی شہتہ او دھرنی دہار
دور دور سے وقت آ لے ایک غدار

کرشن مشر کے متعلق مسکرت ناکہ پر بودہ چند روئے کو قرار دیتے ہیں۔ جس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ دہری گنگہ بنے جانے سے بھی بتایا ہے کہ بودہ چند روئے کے اثرات دور رس رہے ہیں لیکن جاوید و شفقت اس تحقیق کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ قاضی نے ”قصہ حسن دول“ رقم کیا تھا لیکن ہے کہ وہ بودہ چند روئے سے واقف ہو لیکن اسے اس کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ عید الحق اور نور السعد آخر دونوں ہی اسے قاضی کے ”قصہ حسن دول“ سے بغض ہاتھ ہیں۔ میرزا دانی خیال ہے کہ عداوتی کے پیش نظر کرشن مشر کی کتاب دہری ہو یا نہیں وہی ہو لیکن اس کا اصل دہری ہے۔

”سب دس“ ایک نمٹیلی قصہ ہے جس میں حکم از حکم لے کر دار ہیں۔ ۴ استقامت کو بھی ذکر آیا ہے۔ دل اس قصے کا ہیرو ہے جو بادشاہ بھی ہے اور شاہاب کا سوا لا بھی۔ یہ اپنے بچے کو اس حد تک ادا ہے کہ اس کے بچے پر شہر دیار کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حسن پرست بھی ہے اس لئے غزوئے سلطان حسن کے قریب میں اس کے پیچھے گھوڑے اٹال دیتا ہے۔ چاہہ تو قن میں قید ہوتا ہے۔ حسن اس کو گھنٹن رخسار سے نکال تو لیتی ہے لیکن جدی خانہ میں ڈال دیتی ہے۔ وہاں سے نکال کر رقیب اسے بھر اس کی کوٹ میں بند کر دیتا ہے۔

حسن بھی ایک کردار ہے بلکہ انکسٹیت مرکزی ہے۔ بحیثیت ہیروئن اس کی خوبیاں بے شمار ہیں۔ یہ عشق کی بنی ہے اور آپ حیات پر اس کا عمل فعل ہے۔ دل پر عاشق ہو کر اسے کسی طور بلالیتی ہے۔ عقل اور دل ہنجر کے ساتھ شہر دیار کی طرف بڑھتے ہیں تو حسن اپنے باپ کا انکی خیر بچاؤ دیتی ہے۔ جس اس جنگ میں شریک ہو جاتا ہے۔ جنگ آگے بڑھتی ہے تو خانہ کی بد سے اپنی بھڑاکو بڑا لیتی ہے اور اپنے کمان و بار بال کو بڑھاتا ہے۔ اس کی کمک پر بچھو دیتی ہے لیکن جب دل دنگ ہوتا ہے تو وہ اچھائی کرب کے عالم میں ہوتی ہے۔ آخر اس کی رنج ہوئی ہے۔ جب دل کو بچاؤ قن میں بند کرنی ہے اور وہاں اس لئے اس کے پاس بھیجتی ہے کہ وہ بچھائے۔ قید لاکھوں کا انتقام دیتا ہے لیکن پھر جب دھار سے دیتی ہے تو وہ قصہ سے بھر جاتی ہے اور دل سے اس دھم بڑھائی ہو جاتی ہے کہ اس سے مزاحمتی ہے۔ خیر اسے حقیقت حال سے واقف کراتی ہے تو وہ اپنے محبوب سے مصفاہ طلب کرتی ہے۔ اس طرح انسانی فطرت کی کرداریاں بھر جاتی ہیں اور سارے کردار اپنے کام میں با اثر نظر آتے ہیں۔

لیکن یہ سارے کردار نمٹیلی ہیں اور اس حقیقت سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے کرداروں کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ دل دراصل قالب ہے یعنی صوفیانہ قالب، آپ حیات میں شریعت ہے یا بچا کا سر جب ہے، حسن جل وادہ ادا دہری ہے، دل سا لگ ہے، عشق اور منطق ہے، شہر دیار دہری اور انکی کاؤ رید ہے۔ عقل منطقی تصور کا ایک ٹکڑ ہے، جب کہ منطق مشرقی کا۔ ناز حسن کا خاصہ ہے، خیر الخیر ہے، فکر جاسوس ہے۔ فز و طریقہ اعتدال ہے۔ وہ غمزدہ رہنے کی علامت ہے، شہر تن انسانی وجود ہے۔ چاہہ تو قن بھر و فراق ہے۔

یہ ساری علامتیں میں نے عمل نمونوں کی ہیں بلکہ مختلف نکتے والوں نے اسے اپنے اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جی نے اس کی وضاحت کی ہے کہ اردو نثر کی ابتدائی صدیوں کی تاریخی میں روشنی کے چکار کی طرح سب خصوصیات اور مضامین اور طبع و ادب ہے۔

اسکا نام اور اچھائی نمٹیلی میں بھری پڑی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی تفسیرات و استعارات کا بارشاد ہے اور وہ انکس جس طرح چاہتا ہے بڑی آسانی سے اپنے مصنف میں لے لیتا ہے۔

ملا دہی اپنے وقت کا ایک ممتاز اور کامیاب شاعر تھا۔ اس لئے نثر کی تعمیر کے بارے میں اس کا ایک سوچا سمجھا موقف ہے۔ اس نے ”قلمب مشرقی“ کے اکبر اخبار پر ”مشتعل ایک باب“ اور ”شرن شعر گوید“ میں اپنے نقد نظر کی وضاحت کی ہے۔ یہ توضیح اپنے طور پر اچھی نمٹل ہے کہ دہی کو شاعری کا ایک مستند عالم تسلیم کر لینے میں تامل نہیں ہوتا۔ شعر کے جواہر صاف حید وہ جس کے تسلیم کئے ہیں وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں اور ہر ماحول اور ہر زمانے کے لئے کامل قبول ہو سکتے ہیں۔

ملا دہی کی نثر کی کتاب ”سب دس“ بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اول اول مولوی عبدالحق نے اسے دریافت کیا تھا اور ۱۹۳۵ء سال ”اردو“ میں اس کتاب پر سیر حاصل مقالہ لکھ کر کیا تھا۔ پھر یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد تو اس کے مسلسل ایڈیشن چھپتے رہے ہیں۔ ”سب دس“ میں ایک دیباچہ بھی ہے جس کی اپنی اہمیت ہے۔ دہی نے حمد و ثناء، منقبت کی روایت جواب تک چلی آئی تھی اسے برقرار رکھا ہے۔ دہی کے حمد میں کبیر اس کا ایک مشہور رو پائی ہے:

پائی تھی سو کھوئی بھی چنڈت بھیا نہ کوئے

انکھی انچھ پریم کا بھیرے سو چنڈت ہوئے

یہ شعر تو جس بھی مشہور ہے:

پوچی پوچی پوچی ہنک مو پندت بھیا نہ کوئے

دھالی انکھ پریم کا چڑھے سو چنڈت ہوئے

سوال یہ ہوتا ہے کہ دہی نے قصہ حسن دول کو نثر میں منتقل کیا۔ حالانکہ وہ خود گوگنڈ کا عظیم شاعر تھا۔ جس کی تفصیل اور پوچھی ہے۔ ملا دہی نے اس کتاب کی اہمیت کو چند الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:-

”اس کتاب کا ناول سب دس سب کو پڑھنے والے ہوس بول بول کرں چڑھے اس یادگار ہو

اچھے گویا جس کی لاکھ برس۔“

اس دہی نے تعلق کی بھی ایک صورت پیدا کی ہے اور کتاب کی تعریف میں بے شائبہ لکھا ہے۔

ایک جھٹ چلی آ رہی ہے کہ ”سب دس“ کا موازنہ کیا ہے اس لئے کہ دہی نے انکس بھی اس سوال کو پھر اسی نمٹلی۔ دراصل اسے ایک قصہ محمد بنی ابن سبک قاضی شہر دیار کی فارسی نمٹلی ”دستور عاشاق“ اور اس کا خلاصہ ”قصہ حسن دول“ اور ”شہر دیار“ میں مل گیا تھا اور اس نے اپنے طور پر اس میں رنگ بھرنا شروع کر دیا۔

انتہاکر دبا لہذا وہ ایک ممتاز شاعر کی صف میں آگیا۔ یہ پہلیوں کی صدی کے شاعر کی بات ہے۔

غواصی نے اپنے دیوان کی ترتیب میں خاصی توجہ کی۔ سلطان محمد قطب شاہ کے وقت اس کی شاعری کافی اہم بن چکی تھی۔ یہاں تک کہ اسے عبداللہ شاہ قطب کے عہد شاہی میں تقرب حاصل ہو گیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ غواصی نے محمد قطب شاہ کی زمینوں میں غولیں بھی چیں جو اس کا ثبوت ہے کہ وہ شاہوں سے قریب ہو گیا تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ سید شاہ ابو الحسن حیدر خان اس کے ہر حقے لیکن اس بات کی تردید بھی کی جاتی رہی ہے۔ غواصی نے خود اپنے دور میں اس شاہ سید شاہ حیدر ولی اللہ کو اپنا مرشد قرار دیا ہے۔ غواصی کے کلیات میں اس کے اشعار سے ملتے ہیں۔

غواصی کہیں اپنے آپ کو غواص بھی کہتا ہے، اس کے علاوہ غواصیہ بھی۔ بہر حال غواصی اپنی شاعری کے طفیل اہمیت حاصل کر چکا تھا اور یہاں تک کہ وہ انتظام سلطنت میں بھی داخل دینے لگا۔ وہ محض ملک اشترانہ کا حکمراں کی حیثیت امور سلطنت کے ایک اہم رکن کی ہو گئی تھی۔ اس کے قصائد میں یہ باتیں ابھرتی ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ نے بطور علیہ اسے ایک کاؤس بھی دیا تھا غواصی آخری دنوں میں تبارک الدین نامہ لکھا تھا۔

غواصی نے کلیات تو چھوڑ دی ہیں مگر اس کے علاوہ اس کی تین مشنوں ہیں ”مناجاتی“ ”سیف الملوک“ ”دلچ انجمال“ اور ”طولی نامہ“۔

”طولی نامہ“ میں اس نے عبداللہ شاہ کی مدح کی ہے جب کہ ”سیف الملوک“ ”دلچ انجمال“ محمد قطب شاہ کے عہد کی تصنیف ہے۔ اس میں بھی بادشاہ وقت کی مدح میں اشعار ہیں۔ عبداللہ شاہ اس قدر چاہتا اور ماننا تھا کہ اسے ”نصابت آواز“ کا لقب بھی عطا کیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ ملک اشترانہ میں پایا گیا تھا۔ غواصی کی عظمت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ اس کا ذکر شاہی چند میں بھی ہونے لگا تھا۔ قائم میر اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی مشنوں پر نگاہ ڈالی جائے۔

ایسا محسن ہوتا ہے کہ ”سیف الملوک“ ”دلچ انجمال“ میں شاہ وقت کی مدح ہے:

جو سلطان محمد اللہ آفاق میر

ملکین شہنشاہ گردوں سرور

چندوں چوہوں خسروی برج کا

امروک دن حسن کے رنج کا

ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عبداللہ شاہ قطب کے عہد میں لکھی گئی لیکن اس کے پیش رو سلطان محمد قطب شاہ سے بھی اس مشنوی کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ مشنوی کا ایک مخطوط ”سالار جنگ“ میں محفوظ ہے جس میں شاعر کا مودعہ سلطان عبداللہ شاہ بلکہ قطب شاہ ہے۔ مخطوط شعر ہے:

کہا جاسکتا ہے کہ ”سب دس“ ایک غیر معمولی کتاب ہے، جس کی مثال ملتی محال ہے۔

دعویٰ کی نظر کافی دلکش ہے۔ اس میں ایک طرح کی موسیقی پائی جاتی ہے۔ جسم کا خمیری نے اس کے اندر ”سرخ طہوری“ جیسا عالم آباد پر دعب آہنگ تو محسوس نہیں کیا ہے لیکن اس کے لہجے کی مٹھاس اور سلاست کی تعریف کی ہے۔ دعویٰ کے سلسلے کی قد وے تفصیل کا اختتام اپنی تاریخ میں دواں طرح کرتے ہیں:-

”دعویٰ کی وفات سترہویں صدی کے درج سوم (۱۶۹۶ء-۱۶۹۷ء) کے دوران میں ہوئی ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب قطب شاہی کا گولڈن واک آدب کے سہری دور سے گزر چکا تھا۔ محمد قطب شاہ اور دعویٰ جیسے بلند مرتبہ شعرا کے کلام سے گوشت و اپنی ابھرتی ادبی روایات کا سفر پورا کر چکا تھا۔ دعویٰ کی تالیف ”سب دس“ اس عہد کا حاصل قرار پائی تھی۔ ”سب دس“ لکھا گیا شعر کا اہم ترین نقش بھی جاتی تھی۔ یہ دہائی کتاب ہے جس کے بارے میں محمود شیرانی نے لکھا تھا کہ اس تالیف کو اردو زبان کے ساتھ دہائی نسبت ہے جو مقامات دعویٰ کو عربی کے ساتھ اردو مقامات حیدری کو فارسی کے ساتھ ہے۔ قطب شاہی دور دعویٰ کی وفات کے بعد بھی کچھ مدت تک جاری رہا۔“

غواصی

غواصی کا پورا نام شیخ حسین بہاؤ الدین اور غواصی لکھن تھا۔ دراصل یہ پورا نام ثقافت مرزا نے اپنے ایک مضمون ”ملک اشترانہ غواصی اور اس کا کلام“ جو رسالہ ”دورہ کراچی“ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا میں رقم کیا ہے۔ لیکن بعضوں نے اس کی تردید بھی کی ہے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ نصیر الدین ہاشمی بھی اس خیال کو رد کرتے ہیں کہ غواصی کا نام بہاؤ الدین تھا۔ لیکن ”سارخ آواز“ پر دھیر سید مظفر پر دھیر تپان چند جین میں ہے کہ:-

”مالک الحداد کو اپنی تحقیق کے دوران میرا ان قصائی کا لفظ ملنے پر لکھا ہوا عربی مخطوطہ نصابت الاحساب جلد اول دستیاب ہوا ہے جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا غلہ ہے۔ اس مخطوطے کے کاتب خود غواصی ہیں۔ انہوں نے میران بھٹائی کی انصابت الاحساب کو جو عربی میں ہے فتح کے بجائے تنقیص میں تحریر کیا ہے۔ ترجمے میں غواصی نے اپنا نام شیخ حسین بہاؤ الدین انصابت غواصی تحریر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ غواصی کا نام شیخ بہاؤ الدین لقب غواصی کنیت اور دھیر لکھن غواصی تھا۔“

اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کی پیدائش ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں ہوئی۔ ابتدائی حالات متعین نہیں مگر دے یہاں تک کہ بے حد معمولی سلاست اختیار کر لی ہوئی لیکن ابتدائی سے شعر و شاعری کے باب کے سلسلے میں کافی

سو سلطان عمر قلعہ شاہ گھن بھید
جنگ آدھا رہے ہو دھک دست گیر

یہاں لفظ ”گھن بھید“ عمر قلعہ شاہ کیلئے ہی ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ بعد میں اسے بدل دیا گیا اور عبداللہ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے وہ اشعار رقم کیے گئے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کی تصنیف کا سال ۱۶۱۹ء بتایا جاتا ہے۔ اس کا قصہ ”الف لیلیٰ“ سے ماخوذ ہے لیکن غواہی نے اسے اپنے طور پر رتا ہے۔ ترجمے میں غواہی نے اپنے تخیل اور احساس ہر حال کو بدیع اہم استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے واقعات موثر ہیں۔ قصہ گوئی میں کوئی بھول نہیں ہے اور دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ اس میں شکرت کے حسین مزاح بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ جہاں جنگ کا مظہر نام ہے وہ کسی حد تک پیکا معلوم ہوتا ہے۔

غواہی کی دوسری مثنوی ”طوطی نامہ“ میں چار ہزار سے زیادہ آیات ہیں۔ یہ ۱۶۳۶ء میں فی الدین غلشی کے فارسی طوطی نامے سے ماخوذ اور ترجمہ ہے لیکن اس میں بصری الفاظ کافی پائے جاتے ہیں۔ ہر لحاظ سے دونوں مثنویوں کی قطعاً اسلامی ہے۔

غواہی کی تیسری مثنوی ”دینا ستوتی“ ہے۔ اسے ”چندالورک“ بھی کہتے ہیں۔ سب سے پہلے تعمیر الدین ہاشمی نے دریافت کیا تھا اور انگریز غلام عمر خاں نے رسالہ ”قدیم اردو“ جلد اول ۱۶۶۵ء میں اسے شائع کیا تھا۔ اس کی کہانی کسی لوگ کھاپڑی جی ہے۔ بشمول زاکر پرکاش مونس اس کا ایک ”دینا ستوتی“ میں اور دوسرا ملاوا کی مثنوی ”چندرائن“ میں اپنا گڑ کیا گیا ہے۔ ایسے لاکھ گوئی چند رائج اے ”چندرائن“ سے ماخوذ قاتے ہیں۔ ”دینا ستوتی“ کی کہانی کو فی مقبول تھی۔ شری رام شرما کی جلدی کا ساچہ سنو ۳۹۹ میں اس کا اظہار کرتے ہیں کہ براہمن نے اپنی کتاب Folk song of Choleesagari میں ”چندرائن“ کے دس مختلف روپ سامنے لائے ہیں۔ چھتیس گز مٹی میں لورک کی کہانی میں لورک دھوئی ہے۔ غواہی کی دینا ستوتی لاکھ کی چندرائن کی نقل نہیں ہے بلکہ اس کا قصہ مرادھن کی دینا ستوتی سے منسلک تھا ہے۔

غواہی کی یہ مثنوی ہر لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا ہندوستانی ماحول بڑا پرکشش ہے۔ دکائے جست اور راست ہیں کہیں کہیں ہمدردی کی زبان بھی ایک خاص انداز سے برتی گئی ہے۔ اس میں اولیٰ چاشنی بھی ہے۔

غواہی کی مثنوی ”طوطی نامہ“ اصلاً غلشی کا ”طوطی نامہ“ ہے جو فارسی میں ہے۔ غواہی نے خود اس سے استفادے کا اعتراف کیا ہے:

ہوئے حضرت غلشی جج مد
دیا میں اسے تو رواج اس سند

غلشی کے طوطی نامے کا ایک نسخہ ڈاکٹر حسین لاہوری کی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی ہے۔ ویسے یہ بات یاد رکھنی

صرف بارہ کا انتخاب کیا تھا۔ گویا غواہی کے یہاں بھی یہ بارہ کہانیاں ہی ہیں۔ ”طوطی نامہ“ کو غواہی کی شاہکار مثنوی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں سب سے پہلی ”ساوگی اور روانی بدیع اہم موجود ہے۔ اس ضمن میں بھٹی اور لکھتے ہیں:-

”طوطی نامہ“ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی غواہی کے آخری زمانہ کی تصنیف ہے۔ اس کو شہرت، عزت اور وہ تمام دنیاوی مراعات حاصل ہو چکے ہیں جس کا کبھی وہ آرزو مند تھا۔ شاید اسی لئے وہ دنیا کی بخش و عشرت اور دولت و ثروت سے بیزار نظر آتا ہے اور دنیا سے کنارہ کشی و تقاضا پسندی اور عشق الہی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ وہ دنیا کو ایک ایسی دو شیزہ سے تشبیہ دے گا کہ جس کا ایک ہاتھ لوٹا ہوا ہے اور دوسرا ہندو سے چا ہوا ہے۔ ”طوطی نامہ“ غواہی کی شاہکار مثنوی ہے۔ ”دینا ستوتی“ کی طرح یہ مثنوی بھی خالص ہندوستانی قصہ پر مبنی ہے۔ ”طوطی نامہ“ میں ایک ایسی کشش موجود ہے جس سے ہر شخص ہر زمانے میں لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اس مثنوی کا شمار دنیا کی اعلیٰ ترین ادبی کتابوں میں کیا جاسکتا ہے۔“

غواہی کے دلیان میں نظم و نثر اور دستخط ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ غواہی فرلوں میں ایک اہم مقام نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے کایات میں کتنے ہی ایسے اشعار ہیں جو اس کے تخیل اور فکر کا بخوبی احساس دلاتے ہیں۔ ان میں گہرائی بھی ہے بلکہ اسے قول کا بھی ایک ممتاز شاعر کہا جاسکتا ہے۔ اس کے عہد کے دوسرے شعراء نے اس سے حاشا نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ غزلیں ان کی توجہ رکھتی ہیں۔

مطلب کا انداز بھی عام دلی توجہ سے الگ نہیں۔ یہ اپنے مثنوی کو کھلی، سلی، بھانا، مٹولی، دھن، اندھری جیسے ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اس کی غزلوں کی جو محسوس حد و خال اور دوسرے رنگ روپ سے بھی ہندوستانی ہی ہیں۔ بلکہ ان کی اثرات کا کہیں کہیں چھل چلا۔ تین اشعار دیکھئے:

کالی چٹیاں ہیں پھول بھر چب سوں گھدی سو پوں دی
تار پاں کی مہمانی مگر کرتے تھے تارے تار دات

لال در کمال رنگ بھرے تیرے
بھیا بھین تارنگیاں چیا بنگالی

کھول ابرو بچ سوں بول پارے توں
سوں چو کی ہے پھول کی ڈالی

اس کی رشتگی میں جو چھال پکڑا ہے اور یہ صنف جس طرح ادا کرنے پر ہوئی ہے اس کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔
خبریت دہلی ہوئی ہے جہاں اس نے قصیدے میں اپنے جو ہر دکھائے۔ غرض کہ شاعرانہ اعتبار سے اگر غواصی اپنے عہد کا
بے حد اہم مقبول شاعر ہے تو اس کی وجوہات موجود ہیں اور اسے اعتبار اور اہمیت اس لئے حاصل ہے کہ واقفانہ ایک
یا کمال شاعر ہے۔ اپنے قصیدے کے اعتبار میں اس کا خیال ہے:

قصیدہ جو غزل کہنے کے فن میں دیکھتا ہوں تو
غواصی میں قصیدہ غامدیا کی منتالی ہے

دلچسپ بات ہے کہ اس نے انوری، خاقانی، عارفی اور سودا کے رنگ میں قصیدے کیے ہیں اور اس کے قصیدوں
میں بڑی نفسی اور روحانی پائی جاتی ہے۔ لہرتی ہے مگر قصیدے کے لیے لیکن غواصی کے قصیدوں کی بات الگ ہے۔
غواصی نے رہا عیاں بھی لکھی ہیں جن میں چند عشق اور اخلاق و تصوف موضوعات بنے ہیں۔ حسن و عشق کی
بھی رہا عیاں ہیں جو پراثر ہیں۔ غرض یہ کہ اس کے شاعرانہ جہات کئی ہیں اور وہ سکھوں میں ممتاز نظر آتا ہے۔ اگر لہرتی
ہی کو سب سے بڑا قصیدہ گو کہا جائے تو اس کی پوزیشن اس کے بعد ہی آتی ہے۔

احمد گجراتی

(۱۶۳۶ء — ۱۵۹۹ء سے کچھ پہلے)

احمد گجراتی کا نام شیخ احمد شریف گجراتی ہے۔ ویسے وہ شیخ احمد کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے نام کا ایک
اور جزو فضل اللہ بھی ہے۔ احمد گجراتی کا ایک تاریخی نام بھی ہے۔ جس سے سال پیدائش ۱۶۳۶ء برآورد ہوتا ہے۔ ان کا
گھرانہ تھی تھارہ

احمد گجراتی کی دو مشہوریاں سامنے آئیں۔ پہلی مثنوی "مکلی جھوں" ہے۔ اسے ادبی دنیا میں روشناس کرنے
والے حافظ محمود شرانی ہیں۔ جنہوں نے ۱۹۳۵ء میں اس مثنوی پر "اور مثنوی کا کالجنگلوں" میں ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ اس کا
کولی اور نسخہ کتب ہے۔ ایک آدھ نسخہ جو بعد میں ملا اس کی حالت بہت خستہ ہے۔ "مکلی جھوں" کا سال تصنیف محدث نہیں
ہے۔ ایک قیاس ہے کہ ممکن ہے یہ بہت پہلے کی مثنوی ہو لیکن جیسے جانتی ہے احمد گجراتی کی ایک اور مثنوی "یوسف زلیخا"
کا چھ چھاپا ہے جو ۱۵۸۰ء سے ۱۵۸۸ء کے درمیان لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی کو سیدہ صفیر نے ۱۹۸۳ء میں ترتیب دے کر
شائع کرادیا ہے۔

احمد گجراتی شہادہ اللہ علیہ سے مرید تھارہ انہوں نے اسے خلافت بھی عطا کی تھی۔ محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ وہ

"محمود شیرانی کا یہ بیان صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ ان کی نظیر سے احمد گجراتی کی مثنوی یوسف و
زلیخا نہیں گزرتی تھی۔ جس میں شاعر نے اپنے روحانی مرید شہادہ اللہ علیہ طوی گجراتی کا
ذکر کیا ہے اور ان سے خلافت عطا ہونے پر اچھا دھڑ دھڑا کر رہا ہے۔ محمود شیرانی نے مثنوی
المکلی جھوں میں احمد گجراتی کے اظہارِ شہادت کو دیکھ کر غائبانہ رائے قائم کی تھی۔ مثنوی المکلی
جھوں بھی بے شک محمد علی قند شاہ کی ترانہ پر لکھی گئی تھی اس لئے شاعر نے غائبانہ بادشاہ کی
خوشنودی کی خاطر حضرت علی اور انما اطہار کی خوب مدح کی ہے۔"

احمد گجراتی کی مثنویاں اس کے حالات پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ "یوسف و زلیخا" میں وہ ایک ایسا شاعر معلوم ہوتا
ہے کہ جس کے حالات اقتصادی طور پر تفصیلی بحث ہیں۔ چونکہ وہ خود اپنی خوش نصیبی پر فخر ہے لیکن اس کے برعکس "مکلی
جھوں" میں اس کی زندگی انتہائی پریشان کن نظر آتی ہے۔ وہ اپنے حالات سے چند پریشان معلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ اس سے کوئی اچھا روزگار برسر نہیں لہذا وہ مختلف مشغلوں میں اپنا وقت صرف کرتا رہا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں
مثنویوں کے زمانے میں کافی فرق ہے۔ اس لئے کہ پریشان حالی کے بعد وہ اچھے حالات سے دوچار ہوا تو اس میں خاصا
وقت لگا ہو گا۔ اس لئے دونوں مثنویوں کی تاریخ کا تقسیم ایک مشکل امر ہے۔ فی الحال اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی جاسکتی۔

بہر طور، احمد گجراتی نے اپنی مثنوی "یوسف و زلیخا" میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ ہر طرح دکلی ہے۔ نئے
تعمیم کا شعری شہدہ دیکھی کہتے ہیں۔ ایسے اسلوب کا تقاضا بھی ہے کہ وہ پرانے رنگ کا اختیار کرتے۔ چند ایسے کام نکلا ہے کہ
احمد گجراتی کوئی آداب زندگی اور زبان کا بڑا پاسدار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زبان میں قدامت کے آثار ہیں۔ لیکن
"یوسف و زلیخا" جس کی تاریخ اندازاً ۱۵۸۰ء اور ۱۵۹۹ء کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ ایک الگ اسلوب کا پتہ دیتی
ہے۔ یہاں وہ رنگ غالب ہے جو "مکلی جھوں" کا طرز و امتیاز تھا یعنی احمد گجراتی اپنی فکر سے جتنا بے نظر آتا ہے۔ اس سے
خفا ہوتا ہے کہ کیا واقفانہ دونوں مثنویاں ایک ہی شاعر کی ہیں۔

لیکن دونوں مثنویوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احمد گجراتی اپنے عہد کے تہذیبی مناظر کو بہ درجہ احسن
چشم کر سکتا تھا۔ اس کی نگاہیں جزئیات پر ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے لباس، زیورات، آرائش، رہنمائی کے طریقے،
گھوڑے کے سامان ان تمام امور کی تفصیل اس کی مثنویوں میں ملتی ہیں۔ مگر وہ محدود حالی تہذیب کی نگاہ ہے جس کا پس منظر
کراس کے نقشہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ اسے زبان و بیان پر قدرت تو تھی علیٰ لہذا اس کے یہاں تشبیہات و استعارات میں
نور سے نظر آتی ہے۔

احمد گجراتی نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اس کی دو غزلیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نقل کی ہیں۔ ایک حسن عشق کی

زمین میں ہے۔ میں ذیل میں دونوں غزلیں درج کر رہا ہوں:

تھو گھٹ بہ زردی کھ پرتے مومن ڈال کر لے
مقابل ہوتے تا ہرگز اگر سور بھر لے
بجب کل رات دھن سوں نوا یک میزد دیکھا
کہ سارے چاند وہ زل سو یک چلی بھر لے
چنگل کی جب ملت گھنے قلم میں ہاتھ نہا لینے
ایک ایک ہاتھ میں میرے قلم ہو بٹھکر لے
مومن کے قلم سوں گل گل کر نہیں سوں رات دن میرے
کہ پانی ہو کے مجھ سارا کلیجہ اور بھر لے
ٹھٹھے بچن ترے سن : بات کر کے گھبرا
شیریں کہاں بوجھ رہے جس شات کر کے گھبرا
والا بڑا بڑھن ہے حالی — دیکھ کر میں
امرت بھلاں یہ گویا ہے بات کر کے گھبرا
بیتوں میں ہے منکسل سر پہ ہے زر کا آجیل
جھکات دیکھ کر کہ کاشب برات کر کے گھبرا
دھن کے بولے کا فی اعتبار مجھ کن
یک ہاتھ میں دو تن کے کے گھکات کر کے گھبرا
گلاں ابر سناہنی کے بھرے مجھے سوزا قن
آب حیات اوپر ظلمات (کذا) کر کے گھبرا
احمد دکن کے غراں ہوتاں ہے یہ ملاحت
توتوں دکن کو اپنا بھرات کر کے گھبرا

ان غزلوں کے مطالعے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ احمد بھراتی تک آتے آتے دکنی اسلوب قدر سے فارسی اسلوب میں تبدیل ہوئے لگتا ہے۔ چونکہ مختلف مشعوں کا تھیں زمانہ انتشار ہے لہذا ایسے معاملات میں سیاق و سباق کے ساتھ دوسری نگشات سے ہمارے لئے کچھ بھی ظہور پر کہا جاسکتا ہے۔

ابن نشاطی

ابن نشاطی کا پورا نام شیخ محمد قمر الدین ابن نشاطی تھا۔ اس کے والد شیخ فخر الدین تھے، لیکن ابن نشاطی کے تفصیلی حالات آج بھی نہیں ملتے۔ ایک تخلیقی کی بنیاد پر استوار اور طبعی طور پر "پھول بن" کے علاوہ "خوشی نامہ" کو نشاطی کی تصنیف قرار دیا ہے لیکن زور نے اس خیال کو رد کر دیا ہے۔ ابن نشاطی کی ولادت کا سال ۱۰۳۰ھ اور ۱۰۳۵ھ کے درمیان قائم کیا گیا ہے۔ اس کے نام کے آگے شیخ الکاتب لکھے جیسے الفاظ لکھے جاتے رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا مرشد بھی تھا۔ ابن نشاطی کو فارسی سے خاصی قربت تھی اور وہ فارسی شاعری کے حواشی سے آشنا معلوم ہوتا ہے۔ ابن نشاطی کی فن نام تر شہرت "پھول بن" کی وجہ سے ہے۔ اس کا سن تصنیف کیا ہے یہ بھی ایک الجھن کی بات ہے۔ مختلف لوگوں نے مختلف تاریخیں درج کی ہیں لیکن عبدالقادر سرودی نے اپنی مرثیہ شری "پھول بن" میں جو شعر درج کیا ہے اس سے ایک واضح چرخی نکلتی ہے یعنی ۱۰۶۵ھ:

اتھا چرخ تا لایا یہ گلزار

اٹھارہ سو کوں گم تھے ہیں پر چار

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ابن نشاطی سلطان عبداللہ شاہ کے دربار سے وابستہ تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ وہ

"پھول بن" کی تخلیق کے بارہ بادشاہ سے قریب ہونا چاہتا تھا اور یہ خود اس مشوری کے ایک شعر سے واضح ہے:

اچھو بود : مبارک پھول بن ہو

نظر میں جم اچھو شہ کی بچن بچ

لیکن یہ بات بھی ثابت ہے کہ "پھول بن" ایک فارسی قصے "برہنہ" سے اقتباس پر مبنی ہے۔ پہلے یہ بات

کہ جاتی تھی کہ "برہنہ" ملا احمد دیرانی کی فارسی تصنیف ہے لیکن اب یہ خیال مٹا دیا گیا ہے کہ اس فارسی تصنیف کا مصنف احمد حسن زہیر میردی ہے۔

"پھول بن" کے قلم پر غور کیجئے تو اس میں اصول کا ایک حائل نظر آئے گا ایک قصے کے خاتمے پر دوسرا شروع

ہوتا ہے اس طرح کئی قصے ایک لڑی میں آجاتے ہیں۔ اس کی داستان نشاطی ہر جگہ مثال پرندی کی جھلک لٹا رہا ہے۔

اس کا شہر گنچن ایک شاہی شہر ہے جہاں غریباں ہی خوشیاں منگتی رہتی ہیں۔ داستانوں میں دفا شہر کی ہر جگہ موجود ہے

نئے، بھلا پر قسم کا شہری نے استعارہ سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں خبر و خبر کی جنگ لگتا ہے۔ لیکن شہر کو ہر طور پر طلب ہوتا ہے۔

ہوتا ہے۔ ایک اور صورت جو "پھول بن" میں ابھرتی ہے وہ ہے راس کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونا۔ دکن

کی کئی مشعوں میں اس طرح کا تصور دیا ہے۔ شہری "کدم راز" میں فردین نکالی نے تہذیب قلب کا ایک خاص

لئے کئی طرح کے التزام رکھے ہیں۔ سب سے اہم بات جو سامنے آئی ہے وہ موضوع کے لحاظ سے اشعار کا تناسب ہے۔ ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر محض جذبات کی رو میں بہہ رہا ہے اور اسے یہ فکر نہیں ہے کہ کس کے سلسلے میں کتنے اشعار لکھنا چاہئیں۔ لیکن ایسے تو ازان اور تناسب کو تکنیکی طور پر کامیابی کی ایک شرط تسلیم کرتا ہوں۔ اس مثنوی میں ۱۲۳ اشعار ہیں اور اس کی تعلیف میں چالیس دن صرف ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مثنوی کی بعض منفرد خصوصیات کو اس طرح قلمبند کیا ہے:-

"طبعی نے اپنی مثنوی کی بنیاد فارسی شاعر گھامی کی مثنوی پر رکھی ہے۔ گھامی نے 'ہفت بحر' میں اور باگھی نے 'ہفت منظر' میں ایم اے کے خاندان سامانیہ کے چودہویں بادشاہ بہرام گور کی حکایات کو موضوع غن بنا لیا تھا اور اسات کی اہمیت یہ تھی کہ بہرام گور کی اسات چوبیس تھیں جو اسات باغیوں میں دہشت تھیں۔ طبعی کی مثنوی کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ شعریت اور قصے کے ادوار چڑھاؤ سے اس میں مثنوی کا فن ترقی پانہ شکل میں نظر آتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مثنوی میں اشعار کی تعداد اور عنوانات کی تقسیم میں ایک باضابطگی ملتی ہے۔ خلا بر عنوان کے تحت ایک ہی تعداد میں اشعار لکھے گئے ہیں۔ مدح ابو الحسن میں چھ اشعار لکھے گئے ہیں اسے ہی اشعار شاہ راجہ کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ قصے کے دوران میں ایک موقع ایسا آتا ہے کہ بہرام گور کا باپ اسے سات تعلیم کر رہا ہے۔ طبعی نے ہر نصیحت کو بالاتزام سات سات شعروں میں لکھا ہے۔ اس مثنوی میں قدم قدم پر ایک اہتمام کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ طبعی دلی مثنویوں کی روایت سے باخبر تھا۔ مثلاً جس طرح دہلی نے 'قلب مثنوی' میں استادان فن کو خواب میں دیکھنے اور ان سے اپنے فن کی اور طلب کرنے کا ذکر کیا ہے اس طرح طبعی نے دہلی کو خواب میں دیکھنے کا ذکر کیا ہے جو طبعی سے کہہ رہا ہے:

کیا بات طبعی میری نوبی

ایک اور خصوصیت اس مثنوی کی یہ ہے کہ اس کی زبان اور اسلوب بیان رایت سے قریب تر ہو گیا ہے۔ اس لئے اس مثنوی کو آج بھی آسانی کے ساتھ چلا جا سکتا ہے۔ اس میں بہت سے الفاظ مثلاً 'چھر چھی'، 'سور چھو'، 'سے'، 'تھو'، 'جگ'، 'اچھا'، 'چٹا'، 'اچا' اور غیر ضرور استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ الفاظ زبان کے لئے معیار کے اعدادی رد میں حتی کہ دلی کی کے باں بھی رکتے تھے۔ استعمال ہوئے ہیں۔ طبعی کی یہ مثنوی شمال کی زبان کے گہرے اثرات کے تحت چلتی ہوئی زبان کی ترجمان ہے۔"

میر نے خیال میں یہ رائے ہے جو دہلی سے اور اس سے 'بہرام گور' نام کی اہمیت کی طور پر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ فارسی روایت کس طرح آہستہ آہستہ دہلی ہو کر دلی ادب کے حراج کوئی سمت سے ہٹا کر رہی ہے۔

ابو الحسن تانا شاہ

(۱۶۴۳-۱۷۰۰ء)

قلب شاہی عہد کے آخری بادشاہ ابو الحسن تانا شاہ کا قلعہ کوٹلہ سے تھا۔ ایک روایت کے مطابق دو عہدہ قلب شاہ کا جتیم اور بادشاہ۔ دلی خیال غالی غالی کا بھی ہے۔ لیکن لاکھ جگہ بیون اس نے اپنی کتاب "مغرب السورج" میں اسے مرد بگاہ کہا ہے۔ وہ اسے غفل سمجھتا ہے۔ کئی دوسرے لوگ بھی اسے باہر کے آدمی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن "نگارۂ متنبہ" میں ہے کہ وہ سلطان عہدہ کے دہشتے واروں میں تھا۔ اس طرح وہ شاہی خاندان کا ایک فرد ہوا۔ بہر حال صورت حال جو بھی ہو۔ بڑے کرنا مشکل ہے کہ وہ افغان شاہی دہشتے سے کوئی غریبی تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اپنی خوش خلقی سے وہ عہدہ شاہ کی وفات کے بعد ۱۶۷۷ء میں قلب شاہی سکران بن گیا۔

تانا شاہ کی تعلیم شاہ راجہ کی نگہانی میں ہوئی۔ وہ ان کا مرید بھی تھا۔ تانا شاہ کے کردار پر بھی لکھنا اظہار جاتی رہی ہیں۔ کوئی اسے قلعہ کرنا تصور کرتا ہے تو کوئی اسے سوتھا سمجھتا ہے۔ شاہی اس کی ابتدائی زندگی، لڑائی میں گزری ہو لیکن اس کا تابع ہو جانا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اس لئے کہ ایک طرف تک وہ راجہ قبال کی خاندان سے وابستہ رہا۔ سید جعفر اور پروفیسر گیان چند جی نے "تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے:-

"جو کوٹلہ سے کے آخری تاجدار کی عمر کی تقسیم اس طرح ہے کہ چودہ سال تحصیل علم اور چودہ سال حاضر باغی خدمت مرشد میں بسر ہوئے۔ چودہ سال حکومت کی اور پھر چودہ سال قید و ملت آباد میں گزار دیے۔ اب اس کا ایک فرزند جو دولت آباد کے لاکھ قیہ میں اس کے ساتھ چھین گلی میں تھا خداوند و باندہ ملکان تھا۔ تین لڑکیاں ہیں۔ سے بڑی شہزادی کا بیوا بیچا۔ کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ سے ہوا تھا۔ ابو الحسن تانا شاہ کو قلعہ دولت آباد کے چھین گلی میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں اس نے زندگی کے چودہ سال انجمنی سمجھی کے عالم میں گزار دیے۔ سکندر علی وجہ نے چھین گلی کا قیدی کے ذریعہ ان ایک چودہ سال کی قیدی میں کوٹلہ سے کے اس آخری تاجدار کے اہم قیدی اور اس کی بیوی اور بے بی کی بیوی موثر قیدی کی کئی تھی۔ راجہ الحروف کو انہوں نے تانہ تھا کہ مولوی عبد الحق نے انہیں اس نظم کو شائع کرنا سے منع کر دیا تھا۔ کیونکہ اس سے اور گہرے رعب کے شب و حتم کا اظہار ہوتا ہے۔" ۱۰۱۲ء

میں اور انہیں تانا شاہ کا انتقال ہوا۔ اس کی تاریخ و حالات ہجرات ۱۱۱۱ھ یعنی ۱۷۰۱ء کی بتائی گئی ہے۔ سیکندر علی صاحب کی تذکرہ والا نظم کا یہ بند ملاحظہ ہو:

دکن آ گیا شاہ غازی کے بس میں
کئی آئی لیکن نہ حرص نہ ہوس میں
نہ پوچھی کبھی بات چودہ برس میں
یوں ہی عمر گزری یہاں خار و خس میں

غزل نے مکان اجل دے دیا ہے
دکن لے کے چھٹی محل دے دیا ہے

یہاں اس بات کا ظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گوکنڈہ کے سقوط اور اورنگزیب تانا شاہ کی قید و بند کی زندگی بھر موت نے گوکنڈہ کی خویں تہذیب اور لسانی تہذیب کا کلیجہ قح کر دیا۔ گویا اورنگزیب نے چڑھی کارروائی کی اس کے اثرات دور رس رہے۔ تہذیب سماجی ڈھانچے کے انہدام سے نئی صورتیں پیدا ہوتی رہیں اور فارسی اثرات تیزی سے کام کرنے لگے۔ لیکن یہ کہ ادب عالیہ کی تخلیق کے لئے یا ایک فطری صورت پیدا ہوئی ہو لیکن گوکنڈہ کے مجددوں نے جس طرح کئی زبان میں ادبی کاروائی کر بائی اور انہدام دے دئے تھے انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اورنگزیب کی فتح اور آخری تاجدار گوکنڈہ کی شکست کو تہذیبی افسانہ کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں بات ہے کہ اس افسانے سے لامرکزیت کا بھی خاتمہ ہوا اور ایک وسیع و عریض علاقے میں سے خود پر ادبی نشو و نما کے پہلو پیدا ہوئے۔

چاندگل میں زندگی بسر کرنے والا اورنگزیب تانا شاہ چونکہ شاعر تھا اس لئے ان نے اپنے بعض احساسات کو شعری روپ لازادیہ ہوگا۔ ایک غزل ڈاکٹر تقیہ کاظمی نے اپنی کتاب ”ادب اردو کی تاریخ“ (ص ۲۰۳) میں درج کی ہے اور یہ احساس دلا دیا ہے کہ یہ غزل قلب شاہی ریاست کی سیاسی تہذیب اور لسانی شکست کی علامت ہے تو دوسری طرف مقلد تہذیب طرز احساس اور فارسی روایت کی فتح کی علامت ہے۔ متعاقب غزل ملاحظہ ہو:

اے مرد گل جان تو ذرا تک جمن میں آ
جیوں گل گفتہ ہو کے مری انجمن میں آ
کب تک رہے گا جیوں لب تشویم بے شبنم
اے شوق غدا پند توں تک بھی سخن میں آ

چاندل ہوں دھن تو میں کروں گل شعر کی
اے معنی پندر ششابی سوں میں میں آ
اے جان یوگن قوں ایتھے خوش لک ہے
بد تہا کوں کھول کے مچن چمن میں آ

لیکن یہ غزل ڈاکٹر جمیل جہاگی کی ”تاریخ ادب اردو“ (جلد اول (ص ۵۰۸) میں بھی ہے۔ جن کی رائے یہ ہے کہ اس غزل کا فارسی انداز، اچھا رنگ سخن اسے سولی دکن کی آواز سے قریب تر کر رہا ہے۔ جمیل جہاگی کی تاریخ میں اورنگزیب کی ایک اور غزل ”کوئی کچھ کئے کوئی کئے“ کی دریافت میں ہے۔ اس کا بھی مزاج وہی ہے۔ کچھ اور اشعار جو اورنگزیب ۱۱۲۰ھ سے منسوب کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:

کس دھڑکوں چاؤں کہاں کچھ دل پہ بھل چھرات ہے
اک بات کے ہوں گئے جن یوں ہی میں بارہ بات ہے

لانا مین کا پیر سوں کوئی جھوٹ کوئی جھج جھج کے
کس کس کا منہ سولہاں سخن کوئی کوئی کچھ کچھ کے



طریقہ زندگی میں غلامت کا پہلو نما اس بارہا وقت اور نہایت پر زور صرف کیا جانے لگا۔ علم و ادب کسی بھی فرد کی عظمت کی دلیل ثابت ہوئی۔ کہہ سکتے ہیں کہ قہر علی اعتبار سے یہ صدی انار یاں رہا اور طریقہ زندگی کا ایک ایسا رخ سامنے آیا جسے بطور پرمیاری کی کہہ سکتے ہیں اس دس مظلوم شعروں نے بھی جلا پائی۔ خلفائوں میں اس کی بازگشت تو تھی ہی جہاں ہمارے مقلدیں ایک خاص انداز اور رخ اختیار کرنے کی طرف راغب ہوئیں۔ تصوف نے تعلیمِ اہلیات کے نئے آفاق پیدا کئے جن میں محقق و محبت نے ایک خاص انداز سے جلا پائی۔ صوفیہ تصورات میں مہر کی اور معنویت کی تکمیل پڑھوئی اور عشقِ حقیقی کے شاعرانہ بیان کی صورت پھری۔ ایسے مصوفانہ تصورات بعد میں ہماری شاعری کی روایت بن گئے اور ان میں شہدائی کی ایک صورت سامنے آئی۔ صوفی کے آستانوں نے اپنی کامروری سے انہیں کوٹھار کرنے کی کیفیت پیدا کی لیکن ہر عظمت کا ایک پس منظر کسی نہ کسی طرح پیدا ہو جاتا ہے لہذا امر دینی کا قائل مسترد چنان بھی شاید اسی سلسلے سے پیدا ہوا۔ اس علاقے نے اردو شعروادب کو خاصہ انداز کیا۔ حیرت ہے کہ بعض اہم شعرا نے امر دینی کی دو مثالیں قائم کیں جن کی تفصیل میں جانے سے غرضت آج بھی مکمل ہو جاتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی اور مصوفانہ تھی زمین میں بھی تصوفی رنگ بار پائے گئے۔ جن کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

روادنی دبستان

لیکن عمومی گفتگو میں یہ بات واضح کی جا سکتی ہے کہ جذبات نگاری کی اپنی سلسلے سامنے آئی۔ داغیت کا رنگ غالب ہوا۔ تصوف کے پس منظر نے صحتی آخری کی نئی صورتیں پیدا کیں اور خاصیت و بلاغت زبان کی معنائی اور تحریری پر خاص زور صرف کرنے سے اردو کا حیا بلکہ تر ہوا اور اس زمانے کے بعض شعرا تو تاریخ کا نہ صرف انوت حصہ بن گئے بلکہ اردو شاعری کی پہچان ان ہی سے قائم ہوئی۔ لیکن ۱۸۷۵ء کے بعد یاجد و جہاد آدنی سے حالات کا رخ موڑ دیا۔ دلی برادریوں اس طرح کا سخت و شعرا جو کرنے سے زندگی بھر کر رہے تھے اس الجھ کر رہ گئے اور اردو کی دوسری اہم بنگوں کی طرف مراجعت کرنے لگے۔ ذیل میں میں بعد متعلقہ کے شعرا اوراد کا جائزہ لے رہا ہوں۔ ایسے تجزیے میں ہر شاعر یا ادیب کی اپنی شناخت سامنے آئے گی۔

دبستانِ دلی

یوں تو روایتی طور پر شعروادب کے مخصوص مزاج کی شناخت دبستانوں سے کی جاتی رہی ہے لیکن میں غلطی جوہ زیدی کے اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتا ہوں کہ ایک اسکول کا مزاج کسی دوسرے دبستان سے نہیں نکلیا جاسکتا ہے بلکہ ہوتا ہی ہے۔ لیکن اختصار کے مرکزی پہلوؤں پر نگاہ کی جائے تو کچھ مختلف صورتیں ضرور ابھرتی ہیں۔ لہذا ان ہی کو دیکھا جاتا کہ میں چند نکات پیش کر رہا ہوں۔ یہ وہ نکات ہیں جو عام طور سے دلی اسکول سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ قصہ بالکل کھلی کھلی گفتگوئی دبستان میں بھی ملے گا اور آخر دبستانِ عظیم آباد میں بھی۔

دبستانِ گفتگو

دلی کے بعد ایک دوسرا دبستان، دبستانِ گفتگو کے نام سے معروف ہے۔ اس کی کچھ خصوصیات بیان کر دینی چاہتی رہی ہیں اور یہی خصوصیات اس اسکول کی شناخت ہیں۔ سب سے پہلی بات جو ابھر کر سامنے آتی ہے وہ اس اسکول کی لطافت زبان سے متعلق ہے لیکن یہ لطافت کثافت میں جاتی ہوئی نظر آتی ہے اس لئے کہ شاعری زبان اور اس کے صنفی کی خصوصیات میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں وہ روزِ رواست و بے شک اور سامانِ آرائش ہیں۔ یہ شاعری جن چیزوں کے حسن و جمال سے علیحدہ نہیں کھی جاتی ہیں ان میں ایک چیز کا ذرا بے بی جا ہوتی ہے جہاں داغیت کو کوئی اصل نہیں اور وہی

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دلی ادب کے مہمادوں نے اتنی بات تو ضرور کی کہ فارسی کی بلا دینی تو ختم کرنا چاہا۔ ٹھیک ہے کہ بعض اہم شعرا کے یہاں فارسی ترکیبوں کی بھرمار نظر آتی ہے لیکن اب تک جو تصور تھا کہ فارسی ہی میں شعر کہنا شاعر کا سب سے وہاں ہونا نظر آتا ہے۔ اب تجزی سے اردو فارسی کی جگہ اپنی نظر آ رہی ہے۔ عربی اور فارسی کیف و رسم کے ادغام سے اردو مزید تخلیقی حاصل ضرور کر دیتی تھی لیکن ایسا نہیں تھا کہ ان زبانوں کا تسلسلہ محسوس کیا جاسکتا تھا۔ لہذا سانی سلسلے پر ہمارے اہم استاد شعرا نے نہ صرف اردو کو ایک مختلف اسالیب سے آگیا بلکہ اس کا اپنا رنگ پھر کر سامنے آگیا۔ اس کا اپنا لہجہ و لہجہ رکھنا جسے کی چیز ضرور، جو بعد میں ایک روایت کے طور پر ہمارا دلی نامیہ ثابت ہوا۔

روایت پارتی ہے۔ مشرقی کوئٹہ کی اوصاف سے تصنف کر کے اس کی روح اور جذبے کا طبعی احساس بھی نہیں۔ پھر ایسا بھی ہے کہ تفصیلات کو بڑے بڑے کاروائے کے لئے لکھنوی شعر اور طرز اور سہولت تک کہتے ہیں اور اس عمل کو وہ اپنا کمال قرار دیتے ہیں۔

لکھنوی اسکول کے شعراء رعایت لفظی کی طرف خصوصی توجہ کرتے ہیں جس سے زبان میں ایک کھیل کی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ رعایت لفظی کو بھی انداز الہجہ پہنچانے کا عمل عام ہے۔ عشق و عاشقی کے مرتطے میں معاملہ بندی پر بہت زور صرف کیا جاتا ہے جس میں مطبعت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ تجویہات و استعارات فراغت و لطافت نہیں پیدا کرتے بلکہ بیجان تیزی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ لکھنوی اسکول کا ایک وصف فاشی بھی ہے۔ فاشی بھی کا بھی عنصر جتنی ہے ماحرود پر جتنی بھی ملتی ہے۔

لیکن یہ نکات ہر چند کہ لکھنوی اسکول کے نام ہیں لیکن اس کا کوئی نہ کوئی تختہ رخی اسکول میں بھی ملتا ہے۔ لکھنوی اسکول کی چند اہم خصوصیات شعری کی ذیل میں علی حراذی نے بارہ نکات درج کئے ہیں۔

لکھنوی اور دلی کی شاعری میں جتن کا خاکہ ہے۔ لکھنوی شعر کی محبوبہ لازمی طور سے صنف نازک سے تعلق رکھتی ہے۔ لکھنوی شعراء غزلوں سے متعلق سامان آرائش کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں۔ ان کے زیورات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ ان کے لباس پر زور دیا جاتا ہے۔ طوائف اور قصص و سرود کی کیفیات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ چند سماج و ہندوانہ رسم و عہدہ واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ لفظ پری کا بطور خاص استعمال ہوتا ہے۔ لکھنوی شعر کو کچھ جتنی کہے گا بہت شوقی ہے اور لکھنوی شاعری کی ایک اہم خصوصیات غزلوں کے مخلصوں میں رسولی مقبول، بختین یا اے کے قوسن سے قلب بجات ہے۔

لیکن ”روادلی اسکول“ اس ایسی تو جیہات فاشی کی گئی ہیں جس سے متذکرہ محملات میں چند رستہ دلی کو بھی حصہ ہیں۔ لیکن میں اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتا اس لئے کہ بعض عناصر اگر تو اثر سے اٹھتے ہیں تو پھر ان سے وابستہ اسکول ان بل بیاویہ پہنچانا نا جاسکتا ہے۔

اس میں ذیل میں چند لکھنوی شعراء اور ان کے خدو خال پیش کر رہا ہوں۔



اٹھارہویں صدی عیسوی کا ادب

اٹھارہویں صدی کا سیاسی بحران

اٹھارہویں صدی کا ہندوستان اولیٰ لحاظ سے جتنا اہم ہے اتنا ہی سیاسی نقطہ نظر سے بعض مراحل بعد نہیں رہے ہیں۔ سب سے اہم وقت ہے جب مرہٹوں کی طاقت عروج پر ہوتی ہے اور ان کی حکمت عملی مغلیہ سلطنت کی پرمیشانی کا باعث بھی۔ دراصل مرہٹوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ مغلیہ سلطنت کو باہر کے دربار کے درمیان کی طرح ہندوستان پر قابض ہو جائیں گے۔ بظاہر یہ ایک خواب، مطلقاً ہوتا تھا لیکن ان کی پالیسی وفاقاً وفاقاً استحکام پاتی رہی اور مغلیہ حکمرانوں کے لئے باعث تشویش بھی رہی۔ یہ عمل سترہویں صدی کے درمیان ہی جسے شہر شروع ہو چکا تھا۔ ہر چند کہ اس کا تعلق مذہب سے تھا لیکن لٹریچر کی سلسلہ۔ ان کے عزائم ہے چاہتے اور حرکت۔ عمل میں تیزی و طراری تھی لیکن مرہٹوں کو یہ احساس تھا کہ وہ آہستہ آہستہ غلیظ فوج سے ٹکرائیں سکتے ہیں انہوں نے چھپ کر لٹرائی گئے کی ہر ترکیب کو اپنے موقف کا ایک حصہ بنالیا۔ ان کی طبیعت کی پسندی پہلے قابل مہنو اور ایک محدود رہی لیکن آہستہ آہستہ ان کا دل عمل پر مہم بن گیا۔ اور لگتے ہی لگتے عاقلانہ اور وسیع مدنی تک ایسی بغاوت کا سر کھیلنے کے لئے دکانیں دینا پڑا۔ مغلیہ سلطنت مرہٹوں کی ہر وہ پراسر کوئی کرتی یا نہیں متفقہ کر الٹی لیکن ہر حکمت کے بعد ان کے عزائم بلند ہوئے اور وہ پھر سب کو جاتے اور کوئی راہ کوئی نہا سزا کھول لیجئے۔ صوبہ دار شائستہ خاں نے ۱۶۶۰ء میں انھیں پوٹ ہے باہر نکال دیا لیکن مرہٹوں نے دربار شیواجی خاصوٹی سے بغاوت کا کام کرتے ہوئے ۱۶۷۵ء پر ملے ۱۶۶۳ء کو پھر وہاں داخل ہو گیا۔ اس نے انجانی سے خوفی سے شائستہ خاں کے یہاں حملہ کر دیا۔ اس حملے میں شائستہ خاں کے کئی سپاہیوں کے علاوہ اس کی بیوی اور بیٹا بھی جاں بحق ہو گئے۔ پھر اس نے سورت کی تیار تیار بندر

روپے دوڑا نہ تھا۔ نو اب سالار جنگ کا خاصہ رکاب دار یا دروہو رہے مابھار مشاہیر و لیتا تھا۔

میاثتی کا یہ عالم تھا کہ اب ان نوالوں کی عورتوں کی تعداد بڑھ گئی جاتی ہے جیسے شاعری اصطلاح میں بھڑپاں گئی جاتی ہیں۔ مثلاً شجاع الدولہ کے حرم میں ستائیس سو سے زیادہ عورتیں تھیں جن میں سے دو ہزار توبہیں اور اسی بچہات تھیں۔ اور یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ان میں سے لکاح صرف چارہا سے ممکن تھا۔ نہ جانے اتنی عورتوں کا یہ کیا کرتے تھے؟ واضح رہے کہ شہر کی ملا لکھیں ان ستائیس سو پر مستزاد تھیں۔ وہ بے غلی، بیک سرور، نسانہ بھرے، میں لکھتے ہیں: "مستردہ سوجلیے والیاں۔ تاوردہ نمانہ شہرہ وفاق بھوینی میں خاق ملازم تھیں۔ بارہ سو چست و چالاک، بیجاک، لہجہ سوتھنی میں، یکسا، جان دلیری، صراپا نازان کے علاوہ ہزاروں لڑکیاں جن میں کی سترالیاں، ماہ سمار، جنگ بھر، کسمن، جن کے ادب کے دان، پرانی وہ حاضر تھے۔

لیکن اسی دوران مرد و شاعری نے نئے سوز لے۔ تفصیل تو آگے آئے گی لیکن یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اسی عظیم زمین شہر ایام گولی کی روایت سامنے آئی۔ پھر اس سے آفاق کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ ذہنی کی شاعری کی طرح کی سلطنت کے ساتھ مویچہ پر ہوئی۔ پھر کی اہم شعر ایدہ ہوئے، جن پر الگ الگ کہیں تفصیل کہیں اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جا رہی ہے۔



تھا۔ مرے بس اس راؤ کو اس کی جگہ بنایا جاتے تھے لیکن پائی بہت میں اس کی شکست ہوئی۔ شاہ ولی اللہ عارضی طور پر کامیاب ہو گئے لیکن یہ صورت رہی نہیں رہی۔ جنوری ۱۷۱۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم دہلی کی تخت نشینی کو قبول کرتے ہوئے اسے مضبوط کرنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ کی غیر حاضری کے سبب اس کے بیٹے خواجہ بخت کو جاں بختی بھڑپاں۔ ۱۷۱۶ء میں شاہ عالم تخت پر بیٹھا تو لیکن سکون کیا۔ دلی پر تو مرے چہ ہاتھ تھے اور غلام قادر و دیو کو ۸۸۸ء میں آنکھوں سے محروم کر دیا اب احمد شاہ ابدالی کے تخت پر ممکن تھا۔

یہ سب مظاہرہ نہ بیوقوف سلطنت کے زوال کا پس منظر قائم کرتا ہے۔ اس زوال کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں جن پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن یہاں اس کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں شعرا و ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ دلی جب اپنی قیادہ کے نئے مراکز میں اس کے شعرا ناؤ گزین ہوئے گئے۔ اس کی تفصیل آگے کے صفحات میں شاعروں کے ذکر کے ساتھ پیش کی جائے گی۔ سودا، میر، حاتم، نظیر اکبر آبادی نے "شیرۂ ثواب" لکھ کر اپنے دل کا بخار نکالا اور اس دور کے امتیاز کی سوشل تصویر کشی کی۔ اب جو مراکز تھے وہ فیض آباد، کھنور، فرخ آباد اور عظیم آباد تھے۔ میر اور سودا کھنور کے لیکن انہوں نے اپنی شاعرانہ وضع میں تبدیلی نہیں کی۔ انشاء، جرات اور تھیں کھنور تہذیب میں رچ بس گئے۔ جہاں واجد علی شاہ کے فیض سے رہا یاں اور طو لکھیں مرکزی حیثیت رکھتی تھیں۔ میاٹھی انصب العین تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:-

"نصیر الدین حیدر کے باورچی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بادام کے چاول تراشتا اور پسنے کی وال تیار کرتا تھا پھر ان سے اس قدر نہیں چھڑی پکا تا کہ جو دیکھنے میں ماش کی چھڑی معلوم ہوتی تھی لیکن کھانے میں اس کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا تھا جس کا زبان مدتوں بھلا رہا تھا۔ اسی صورت سے واجد علی شاہ کا رکاب دار بھی کھانوں کی ہیئت تبدیل کر دیے میں ایسا کمال رکھتا تھا کہ مرے کو کھانے تو فورہ کا حرو ہوتا تو مرے کو کھانے تو غیرتی کا لطف آتا اور فیروزی کھاتے تو پلاؤ کی لذت آتی تھی۔ بعض دوسرے رکاب داروں نے بھی کھانوں اور مخصوص چادلوں کی تیاری میں عجیب عجیب صنعتیں دکھائی تھیں۔ مثلاً کسی نے پلاؤ کو کورنگ کے چادلوں سے تیار کر کے تاب کو جواہرات سے مشابہ بنادیا۔ کسی نے آدھا چاول اور جواری اور نصف کو سفید بنا کر انار داغ تیار کر دیا۔..... شجاع الدولہ کے عہد میں کھانے کے اسرار خواں پر چھ نعلات تھیں سے کھانا آتا تھا۔ ان میں سب سے خصوصیت باورچی خانہ مرزا حسن رضا خان کے ماتحت تھا جس میں دو ہزار روپے روزانہ کی پخت ہوتی تھی۔ دوسرا چھوٹا باورچی خانہ خواجہ مرزا حسن علی کے تحت تھا اور پھر عزیز علی خان کی نگہبانی میں آگیا تھا اس پر تین سو روپے روزانہ

کی تحریک ہندی اثرات کا نتیجہ ہے اور یہاں اس میں ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو فارسی کے خلاف ملک میں پورے طور پر اردو کے فروغ کا باعث بن رہا تھا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ شاہی ہند میں اردو شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب مظاہر سلطنت کا زوال ہو رہا تھا، اور ملک ذہب کے آخری دور میں دکن میں اردو شاعری جس انداز سے ہو رہی تھی وہ دہلی کے شعرا کے ظلم میں تھی۔ چنانچہ چاند پوری نے دہلی وکی کے سلیبے میں لکھا ہے کہ وہ ۱۰۰۰ء میں دہلی آئے۔ ان سے پہلے میر جعفر دہلی کا بھڑائی کاہن موجود تھا۔ کئی دوسرے لوگ بھی تھے مثلاً مرزا عبد اللہ درویشی، مسعودی خان، قزویناں خاص امیر۔ یہ سب کے سب بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن اردو میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ اسی عہد میں سراج الدین علی خاں آرزو نے بھی یہ محسوس کیا تھا کہ فارسی کی جگہ اردو کو اپنا لینا چاہئے یعنی فارسی میں شعر کہنے کے بجائے اردو کو ترجیح دینی چاہئے۔ شاہ عبدالغنی بخش نے دہلی کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ اردو میں شعر کہیں۔ ظاہر ہے ایسا مشورہ انہوں نے دیا بھی تھا کہ نہیں یہ ایک متنازعہ امر ہے لیکن دہلی وکی کا رویہ ان دلی تخیل کیا تو حالات تخیلی بدل گئے۔ محمد شاہ بادشاہ کا عہد ۱۷۰۷ء سے ۱۷۴۸ء ہے۔ جب تک شاہی ہند میں اردو شاعری اتنی عام نہیں ہوئی تھی لیکن محمد شاہی دور میں دہلی زبان میں شعر کہنے کی تحریک زور پکڑ گئی۔ واضح ہو کہ دہلی کا دربار ان محمد شاہ کے دوسرے سال بطور یعنی ۱۷۰۸ء میں پہنچا اور دہلی جس طرح مقبول ہوئے اس کا حالی سب پر روشن ہے۔

چند یہ ہے کہ میر اور سوزا بھی اثر پذیر ہوئے۔

دیسے اردو میں ایہام گوئی کی تاریخ محمد شاہ کے ابتدائی دور سے شروع ہوتی ہے اور اس تحریک کا ازیم ازیم ۱۷۵۰ء میں لکھ رہا ہے۔ میر تقی میر بھی ایہام کے سلیبے میں آتی رائے اس طرح رقم کرتے ہیں:-

”ایہام است کہ در شاعران ملف ایہام در ادب داشت، انکوں طبعاً مصروف این صنعت کم است مگر سبب از عقلی رست شود۔“

زلی میں چند اہم ایہام گو شعرا کا ذکر کر رہا ہوں۔

شاہ محمد مبارک آبرو

(۱۶۸۴ء - ۱۷۳۳ء)

ان کا اصلی نام شیخ نعم الدین تھا اور عرف شاہ محمد مبارک آبرو۔ آبرو چھٹھ تھا۔ گوالیار کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا ایک موٹی بزرگ تھے جن کا نام شیخ حمید الدین عرف شاہ محمد ثناء تھا۔ انہیں سراج الدین علی خاں آرزو کا رشتہ دار بتایا جاتا ہے اور شاہگر بھی۔ ان کی بیوی گوالیار میں ۱۶۸۴ء میں ہوئی، جو ان ہی میں دلی آگئے اور شاہی طرز امتیاز کی۔ گرد پڑی نے لکھا ہے کہ آبرو ایک زمانے تک ان کے والد کے ساتھ نارنول میں رہے اور اپنی خدمات

کا سہل بھی پاتے رہے۔ گرد پڑی نے یہ بات اپنے تذکرہ ”رنگین کو بیان“ میں لکھی ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب آبرو نے دنیا داری ترک کر دی اور قلندر ہو گئے۔ ان کی ایک آنکھ خراب ہو گئی تھی۔ تذکروں میں ہے کہ ان کے حوالے میں شوقی و غریب تھے، حسن پرستی اور حاشیہ مراد تھی۔ چنانچہ ایک مثنوی ”در سبب آرائی مثنوی“ تخیل کی جس میں اس زمانے کے جلا سنگار و لطف لے لے کر بیان کیا گیا ہے۔ مصحفی نے اپنے ”تذکرہ ہندی“ میں یہ اطلاع دی کہ ۱۷۰۵ء میں دہلی کے ہوئے چکے تھے کہ گھوڑے سے لٹ ماری، ضرب کاری لگی اور فوت ہو گئے۔ دہلی ہی میں قمر حسن سید رسول لہاسی ان کے ہوئے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے مطابق ان کی ولادت کی تاریخ ۱۶۸۳ء ہے۔

آبرو بنیادی طور پر بھالیات سے بہرہ ور تھے۔ طبیعت بخش و نکاح کی طرف تھی۔ لہاسی میں بھی طرح داری نکاح تھی۔ ان کی حسن پرستی اتنی نمایاں تھی کہ تذکرہ نگاروں نے اس کا خاص طریقے پر ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے کہ:-

”انہیں خوبصورت چیزوں سے محبت ہے۔ خوب رویوں کے قدرتی حسن و جمال کے علاوہ اس میں خوش پوشی اور جلا سنگار بھی شامل ہے جس پر آبرو نے پوری ایک مثنوی لکھ کر اس زمانے کی پوشاک، راج، راج اور پاکین کی تصویر کشی کی ہے۔ یہاں خوش مذاق کے محبت، میلے چیلے، تہذیبی اور موسیقی جہاز اس دور کی اجتماعی زندگی میں نکاح و رست کے پر لطف مواقع تھے۔ آبرو کو بھی یہ مواقع بڑے عزیز تھے۔ ان کی شاعری میں ہنسٹ اور ہولی، عید اور نوروز ہر طرح کے عمومی آجواہروں۔ عذریات کا ثبوت دیتا ہے۔“

آبرو کی شاعری ایہام گوئی میں ایک خاص مقام پر پہنچتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں سچے اور پر خلوص جذبات کی کمی نہیں۔ نمک ہے کہ ان کے یہاں کوئی لکھی نگار نگار نہیں لیکن ایک سنگ پر ان کی شاعری اتنی صنعت گری کے ہار جہز دل کو گھینتی ہے۔ آبرو نے ہندی الفاظ خوب خوب استعمال کئے ہیں۔ بگڑے ہندی ادب و رسوم کو بھی اردو میں برتنے کی کوشش کی۔ چند اشعار موصوفے کے طور پر درج کر رہا ہوں:

دل کو غنچے کے کھول دیکھا
شوق پالا نام تھ لب کا

غزلوں، آبرو کو چاک دل دت سوں نکلا ہے
کہو کیا حال ہے دشت جوں میں اس دلائے کا

میر نے بھی اس طرح رائے دی ہے۔

”شعر ہزل خودی داند و مردان را بہ خودی آورد و خودی شعر بد مگر گاہے مجھے کی کر۔“

بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ناجی شیدہ تھے۔ چنانچہ ان کے کلام سے بھی ان کے مسلک کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں صرف دو شعر نقل کرتا ہوں:

شیدہ عشق ہے ناکی مرا دل

کہ یہ مٹا ہے خاک کربلا کا

مومنوں کے سدا چوں دل تسبیح

ہجر سے یہ کربلائی ہیں

افتخار بیگم صدیقی نے ناجی کی شاعری کا جائزہ دیتے ہوئے ان کی شاعری کو بیش کوش اور خوش و فنی سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے یہاں عشق کا تصور بھی باریک و پیچیدہ ہے لیکن یہ جسم و جان کا عشق ہے جس میں اخلاقی اقدار پار نہیں پاتے۔ یہاں یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ امر و نہی اس زمانے کی ایک خاص روش تھی۔ ناجی بھی اس میں جتا تھے۔ ظاہر ہے اس کا اثر ان کے تصور عشق پر بھی پڑا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہوا:

تمہیں حسن کا دکھ کروں

کہوں مردوں کی کے پچھے گوروں سے

ایک اور شعر دیکھئے:

نزدیک اس کے نہیں منسوب دین دے کوں عاشق کے

معادے غلام ہے لڑکا شمع کر لیتا ہے برساتی

لیکن ناجی کے یہاں ہندوستانی عناصر کی بھی کارفرمائی خاص طور سے ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے مثنوی کی مکاشفہ بھی خوب خوب کی ہے۔ اس باب میں سید جعفر گھنٹی ہیں۔

”ناجی ایک باشعور اور عصری حیثیت سے بہرہ ور شاعر تھے۔ اپنے گروا فنی کے حالات و

روحانیت اور پیچ و خم سے آگاہی رکھتے تھے۔ ان کے بعض اشعار میں اپنے دور کے ہندوستانی اعتقاد،

عقائد و فانی عالمی اور اس کی پیش پرستی اور بے حسی سیاسی اعتدال اور اخلاقی منزل کی طرف

دیکھنے والی میں کسی کی پختہ نگاہیں، رائے بروہ کی تنقید

اور اس کی خاطر تمہارے سناٹا بھکاری اپنا برتاؤ بنانا

ملی ہے، جی پر برد کی کاٹھیں، تلچھو تلچھو کر تائیں راتیں

تمہاری بخت میں نہیں جانی بائیں، اکارت اپنا جسم منوایا

شا کر ناجی

(۱۶۹۳ء — ۱۷۴۷ء)

جن لوگوں کے نام پر اہم مثنوی کے سلسلے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان میں محمد شا کر ناجی کی حیثیت نمایاں ہے۔ ان کے حالات زندگی کی تفصیل نہیں ملتی۔ خاندان کے احوال بھی معلوم نہیں ہیں، پھر بھی بعض تذکرہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے ان کی بنیاد پر چند باتیں کہی جاسکتی ہیں۔

محمد شا کر نام اور ناجی تخلص تھا۔ اتنی بات طے ہے کہ ناجی تذکرہ ہندی، بخش ہندی، تذکرہ شعرائے اردو اور دوسرے تذکرہ نگاروں سے معلوم ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے سید محمد شا کر لکھا ہے اور قاسم نے اپنے ’مجموعہ نقوش‘ میں محمد شا کر درج کیا ہے۔ جہاں واضح ہوتا ہے کہ ناجی سید تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ جو انہیں کے اپنے اس شعر سے واضح ہے:

اگر عشاق ہو ملنے کے ناکی کا خن س کر

تو ہوگا شاد جہاں آباد اے غولیاں وطن میرا

ناجی کب پیدا ہوئے اس پر بھی اتفاق نہیں ہے لیکن تذکرہ نگاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات جوانی ہی میں ہوئی تھی۔ بحث و مباحثہ کے بعد صرف ان کی پیدائش کا اندازہ لگایا جاتا رہا ہے۔ قاضی میاں لودھی نے ناجی کا سن ولادت ۱۶۹۳ء طے کیا ہے اور وفات ۱۷۴۷ء لیکن افتخار بیگم صدیقی، جنہوں نے دیوان شا کر ناجی پر تحقیقی کام کیا ہے، اس تاریخ سے اتفاق نہیں کرتیں۔ ناجی کا پیشہ برگری تھا اور نوآبادی میں خاں انجام کے مطبخ کے داور تھے۔

شا کر ناجی کے چہرے پر چپکے کے داغ تھے یا اطلاع ملے گی تو کراں سے ملتی ہے۔ حراج اور سیرت کے بارے میں جو اطلاع حاصل فرام ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شریعہ اور طریقہ تھے، خوش طبعی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ خوش طبعی اور بڑی نجی ایک طرف لیکن بھوکٹی اور حیرت ماری کے سبب قدرے بدام بھی تھے۔ ”عقائد اشعارے ہند“ میں کریم الدین نے ان کے بارے میں اس طرح لکھا ہے:-

”بہت شریع مزاج تھا ہر کسی کی جھوٹا تھا۔ راہ چلتے سے لڑتا تھا۔ ہر ایک سے بھڑاتا تھا۔ اس سے

نجات پائی مشکل ہو جاتی تھی۔ بجائے ناجی کے اگر پائی تھیں کرتا تو میرے نزدیک بھر تھا۔“

اشارے ملتے ہیں۔ بانی نے ایک شعر آشوب بھی لکھا تھا جو مکمل حالت میں دستِ پاب نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ بانی اپنے دور کے غوطہ خور اس کی دیگر کون حالت کو قحی شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ بانی اپنے دور کی سماجی انتہی، اس کی بے معنی زندگی، غم و غم کی بے قدری اور سماج کے اعلیٰ طبقے کی بے حس کے بارے میں کہتے ہیں:

سوائے گنہگار نہیں ان کو تک دور کی بوجھ
عجب قراش ہے اس دور کے سروں کا

بہت فائل ہیں صاحبِ نوبت اور سب بند کے راجے
لگے نہیں علاقوں سے مگر جس سر پہ آہ ہے

جیسا خوشامد طلب سے اہلِ دول
غور کرتے نہیں بحر کی طرف "

کاش کہ بانی کے یہاں رکاوٹ اور ابتلا اس درجہ نہ ہوتا:

لگے سے گل کے چنگے کب ہو ہمدوش
قیامت اس جن کو گدگدائی ہے

مگر نہ ہو کے رات رہا نہیں رقیبِ پاس
رہنے کی ہے دلیل یہ جاہِ پُشا ہوا

خائفِ پاس تن سینہ ملا
بہانا ادب کی کا بے کا ہے

لکھنؤ میں اس کا احساسِ دالہ ہے کہ بانی کے یہاں روحانی اور بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔ حالانکہ ایہام کو شاعروں کے یہاں صنعتِ گہری پر توجہ زور دینے کی وجہ سے روحانی غائب ہو جاتی ہے لیکن بانی کا ایک اچھا خاصہ کام ایہام کو بے مہارت ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مختلف صنعتوں کو خوب خوب رہنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اور پانچ اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کی شاعری میں صریح کارئی نمایاں ہو گئی ہے:

کہے یہ تاب جو اس کی چلی میں رہے ظہور
دوسرے طور ادبی ہے لیکن تیری کمر بوی

کیا گرم ہو کے برقِ ساہم پر کڑک گیا
آخر کو سن گھٹا کے ہمارے بھڑک گیا

شرابِ سرخ ہے زارِ ست رنجیلے
ہوا جاتا ہے تو کیوں زور دینا لے

بہر طور غزل کے علاوہ بانی کے یہاں دوسری صنعتیں بھی خوب یاد دہانی ہیں۔ انہوں نے قصیدے بھی لکھے ہیں، مگر یہ بھی بشرِ آشوب، داسوخت، قطعات و رباعیات اور نظمیں بھی۔ ان کی تحصیلِ طالعہ کرتی ہوئی "ایمان شاہ" نامی "مہرِ تب" انھیں قلمِ مدحی کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اس سے پہلے انھیں فضل حق نے اسی سلسلے کی کاوش کی تھی جو مکمل نہیں ہوئی۔

ظہور الدین حاتم

(۱۶۹۹ء - ۱۷۸۳ء)

حاتم مختص تھا اور دہلوی بھی لیکن حاتم کو ترجیح حاصل ہوئی۔ ان کے والد شیخ علی الدین کا آبائی وطن دہلی تھا۔ حاتم ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ ولادت کا مادہ "ظہور" ہے۔

حاتم کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں تحصیل نہیں ملتی لیکن اعزاز ہے کہ انہوں نے زمانے کے مطابق تعلیم حاصل کی ہوگی۔ پیشہ پگری تھا۔ ساتھ ساتھ شاعری سے رجعت خاص تھی۔ ۱۷۳۵ء میں خوابِ ادارتِ الملک امیر خاں کے ہمراہ جبہ جینہ دہلی امیر نور الدین خاں سے وابستہ ہوئے۔ ۱۷۴۵ء میں اس طرح کی ملازمت ترک کر دی اور روزِ پیشہ ہو گئے۔ لیکن پہلے داد بخش دینے تھے اور اسی طرح کی زندگی گزارتے رہے تھے جس میں آرام و آسائش کا پہلو حاوی تھا۔ ۱۷۳۶ء میں انہوں نے دوا کی نگینیں لکھیں جن کی خاص اہمیت ہے کہ ایک نظم قبوہ پر "وصفِ قبوہ" ہے اور دوسری نظم میں قبوہ کو موضوع ہے اور نام ہے "وصفِ قبا کا"۔ حاتم نے ایک طویل مثنوی "بزمِ عشرت" بھی تخلیق کی۔ چہرہ شاہ کی مدح میں ہے اور اس زمانے کے ماحول کی تصویر کشی بھی کرتی ہے۔ جس میں رنگ و آغوش کی بڑی اہمیت تھی۔

حاتم کی رسائی و رہا رہے تھے لیکن ان کی صحبت امرا اور دوا کے علاوہ ہندوستان سے بھی تھی۔ لیکن طرفِ تراشہ قفا کی ایک طرف تو زندگی بزمِ عشرت کی تھی دوسری طرف درانی کی بود بخت کی تھی۔ اردو ناول، فقیران اور دیگر فنون کے لئے ان کے دل میں بڑی مہارت تھی۔ مشہور ہے کہ موصوف باہل علی کے عجیبے پر اکثر حاضر ہوتے۔ اور جب ملازمت سے

نیکو دل ہوئے تو مستحق آستانہ مرشد سے وابستہ ہو گئے، جہاں انہیں شرف عطا کیا گیا۔ دانشجو کو شاہ حاتم سلسلہ فردوسیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اب ان کا کام عبادت و وظائف تھا۔ گو زبان کی زندگی و خصوصیات میں تقسیم ہوتی ہے۔ ایک نصف وہ ہے جو پیش و عشرت سے عبارت ہے تو دوسرا درویشی اور فقیری سے۔

شاہ حاتم کی اضداداری کے بارے میں بھی اتفاق کرتے ہیں۔ اچھے لباس زیب تن کرتے، اصناف سحر سے رہتے، دینے، پینے، خیر کھا دینے، دستار باندھتے تھے۔ جب شاہ بادل کا انتقال ہو گیا تو درویش شاہ نسیم کے عجبے پر آ گئے۔ غرض کہ درویشی اور فقیری ان کی آخری زندگی کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ اس سلسلے میں نظام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:-

"یہاں سے شاہ حاتم کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جو قلندری و درویشی سے عبارت ہے۔ وہ دخت پابند شروع تھے۔ صوم و صلوة میں پابندگی تھی۔ سکرات سے توبہ کر لی تھی۔ البتہ لباس میں انکساست تھی۔ بہت پاک صاف رہتے، آزادوں کے خلاف دانشجو پینتے دکھا دے دستار باندھتے اور ایک بار ایک چٹری اور روہالی کے آزادوں کا شعرا ہے۔ اپنے ساتھی رکھتے تھے۔ شاہ بادل کی وفات (قریب ۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۰ء تا ۱۷۶۳ء تا ۱۷۶۴ء) کے بعد شاہ حاتم ایک دوسرے درویش شاہ نسیم کے عجبے (شاہ راہ راج گھاٹ پر تاحہ معنی کے زیر دیوار) میں تشریف فرما ہو گئے۔ شاہ حاتم کی رویتا زندگی کے دور میں بھی آمر اور مہمان کی تعظیم و تکریم کرتے رہے۔ چنانچہ شاہ و گائیکر تائی، ملا مالک، نواب خاں، خاں وغیرہ کا ذکر انہوں نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ شعر و سخن سے دلچسپی اس دور میں بھی قائم رہی اور وہ شاعری مجلسوں میں شریک ہوتے رہے۔"

اگر شاہ حاتم کی شاعری پر غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ یہ ایک وقت فارسی کے بھی شاعر ہیں اور اردو کے بھی اور انہوں نے ریختہ کی طرف دلی کسوت دہان کی دلی چٹنے سے پہلے ہی توجہ کی تھی۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ محمد شاہی عہد میں ایہام گوئی، انفرادیت، ایک مزاج، چٹکی تھی۔ اکثر شعرا اس سے متاثر تھے۔ حاتم نے بھی اثر قبول کیا اور خوب کیا۔ لیکن ایک اہم شاعر کی حیثیت سے ان کا دیوان ۱۷۳۱ء ہی میں مرتب ہو گیا۔ اسے شہرت بھی نصیب ہوئی۔ لیکن حاتم ایہام گوئی کے دائرے میں زیادہ دن نہیں رہ سکتے تھے۔ جب اس کے خلاف رد عمل شروع ہوا تو وہ بھی جانب دے گئے اور شعر کہنے کے لئے فطری انداز اختیار کر کے کوہ قدم چانا۔ کچھ دنوں کے بعد حاتم نے ۱۷۵۵ء میں "دیوان زادہ" کے نام سے ایک دیوان مرتب کیا۔ تہ نام دیوان اور "دیوان زادہ" کا معنی لڑکھانے تو اندازہ ہوگا کہ کچھ پرانے اشعار نظم زد کر کے اور کچھ اشعار نئے خود ہی اصلاح کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "دیوان زادہ" ان کے قدیم دیوان کے مقابلے میں مختصر ہو گیا۔ سب سے اہم عبارت کہ انہوں نے ایک دوسرا کچھ قصیدے لکھے، جس میں "زادہ" کا اصلاح کے سلسلے میں دانا، بونٹ، چتر و کمار

"دیوان زادہ" کا ایک ٹکڑا خجاب و خیر رتی لاہوری کی عمر ہے اور بقول انصار اس سلسلے کا چنانچہ آخری مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے آخری دنوں کا بھی کلام شامل ہے۔

"دیوان زادہ" میں مرتب ہوا ہے کہ اس میں مختلف قسم کی تعلیمات بھی درج کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ حاتم کا فارسی کلام بھی ایک مخطوطے کی شکل میں علی گڑھ یونیورسٹی میں موجود ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ حاتم نے دلی ترقی کی بدولت ہی ہے لیکن فارسی کے سلسلے میں مرزا اصحاب ہی ان کے استاد ٹھہرے۔ شاہ حاتم ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے آج مشہور ہیں۔ ان کی شاعری کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس میں ان کے زمانے کے حالات کی نہ کسی طرح سے یاد پائے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ حاتم نے ایک ہی عمر پائی تھی۔ لہذا ان کے عہد کی کیفیت کی تعظیم کے لئے ان کی شاعری ایک عام وسیلہ ہے۔

شاہ حاتم میں تو غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے "شہر آشوب" بھی تصنیف کیا ہے۔ نظمیں بھی لکھی ہیں جو اپنے دور کے بعض اہم مقامات کو شاعری کے ذریعے نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ حاتم کے پہلے دور کی شاعری ہی کو ایہام گوئی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دوسرے دور میں دلی عشقیہ واردات اور صوفیانہ خیالات ہیں جو شاعری کا اور خصوصاً غزل کا عمومی مزاج ہے۔ لیکن حاتم کی ایسی شاعری شہت اور دلی ہے جس میں غم و الم کی کیفیت جاری و ساری ہے۔

شاہ حاتم باہر لسانیات تو نہیں لیکن انہوں نے اس دیرپے میں زبان و جان اور دوسرے کے عوارض اور دوسرے امور پر اپنا موقف پیش کیا۔ انہوں نے بعد دی زبان یعنی بھاکھا وغیرہ سے اپنے آپ کو الگ کیا اور دوسرے کو اپنے کلام کا طرہ امتیاز بنایا۔ غلام حسین ذوالفقار کا بیان ہے کہ:-

"شاہ حاتم نے ان اصلاحات کے مطابق دیوان زادہ کو ترتیب دیا۔ البتہ مثنوی، غزل اور محفل وغیرہ اشعار دیوان قدیم کو بے ستور رہنے دیا۔ حاتم کے ان خیالات سے اس دور کے لسانی تحریکات کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے قبل شاعری میں زبان کا کوئی معیار قائم نہ ہوا تھا۔ اس میں مختلف یوں کا ملبوس تھا۔ محمد شاہی دور کے ادبی مذاق نے دلی کی با محاورہ زبان کو معیار کی اور فصیح قرار دے کر نامور لوگوں اور نامور لفظوں کو متروک قرار دیا۔ (اگرچہ اصلاح زبان کی اس تحریک کی تکمیل کھنڈ میں شیخ امام بخش، امام غازی کے ہاتھوں ہوئی) اس طرح اردو زبان و ادب کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔"

بہر طور میں کلام حاتم سے کچھ اشعار نقل کر رہے ہیں جن سے ان کے مزاج و دستان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے جو مثنوی حق پر لکھی ہے، اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:-

تہا کو کو نہ جانوں کیا سبب ہے
تا ہے گڑ میں کیوں گڑ طلب ہے

طلب ہے غزلی اس کوں اس سبب سے
 ملا دے غزلا سے پیارے کے لب سے
 خاکِ لبِ غزلِ مجزا کر ہم پایا
 ہر اک نے چاہ کر حب منہ لگایا
 کہے وقت کہ تمہا کو کیوں چلے ہے
 کہ مجھ جہل ترے پاؤں تلے ہے
 تمہا کو نے کہا حق سے جہل کر
 برا کی بات ہے من آہنیں کر
 آہن میں جان اور جوئی جلاوے
 جہن میں ملحق کے لب گل کہا دے

ایہام کا ایک شعر بھی یاد رکھو:

بولی زبان ال ترے ہاتھ سے کھاتے بیڑا
 کیا قبولِ چاہ کے کھلاتے تھے تجھے پاؤں کے بیچ

وعدت الودعہ کے متعلق ان کے اشعار یاد رکھو:

کہیں گل ہے کہیں نہیں باغ
 کہیں درد اور کہیں دریاں ہوا ہے
 کہیں مسجد کہیں بہت خانہ ہے رو
 کہیں کفر و کہیں ایمان ہوا ہے
 کہیں غلطی و کہیں غلطی عالم
 کہیں ظاہر کہیں پنهان ہوا ہے

اعضا کے نام یہ ہیں: دھند، شام، کاکل، وزلف، چھین، چھین، گوش، ہارو، چشم، ہر ایک، ہر گاہ، بچی، ہر خسار، خیال،
 دامن، لب، دندان، زبان، زخم، چاہ، تر، گز، گز، دوست، دما، زرد، شہ، نکست، پہچان، سین، دھند، کمر، مقام، گھوٹ، ساق،
 ہاتھ، کف، پاؤں، دست، ناز، تبسم، خرام، گھوٹ، نعل، ہنس۔

شاہِ عالم ۸۳ء میں فوت ہوئے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ "عقدِ ثریا" میں تاریخِ وفات قلمبند کی ہے۔

سال تاریخ از خود رسم
 ہجری این مصرعہ کو ختم خود
 کہ جو مصحفی جو پر سلاط
 تو صد حیف شاہِ عالم مرد

ڈاکٹر زور نے نقلی سے ان کا سہ ماہی ۱۲۰۲ء لکھا ہے۔ اس کی اصلاح فاضل عبدالودود نے رسالہ "معاصر"۔
 پتہ جنوری ۱۹۵۱ء میں کر دی ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو

(۱۶۸۷ء - ۱۷۵۶ء)

سراج الدین علی خاں آرزو ایہام گو شعرا کے نام سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح کے شعر کہنے والے آخر بھی
 تھے، جنہوں اور کچھ بھی۔ ظاہر ہے یہ قیول آرزو کے شاگرد تھے۔ اتفاقاً انہیں بلکہ ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی مثلاً
 حجاز، بکرو، طاہر، حسن، ندوی، وغیرہ آرزو کے شاگرد تھے۔ گوہر ان کے شاگردوں کے شاگرد کی بھی تعداد خاصی رہی ہے۔
 میں نے ذکر کیا ہے کہ میر بھی خاں آرزو کے شاگرد تھے، لیکن خود میر نے تصدیق چائی اور انکار کلمہ سے کام
 لیا ہے۔ اس باب میں غیر معمولی خاں آرزو کے شیوہ کلمہ اور انکار کلمہ کے قافیے چنی اپنی مضمون۔ اس کی "زبان و سب"۔
 پتہ (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء) میں شائع کیا گیا۔ اس میں "انکاسا شعرا" اور "ذکر میر" کے سہ ماہی سے میر کی تصدیق پائی، جو دشمنی
 ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ مولوی میر تقی، قاضی میرا، وود، مالک، رام، منظور، آدو، رنگی، دوسرے لوگوں نے اس کی وضاحت
 کی ہے کہ کس طرح میر نے انتقاد کے بعد خاں آرزو کے سلسلے میں جھوٹ اور کذب سے کام لیتے ہوئے انکار کلمہ کیا
 ہے۔ یہاں پانچواں مقدمہ دے دے کہ خاں آرزو شعروادب کی ایک بہت بڑی شخصیت تھی۔ یہی نہیں کہ ایہام گوئی کے لئے ایک
 راہ متعین کی بلکہ ان کی دوسری ضد بات بھی اتنی گرفتار ہیں کہ انہیں کبھی فراوانی نہیں کہا جاسکتا۔

سراج الدین علی خاں کا اصلی نام سراج الدین علی تھا نیز خطاب استادِ خان۔ یہ خطاب استادِ رام ظفر نے
 دلوا یا تھا، لیکن استادِ رام کا بیڑ نہ ہیں۔ بلکہ اس کی جگہ خان نے لے لی۔ آرزو کے اصناف کا وہن گوہر اور تھا، لیکن آرزو
 ۱۶۸۷ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حسام الدین تھا، انہوں نے علی آرزو کی تاریخِ ولادت "المستزلی

غیب سے نکالی۔ آرزو اپنے والد کو عالمگیر کا منصب دلواتا ہے۔ لیکن "اشعر عشق" میں ہے کہ وہ عالمگیر کے غلی تھے۔ آرزو کا سلسلہ نسب والد کی جانب سے شیخ کمال الدین یعنی شیخ العبد الدین چورنگ دہلی سے وابستہ ہوتا ہے۔ ماں کی طرف سے خیر خواہ گویاوی تک۔

آرزو دسب چارہ سال کے تھے تو شعر کہنے لگے اور میر عبد الصمد غنی کی شاکرودی میں آگئے۔ پھر میر نظام علی احسن ان کے استاد ہوئے۔ کچھ عرصہ گزرا جانے کے بعد دہلی اور گنگوڑی کے لشکر کے ساتھ دکن چلے گئے لیکن ابھی نو سینے شا گزرے تھے کہ وہاں آگئے اور گویا راجہ میں قیام کیا۔ بہادر شاہ کی تخت نشینی پر پھر وہاں آکر آباد آئے اور تقریباً پانچ سال سولہ ہوا والدین سے فقط قسم کی کتابیں پڑھیں۔ فرخ میر کے زمانے میں سرکاری خدمت پر مامور ہوئے۔ پھر سزہ دل ہوئے۔ لیکن بہادر شاہ کے عہد میں اخبار نویس کی خدمت انجام دیے گئے۔ ۱۸۵۷ء میں آرزو دہلی آئے یہاں ان کی ملاقات آستاندرام مجلس سے ہوئی جنہوں نے منصب اور چاکر کے علاوہ خطاب بھی دلایا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ مستور جنگ کی وفات کے بعد اودھا گئے پھر شجاع الدولہ کے ملازم ہوئے۔ ان کی تصانیف مختلف جہات کی ہیں مثلاً "دیوان آرزو"، "مشکوٰۃ شورش عشق معروضہ بہ سوز و سادہ"، "مشکوٰۃ جوش و خروش"، "مشکوٰۃ مہر و ماہ"، "افسانہ ہجرت"، "اور" عالم آب"، "سراج اللغات"، "خیابان شرح گلستان سعدی"، "شرح سکندر نامہ"، "شرح قصائد عربی"، "اور تنقید میں" حسب الطلبین"، "سراج معین"، "دارخانی"، "بلاغت میں" مفید کبریٰ"، "توابع میں" معیار الافکار"، "تذوال الفوائد"، "مخطوطات میں" پیام شوق"، "اور" لغات آرزو"، "تذکرہ میں" مجمع الفاسی"، "دستاں میں" آداب عشق"، "گلزار خیال"، "آرزو" آرزوئے عشق"، وغیرہ۔ انہیں تصانیف کی بنیاد پر انہیں شعر و ادب میں ایک ارفع مقام حاصل ہے۔ جملہ جاہلی کہتے ہیں:-

"خان گزرا و شاعر بھی تھے اور عالم افکار، ماہر لسانیات محقق اور لغت نویس بھی۔ وہ فارسی، اردو اور سکرست کے علاوہ کئی علاقائی زبانوں مثلاً پنجابی، پرتگیزی، ہندوستانی اور اودھی وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ موسیقی، فنِ تاریخ، گوئی اور علم عربی میں بھی استاد کی کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں حد درجہ خوب ہے۔ فارسی میں لکھے جانے کے باوجود ان تصانیف کا اردو زبان و ادب پر گہرا اثر ہے۔ اس اثر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس دور میں تعلیم یافتہ لوگ فارسی زبان سے اس طرح واقف تھے جس طرح آج کے تعلیم یافتہ انگریزی زبان سے واقف ہیں۔"

صحفی کی روایت ہے کہ انہیں "ملک اشعرا" کا خطاب حاصل ہوا تھا۔ آرزو ریختہ گوئی کی طرف بہت کم رجحان رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہوں میں ان چندہ اشعار سے زیادہ نہیں لیتے۔ فرخ کر آرزو کا اردو میں کوئی دیوانہ نہیں ہے۔ سیدری نے لکھا ہے کہ دیوان فارسی اور ہندی رکھتے تھے لیکن آرزو کا کوئی دیوان آج تک نہیں ملا۔ واضح ہو کہ میر جیسے شاعر نے انہیں استاد اور پیر مرشد کہا ہے یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے استاد سے رشتہ تو فیلا۔

میر کے علاوہ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کی تعریف و توصیف کی ہے۔ ذاکر ملک حسن اختر و قطراز ہیں:-

"تذکرہ نگاروں نے ان کی بے حد تعریف کی ہے۔ میر نے انہیں "استاد اور پیر مرشد کے علاوہ

ایجاز پر دستِ شاعر اور عالم گزرا دیا ہے جس کا کافی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ میر حسن کہتے

ہیں کہ میر خسرو کے بعد ان جیسے صاحبِ کمال، پرمکوار خوش گویا ملک پیدا نہیں ہوا۔ اور آرزو

کے خیال میں خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دھڑکی پہنچتا ہے جو کہ اردو طوطا و منقش پر ہے

شورشِ فتنیں سر آمد شاعران ہندوستان اور ملک اشعرا کہتے ہیں۔ ان کا اندوکام زیادہ نہیں

ملا۔ اس لئے ان کی شاعری پر مطلق تبصرہ کرنا ممکن نہیں۔ جو کلام تذکرہوں میں ملتا ہے اس

میں ایہام گوئی کے متعلق زیادہ شعر نہیں ہیں۔ غالباً تذکرہ نگاروں نے ایسے اشعار نقل

کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اس وقت ایہام گوئی کا رواج ختم ہو گیا تھا۔"

واضح ہے کہ آرزو کے گھرانہ شاہد شعری مجلس یعنی مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اسی حوالے سے "لغات اشعرا" میں

ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک مشاعرے میں سوانے ایک غزل پڑھی، اور اصل یہ شعر فارسی کا تھا لیکن سوانے اسے

اپنے طور پر ترجمہ کیا تھا اور اسے اپنا شعر بار کیا۔ حاجی محمد خاں قدسی کی مجلس میں ایک آدمی ایسے بھی تھے جنہوں نے سوانے

مرنے کا اصرار کیا۔ لیکن اس موقع پر آرزو آواز دے کر ان کی تادیب یہ شعر پڑھا:

شعر سوادِ حدیثِ قدسی ہے لگو دیکھیں چاہئے فلک بہ فلک

میں ذیل میں آرزو کے چند اشعار نقل کر رہی ہیں جن سے ان کے حیرانِ شاعری کا ایک اندازہ ہو سکتا ہے:

یہ بات یہ غور لائیں میں تو نہ تھا

کیا تم جیوان ہو کے بلاے آدمی ہوئے

سے خانہ حج چاکر شیشے تمام توڑے

زاد نے آج دل کے اپنے بچھو لے پھوڑے

وہ عرق میں دوبا تھا صاف قن کے تگے

موتی نے کان بکڑے تیرے رخ کے آگے

اپنی نسوں مری گئی کہ اب ہم تو ہار بیٹھے

ہار گیا یہ کہتا اس دہلیا ہری کو

اب خواب میں ہم اس کی صورت کو ہیں ترستے
اسے آہرو ہوا کیا بختوں کی یادری کو

رات بیدارنے کی الفت مٹی روتے روتے
شع نے جان دیا صبح کے ہوتے ہوتے

دارغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاسم
ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا جھوٹے جھوٹے

شیخ شرف الدین مضمون

(۱۷۳۵ء-)

شرف الدین نام اور مضمون تخلص تھا۔ اکبر آباد کے قریب نصب جان مویشیہ آباد تھے۔ شیخ فرید الدین گنج شکر کی اولاد میں تھے۔ اس کا ذکر انہوں نے خود کیا ہے:

گرداں کیوں نہ شکر ہوں کو مرید
کہ دارا دارا ہے بابا فرید

جان مویشی ابتداً فی زمانہ گدرا۔ جب جوان ہوئے تو شاہ جہاں آباد آ گئے۔ بعض تذکرہ نگاروں سے پتہ چلتا ہے کہ مضمون نے دو پائے جتنا کے کنارے زینت المساجد میں سکونت اختیار کی۔ جب ۳۰ سال کے ہوئے تو دل میں ایک دوسری فطرت پیدا ہوئی اور دلہائش ہو گئے۔ میر نے انہیں نوکر پوش لکھا ہے لیکن قاسم انہیں سپاہی پوش کہتے ہیں۔ میر حسن کے مطابق عماد الملک نواب امیر خاں کی ملازمت میں بھی رہے ہیں۔ مضمون اپنی شاعری کے سلیسے میں اصلاح مرزا ظفر جان جاناں اور خان آرزو سے لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں نزل بہت ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ انہی سبب ان کے حارسہ داشت جھڑکتے تھے۔ لہذا انہاں آرزو انہیں مذاق سے شاعر بنادیا کرتے تھے۔

مضمون صوفی مسلک ہونے کی وجہ سے مجدد و دست تھے۔ لوگوں سے اخلاقی اور گروہی ستلا کرتے تھے۔ شعر کے خرقان کے یہاں حاضر ہوتے اور کسب فیض کرتے۔ قاسم کے بارے میں ہے کہ انہوں نے کئی بار مضمون کے یہاں حاضر فیض دیا۔ ان کی وفات ۱۱۳۵ھ یعنی ۱۷۳۵ء میں زینت المساجد میں ہوئی۔

ایہام گوشا عمر کی حیثیت سے ان کا بھی ایک خاص امتیاز ہے۔ ان کے ہاں میں کچھ اشعار تھے یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔ شیف اورنگ آبادی لکھتے ہیں کہ ان کا دریاخان سرمدیت پر مشتمل تھا۔ (پہوال "ہستان شعر") لیکن میر نے یہ

میر نے ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ ان کے تین الفاظ سے واضح ہے کہ وہ شاہی الفاظ و زبانی کے متعلق تھے۔ گویا صنعت گری اور مضمون آفرینی کی طرف خاص توجہ تھی اور الفاظ کو کلاںف حتیٰ میں استعمال کر کے پیچیدہ صورت پیدا کرنے کے قائل نظر آتے ہیں لیکن بعض اہم شعرا نے بھی انہیں کھل کر رداری ہے۔ انہیں ایک سودا بھی ہیں۔ ان کی موت پر سوراٹنے پر شعر کہی تھا:

جانکس اٹھ نہیں یادیں نزل کے خوب کہنے کی

سپا مضمون دنیا سے رہا سودا سو دیوانہ

مضمون کا کام سادگی اور بے ساختگی سے خالی نہیں۔ مضمون نے ان کے کام کی بے ساختگی اور فطری اعجاز کو نکال کر دکایا ہے۔ لیکن جی ہاں یہ ہے کہ مضمون کے یہاں ایہام کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں سب پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے رعایت لفظی سے خاص طور سے کام لیا ہے۔ اپنی ایہام کوئی پر مضمون کو بنا رہے تھے۔ انہیں کا شعر ہے:

ہوا ہے چک میں مضمون میرا شہید

طرح ایہام کی سب سے نکالی

جس عہد میں مضمون شعر کہہ رہے تھے اس عہد کا طراز ہی مضمون آفرینی کی طرف تھا۔ خیال میں نہرت پیدا کرتا ہوا کمال سمجھا جاتا تھا۔ مضمون ایک اہم ایہام گوشا و شہید کے چاہتے ہیں جن کا اپنا طراز اور طریقہ کار تھا۔ شعری بے خطا ہی تھی جو ایہام گوشا و شہید نے تشکیل دی تھی۔ ان کے چند اشعار بھی ذکر رہا ہوں:

ہم نے کیا کیا نہ تڑے غم میں اے محبوب کیا

میر ایوب کیا ، گرچہ یعقوب کیا

کوئی اس جنس کا دلی میں فرید نہیں

دل تو حاضر ہے لیکن کہیں دلور نہیں

کیا سمجھ لیلیٰ نے ہندما ہے ہمیں میں آشیان

ایک تو گل ہے ادا اور شش پہ ہجر ہامیان

اگر پاؤں تو مضمون کو رکھوں ہاندہ

کروں کیا جو نہیں گنج مرے ہاتھ

کمرے ہے دار بھی کمال کو سہ حاج

ہوا منصور سے نکلتا یہ حل آج

چلا کشتی میں آگے جو مرا محبوب جاۓ ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی نئی ادب جاۓ ہے
افسوں یار صحت پت پتے ہیں دل کو افوا
کئی ساحروں سے سیکھا زلفوں نے حیرتی لگا

مصطفیٰ خاں بکرنگ

مصطفیٰ خاں نام اور بکرنگ تخلص تھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں بھی نام لکھا ہے "تذکرہ اہم" میں
بھی لکھی ہے لیکن مصطفیٰ علی خاں کے دیباچہ میں ان کا نام غلام مصطفیٰ لکھا ہے۔ بکرنگ کا اچھا شعر ہے:
اے کو تم مت بوجھو اوروں کی طرح
مصطفیٰ خاں آشنا بکرنگ ہے
بکرنگ دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا خاں جہاں لودھی تھے اور بادشاہ کی ملازمت کرتے تھے۔
بکرنگ بھی دکن طبعی تھے۔ ملنے جلنے کا ایک خاص انداز تھا۔ اچھی سمجھتوں سے گھبراتے نہیں تھے۔ ان کی شاعری کے انداز
خان رزو تھے لیکن مرزا مظہر جان جاناں سے بھی اصلاقی تھے۔ اس سلسلے میں ان کا پتہ بیان دیکھئے:

بکرنگ نے حاشی کیا ہے بہت دلی
مقرر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

ایہام گو یوں میں ان کی بھی ایک خاص جگہ ہے۔ ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہے لیکن "نکات الشعراء" میں
اس کا اظہار ہے کہ ۱۵۵۷ء سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔

مصطفیٰ خاں بکرنگ صاحب دیوان تھے۔ تاہم نے اپنے تذکرے "تغزل نکات" میں ان کی ابیات کی تعداد
قریب ۵۰۰ بتائی ہے۔

بکرنگ کے کلام سے چند چھڑے کہ در ذیل کا اور الکلام شاعر تھے۔ ایہام گوئی کی وجہ سے انہیں بھی مستندوں
ت بنی، دلچسپی تھی۔ ان کے یہاں استعارات کا خاص نظام ہے۔ عشق کے مضامین انہوں نے قوارے استعمال کئے
پیرائے ان کے یہاں عشق جھلکی بھی ہے اور عشق تھازی بھی۔ بکرنگ صاحب دیوان شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کا
دیوان اسپر گرنے دیکھا تھا جس میں ۱۱۰۰ اشعار تھے۔

مضمون آخر میں کے باوجود بکرنگ کے کلام میں وہ دلی پائی جاتی ہے۔ دلی سے عاریتہ لفظی کے معیار ہی اشعار بھی
اور کے ساتھ ملے ہیں۔ آواز اور آواز کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا قصہ کہہ کر تھکا دیتا ہے۔

عشق بکرنگ کی ہوئی دشمن
صپ سے تیرا وہ دوست دار ہوا
سناٹا نہیں ہے ہات کسی کی تو اسے جن
تھک کو ترا غرور نہ جانوں کرے گا کیا
بکرنگ شمع دائم تھک نہیں میں
جن روئے بھرے ہم انجن میں
پارسائی اور جہائی کیونکہ ہو
اک جاکر آگ و پانی کیونکہ ہو
نہ کہو یہ کہ یار جانا ہے
دل سے صبر و قرار جانا ہے
خیال چشم و ابرو کر کے تیرا
کوئی مسدود پڑا کوئی خرابات

ڈاکٹر جمیل جانی بکرنگ کے بارے میں اپنی رائے اس طرح قلمبند کرتے ہیں:-

"بکرنگ کی زبان صاف ہے۔ محاورے کی رچاوت اس کے کلام میں طاری ہے اور
مخصوصیت کے ساتھ شعر کا دورا مصرع اپنی برتری پر ہے سادگی کے باعث سننے ہی زبان پر
چڑھ جاتا ہے۔"

عبدالوہاب بکرو

(۱۷۵۰ء)

یوں تو تذکرہ میں ان کا ذکر ملتا ہے لیکن تفصیلات سے عاری، یہاں تک کہ میر نے بھی ان کے حلیے میں کوئی
خاص معلومات فراہم نہیں کیں، بس اسے یہاں کیا کہ انہوں نے دو تین ہائے کتابت میں دیکھا تھا۔ ان کے کلام کا بھی
ایک ہی نسخہ ابھی تک سامنے آیا ہے جو "دیوان جانا" کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور رشتہ میوزم میں ہے۔ اس نسخے سے یہ

اطوار، ہم پہنچتی ہے کہ وہ دہلی میں قیام پذیر تھے لیکن ان کا خاص وطن نام تھا۔ وہ اشعار جو ایہام کے ہیں ان کے وطن کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

کہو گے بے وفائی جان جو تم اس طرح سچا

تو نکرو جھوڑ دہلی راہ تب عام کوں لے گا

جی ہو اصل ہائی سے صدارت (ہو) تب

ترا نکرو شامی ہے نہیں ہرگز سامنے کا

نکرو کی وفات ۱۷۷۷ء کے آس پاس معین کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی سند نہیں ملتی۔

ان کے دیوان کے سلسلے میں بھی کئی امور ابھرتے رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے بہت سے اشعار نظم زد کر کے ضائع کر دیے یا کوئی جزو ان ضائع ہو گیا۔ جمیل جالبی نے خوب چند ذکا کے حوالے سے لکھا ہے کہ:-

”کئی مرتب اپنی منتخب فرمایات کو جمع کیا (اور ایک مختصر دیوان مرتب کیا) مگر ضائع ہو گیا۔ جب

اس نے دیکھا کہ یہ تقدیر کے موافق نہیں ہے تو اس نے شاعری بند کر دی۔“

لیکن اتحاد اذہب ہوتا ہے کہ آریہ، نکرو کے اصحاب تھے۔ نکرو نے آریہ کا ذکر متعدد اشعار میں کیا ہے۔ تین شعر دیکھئے:

نکرو من آریہ کے خلق رہتا ہے نادر

دے عاشقی کے ہائے زمانے کو ہر لمحے

من آریہ کے معرے نکرو ہوا ہے فکرے

اک بار پھر کہ کہ لے اپنی زبان سے کیا خوب

ہے فیض آریہ میں میری نظر بلند اپ

کیونکہ نہ ہمارے نکرو بھو فکر کوں رسائی

گویا نکرو ایسا ہے چاہے میں کہ ان کے استاد آریہوں کے شعر کی تعریف اپنی زبان سے کر دیتی اور یہ بھی کہ نکرو دراصل آریہ دہلی کے کام کا دار ہوا ہے۔ پھر یہ کہ ان کی نظر میں جو بلندی ہے دراصل آریہی کا فیض ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نکرو آریہ کے ایک ایسے شاعر تھے جس کے کام میں استاد کارنگ پاپا چانا ناگزیر تھا۔ گویا یہ ایک حد بندی تھی جو خود نکرو نے قائم کر رکھی تھی۔ نتیجہ میں ان کے کام کو بڑے بڑے وقت ہمیشہ زمین میں رہتا ہے کہ انہیں نہ نکرو آریہ کے اثرات ملے اور نہ ان کو جاسکتے ہوں۔ خاں صاحب نے بھی یہ کہہ کر اس کو رد کیا ہے کہ:

کسی دوسرے شاعر کا کام اتنا قبیح ہو کر سامنے آئے کہ انفرادی طور پر اس شاعر کا کوئی اثر قائم نہ ہو سکے۔

لیکن یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ آریہی نہیں بلکہ دہلی بھی نکرو کے لئے ایک تعلق کے حامل شاعر تھے، چنانچہ ان کے کام میں دہلی کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ جالبی لکھتے ہیں کہ نکرو ”ادبیت ایہام اور طرز وئی کی پیروی کا شاعر ہے۔ ظاہر ہے اس سے بیکر تہذیب لاہور جاسکتا ہے کہ نکرو کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ایہام کے شعر امتیازی کے آگے بھی خود بے بس تھے چنانچہ جذبات و احساسات فطری طور پر شعر نہیں بنتے۔ نکرو ہوں یا دوسرے ایہام گو شعرا ان کا طرز اور انداز زبان ایک دوسرے سے بہت مختلف نہیں۔ بہر حال، نکرو کے ایہام کے رنگ کی نشاندہی کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دقیقیاں آگ میں جل کر ہوئے راتھ

جیسی تک حرم ہو عاشق نے مھورا

سست آنکھیاں کا دیکھ دہلا

دلی مرا ہو گیا ہے مہورا

بریں نکرو کے کہوں نہ آیا ہوئے

دے گیا مجھ کوں سرو قد ہلا

گل بدن ہائے ہم میں کہوں دوسرا

ہم ترا لڑکے نہیں لیا دوسرا

بچتی جاتے ہے سرت میں جیہاں تہاں

غزل میری ہے اسے نکرو غزالی

صدر الدین خاں فائز دہلوی

(۱۷۷۹ء - ۱۸۳۸ء)

صدر الدین خاں، نام اور فائز تخلص، نواب ڈیر دست خاں کے صاحبزادے تھے اور ان کے والد نواب ایراکم خاں مہاراجا جالبی کے ایک اہم امیر تھے۔ چلی مردان خاں کے بیٹے اور شاہی منصب دار تھے۔ فائز اپنے وقت کی ایک بہتر شخصیت تھی۔ ان کے خاکہ ان کے افراد اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ لیکن ان رنگ و بپ کے بعد جو خلیہ سلطنت کی کیفیت ہوئی، اس سے فائز کا خاکہ ان بھی خاصا متاثر ہوا۔ ان کے قلم سے خاندانی انشعاریں برخواستہ ہیں، وہ کچھ ایسا لکھتا کہ

یہ اس نمکنت سے بچتے جو ان کا شعار و باقلا جاگیر بھی جو تھی وہ بہت معمولی تھی۔

قائز کی ولادت کب ہوئی اور موت کب اس مسئلے میں تہ کر کے خاموش ہیں۔ لیکن ان کی ہی تحریروں سے کچھ شہادتوں کی بنیاد پر ان کے سال کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ کہ قائز ۱۶۷۹ء تا ۱۶۸۵ء کے درمیان پیدا ہوئے۔

محمد محمد شاہی کے اصغر مراد خواجہ مصداق اللہ خاں دوران خاں سے قائز ملتے رہے تھے۔ اس طرح شاہی اور ہارے تعلق و باقلا اور اسکی محبتوں کا ان کے خراج پر بھی اثر پڑا ہوا چنانچہ سیر و فکار سے بڑی دلچسپی رہی لیکن مطالعے کا ذوق بھی رہا۔

قائز اپنے وقت کے ذی علم افراد میں شمار کئے جاتے ہیں جن کے مطالعے کی وسعت کا حال روشن ہے۔ دینیات، منطق، فلسفہ، طب، ریاضی، ہیئت، کلام اور معنی و بیان پر خاصی قدرت رکھتے تھے۔ عربی زبان پر بھی دسترس تھی۔

ان کی تصنیفات پر ایک ٹھکانے والے قرائد و نگار کا ذکر کرتا ہے کہ ان کی تصنیفات ذیل میں درج کرتا ہوں:-

۱- اعتقاد الصدور ۲- نظری الصدور ۳- صراط الصدور ۴- معارف الصدور ۵- تہجد الطریق ۶- التوازن الصدور ۷- احیاء القلوب ۸- درمیانہ ماحضرات ۹- انشیں الوزر ۱۰- اوارشار الوزر ۱۱- نظم الصدور ۱۲- تحریر الصدور ۱۳- رسالہ فیضیہ ۱۴- اہادیۃ الصدور ۱۵- حیات الباقی ۱۶- تحفہ الصدور ۱۷- حقائق الصدور ۱۸- خلیات ۱۹- اویوان قاضی ۲۰- اویوان رسل

قائز قاضی کے بھی شاعر تھے اور اردو کے بھی۔ مسعود حسن رضوی نے انہیں شاہی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر بتایا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ ان سے پہلے آدے نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا اور اس مسئلے میں غلط فہمی کی سمجھاؤں نہیں ہے۔

یوں تو قائز کے یہاں غزلیں بھی ہیں لیکن ان کے یہاں شطریوں کی تعداد خاصی ہے۔ مسعود حسن ادیب کا بیان ہے کہ وہ شاعر دیں میں شرکت کم کرتے تھے۔ قائز نے قصائد سے تعلق بہت کم رکھا لیکن اس صنف کے بارے میں جو خیالات پیش کئے ہیں ان کی اپنی اہمیت ہے۔

غزلوں کا انداز عقلی اور بے ساختگی سے سیر دور ہے۔ روانی ان کے کلام کا ایک حصہ ہے۔ عام طور سے فطری انداز اختیار کرتے ہیں۔ قائز نے اپنے دیوان میں غزل کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے ان میں یہ بھی ہے کہ وہ ذاتی آغ کو اہم سمجھتے ہیں نیز یہ کہ تنقید ان کا شیوہ نہیں ہے۔ محنت زبان پر ان کی خاص نگاہ ہے۔ صنائع بدائع کا بھی اپنی جگہ پر خوب استعمال کرتے ہیں لیکن ایسے معانی میں بھی دور و راز کی صنعت کاری کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے شعریات کے مسئلے میں کچھ تاہم ایسا درج کی ہیں جنہیں تنقید کے دوسرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

کرتے۔ صحن پرستی اور جمالیاتی احساس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ سید جعفر گھنٹی ہیں:-

”اپنی تحریروں میں انہوں نے اپنی حسن پرستی اور اپنے جمالیاتی ذوق کے رچاؤ کا تذکرہ کیا ہے۔ قائز کی غزل میں ایک ارضی محبوب اپنی ساری مادی کیفیات کے ساتھ قاضی کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے اور قائز نے اس کی عشق و طراری، اس کے جمال دل آرا کی عمر بختی و اور اس کی پرکشش شخصیت کی مرقع کشی ہی کو اپنے فن کا مقصد و محور بنایا ہے۔ عشق بھاری کے گونا گوں تجربات، اس کے عجب دفر اور زندگی کے سر و گرم کی پراثر تصویریں قائز کی غزل کو حقیقت پسندی کی خوبیوں سے متصف کرتی ہیں۔ خوبصورت تشبیہات و استعارات و کشف طراز سے اور نتائج بدائع کی چابکدستی نے قائز کی غزل کو تازہ آفرینی عطا کی ہے۔ ایہام سے شعوری گریز کے باوجود قائز کے کلام میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ محبوب کے خدا و خال اور اس کے لباس کی معریت میں ذرا بی ہوشی تصویر کشی غزل مسلسل اور مستی رنگ کی پڑائی دکنی شاعری سے اثر پذیر بنی کے قیاد ہیں۔“

قائز کی شتویاں نجم کے اعتبار سے مختصر ہیں لیکن یہ سب کی سب معرطہ معرطوں میں ہیں۔ چند شتویوں کے نام ہیں: چھٹ، ”ایمان مسافروں“، ”جو گمنام تعریف چاہتے“، ”صفت بھنگنوں“، ”تعریف جہان و غیرہ۔“

قائز کا دیوان مخمض نہیں ہے۔ اس میں کل ۳۹ غزلیں ہیں، لیکن ۳۳ غزلیں ایسی ہیں جہوں کی طرحوں میں تکللی کی گئی ہیں۔ قائز کے قیاد میں وہی ایک غزل اور شاہی شاعر تھے اور اس طرح وہ ان کی غزلوں پر غزلیں کیوں کہتے۔ قائز کا انتقال دہلی میں ۱۰۳۸ھ میں ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب کچلے غرام کرتے ہیں
ہر طرف قتل عام کرتے ہیں
دل بھاتا ہے سب کا وہ ساجن
دل قرینی میں اس کو کیا فتن ہے
اے جن وقت جاں گزاری ہے
موسم پیش و نفل پاری ہے
قائز اس غزل اور سترہاں پاس
ہے کتاباں کا قتل بازی ہے

سید عبدالولی عزالت

عزالت کے والد سید سعد اللہ تھے اور سید محمد اللہ غلام محمد کے صاحبزادے تھے جن کا تعلق راستہ بریلی کے ایک قبیلے سے تھا۔ ان کا ہی نکلیں بلکہ وہ مشہور بزرگ شاہ فرخ محمد کے نواسے تھے۔ اس واسطے سے سید عبدالولی عزالت رشد و ہدایت کی درایت سے بالا مال تھے۔ عزالت کی تعلیم و تربیت ان کے والد نے کی تھی۔ محفولات میں انکس، اسرار حاصل تھی۔ واللہ کی تعلیم و تربیت کی وجہ سے یہ بھی علم و فضل کے اعتبار سے اپنے وقت میں مجدد اسم تصور کئے جاتے تھے۔ اردو ہندی پر تو دوسری تھی اس میں مہارت اور مصوری کے بھی زور اور تھے۔ سیر سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ شعر و شاعری ان کے مزاج کا ایک حصہ تھا۔ ان کی کئی تصانیف یادگار ہیں جن میں کچھ مہم ہو گئی ہیں جیسے "راگ ہلا"، "پانچک مثنوی" ہے اور اس میں بارہ سوا اشعار ہندوستانی موسیقی کے سلسلے میں ہیں۔ دوسری "سالی نامہ" ہے جو نایاب ہے۔ ایک تعلیف "مظہر کبیر جہ" ہے۔ چاقی، دو خان، اردو، اردو دیوان میں بارہا نام نہاد مکرناں، کچھ، اور پرے، میرا، سورن، جھولنا وغیرہ ہیں۔ ان کے دیوان میں ایک دیباچہ بھی ہے جو اردو میں ہے۔

عزالت کا اسلوب بیان دلکش اور جلیقہ ہے۔ موسیقی سے گہرا تعلق ہونے کے سبب وہ جانتے تھے کہ کلام میں نرم مس طرح پیدا کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ فارسی کے بھی شاعر تھے۔ اس لئے اس کی ترکیبیں ایجاد کی سلیقے سے استعمال کرتے تھے۔ ان کے یہاں صنعت ایہام جو چور ہے لیکن کلام کا بڑا حصہ اس سے بہت دور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عزالت کا کلام سوار نہیں۔ کہیں انھیں موت اعلیٰ قسم کی شاعری ہے تو کہیں بہت پست۔ لیکن ان باتوں سے ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ قدیم شعراء میں ان کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

محمد محسن فدوی

(۱۲۹۹ء۔)

نام محمد محسن، فدوی تخلص تھا۔ لیکن گاہے گاہے محسن بھی تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد میر غلام مصطفیٰ خاں سید حسینی تھے۔ ان کی پیدائش لاہور میں ہوئی تھی اور فرخ میر کے زمانے میں وہی آئے۔ پیدائش کا سال ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۶ء) متعین کیا گیا۔ بعض تذکرہ نویس میں ہے کہ شاکر تائی کے شاعر تھے لیکن مصحفی انھیں آزاد کا شاگرد جانتے ہیں۔ بہر طور محمد محسن فدوی کا تعلق شرقائے جہان آباد سے تھا۔ یوں تو خاندانی طور پر روایتی کا طریق خاندان میں تھا لیکن فدوی نے خاندان سے اختیار کر لی۔ موسیقی اور شاد سے دلچسپی تھی اور شاعری بھی اختیار تھی۔

فدوی نے اپنا دیوان "ریختہ عرب" کیا تھا جس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو بمبئی میں محفوظ ہے۔ اس

تذکرہ میں سے پتہ چلتا ہے کہ محمد محسن فدوی کی طبیعت میں بڑا انکسار تھا۔ شاعرانہ غریبوں کے سلسلے میں کوئی تعلق نہ کر سکتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھیں دنیا کی مکاری اور فریب سے سخت نفرت تھی۔ دولت و ثروت سے بھی ان کا کوئی تعلق نہیں تھا کہ وہ دراصل مٹش تھے اور ای طرح کی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا محبوب بھی شرافت سے کم تر معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ آبرو کے شاگرد تھے اس لئے ایہام کوئی ان کے شعری مزاج کا حصہ تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس گل بدن کوں بارغ میں لالہ کہا کرد

اس سرد قد کے تار کوں بالا کہا کرد

آہ و لہاں میں انجک یہ دریا سے کم نہیں

دریا سے گر جو کم ہو تو بالا کہا کرد

تو اپنے ہاتھ سے اسے ہم تن مطلق کو مت کہنا

نقصیت جانو ہر آن اس کا ساتھ ہی سنا

شاہ ولی اللہ اشتیاق

(۱۷۳۸ء۔۱۷۷۷ء)

شاہ ولی اللہ اشتیاقی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی میں فرق کرنا چاہئے۔ "محسن ہند" میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ شاہ اشتیاقی مرزا امیر المظاہر قول کشمیری کے شاگرد تھے۔ میر نے احساس دلایا ہے کہ کبھی کبھی رخت کہتے تھے۔ لیکن ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایہام بہت تھے۔ "ہندستان شعرا" اور "گلشن ہند" میں ان کی ایک ایک غزل ملتی ہے۔ ان غزلوں میں بھی ایہام کوئی کے اثرات ہیں۔ ان کی وفات کا سال ۱۷۳۸ء۔۱۷۷۷ء بتایا جاتا ہے۔ بقول جمیل چاشنی ۱۷۳۳ء۔۱۷۷۷ء میں جب محمد فقیہ درویش دکن سے واپس آئے تھے تو شاہ اشتیاقی ہی نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ بہر طور اس باب میں ڈاکٹر ملک اختر کی تحقیق یہ ہے:-

"نام شاہ ولی اللہ اور محمد اشتیاقی تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے اور حضرت شاہ گل تخلص بہ وحدت کے پوتے تھے۔ لطف کہتے ہیں کہ علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاہ محمد گل کو ان کا جد گھسا ہے لیکن راقم دھرواف کے قول زاد یہ مضمون نہیں ہوا ہے۔ فی الحقیقت سرتبہ علم کا اس عالی مقام کے کیا بہت بلند تھا..... یہاں تک کہ اسم گرامی اس بزرگ و سرور کا نام کا زبان قلوب پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کے گرد کے جاری ہے والد ماجد ہیں یہ..... جس کا نام نامی مولوی عبد العزیز ہے۔" دراصل لطف کو غلط فہمی ہوئی اور محمد مولوی

کریم اللہ علیہ السلام اسری رام اسی غلط فہمی کا فکرمبر ہو گئے۔ اور تو اور مولوی عبدالحق صاحب نے لطف کو اس تحقیق پر اردو کیا اور کہا بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جن کی نسبت اردو کی شاعری کا تعلق بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اردو کے شاعر تھے اور ان کا تحقیق اشتیاق تھا۔ لیکن یہاں ایک غلطی بھی تحقیق شمار ہوئی ہے۔ لطف کو کام کے اشتراک سے دھوکا ہوا ہے۔ ایک بات انہیں سمجھنی چاہی کہ جدا جدا شاہ مغل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کی طرف اشارہ کر دی۔ حالانکہ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کو شاہ مغل کا تصور دیکھا ہے۔ چنانچہ ان کے اشعار (ص ۶) کا تذکرہ شعروے اردو (ص ۸) طبقات اشعار (۶۵) تذکرہ عسقلانی (ص ۱۸) میں شاہ مغل کو ان کا والد لکھا گیا ہے۔ وجود درست نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۱۷۶۶ء میں فوت ہوئے جبکہ طبقات اشعار (۱۱۶۵ء) مخزن لکات (۱۱۶۸ء) اور تذکرہ ریت گویاں (۱۱۶۶ء) میں اشتیاق کی وفات کا ذکر ہے۔ تذکرہ ریت گویاں میں تو لکھا ہے کہ چند سال ہوئے فوت ہو گئے ہیں۔ اشتیاق در حقیقت ۱۱۵۰ء میں فوت ہو چکے تھے۔ جیسا کہ صحت منشاں اور "عقربا" سے معلوم ہوتا ہے۔ اور غرض یہاں اگر اہل نقل و شری میں بھی انہیں شاہ ولی اللہ اشتیاق نے بھی سال وفات ۱۱۶۱ء متعین کیا ہے۔ اسی کی تجدید میں افتد الحسن نے ایم اے (اردو) کے لئے لکھے گئے مقالے میں ان کا سال وفات ۱۱۶۱ء لکھا ہے۔ حالانکہ یہ تذکرہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا حسن وفات ہے اور نہ شاہ ولی اللہ اشتیاق کا۔ اشتیاق سرحد میں پیدا ہوئے۔ ان کا سن پیدائش معلوم نہیں ہے لیکن محمد رفیع درودندہ ۱۱۳۶ء میں دہلی آئے تو انہوں نے اشتیاق کے مایہ عافیت میں رہنا شروع کیا۔ اس وقت اشتیاق کی عمر انہیں بعض برس ہو تو وہ ۱۱۰۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔

محمد شانش اور کے دوسرے شاعروں کی طرح اشتیاق کے یہاں بھی امرہ پر اشعار ہیں، شراب بھی موضوع بنی۔

ان امور کے لئے حسن اشعار ملاحظہ ہوں:

لوگوں کے چہروں کی گلی کیونکر اس کو چوت

ہر ایک گردبار ہے بھٹوں کو دھول کوٹ

دوبالا ہو گی گھوڑی مٹ آٹھوں کو دتا ہے

بیالہ اور بھی پنا لے لیکن یہ دور چلتا ہے

آخر ہونے کا نیا قیامت کے دن بنا
بھ راست سے پھرا کے جو دامن بھگ گئے

میر محمد سجاد

میر محمد نام تھا اور سجاد بھی کہتے تھے۔ اسلاف آذربائی جان کے تھے۔ ہندوستان آئے اور اکبر آباد میں مقیم ہوئے۔ سجاد کے والد میر محمد عظیم تھے، جو محمد اکرام خاں کے صاحبزادے تھے۔ سجاد کے دادا بادشاہ کے شقی تھے۔ سجاد اکبر آباد ہی میں پیدا ہوئے لیکن "مخزن لکات" میں میر حسن نے شاہجہاں آباد کی غلط فہمی کی بنیاد پر لکھ دیا ہے۔ سجاد مصنفین کے شمارہ میں نہیں آتے۔ انہوں نے ابتدائیں سجاد شمس افشار کی لیکن بعد میں اس سے الگ ہو گئے۔ ڈاکٹر مجمل جالبی نے ان کی وفات کا سال ۱۲۱۳ء اور ۱۲۶۱ء کے درمیان طے کیا ہے لیکن "تذکرہ مسرت افروز" میں ۱۸۸۸ء اور ۱۱۹۶ء کے درمیان کی تاریخ متعین کی گئی ہے۔

میر سجاد خوش لوٹس بھی تھے۔ شعر تو کہتے ہی تھے، شعر بھی میں بھی طاق تھے۔ تذکرہ میں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بھی استاد کے درجے تک پہنچ چکی تھی۔ میر حسن کا خیال ہے کہ ان کے یہاں ایام میں درودندی بھی ہے اور چاشنی بھی۔ جس سے کلام میں ترقی پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

جان و دل سے قبول سب جان

بہر بھی گل میں قری مجھے آتا

اس زمانے کی دہلی کا رنگ

ان میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

کس طرح کہہ کن پہ گزری گی

بہر کی یہ پہاڑ کی دامن

میں جو اس کی مٹی میں جاتا ہوں

دل کو کچھ مٹا دیا سا پاتا ہوں



ہے کہ تازہ گوئی کو مرزا مظہر نے رواج دیا۔ "اشعار بخند قبل ازین بطور آبروئی مردمان دہلی
می گفتند" اس طور کا افعال مردمان کیلئے چھ۔ اس حضرت رواج داد۔

مولانا محمد حسین آزاد بھی "آب حیات" میں اس طرح رقمطراز ہیں:-

"خان آرزو بھی شخص ہیں جن کے دامن توحید سے ایسے شائستہ فروع توحید پائے کر اٹھے جو
زبان اردو کی اصلاح دینے والے کہلائے یعنی مرزا جان جان مظہر....."

بہر طور مرزا مظہر جان جانا کی تہنیتات کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) "دیوان فارسی" جس کے بارے میں موصوف کا اچھا بیان ہے "اس سے بیس سال قبل ایک عزیز نے فقیر کے
تھوڑے سے اشعار جمع کر کے اس غرض سے پیش کئے تھے کہ فقیر اس کا مقدمہ لکھ دے۔ میں نے چند سطریں لکھ دی تھیں۔
لیکن ان کو مستر خیال نہیں کرتا، کیونکہ وہ مطالب اس عبارت کے ضمن میں آگئے ہیں۔"

یہاں ایک فارسی دیوان کے حوالے سے بات کہی جا سکتی ہے کہ جو عقلی اور جیسے اشعار اردو میں پائے جاتے
ہیں ویسے ہی فارسی دیوان میں۔

(۲) "خط جواہر" مرزا نے مختلف دیوان سے اساتذہ کے اشعار جمع کئے تھے۔ یہ انتخاب ان کے اپنے پسندیدہ
اشعار کا ہے۔ فارسی شاعروں کے اشعار اس میں درج ہیں۔

(۳) "مکاسب" (فارسی) اس میں مرزا مظہر کے فارسی خطوط ہیں۔ ان خطوط میں مرزا نے سلوک و تصوف کے
مسائل و نکات شریعت و طریقت کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

(۴) "اردو کلام" مظہر جان جانا کا کوئی دیوان موجود نہیں ہے۔ ان کا اردو کلام جو مختلف تذکروں میں ہے
حیدرآباد قمریشی نے یکجا کر دیا ہے۔ ان کے اشعار کی تعداد ۱۶۳ ہے۔

لیکن ان کا طرز و اقتدار اردو شاعری کو ایسا ہم کوئی سے نہایت دلاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے شاعروں کوئی راہ دکھائی
جو بہر حال غفری تھی۔ زبان کی شانگلشی اور صفائی پر زور دیا اور ایک طرح سے اپنے شاگردوں کی اور دوسرے شاعروں کی
ترتیب کی۔ ایسے میں مصطفیٰ انیس نقاش اول کہتے ہیں تو غلط نہیں۔

راوی جو کہ بعض اثرات کے ذریعہ فارسی شاعری کا اردو میں ترجمہ کرنے کا وہ جان بڑھا جس سے فارسی
تراکیب اور حسن بیان کا اثر دیکھا زبان پر بھی چڑھا۔ گویا اردو غزل ایک نئے حراج سے آشنا ہوئی اس کی طرح ادبی میں نئی
شان پیدا ہوئی۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

بہار آئی گل آئے باغ بلبلی پہل کر بیٹھی

دوانوں کو کہو اس وقت کر کیوں علاج اپنا

مگر چہ الطاف کے کاغذی یہ دل زار نہ تھا

اس قدر جو رو جھا کا بھی سر نہ تھا

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ مرزا مظہر جان جانا کی شاعری مثلاً عشقی کے جذبات سے بھری پڑی ہے۔
لگتا احساس کی شدت اپنی جگہ پر۔ عشقی نے ان کے جذبات میں بھجوان پیدا کیا جس بھجوان میں بڑا ترقی اور پاکیزگی
ہے۔ چنانچہ نظم کے جذبات کے اعتبار میں وہ ایک طرح سے ترقی پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن
میں ان کی غزلوں کے مختلف تجر کی نکتہ دہی ہوتی ہے:

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا حوسے سے زور لگی کرتے

اگر ہوتا چن اپنا گل اپنا باغبان اپنا

جن کس کس مزہ سے آج دیکھا مجھ طرف پار

اشارات کر کے دیکھا جس کے دیکھا مسکرا دیکھا

فصیح پایا حوسے دے کوں اور فریاد کوں ہاں

بس دیکھا بھڑکی کوں ہاندہ دیکھا کڑکڑا دیکھا

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے محنت سے لپک

جی لعل جاتا ہے جب نکتے ہیں آتی ہے بہار

خدا کے واسطے اس کو نہ ڈکو

بھی اک شہر میں قافلہ رہا ہے

وقت ہے مار مار کے آنے کا

مگر کر شیخ کے بھانے کی

شاہ آیت اللہ جوہری

(۱۷۱۳ء-)

تجربہ طلب مرتضیٰ کے بڑے بھائی حضرت جعفر کی اولاد سے تھے۔ بقول محد والدہ بی نقاش عشقی حضرت جعفر کے
ایک بیٹے حضرت عبد اللہ کو ادبی و صحیری ہیں حضرت نسیب بن حضرت علی سے ہے گئے۔ ان کے مہلن سے دہلی کے علی
اور معاد یہ بیٹے ہوئے۔ معاد کی نسل زیادہ دور تک تدریج لیکن علی کی نسل جاری رہی۔ ترقی اور تپان کے بیان کے مطابق

شاہ آیت اللہ جوہری کی پیدائش فرخ سیر کے عہد میں اور انتقال شاہ عالم خانی کے عہد میں ہوا۔ موصوف کا قلمی نام غلام سرور اور عرف آیت اللہ تھا۔ یہ بات صرف رسالہ پھولاری شریف قلمی میں ہے، لیکن اور اس کا ذکر نہیں ملتا۔

بہر طور حضرت شاہ آیت اللہ جوہری ایک عالی مرتبت صوفی اور باکمال شاعر تھے۔ اردو، فارسی اور عربی پر عبور رکھتے تھے۔ ہندی میں بھی ان کی واقفیت عمیق تھی۔ ریختہ میں جوہری سرچ میں مذاقی اور فارسی میں شوری قلمی کے تحت ملے۔ ان کے حالات قلم تدکروں میں ملتے ہیں۔ پھولاری شریف کے قلمی ناموں میں بھی۔

موصوف کے کارناموں میں ایک مثنوی "گوہر جوہری" بھی ہے جس میں دو ہزار میں سو چار اشعار ہیں۔ ایک دیوان فارسی بھی ہے جس میں غوسہ انچاس اشعار ہیں اور ۳۲ بابیاں۔ انہوں نے ریختہ میں نعت، قصیدہ، غزلیہ اور شہر آشوب اور مرثیہ بھی تخلیق کی ہیں۔ فارسی میں ایک شہر آشوب ہے۔

نفا مثنوی نے جوہری کی زبان اور ان کے مختلف سیلابات کا تفصیل سے تحقیق مطالعہ کیا ہے۔ اس میں عرض و قرائی، صنائع و بلاغ کے علاوہ دیگر خصوصیات مثلاً بہاری لب، دلچپے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ زبان کے علاوہ ان کے مذاق کے مجموعہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے کلام کی قدریں متعین کی گئی ہیں۔ میں نے یہ تمام امور "حضرت شاہ آیت اللہ جوہری، ان کی حیات اور شاعری" سے اخذ کئے ہیں۔ یہ پوری کتاب ۶۳۴ صفحات پر مشتمل ہے اور بڑی قیمتی میں ہے۔ تفصیل کے لئے اس کتاب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں مثنوی گوہر جوہری بڑی پر توجہ صرف کی گئی ہے۔ اس کے حصول کا قصہ اس کا خلاصہ اس کے ماخذ کے علاوہ جوہری مثنوی نگار کی حیثیت سے دیکھے گئے ہیں۔ اس مثنوی میں جس طرح تصوف کے عناصر ملتے ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ بارہا شہر آشوب اور مرثیہ پر توجہ کی گئی ہے۔

بہر حال میں اس مثنوی کے بعض خاصائص تصافی کے الفاظ میں نقل کر رہا ہوں:

"نظم کے لحاظ سے قشطنظر مثنوی میں اعتدال، وسط اور غرض کا واضح اور بھرپور احساس ملتا ہے اور تسلسل بھی برقرار ہے۔ اگرچہ اس میں اصل قصہ کے علاوہ اور بھی چند قصے لائے گئے ہیں لیکن ہر قصہ دوسرے قصہ سے منطقی استوار کی کے ساتھ رہا دکھتا ہے اور سب کے سب ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ مگر رہا و مضبوطی کے اس احساس کے ساتھ نظم میں جو چستی آتی جا رہی ہے وہ بظاہر مشغور ہے۔"

مثنوی گوہر جوہری ایک الیہ ہے۔ یہ نام دہلی اور کنول دی دونوں کا الیہ ہے۔ قصہ اس نج پر چلتا ہے کہ ابتدا میں الیہ کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن یکا یک کسی لامعلوم جہ کی بنا پر بیروزہ

قصہ کو آسانی سے طرہ بنا سکتے تھے۔ اس لئے اپنی تکمیل سے اس کو طرہ کے طرح ڈالتے؟ الیہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ قارئین کی تعدادی حاصل کرے۔ قشطنظر مثنوی میں رام راجا اور کنول دی دونوں قشطنظر سے ہمیں مدد ملتی ہے اور دونوں ہی کے قلم کو ہم اپنا قلم سمجھتے ہیں۔

اس مثنوی کا بلاغ سادہ ہے۔ لیکن عرب و نظم اس کا قصہ ایک واقعہ ہے۔ جوہری کہتے ہیں کہ یہ قصہ اکبر آباد کا ہے۔ لیکن میر نے بھی اس طرح کا قصہ نظم کیا ہے اور اس کو بچے کا ایک چنگی واقعہ بنایا ہے۔

حضرت جوہری مسند و شہادت پر جوہر افروز ایک ۹۶۷ میں دیوانہ ذوات الصدور واصل بحق ہوئے اور پھولاری شریف میں مدفون ہوئے۔ یہ مقبرہ کنگی مسجد کے پار پتر چاہ ہے۔

(صفحہ ۵۱، شاہ آیت اللہ جوہری)

انعام اللہ خاں یقین

(۱۷۲۳ء - ۱۷۵۵ء)

انعام اللہ خاں نام اور یقین قلمی تھا۔ ان کے والد اکبر اللہ بن خاں مبارک جنگ تھے جن کا سلسلہ پنج احمد سر ہندی مہاراجہ خاں تک پہنچتا ہے۔ اسلاف سرحد کے تھے۔ لیکن ان کے والد دہلی چلے آئے تھے۔ ان کی زندگی میں نواب حمید الدین خاں کی لڑکی سے ہوئی۔ یقین بھی دہلی میں پیدا ہوئے۔ یقین کا سال پیدائش متعین نہیں، لیکن ایک اندازہ کے مطابق ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ یقین قلم کر دئے گئے تھے۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ قلم کرنے کا تھا لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ خردان کے والد نے ہی کیا تھا۔ ایک اندازہ کے مطابق یہ ۵۶-۵۷ء میں ہوا۔

راجہ جو کہ مرزا مظہر جان جاناں سے انعام اللہ خاں یقین بہت قریب تھے اور انہیں کی تربیت کا بھی تھا کہ انہیں بھی ایک امتیاز حاصل ہوا۔ یقین اپنے وقت میں نہ صرف خاصے مشہور بلکہ عزت و سر بلندی میں بھی ان کا ایک مقام تھا۔ اس حد تک کہ لوگ ان سے رشک و حسد کرنے لگے تھے۔ خاندانی اجابت بھی حسد کا باعث تھی۔ لہذا ایک انوار پھیلائی گئی کہ یقین کا حکم اپنا نہیں ہے بلکہ یہ جان جاناں کی دین ہے۔ اس انوار کے پھیلائے میں میر تقی میر کا بھی بہت زور دست و پاؤں ہوا۔ "کلمات الشہداء" میں بھی انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ان کا جملہ ہے "خاکہ شعر نبی مطلق و دار"۔ لیکن میر کا یہ بیان ان کے اپنے تعصب کا دال ہے۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے مثلاً گزہ بڑی اور قائم نے دوسرے ایسی انوار کی تردید کی ہے بلکہ واضح کیا ہے کہ یقین نہایت باصلاحیت شاعر تھے۔ قلم نے خاص طریقے سے ہر کے جان کو لہو و بارہا سے کندہ اور اختر اکا نام دیا ہے۔

یقین کا دیوان ۷۰۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے یہ بہت ہی مختصر مادیان ہے لیکن اس میں بحر کی اشعار

تقریباً نہیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یقیناً نے افعار کہنے میں خاص محنت کی ہے اور گوش کی ہے کہ وہ معیار سے نیچے نہ آئیں۔ مولانا عبدالحی نے پرانے قلم کی ہے کہ اگر ادیب جیسے رہتے تو میر یوں یا مرزا کی کا جملہ ان کے سامنے نہیں بلکہ سنکھت تھا لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ سبالت ہے۔ میرا مرزا اپنی نوعیت کے اہم ترین شعرا میں سے ہیں جن کی مثال آج بھی نہیں ملتی۔

دلیل ہو کہ یہ درایہام کوئی کا تھا جس کے خلاف رد عمل شروع ہو چکا تھا۔ طبع جان چاہا تو اس کے رد کرنے والوں میں ایک ستون ہی تھے۔ اسی راستے پر یقین بھی ملے۔ چنانچہ زہد خیالی کی رو ان کے یہاں نہیں ملتی اور ایک طرح کی ایسی احتیاط ملتی ہے جو تحقیق کو معیار سے آشنا کرتی ہے، منہایت گری رہ جاتی ہے۔ سمجھتے ہیں کہ یقیناً ہی ایہام کے خلاف جو نیک شروع ہو چکی تھی اس کے ایک شاعر خاص تھے۔ ان کی غزلوں کے سلسلے میں جمیل جالبی، قسطراز ہیں اور کچھ مثالیں بھی بچھائی ہیں:-

”یقین کی غزل میں لطافت و شائستگی کے ساتھ ایک شگفتگی و شیرینی کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ شاعری وصف و حسن محبوب تک محدود نہیں ہے بلکہ عشق کے تجربات کو بیان کر رہی ہے۔ یقین کی غزل میں فانی غزل کی طرح، انتظام کے ساتھ بات کو چاکریوں کرنے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے۔ الفاظ احساس و خیال کے ساتھ مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ یہاں ایسی بحریم اور حسین ملتی ہیں جو نہ صرف منتخب ہیں بلکہ اس سے پہلے ادب میں استعمال نہیں ہوئیں۔ زبان میں غایت بڑھنے کے باوجود عام بولی چال کی زبان سے اس کا گہرا تعلق قائم ہے۔ مثلاً یقین کی یہ غزل دیکھئے:

اگر چہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
ترا برا نہیں یہ شعلہ کچھ بھلا بھی ہے
اس اشک و آہ سے سوزا مجھ نہ جائے کہیں
یہ دل کیجو آپ رسیدہ ہے کچھ بھلا بھی ہے
یہ کون دھب ہے جن خاک میں ملائے گا
سو کا دل کہو پاؤں تلے ملا بھی ہے
یہ آواز ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں
کہ میرے بے مزہ رکھے ہیں کچھ مرا بھی ہے
نہیں کا شہر انوں سن کے یاد نے پوچھا
کہ تو خدا کے جوتے میں رکھ دے گا مجھ کو۔۔۔

میر عبدالحی تاباں

(۱۷۵۲ء)

میر نے میر عبدالحی تاباں کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

”بہت خوش فکر، خوبصورت، خوش اخلاق، پاکیزہ طینت، عاشق مزاج معشوق تھے۔ اس وقت تک شعرا کے گروہ میں ایسا خوش نگاہ شاعر پروہ عدم سے میدانِ عشق میں نہیں آیا۔ جب معشوق دنیا کے باغوں سے جا کر بارہا فوساں، فوساں، فوساں“
ان کے سلسلے میں میر کا یہ شعر بھی ہے:

دارا ہے تاباں طبع احمد کا چھائی پہ میر
ہو نجات اس کو چھارہ ہم سے بھی تھا آشنا

میر کے یہ تاثرات تاباں کے نہ صرف مزاج کو واضح کرتے ہیں بلکہ ان کی معشوقہ کیفیت بھی نمایاں کرتے ہیں۔ تاباں دلی ہی کے کہنے والے تھے اور سید اے تھے۔ جب بات یہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے ان کے حسن و جمال کا خوب ثبوت ذکر کیا ہے۔ مصطفیٰ کا بیان ہے کہ اس عالم فریب کے حسن و جمال اور حسین قاصب اعضاء کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے سب بھلا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے حسن و جمال کا ان کی شاعری پر بھی اثر پڑا ہوگا۔

تاباں کی ولادت کا سال یا وفات کا سال متنازع قید ہے۔ جو یہ طور پر کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ”لغات الشعراء“ میں انیس مرحوم لکھا گیا ہے یعنی ۱۷۵۲ء میں وہ زندہ نہیں تھے۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے ان کا سال وفات مختلف انداز سے لکھا ہے لیکن سب بے دلیل ہے۔ سہر حال ایک اندازے کے مطابق ان کی وفات کی تاریخ ۱۷۴۹ء سے ۱۷۵۲ء کے درمیان متعین کی جاسکتی ہے۔

تاباں کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ پانچواں، قطعات، مسدس، مثنوی، ترکیب، بند، جنس، نقیض، مستزاد، قصیدہ، مثنوی، قطعات، جہانگیر و غیرہ موجود ہیں۔ گویا انہوں نے اکثر صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ تاباں کی شاعری کے اہم اساتذہ اول حاتم ہیں پھر دھولہ شمس سے اصلاح لینے لگے۔

اگر تاباں کی شاعری میں الفاظ کے استعمال کی روشنی کی طرف توجہ کیجئے تو انداز ہوگا کہ انہوں نے فانی تراکیب کو اہمیت نہیں دی بلکہ ان کے مقابلے میں اپنے اسلوب کو مقامی زبان سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کی اس لئے ان کے یہاں درود کا مزاج زیادہ بکھر کر سامنے آیا اور اس میں ایک طرح کی لطافت بھی ہے۔ شاید یہی سب سے کہ تاباں کا دیوان

کریں گے فعل عمل سے دھوم آٹھاپے باغیاں اپنا
قدیم صاحب اپنا ، مشفق اپنا ، میراں اپنا
خدا سے تک تو دشمنی نہیں لے اس پناہ کی
کیا فرما لے تجھے سے سر لوہوہاں اپنا
ہوا کی کچھ طرہ ہے اور گل نے رنگ بدلا ہے
اٹھالے اس جین سے عذیب اب آشیاں اپنا
بھرا ہے دروہدی کا دھواں اس کے داغ اندر
دکھایا چاہتے لالہ گول داغ خوں چکاں اپنا
غزلاب کچ چچا ہے ترے عروکان و اندر کا
ہے بھی تک دکھایو اے مہاں ترش کماں اپنا

میر اشرف علی فغان

(۱۷۷۶ء - ۱۸۷۲ء)

مرزا اشرف علی نام فغان تخلص کرتے تھے۔ نہایت ان کے والد کا نام مرزا علی خاں لکھا ہے لیکن "گلشن ہند" میں لطف نے انہیں مرزا علی خاں کنہ سے یاد کیا ہے۔ غالباً یہی صحیح ہوگا۔ فغان کا وطن دہلی تھا۔ یہ احمد شاہ کے دشمنی بھائی تھے اس لئے کواکے جاتے تھے۔ لیکن بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اصل کوکا خطاب تھا جو احمد شاہ نے انہیں دیا تھا۔
مرزا اشرف علی فغان کب پیدا ہوئے معلوم نہیں لیکن اندازے کے مطابق ان کا سن پیدا کھ ۱۷۲۶ء بتایا جاتا ہے۔

ان کے ابا بایان خان خانان کا قاضی محلی سے براہ راست رابطہ رہا تھا لہذا ان کی تعلیم و تربیت میں مختلف ماحول کا بھی اثر رہا ہوگا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اسی ماحول میں ہوئی ہوگی۔ ان کے استادوں کی فہرست میں قولیاں خاں امید کا نام آتا ہے۔ لیکن بعض تذکروں میں یہ بھی ہے کہ انہیں علی علی خاں ندیم سے سند تھا۔ مرزا علی لطف کے مطابق یہی صحیح ہے۔ ندیم کی شاگردی کے طے میں مرزا فغان نے ایک شعر کہا ہے:

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغان

۱۱ دن کے بعد دیکھئے استاد ہوا ہے کا

لیکن گلشن ہند ان شفیق نے "چند سال شعرا" میں اس کی وضاحت کی ہے کہ فغان فارسی میں امید سے اصلاح

فغان احمد شاہ کے مصاحب رہے تھے۔ یہ صورت ان کے بچپن سے تھی۔ لیکن جب احمد شاہ ۱۷۷۹ء میں تختِ نعش ہو گیا تو پھر اس سے قربت اور بڑھتی اور انہیں بھی بڑی منصب حاصل ہواں وسیع ہو کر ۱۷۹۵ء میں غلام الملک نے احمد شاہ کو قید کر لیا تھا اور انہیں ایک حاکم بنا دیا۔ اس کے بعد فغان دہلی منتقل ہو گئے۔ اس کا حال فغان نے خود ایک مثنوی میں بیان کیا ہے۔
بھرا دہر شاہ آباد آگئے ، جہاں ان کے بچے شروع حال رہتے تھے۔ لیکن مرشد آباد میں بھی قیام مستقل نہ رہا اور دہلی چلے آئے۔ دہلی بھی انقلاب کا شکار تھی تو وہ نواب شجاع الدولہ کے یہاں فغان آباد چلے آئے اور ان کے یہاں ملازم ہو گئے۔ لیکن ان سے ان کی تادیر نہیں تھی اور فغان یہاں سے ہجرت کر کے رولہ شتاب رائے کے یہاں تعلیم آباد چلے آئے۔ یہ دور ان کی زندگی کا خوشگوار دور تھا۔ ان کے انتقال کی تاریخ انہیں ۱۸۷۲ء اور انہیں ۷۲ سالہ عمر بتائی جاتی ہے۔ لیکن ان کا ایک لوبا مرور ہے جس کے قلم سے ان کی تاریخ وفات ۱۸۷۲ء بتائی ہے اور یہی صحیح بھی ہوگی۔ فغان کا انتقال پڑتالی میں ہوا۔

فغان اپنے وقت کے قابلِ ملاحظہ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی محبوب رہی تھی۔ جہاں کہیں رہتے تھے وہیں ان کی محبتیں نہ رہا کرتے۔ لطیف گوئی اور بے لوثی میں ملاقا تھے۔ حاضر جوابی میں کمال حاصل تھا۔ لہذا دہلی اور شہرِ محبتوں میں ان کی بڑی عزت ہوئی۔ ریلنگ گو یاں یا کمال میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دراصل فغان مرزا مظہر کی اصلاحی تحریک سے بھی وابستہ تھے لہذا یہ کام انہوں نے بھی کیا یعنی زبان کی اصلاح کے متعلق جس کا بڑا مقصد اٹھانے ہوئے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں میر اور سورا کے مقابلے میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں یہ مبالغہ ہے۔ ان کا جو بیان ہے اس میں اپنے اشعار میں جنہیں سورا یا میر کے دوش بدوش دکھایا ہے۔ پس کہیں کہیں چمک پیدا ہوگی ہے۔ چونکہ فغان سادگی کر رکھتے تھے اس لئے زبان کی شائستگی اور لہجے کی سادگی تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ ان کا دماغ ان مختصر ہے۔ جن میں جذباتی تصدیقے غزلیں قطعاً اور باعیاں ہیں۔ انہوں نے کچھ یہ بھی کہی ہیں۔ چند اشعار دیکھئے

دست سے ہو رہا تھا مرا داغ داغ دل

اس گل کو دیکھتے ہی دوبارہ داغ داغ دل

کھلا دیکھو چہا کے ہے وہ اگر کہیں

لیتا نہ میرے نام کو اپنے نام پر کہیں

سرخ ہو اور بیٹا ، سبھا ہو اور سیا ہو

ہم جم رہے یہ صحبت دینا ہو اور تو ہو

عالم میں ہو کہ عشق نے دہا کیا مجھے

لیکن تجھے تو شہرہ آفاق کر دیا

کیا ہوا عرش پر کیا
دل میں اس شوق کے توراہ کی

قائم چاند پوری

(۱۷۲۲ء - ۱۷۹۳ء)

قائم نے خود اپنا نام محمد قیام الدین لکھا ہے ظاہر ہے کہ اسکے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ لہذا مختلف تذکروں میں اسکے نام مختلف طریقوں سے لئے گئے ہیں وہ قابل اعتنا نہیں۔ مولانا احتیاج علی عری نے بھی ان کا نام محمد قائم بتایا ہے۔ جب کوئی شخص اپنا نام تحریری صورت میں خود واضح کرتا ہے تو پھر بحث کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

قائم کا وطن تھہ۔ چاند پور، ضلع بہنور تھا لیکن ایک آدمہ جیکان کے گاؤں کا نام محمد وہ بتایا گیا ہے یہ شاید درست نہیں۔ سن ۱۷۷۷ء میں بھی عینیں نہیں لیکن بعض شہادتوں کی بنیاد پر ان کی پیدائش ۲۲-۲۳ء بتائی جاتی ہے۔ "خزن نکات" میں ہے کہ قائم کی ولادت ۱۷۲۲ء پاس سے بھی ایک دو سال پہلے ہوئی چاہئے۔

قائم کے ایک بھائی محمد منعم دہلی میں تھے اس لئے ابتدا ہی میں قائم دہلی آ گئے۔ جوانی ہی میں شاعری تو پ جانے میں غازی ہو گئے۔ مرہٹوں کے حملے کے بعد یہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور ملازمت ترک کر دی۔ ویسے ان کی زندگی میں قیام و فراز آتے رہے۔ انہیں حالات میں امروہ، سنبھل، مراد آباد اور آٹول کا سفر کرتے رہے۔ "تذکرہ شعرا" میں اردو کی تالیف کے وقت بقول میر حسن جو سنبھل ہی میں تھے، سیولی اور بریلی میں بھی ان کا قیام رہا تھا۔ ۱۷۷۷ء میں نواب محمد یار خاں کی دعوت پر غازی آ گئے۔ واضح ہو کہ نواب موصوف نے سودا اور سود کو بھی غازی آنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ نہیں آئے۔ جب نواب کی نظر قائم پر پڑی۔ غازی وہیں ان کی تحفہ اور روپے ملائے مقرر ہوئے۔ اسی وقت مصحفی سے بھی ان کی ملاقات ہوئی جس کے "تذکرہ ہندی" میں اس کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

"وہند کہ یازاں صحبت گزشتہ رخ نام کا ہی ہر دل رو ہندی گز اور۔"

سکرپل کے چنگ سے سے غازی کا سکون بھی ختم ہوا۔ چنانچہ اس اشتیاق کے سلسلے میں قائم نے ایک "شیر آشرب" تصنیف کیا۔ پھر ۱۷۷۶ء میں یاں اس کے آس پاس دو کھنڈے آ گئے۔ اس کے بعد ۱۷۸۷ء میں نواب احمد یار خاں نے انہیں دامپور بطور الیاء راجپور میں ان کا وقت اچھا گزارا اور ان کی ملاقات وہاں اور باپ کمال سے ہوئی اور خوران کی ذات مرکز توجہ بن گئی۔

بعضوں کا خیال ہے کہ میر اور سودا اگر نہ ہوتے تو قائم اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر ہوتے۔ لیکن یہ جگہ ہے کہ قائم نہ تو میر ہیں اور نہ سودا۔ ہاں ان دونوں کی ذہانت ان کے یہاں موجود ہے۔ لہذا احمد مدنی لکھتے ہیں کہ:-

رفتہ رفتہ ان کی طبیعت پر فقر و درویشی کا رنگ چڑھتا گیا۔ انہوں نے اپنے تذکرے میں بڑی رنداداری اور عتیق آواز ان کا ثبوت دیا ہے۔ غازی نے میں جب مصحفی نے انہیں دیکھا تو اوچھوٹ کر میں وہ بڑا شوق اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں:

"فقیر آوارہ ایم درد سونی یہ لباس درویشی..... دے دے"

پھر ترقی ادب کے ذریعہ تمام کلیات قائم ۱۷ جلدوں میں مرتب ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ پہلی جلد میں ۷۷ غزلیات ہیں۔ دوسری جلد دیگر اصنافِ سخن پر مشتمل ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

رباعیات: ۱۰۰ قطعاً: ۳۶ بخشات: ۷، مسلمات: ۲، ترجیع بند: ۱، قصائد: ۱۳، مشواریات: ۳۶، (۱۱ کلیات ۱۲، مختصر مشواریات اور ۳ طویل مشواریات) سلام: ۱، سر ملی: ۱۳، کلام فارسی (۳۳ غزلیات، چند رباعیات و قطعات اور ایک مقام)

اس تفصیل سے قائم کی غزلیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر چنان کی طبیعت کے جوہر مشواری اور غزل کے میدان میں پوری طرح کھلے لیکن دیگر اصناف میں بھی ان کے کام کی سطح اس سیار سے ہرگز فرار نہیں ہے جو سودا اور میر جیسے استادوں کی قائم کر چکے تھے۔ ان کے قصائد میں سے صرف دو قصیدے لغت و سنیت میں ہیں۔ ایک قصیدہ مرزا سودا کی مدح میں ہے باقی اہل قصیدوں کے محمود و ماضی اور دوسرا ہیں جو مختلف ادوار میں ان کے مرثیہ اور سر پرست رہے۔ ان کے قصیدوں کے موضوع اور اسلوب میں خوب تمیز، تشبیہیں حالیہ ہیں۔ اس یکسانیت کی وجہ سے ان کی تشبیہوں میں حسن و جاہلیت، یاقی نہیں رہی۔ لیکن زور بیان، محتات و جزالت اور نکات آخری میں دوسروں کے سوا اپنے معاصر شعرا میں سب پر سبقت رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قائم اپنی الہامی کے لحاظ سے منفی قصیدہ کے مریدان نہ تھے۔ انہوں نے دنی شوق اور طبیعت سے قصیدے نہیں لکھے۔ میر کی طرح انہیں حالات روزگار نے قصیدہ گوئی پر مجبور کیا۔ قائم کے یہاں رباعیات، قطعات کی تعداد اردوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے اور ان کا فنی معیار ابھی خاصا بلند ہے لیکن ان میں کوئی امتیازی شان نہیں۔ قطعاً تمام شخصی (حالیہ ادبیہ یا تاریخی) ہیں۔ رباعیات بھی نصف سے زائد شخصیات سے متعلق ہیں۔

قبل اس کے میں ان کی شاعری کے سلسلے میں حیرت انگیز کروں، اس سے پہلے میں ایک نظر "خزن نکات" پر ڈالنا چاہتا ہوں۔ واقعہ ہے کہ یہ تذکرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں شعرا تین طبقوں میں تقسیم کر دئے گئے ہیں۔ شعرا نے

حقدار، بخوران، مستطین اور شعراے متاخرین۔ پھر ان سب شعرا کے ذیل میں ہر طبقہ کی کیفیت قلمبند کی گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ تینوں دور اپنے اپنے نقد و اشعار کے ساتھ واضح ہو جاتے ہیں۔

قائم نے چونکہ متعدد صنفِ سخن میں اپنا تجربہ دکھایا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند سطور ان امور پر بھی لکھے جائیں جن کا تعلق ان کی مصنف سے ہے۔ ان کی غزلیں شاد، حاتم کی غزلوں کا مزاج رکھتی ہیں لیکن انہوں نے اس کے امکانات میں وسعت پیدا کی ہے۔ قائم جس طرح زمانے کے متاثر ہوئے تھے ان کے احساسات میر جیسے ہوئے تھے۔ وہ بد رنگ نہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ نقادوں نے اس کی طرف بھی اشارے کئے ہیں کہ قائم کے یہاں پہلا مصرع تو برا چلتا تھا، وہاں ہے لیکن دوسرے مصرعے عام طور پر اُسی طے پڑ جاتے ہیں۔ قائم کے یہاں کئے گئے ایسے اشعار ہیں جو اردو شاعری کے تحت سے تحت انتخاب میں آسکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ انجلی غزلیں کہنے کے باوجود میر اور سونہار کی حیثیت کو نہیں پہنچتے۔

قائم کے دیوان میں ۱۳ قصیدے ہیں جس سے ان کی قور الکافی کا پتہ چلتا ہے لیکن اس باب میں ان کا مقابلہ سورا سے نہیں کیا جاسکتا۔

کلیات میں ۱۱۱ نظمیں خنساں ہیں ایک "شر آشوب" اور دوسرا "اور جو قاشی"۔ گویا قائم کی تھوڑی شاعری سے بھی دلچسپی رہی تھی لیکن ان کے جھوکوں میں مزاج کا فقدان ہے۔ ان کی ایک نظم "راز گوشت مرما" بڑی اہم ہے۔

قائم کی طویل منظومیاں بھی قابلِ ملاحظہ ہیں۔ "قصیدۃ" اور "موسم بہ" "میرت افرا"۔ ایک اور منظوم قصہ شاد "موسم بہ" "مشتی و رویش" بہت قابلِ ملاحظہ ہے۔ "مشتی و رویش" سے متاثر ہو کر راجہ عظیم آبادی نے "انجلی حتمی" تخلیق کی۔ بہر حال، منظوموں میں ان کا ایک خاص رنگ ہے جو قابلِ ملاحظہ ہے۔ ان کی ریا میاں اور قطعات بھی اہم سمجھے جاتے ہیں۔ بہر طور ان کے شاعرانہ حرائج کی تکمیل کے لئے چند اشعار ذیل میں نقل کر رہا ہوں:

نہ جانے کون سی ساعت چمن سے بگڑے تھے
کہ آگے بھر کے نہ بھر سوتے گلستاں دیکھا
نہ کہ غم تو غم کہ ایک گردش میں
نقیر کا سا چالہ ہے تاج شامی کا
کشت گل سونے سے کرنا کوئی مقدور ہے خس کا
میں اور میری رضا پیارے دھڑ چاہے اور لے جا
ہاتھی کا اپنی سبب اس شر سے بچو

قائم اس بارغ میں بھلے تو بہت ہیں لیکن
دل کھلے نالے سے جس کے وہ ہم آواز نہیں
دور دل کچھ کہا نہیں چاہا
آہ چپ بھی رہا نہیں چاہا
قسمت تو دیکھ لوٹی ہے جا کر کہاں کند
وہ چار ہاتھ جب کہ لب ہام رہ گیا
غیر اس کے کہ خوب داپے اور
غم دل کا کوئی علاج نہیں
قائم اور قند سے طلب ہوئے کی کیوں کر مانوں
یوں وہ نساں ہے پر اتنا بھی بد آموز نہیں
اس جن میں دیکھتے کیوں کر ہر سو اے ضم
ہے حرائج کبھت گل شونہ اور ہم بے دماغ

شیخ محمد علی حزیں

(۱۷۶۶ء-)

شیخ محمد علی حزیں کی وفات کی تاریخ ۱۷۶۶ء بتائی جاتی ہے۔ ۳۵-۱۷۶۳ء میں ہندوستان وارد ہوئے اور دہلی میں اقامت پذیر ہو گئے۔ ان کی ایک کتاب "تذکرۃ الاولیاء" لکھی جو سوتے بے حد اہم سمجھی جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو اس کتاب کے بارے میں حاکم لاہوری نے "مردم مدیدہ" جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے مرتب کر کے "اورینٹل کالج ٹیکرین" میں شائع کروایا ہے۔ حاکم لاہوری اس کتاب یا دہلے سے بے حد بدگمان نظر آتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس کتاب کو لکھنے کی غرض اسی تھی ہے کہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی مذمت کی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ حزیں، مجدد ملک حرائج تھے اور عایت دہلی کے کچھ میں جتا تھے۔ حد تو یہ ہے کہ انہوں نے اس زمانے کے مجدد فارسی دہلی، میران الدین خاں، تہذیبی فارسی دہلی کا تصنیف کرنا شروع کیا اور ان کی فارسی پر شہید اعتراضات کئے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ بعض ہندوستانیوں نے خان آرزو کو ایک اہم فارسی دہلی کے طور پر پیش کیا تھا کہ وہ فارسی کے کسی امر میں بھی سہل دہے سکتے ہیں۔ یہ بات خس کو آرزو بھی ناگوار گزری اور پھر وہ آرزو کے پیچھے نہ گئے۔ ظاہر ہے اسے حالات میں قناعت

زور چکوتی تھی اور دو سال تک تازہ کی خطا تھام رہی۔ آخر اس آرزو نے ”سحبہ الفلین“ نام کی ایک کتاب لکھی جس میں موصوف نے وہ خطا نظر پیش کیا کہ ایران کی ترکی زبان کی ترکی سے مختلف ہے۔ ترکی ہی ترکستان اور توران کی زبان ہے فارسی نہیں ہے۔ عربی اور ترکی یہاں تک کہ انہی کے الفاظ کا استعمال فارسی زبان میں ہو چکا ہے۔ خان آرزو نے یہاں تک لکھ دیا کہ ہندی الفاظ کا استعمال تو ابھی ممنوع نہیں سمجھتے۔ مستند فارسی زبان ہے جو دربار شاہی اور زبان اردو میں بولی جاتی ہے اپنی شعرا کی خواہش اور انہیں چاہو نہیں۔ غیر زبان کے اکتساب کی ابتدا میں ہندوستانی اور اپنی قومیت رکھتے ہیں۔ ان اصول کا یہاں نے ”دار الفکر“ میں بھی قلمبند کیا ہے اور ”مضمون خاکسار“ میں بھی۔

”سحبہ الفلین“ میں شیخ علی حزیں کے بہت سے اشعار کی غلطیاں سامنے آئیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حزیں کا حکام بھی مستحق نہیں۔ حزیں پر اس کا رد عمل کیا ہوا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس سے کئی ہجرت سراج سامنے آئے۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ یہ امر واضح ہوا کہ ہندوستانیوں پر فارسی کا عیب کم ہوا اور وہ کاغذ پار ہوا اور جو لوگ پہلے تھے کہ اردو میں لکھنا ایک غلطی بات ہے ایسا تصور کا عدم ظہور۔ اب ہندوستانیوں کے ذہن میں یہ بات صاف ہو گئی کہ وہ اردو میں بھی گراں قدر کام انجام دے سکتے ہیں۔ آرزو نے اردو کے حوالے سے فارسی کی صرف سند کو کافی نہیں جانا بلکہ دونوں زبانوں کے اختلاف اور ادغام سے جو صورت ابھرتی تھی اسے پیش قبول ضمیر اپنی اردو شعروادب کے لئے یہ تجاویز عید اہم ثابت ہوا۔ اسے ہم اردو و فارسی کے لئے زبانوں کے سلسلے ایک اہم تاریخی موڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تبسم کا ضمیر یہ کہتے ہیں:-

”علی حزیں اور خان آرزو کی اس تاریخی آواز پر جوش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی دانشوروں کو پہلی بار پوری طرح یقین ہو گیا کہ وہ فارسی میں کتنی عظیم دست گاہی کیوں نہ رکھتے ہوں، ایرانی اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ چنانچہ ایرانیوں کے غرور اور احساس برتری سے بے نیازت حاصل کرنے کے لئے ہندوستانی شعور نے فارسی کی جگہ اردو کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی تاریخی اقدام کی طرف لے جانے والی شخصیت خان آرزو نے رفتہ رفتہ جو ان شعرا کو اردو شاعری کی طرف راہل کرنے کی سعی شروع کر دی اور یہ شاعر آہستہ آہستہ ان کے فطری وراثت سے کام لے کر آئے۔ خان آرزو کے ادبی ماحول اور اردو شاعری کے اولین دور میں بہت محدود طاقت چلتی ہوا۔ آج اس عہد کے اثرات کا انہی طرح دواؤں کو کرنا مشکل ہے مگر اظہار نویں صدی کی دلی میں فارسی شعرا کا اظہار غلغلہ کے تذکرہ پر نظر ڈالی جائے تو ان کے ادراک میں خان آرزو کی عقلی عظمت کی شاندار تصویر ہمیں نظر آئے گی۔ ان کا تہاہل کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے سہاروی زبان کی اشاعت میں واضح اول کردار ادا کیا۔“

زلی، ولی اور سراج

یہ امر بالکل درست ہے کہ غالب ہند میں ولی سے پہلے ایسے شعرا کی تعداد کثیر تھی جو فارسی سے رغبت رکھتے تھے۔ اس حد تک کہ اردو زبانہ وستانی اپنی عظمت کے بارے میں اور سری منزل پر تھی، لیکن دکن کی صورت حال قطعی مختلف تھی۔ وہاں سراج و میلا ان کے اعتبار سے لوگ اپنی انہی سے جڑے ہوئے تھے اور ان کی روایات میں ان کی عاقبتی ہولیاں زیادہ اہمیت رکھتی تھیں۔ فارسی سے ان کا تعلق داہمی تھا۔ شاید انہیں اس امر کا احساس بھی تھا کہ اس ضمن میں دو قطبی طور پر کوئی موڑ کام نہیں کر سکتے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے بہت زیادہ تفصیلی مباحث میں جانا ضروری نہیں معلوم ہوتا لیکن یہ احساس کہ فارسی سے ان کا رشتہ یہ حد تک زور ہے، کچھ لوگوں کو اس کی طرف راغب بھی کرتا رہا، لیکن اب تک اس کے لئے قضا ہوا نہیں تھی۔ جنوبی ہند میں کچھ شعر فارسی کی طرف رجحان رکھتے تھے، جن کا ذکر اسی کتاب میں اپنی جگہ پر ہو چکا ہے۔ خصوصاً صوفی، شاہی، دہلوی، غواص وغیرہ اور حسن شوق ایسے شعرا ہیں جن کے یہاں فارسی کی طرف ایک کاغذ ہوتا ہے اور فارسی میں تتبع کے طور پر غزل کی فضا بھی پوان چڑھتی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ دکن میں رجحان کی کچھ نہ کچھ بنیاد تو قلمی ہی اور بعض شعر فارسی کے مضامین کا اپنے طور پر جوئے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید گشت کی قلمیں اردو کی زبان کی ہدایت کی تھیں۔ آئے آتی ہے۔ ولی نے شعری روایات کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح کہ وہ اردو کے پہلے قابل لحاظ شاعرین کا تعلق دکن سے زیادہ فارسی روایات کا حامل ضمیر تفصیلی مباحث کا موضوع ہے۔

ذیل میں کوشش کروں گا کہ ولی، سراج، جعفر زلی اور دیگر اہم شعرا کی مخصوص اہمیت کے تحت ان پر تفصیلی دواؤں سے روشنی ڈالوں۔

ذہنی نام کا جزو تھا یا خود مختار کیا اعتبار کر دے یہاں اس سے بحث نہیں بلکہ اس نسبت سے اپنے ایمان کا نام "زلی نامہ" رکھا ہے۔ اس نے خود ہی لکھا ہے:

جعفر! شکر کن کہ در عالم
جا بہا نام تو زلی شد
شہرت مرید بہتر از ہر قسم
ہر کہ گنام زیست، لای شد

جعفر نے سب لکھا خود یہ تھا:

سکہ زد مریدم و موطہ و منر
بادشاہ قسمہ کشی فرغ میر

اس سلسلے میں شغل بادشاہ فرخ میرا اعتبار نام ہوا کہ جعفر کو قتل کروادیا۔ ایک قیاس کے مطابق یہ ساخنہ ۱۱۲۵ھ میں عمل میں آیا۔ گویا زلی کا انتقال ۱۱۳۱ھ میں ہوا۔ خواجہ عبدالرؤف نے عشرت نے "آپ جہا" میں یہ اطلاع مجھ پہنچائی تھی کہ:-
"دل سے جب آئے تو فیض آیا دہش رہے۔ پھر لکھنؤ آصف الدولہ کے عہد میں چلے آئے اور وہیں انتقال کیا۔"

اس بیان پر رشید حسن خاں کی گرفت ملاحظہ ہوا:-

"آپ نے ملاحظہ فرمایا! خواجہ صاحب عہد فرخ میر کے متحول کو عہد آصف الدولہ میں لکھنؤ میں سمجھنے لائے ہیں یہ تذکرہ نہ معلوم کتنی سربہ پارہ اقدار کا خزانہ ہے۔ چونکہ خواجہ صاحب نے اس کا التزام کیا ہے کہ حوالہ کہیں نہ دیا جائے اس لئے وہ اس قسم کی بے سرو پا باتیں پیا سانی لکھتے چلے گئے ہیں۔"

بہر حال اکام جعفر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس کے مطالعے سے بہت سی غلطیاں جو رواج پا گئی ہیں ان کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ ماہن میں ایک پہلو یہ ہے کہ دہلی میں جب دل کا دیوان آیا تو شاہی ہند میں غزل گوئی کا آغاز ہوا۔ دراصل جعفر کا زمانہ دروہی کا زمانہ ایک ہی ہے۔ رشید حسن خاں نے بڑی کٹھن دہی باتیں کہی ہیں، جس میں انہیں کے الفاظ میں درج کر رہا ہوں:-

"یہاں دروہی دیر کے لئے رک کر ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ جنگ فوج کے ساتھ پہنچتے ہیں کہ دہلی میں جب دل کا دیوان آیا تو شاہی ہند (پارہلی) میں غزل گوئی کا آغاز ہوا (پہلو لکھنؤ میں غزل گوئی کو فروغ حاصل ہوا) اس

جعفر زلی

(۱۱۵۳ء - ۱۱۷۳ء)

جعفر زلی کے حالات زندگی تقریباً ہی مش ہیں۔ بعض تذکرات میں ان کا کچھ ذکر ہے تو کس ادا کا کہہ لیں گوتھے، اور بارہ زبانیہ، لہذا مجموعہ درکار معصومیت اور شوخ مزاجی۔ لیکن "مجموعہ نغمہ" میں ان کا وطن نارول ٹھہرایا گیا ہے اور یہ بھی کہ وہ سید تھے۔ خاندانی حالات سے کسی کو کوئی واقفیت نہیں، سال ولادت بھی معلوم نہیں۔ لیکن جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں یہ اطلاع مجھ پہنچائی ہے کہ وہ شاہجہاں کے آخری دور میں جہاں تھے۔ لیکن یہ بھی ان کا قیاس ہے۔ محمود شیرانی نے "مخاب" میں اردو "میں یہ اطلاع مجھ پہنچائی ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال کے واقعے ہیں اور یہ کہ جعفر کے والد کا نام سید مہاس تھا، جن کا پیشہ کاغذاری تھا۔ ان کے چچا کا نام میر مراد تھا اور مغلداران کے چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ لیکن رشید حسن خاں کہتے ہیں کہ یہ قیاس ہمیشہ مولف ذر جعفری کی گپ ہیں۔ اس نے سارے خیالات گڑھ لئے ہیں۔ شیرانی صاحب نے بھی اس کتاب کو غیر معتبر بتایا ہے۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ نام جعفر جعفر تھا۔ یہ بات قطعییت کے ساتھ اس مرتلے سے معلوم ہوتی ہے جس کا عنوان ہے "رقص سیدائل کہ از نارول فرستادہ بود۔"

موصوف نے جالبی کے اس خیال کو بھی رد کیا ہے کہ وہ مرزا تھے میر نہیں تھے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ جعفر سید تھے۔ قیام کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "مرزا دراز سات نارول"۔ پھر میر حسن کے تذکرے کے حوالے سے میر جعفر لکھتے کی تصدیق کرتے ہیں۔ خود جعفر نے کئی جگہ خود کو میر جعفر لکھا ہے۔ ان کی وضاحت ہے کہ کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیرازہ کام بخش کی فوج میں ملازم تھے اور ان کے معرکوں میں شامل رہے تھے۔ خاں صاحب نے کلیات کے حصہ نظم کی چار نکلیں کا حوالہ بھی دیا ہے، جو کام بخش کے سلسلے کی ہیں۔ دراصل جعفر نے کام بخش کی نمائندگی پیش بھی کی تھی، جس کی پاداش میں وہ ملازمت سے الگ کر دیے گئے۔ مزید وہ اس کا اظہار کرتے ہیں کہ جعفر کو خود اس بات کی پہچانی تھی کہ اس نے کام بخش کی جو نکلیں اور ساتھ ساتھ دو اشعار بھی تصنیف کیے:

از لفظ ہے معنی خود، از لاف لا یعنی خود

فتاحی از ہر شک و تر کہ جعفر اب کہی نئی

با ہزار نصرت ہوتا، سر بہ لکھ فرمود

انہوں کا آں ہزار برا کہ جعفر اب کہی نئی

نیچے میں جعفر وہ دور ہے اور جہاں آئے۔ اس کے بعد یہیں مستقل قیام ہو گیا۔ پھر وہ شیرازہ و لکھنؤ کی

طرح روحانہ نمایاں ذہنوں میں چٹھ جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دہلی میں اردو شاعری کا اصل سرمایہ غزل ہی رہی ہے۔ جعفر کا زمانہ دہلی ہے، جو دہلی کا ہے۔ جعفر کا کلیات موجود ہے، اس میں ایک بھی غزل نہیں۔ یہ بات بھی اسی سلسلے کی ہے کہ جعفر کا قتل (بقول مشہور) ۱۱۳۵ھ میں ہوا اور دہلی کا دہلی ان مصلحتی کی روایت کے مطابق سن ۱۱۳۵ھ میں غزوہ شامی (۱۱۳۳ھ) میں دہلی آیا تھا، یعنی جعفر کے قتل کے کم و بیش سات برس بعد۔ اور جعفر اپنا دہلی ان اس سن سے برسوں پہلے دہلی نامہ کے نام سے مرتب کر چکا تھا۔ اس طرح یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کی روایت کی بنیاد رکھنے والوں میں جعفر کو مقدم زمانی کا شرف حاصل ہے۔"

گویا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شمال میں اردو شاعری کا آغاز زمانی حقیقت نگاری سے ہوتا ہے اور اس کا سہرا جعفر زلیٰ کو بھی جاتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس باب میں غزلی کو شخصی اہمیت دینی گئی، و درست نہیں، اس لئے کہ جعفر زلیٰ نے غزلیں نہیں کہیں، بلکہ نظم ہی اس کی تخلیقات کا جویر رہی ہیں۔

چونکہ جعفر زلیٰ خود اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ کسمپرسی میں گزرا، تاہم باہر دست و قضا کی گفتگوں میں جھلا رہا، ایسے میں دہلی کے طور پر اس کی بڑی شاعری کا وجود ہوا۔

محسوس ہوتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے دور آخر کے آلام و مصائب سے بظاہر واقف تھا اور اس ضمن میں ہمدردی بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے بیانی کی جاتی اسے بہت تکلفی تھی، لہذا وہ کلمے انداز میں ان کی مذمت سے بچے آپ کو روک نہ سکا۔ یہ بھی واضح ہے چونکہ اورنگ زیب ایک عرصے تک حکومت کی ضرورت کے تحت دکن میں قیام پذیر رہا، دکنی صورت میں شمالی ہند کا نظام (حکومت) سے نہیں جو پایا۔ یہ صورت بھی دہلی کے یہاں اقدار میں داخل تھی۔ جہاں جہاں اس نے ادارت و سرکاری کام سنبھالا، اڑایا ہے، دراصل وہ اس زمانے کے نااہل و میردوں اور سرداروں کا الیہ ہے۔ یہاں بات ہے کہ بیان اور اسلوب ہیسا اپنایا جس سے سختی خور یہ انداز دیا گیا جاسکتا ہے کہ وہ تفسیر طبع کے طور پر یہ سب کچھ کرتا رہا۔

دہلی کے یہاں بخش کام کی موجودگی اور بھی لوگوں کو اس کے خلاف منف آراء ہونے کی طرف راغب کرتی ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ بقول رشید حسن خاں یہ جعفر کی "کل کا نکاح" نہیں ہے۔ دراصل ایسے کلام میں بھی محض دشنام طرازی نہیں ہے بلکہ واسوہ بھی ہیں، جہاں زمانے کے امرا اور ارباب مل و عقد کی جاتی کو واضح کرتے ہیں۔ جعفر کے چار ماہ انداز سے بہت ساری غلامیوں یا پیدہ ہوئی ہیں۔ لیکن یہ انداز دراصل اس جہد ہی زوال کا شکار ہے جو اس زمانے کا مقتدر ہو چکا تھا۔

یہ اس قابل توجہ ہے کہ جعفر زلیٰ کے یہاں تو کل اور ترکہ دنیا کے بھی احساسات پائے جاتے ہیں۔ دراصل اس کا کینہ منظر بھی وہ ناامیدی ہے، جہاں زمانے کے حالات کا فطری نتیجہ ہے۔ جعفر کا حساس دل ایسے پرالندہ حالات سے بے حد متحرک رہا، نتیجے میں جو تخلیقات سامنے آئیں وہ اس کے دہلی کو واضح کرتی ہیں۔ رشید حسن خاں نے جہاں طور پر جعفر زلیٰ کے سلسلے میں یہ دلائل قائم کیے۔

"جعفر کی شاعری اور شخصیت کی دو جہتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہاں حقیقت نگاری کے واسطے ہے اس کی شاعری نے شیر آشوب کے لئے زمین ہموار کی، اس کے ابتدائی لفظی بلائے اس کے بے لاگ انداز بیان نے شاعرانہ آرائش پسندی کے تصور کو جاری نہیں ہونے دیا۔ اس اعتبار سے اگر اس کو شاعر محض نہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

دوسری بات جس کی اہمیت کچھ کم نہیں، یہ ہے کہ وہ دہلی کا پہلا شاعر تھا، جو بے جھجک اظہار رائے اور فتح نوازی کی بظاہر مقبول تھا۔ اس بنا پر وہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہمارے زمانے کے بعض ایسے میدان انقلاب پسند شاعروں سے برتر نظر آئے گا جن کو ہر سیاسی موسم داس آتا ہے۔ ایک تلخ مکتبہ شاعر جس نے شاہ وقت کا نام لے کر اپنے شہر دہلی کا بے جا اظہار کیا، اسے کوئی خوف تھکیں، میرزا جانی سے باز نہیں رکھ سکتا۔

ایسے شاعروں کی تاریخی اہمیت کا اعتراف نہ کرنا کم فطری کا اعلان کرنا ہے۔"

جعفر زلیٰ کے شعری کارنامے بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ اس زمانے کی شعری تقسیم کے لئے اس کی طرف رجوع کرنا ضروری امر ہے۔ کلیات جعفر زلیٰ میں تمام چیزیں جمع کر دی گئی ہیں، ان کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں رشید حسن خاں کا مرتب کردہ "دہلی نامہ" یعنی کلیات جعفر زلیٰ جعفر کے سلسلے میں بہت سے اقتضا کو درگزر ہے۔ چنانچہ بات تو یہ ہے کہ جعفر زلیٰ کے کارناموں کی تقسیم کے لئے اس کی طرف توجہ کرنا لازمی ہے۔

بہر حال اقامت مباحث کا مغزیہ ہے کہ جعفر اپنے زمانے کا ایک بے حد اور مغز شاعر تھا اور نظر نگار بھی، جس نے بڑا کام کر چکا، لیکن بار بار کیا تھا۔

دلی دہلی

(۱۷۷۰ء)

دلی دہلی (مجموعہ) اردو کے پہلے شاعر ہیں۔ اب تک اردو نے کئی گروہ لی اور دہلیات کا ایک بڑا ذخیرہ اب ہمارے سامنے ہے۔ لہذا یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ اردو دلی دہلی تک تین سو سال سے کچھ بگلی تھی۔

عجیب بات ہے کہ ولی دکن کے نام کے بارے میں بھی بڑا اختلاف رہا ہے۔ مختلف تذکروں میں کہیں ولی اللہ کہیں شاہ ولی اللہ کہیں محمد ولی کہیں ولی محمد اور کہیں میان ولی محمد لکھا جاتا ہے۔ لیکن اہل کے عہد سے قریب لکھنے والوں نے ان کا نام ولی محمد ہی لکھا ہے۔ خصوصاً "گلشنِ گلزار" میں ولی محمد نام ہے۔ "دیوان ولی" میں شاہ ولی نے ان کا نام ہی لکھا ہے۔ ولی کے مزید ترین دوست میر عبدالحی بقول "جیل جالبی" جنہوں نے ستر سو سو بیس میں ولی کا سفر کیا تھا ان کے لڑکے سید محمد تقی نے یہی نام لکھا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کا حقیقی نام ولی محمد تھا۔

ان کے وطن کے سلسلے میں بھی خاص بحث ملتی ہے۔ لیکن بحث کا معاملہ بھی کچھ ایسا نہیں ہے کہ اسے کوئی واضح رخ نہ دیا جاسکے۔ دراصل بعض لوگ ولی کو گجراتی بھی کہتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس زمانے میں یہ وہ جگہیں آمد و رفت اور تعلقات کے باعث ایک ہی تھیں۔ لہذا اگر ولی کا وطن گجرات نہ بھی ہو تو وہاں سے ان کا تعلق رہا ہوگا۔ ولی نے خود اپنے آپ کو گلی اشعار میں دکن کا ہی لکھا ہے۔ ایک شعر تو زبانِ خود خاص و عام ہے:

ولی ایران و قراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

جب نام اور وطن کے بارے میں ایسا اختلاف ہو تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تاریخ وقات میں بھی اختلافی صورت ہوگی لیکن مولوی عبدالحق نے "دیوان ولی" کے ایک غلطی نسخے سے ایک قصیدہ دریافت کیا جو ولی کی تاریخ وقات کو حتمی بنا سکتا ہے یعنی ۱۷۰۷ء۔ ۱۷۰۸ء۔ ۱۷۰۹ء۔

باد پناہ ولی ساقی کوڑ علی
(مستوفی ۱۶۳۹ھ تا ۱۱۱۹ھ — ۱۷۰۷ء تا ۱۷۰۹ء)

لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے قلم لکھتے ایسے پیش کئے جس سے یہ تاریخ وقات بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ ان کی تحقیق ہے کہ ۱۷۰۷ء تک ولی کے زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر یہ کہ وہ وطن کی کوچنی کر رہے اور ان کے سرشارہ استاد ساقی و قمر ۱۷۰۷ء سے نہیں بچیں سال بعد تک زندہ رہے اور ایک اہم بات یہ ہے کہ ۱۷۰۷ء میں ولی دکن آئے اور شاہ گلشن سے ملے۔ یہ "قزاقانہ" کی اطلاع ہے۔ ان وقت ولی زندہ تھے۔ اور یہ ۱۷۰۷ء کا واقعہ ہے۔ جمیل جالبی نے اس بحث کو مزید طول دیا ہے۔ اس سلسلے میں "ولی کا سال وقات" کے عنوان سے چلن صد سالہ نمبر "اورینٹل کوائ" نیو یارک ۱۹۷۳ء میں لکھا گیا جاسکتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے کہ ان کی وقات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اور وقت بھی مقرر کیا یعنی مصر کے وقت لیکن جمیل جالبی اصرار کرتے ہیں کہ ان کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا۔ اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، پھر بھی مجھے جمیل جالبی کی دی ہوئی تاریخ وقاتی معلوم ہوتی ہے۔

ولی کی شاعری کی بحث میں اس عہد کے ایک مشہور مصنفی شاہد محمد گلشن کا ذکر بار بار ہوتا ہے اور جنس کے

اور سالیب اختیار کریں۔ اس کا ذکر میر کے تذکرے "نکات اشعار" میں بھی ہے۔ اس میں یہ ملاحظہ ہے۔

"اسی ہر مضامین قادری کہ بیکار افتادہ اندر نہایت خود ہر"

"شعر الہند" جلد اول کے صفحہ ۳۶ پر بھی شاہ صاحب کی یہ تلقین ملتی ہے۔

"قزاقانہ دکنی راگزشتہ درختہ را ساقی اردو نے سلی شاہ جہان آبادیوں کچھینا تا سو چپ

شہرت و دروایہ قول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج کرد"

بعضوں کو اس بات سے اختلاف ہے کہ مصنفی شاہ گلشن کے مشورے سے انہوں نے اپنا رنگ سخن اس حد تک تبدیل کر دیا کہ دکنی ادب سے اس کا اپنا امتیاز واضح ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ولی کا قادری کا مطالعہ قابلِ لحاظ رہا ہوگا اور وہاں کی جو ادبی فضا تھی وہ اس کو کلی طور پر جذب کر چکے ہوں گے اور جب گلشن کا مشورہ سامنے آیا تو پھر ان کی طبیعت اور ذات متحرک بھی ہوئی اور اس کی طرف رجحان بھی۔ لہذا ایک نئی صورت سامنے آئی جو دکنی سے مختلف تھی۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اب تک دکن میں مولویوں سے براہِ راست باتیں کرنے کا عمل شاعری کا خاص عمل تھا۔ تمام نسائی کیفیات کا پان بھی ایسی ہی صورتوں میں ملتا ہے۔ لہذا یہ کہہ آسان ہے کہ وہ اصل یا جسم و جان کی شاعری کا تاریخی موضوعات تو رکھتی ہی تھی تجربہ کسی سطح پر گہرائی نہیں تھا۔ شاعری سے غرضی تک یہ صورت دیکھی جاسکتی ہے۔ ضرورتاً اور باغی بھی منتقلی نہیں۔ مولوی ہی صورت جو بدلتی ہوئی نظر آتی ہے وہ محمود اور حسن شرقی کے یہاں ہے۔ اب ولی نے نئی صورت پیدا کی اور وہ بہت نمایاں بھی تھی۔ ایک وصف تو یہ تھا کہ انہوں نے شمال اور جنوب کے الفاظ کا ارقام کیا اور دکن کی جگہ قادری کو ترجیح دینی شروع کر دی۔ دمری طرف یہ کہ گلشن احساسات کو خاد دینی علی پر نہیں رہا بلکہ داخلی خواص کو بھی بے حد اہمیت دی لہذا اب حسن و عشق کے معاملات کے ساتھ دوسرے نئے نظر آئے۔ غم جاناں و دور تھا جو کچھ دکنی مزاج سے ہم آہنگ تھا اور عصری دنیا نے بھی وہ جنس تھے جنہیں کلی طور پر دکنی کہا جاسکتا تھا۔ ایسے میں غزل نے ایک نئی کردار لی اور نئے اتفاق سے ہم کنار ہو گئی۔ پھر یہ بھی ہوا کہ موضوعات میں دوست آگئی۔ شاعری کے نئے امکانات روشن ہوئے۔ فارسی عروض و بحر و محلی و دیہات میں غزلیں کہی جانے لگیں اور اب محبوب خارجی احوال کے ساتھ داخلی کیفیات سے بھی منسلک ہوا۔ حسن و عشق کے بدلے ہوئے تیر کو کوئی بھی محسوس کر سکتا ہے۔ صرف چارہ شعرا ملاحظہ ہوں:

حسن تھا پردہ تجرید میں سب سوں آزار

طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

ہے ترا حسن بیحد یکساں

جنسے سوں بہت کہیں کہ چاہے

مکھی و لیلیٰ کا گرم ہے بازو
اس یمن میں چدر نگاہ سرد

مجھے خلق کا تیرے کاری گئے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری گئے

یہ چاروں اشعار غزل کی لگی چھوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے شاعری کی نئی معنی دریافت ہو سکی
اور زیادہ جن شاعروں کے لئے فضا ہمار ہوئی۔

دکنی ادب میں عشق کی سطح کی کیفیت بہت نمایاں رہی تھی۔ یہاں تک کہ عشق جس کا فضا ہے شائستگی اور سنجیدگی
خالیاں خالی ہوتی ہے۔ شعرا اپنے آپ کو ضبط نہیں کرتے اور کھل کھینے کی ایک فضا ابھر جاتی ہے۔ لیکن دل نے تصور عشق کو گہرائی
اور گیرائی سے ہم آہنگ کیا اور فارسی مطالعات کی روشنی میں واقعیت کے کیف پیدا کئے۔ جمیل چاہلی نے نعتی اور ولی
کے حوالے سے یہ ٹھیک لکھا ہے کہ:-

”نعتی محبوب کی ہف کا تاثر بیان کر رہا ہے اور ولی خال کا۔ دونوں میں مذہبی روایت سے
بدولی گئی ہے۔ نعتی زم زم کا ذکر کرتا ہے ولی حوض کوثر اور بلال حبشی کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن
دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ ولی کے یہاں شائستگی اور طہارت
ہے نعتی کے یہاں تہذیب و دیوانہ اور بھوک ہے نعتی کے لہجے میں سمجھا جاتی کا احساس اس
لئے ہوتا ہے کہ یہ آواز مرد اور یہ لہجہ مرد کا ہے۔ ولی کے یہاں ایک مردانہ آواز سنائی
دیتی ہے اور وہ لہجہ دکھائی دیتا ہے جو آج بھی اردو شاعری کا زمرہ لہجہ ہے۔“

مکھی سے وہ محبت بھی زیادہ ہوتا ہے کہ ولی کا عشق تصوف کی سرحد میں کس طرح آگیا۔ ولی کی ایک مشہور غزل
ہے جس کی رد و لک ہے جلالی یا بجھائی جا اس غزل کے بعض اشعار میں بعد میں نقل کروں گا۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ ولی
کا عشق تصوف کے حلقہ اثر میں آکر قطعی مختلف ہو گیا۔ صوفی شاہ مکین کے علاوہ بعض دوسرے صوفیائے جن سے ان کا ربا
جارت ہے وہ تھے شاہ نور الدین جن کا تعلق سرور دہلی سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ موصوف نے ان سے درس سلوک لیا تھا۔
لیکن بعض اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ شاہ مکین کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ واضح ہو کہ شاہ مکین جوں تو خود صوفی بزرگ تھے
اور شاہ گل سرہندی مختلف وحدت ہیں سید محمد سعید بن شیخ احمد مجدد سرہندی کے مرید تھے۔ اس نسبت سے انہوں نے نقل
شاہ مکین لکھا دیا تھا۔

ان کے علاوہ ایک ہی کامل غزل دھماکا ذکر آتا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شاہ ولی دھما سرہندی نے
آپ کو خرق خلافت سے سرفراز کیا تھا۔ ولی کو ان سے ملنے کی حقیقت تھی۔ ایک نام شیخ نور الدین سرور ولی کا آتا ہے جن سے
ولی نے باقاعدہ علوم و عقل و نقل کا درس لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرور ولی سلیطہ کا اثر ان پر زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ عشق کی یہ
تعلیم ولی کو ایک سلیطہ سے جوڑتی ہے۔ لہذا ان کا عشق مجاز اور حقیقت کا ہر جگہ ایک احترام پیش کرتا ہے۔ ولی نے عشق کو کس
طرح دیکھا ہے اس باب میں چند اشعار دیکھئے:

ہر طرف ہے جگہ میں روشن نام نفس الدین کا
میں میں ہے شور جس کے اوزے پر چین کا

ہے بس کہ آب و رنگ صبا تھیم داس میں
آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

خوہاں حیا سوں فرق عرق ہوں تو کیا مہب
جس دقت جلوہ گر ہو جمال گوہر ال

شیخ بزم وفا ہے امرت ال
سرد بارغ ادا ہے امرت ال

ترا تیرہ دیکھ اے سید معالی
خون نہماں کی ہوئی ہے فکر معالی

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں صرف مسلمانوں کے نام نہیں۔ یہاں تھیم داس بھی ہیں اور امرت ال اور گوہر ال
بھی۔ گوہر تصوف جس طرح ایک عام بھروں اور قدرت خصوصاً روحانیت سے ہر فرقے کو اپنے اندر سمیٹتا ہے وہ یہاں
دیکھائی ہے۔ یہاں خارجی احوال کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ دل کا کیف و کیم اور آئینہ خالص ہے جہاں ایک صوفی شاعر اپنی تصویق بھی
دیکھتا ہے اور دوسروں کی بھی۔ لیکن عشق اسی تک پہنچنے کا گھڑا دیہ ہے۔ گوہر یہاں عشق محض خیالی نہیں بلکہ اس کی جڑیں
حقیقت میں پیوست ہیں۔ یہ روایت ہندی بھی ہے ایرانی بھی۔ چند اشعار نقل کرتا ہوں:

صنعت کے تصور نے صبا سے کے صلے پر
تصور جناح ہے تری نور کون حل کر

دل کوں گر مرتبہ ہو دین کا
مقت ہے دیکھنا سری جن کا

دیکھ تھ میں جمال حق کا ظہور
جس دعا کو ملک پہ سارے ملک

عشق کر اے دل سدا تجرید کی
چاشنی ہے ابتدا توحید کی

عارفان پہ ہمیشہ روشن ہے
مگر فن عاشقی عجب فن ہے

مست غصے کے شعلے سوں جلنے کو جلاتی جا
نہک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

توہ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاہل
یہ روشنی افزا ہے اکھیاں کو لگاتی جا

یہ مباحث زیادہ تر Content سے متعلق ہیں لیکن اگر کئی طور پر بھی دلی کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو کوئی خواہ صورت دہراؤ لے دیا ہو تو یہاں کے یہاں نئی تشبیہوں کا ایک جال بچھا ہوا نظر آتا ہے۔ ویسے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دکن کے اکثر شعرا احساس جمال سے بہرہ ور معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں بات ہے کہ ایسا احساس ترشح کی سطح نہیں چھوتا۔ دلی ایسی تشبیہات وضع کرتے ہیں جن میں آقایت بھی ہوتی ہے اور علاحدیت بھی۔ چونکہ شعر گوہرائی سے متصف کر نے میں ان کا قافیہ پائے کافی مدد کرتا ہے لہذا تشبیہوں، استعاروں اور ہیکروں میں نئی جان آ جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہاں لے لیکن ہوسکا کہ کئی غلطیات نے ان پر لے آفاق روشن کئے اور لفظوں کا ایسا استعمال بھی ایرانی مطالعات کا نتیجہ ہے۔ لہذا عشق و محبت سے لے کر زندگی کے دوسرے رموز و عالم اسی طرح وسعت اختیار کرتے رہے۔ اگر دلی کا دیوان دلی نہ پہنچتا تو اردو شاعروں کی ہرگز وہ پہچان نہیں ہوتی جس پر آج ہم غور کرنے نظر آتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دلی سے پہلے جعفر زلی کے یہاں کچھ ایسے نکات تھے جو حسی صورت و واقعہ میں گرا ہمارے لیکن انی طور پر دلی کو جو امتیاز حاصل ہے اولیات کے سلسلے میں دوسری دوسرے کو نصیب نہیں۔ ہاں اردو شاعری نے غزلیں میں حب دلی کے بعد نئے رخ اور تیز اختیار کئے تو وہ اس

ہے۔ اس احساس کے ساتھ کہ اردو شاعری نے بہت سے نئے روپ اختیار کر لئے ہیں اور دلی کے بعد کتنے نئے رنگ و آہنگ نے اردو شاعری کو رحمت دی ہے ایسی تمام تر ارتقائی اور ارتقائی صورتوں کے بعد بھی دلی کا استحکام اپنی جگہ پر اور ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔

سراج اور نگ آبادی

(۱۷۷۷ء — ۱۷۷۷ء)

سراج اور نگ آبادی کا پورا نام سید سراج الدین سراج اور نگ آبادی تھا۔ یہ اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت تک دلی کا دیوان دلی بکچھ چکا تھا اور اس کے دور رس فنکار قائم ہو رہے تھے۔ یہ دو زمانہ ہے جب اورنگ زیب کا انتقال ہو چکا تھا اور چند سال بعد سراج پیدا ہوئے تھے۔ بقول عبدالقادر سروری ان کے انتقال کی تاریخ ۷۷۷ھ ہے۔ گویا انہوں نے انہیں اس کی زندگی پائی۔ جب ان کی عمر بارہ سال کی تھی تو علوم متداولہ حاصل کر لئے۔ لیکن ان کے حراج میں جذب و مستی کی کیفیت نمایاں رہی تھی جس کا اظہار مکمل طور پر ہونے لگا تھا۔ اسی جذب و مستی میں انہوں نے ایسے فارسی اشعار کہے جن کی اپنی اہمیت ہے۔ جب یہ جذبہ شدید ہوا تو گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور محراب نورانی کرتے رہے۔ بزرگوں کے محاورے دیکھیں لینے لگے۔ ایسی ہی حالت میں چشتیہ سلسلے کے ایک صوفی بزرگ شاد عبدالعزیز سے محاورات و محبت حاصل کی۔ انہوں نے کچھ اہمیت شاد بہان غریب کے محاورے پر بھی گزرا۔ اس طرح تصوف ان کی گھنی میں پڑا تھا اور وہ جذب و مستی میں سرشار و عشق و عاشقی کے سرسلسلے میں شعری تخلیقات کے سرسلسلے سے گزرتے رہے۔

سراج اور نگ آبادی دراصل اس روایت کے اہم ترین نمبرے جو دلی کی روایت کہی جا سکتی ہے۔ اور یہ روایت کوئی شاعری میں خاص پرانی تھی۔ کئی شعرا کا انتہا کہ اردو کی طرف تھا جو کوئی حوالے سے دور بکچھ رہا تھا۔ دلی کے دیوان نے دلی کی لفظ اور بھی گرا دلی اور شعر افاد کی کو چھوڑ کر اسی طرف راجع ہو گئے۔ صورت یہ تھی کہ فارسی ہی میں شعر کہنا باعث عزت تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن دلی کی روایت سے کا یا پایت ہو گئی اور اردو یا مقامی زبان کی اہمیت جو سبھی جلی گئی۔ اس حد تک کہ اردو میں لکھنا باعث شگفتہ نہیں بلکہ وقار کا سبب ہوا۔ سراج اور نگ آبادی اس ادبی روایت کے اہم نمبرے جو صدیوں سے دکن میں فروغ پا رہی تھی۔ دلی اور سراج کے ذریعہ شمالی ہند میں یہ روایت کمبو پر ہو گئی اور اس حد تک کہ میر ہوسا اور د۔ سبھی دلی اور سراج سے متاثر ہوئے۔ گھر حسن نے سراج اور نگ آبادی کا ایک انتخاب شائع کیا جس میں انہوں نے سراج کی شاعری کی بعض کیفیتوں کو چند سطروں میں سمیٹ لیا ہے۔ میں وہ سطر یہاں پیش کر رہا ہوں:-

”انتخاب کلام کے ان چند ابواب میں ایک ایسا مال پرست اور سبقت فرار شخصیت کی جھلکیاں

نہیں گی جو ذات و کائنات کے لئے عرفان کی تلاش میں ہے اور اسی تلاش کے عمل میں پڑنے

اشعار میں ایک درمندر دل کی آواز بھی ہے اور ایک تہذیبی اور ایک تاریخی دور کی صدا بھی۔ اچھا شعر ہمیشہ شخصیت، ماحول اور ادبیت کے سرگرم سے عبارت ہوتا ہے۔ اور اس اعتبار سے اچھے شعر کا مطالعہ پرانی شراب کا نشہ ہے جسے وقت فرسودہ نہیں کر پاتا بلکہ اور زیادہ شاداب اور پُر کیف بنا دیتا ہے۔ سراج کا مطالعہ ایک وقت تاریخ کے گھر جاوے گا مطالعہ بھی ہے اور عصر حاضر کا زندہ اور تازہ نگاہ تجربہ بھی۔

میر ذوقی خیال یہ ہے سراج کے بارے میں یہ خیالات بالکل درست ہیں۔ یہ کہنا کہ سراج پر دلی کے ایسے اثرات تھے کہ وہ اسی دائرے میں رہے درست نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض غزلیں ایسی ہوں جن پر دلی کے اثرات حاش کئے جاسکتے ہیں بلکہ کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ تمام تر حقائق نہیں ہے۔ جس قسم کا انتخاب سراج کے یہاں ملتا ہے وہ انوکھا بھی ہے اور ان کی آہنی کیفیت کی تفہیم کا باعث ہے۔ پھر اس حوالے سے ان کی شاعری اور تہذیبی زندگی کے مطالعے کی کمی جہتیں نکلتی ہیں۔ ردیفی اور سرسختی تصوف کی ایک ایسی شق ہے جو تخلیق راہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کے لئے امکانات سامنے آ جاتے ہیں۔ یہی صورت سراج کے یہاں پیدا ہو رہی ہے۔ میر ذوقی خیال ہے کہ ایسا انتخاب دلی کے یہاں نہیں ہے۔ ہاں بکھو تصوف کے اشعار ان کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن عشق و عاشقی کا وہ ایک جوہر انیت کی منزلوں سے گزر کر ایک ایسے آفاقی کی طرف لے جاتا ہے جس میں انسانی زندگی اور تہذیب کی تصویر بنی ہے سراج کے تصوف کا خاصہ ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ سراج ردی کی طرح تھا تصوف کے شاعر ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سراج کے یہاں تصوف ایک محدود سطح پر ہے اور وہ عشق و عاشقی سے عبارت ہے جس میں خفائی اور ربانی تصورات و محرکات کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں۔ جمیل جاوید نے یہ بہا طور پر لکھا ہے کہ:-

”پوری اردو شاعری کے پس منظر میں سراج کی شاعری کو دیکھا جائے تو وہ اردو شاعری کے راستہ پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے میر، درد، مصطفیٰ، انکلی، جوگن، غالب اور اقبال کی روایت کے راستے صاف نظر آ رہے ہیں۔ سراج نے اردو شاعری کے بنیادی رنگ کو چکنا چار کیا ہے اس لئے ان کی آواز سارے بڑے شاعروں کی آواز، نئے اور لکھے میں موجود ہے۔ سراج دلی کی روایت کو بھی اپنے جذبہ عشق سے اٹھا آگے لے جاتے ہیں کہ ان کی شاعری کو پڑھتے وقت ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہم دلی کے فوراً بعد کی نسل کے شاعر کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ سراج کے کلام میں دلی سے زیادہ اچھے مشتق اشعار کی تعداد دلی کے گھر سے زیادہ ہے اور اگر اس تعداد کا مقابلہ دوسرے بڑے شاعروں کے اچھے اشعار کی تعداد سے کیا جائے تو سراج یہاں بھی ہمیں بائیں نہیں کرتے۔ ہم کلیات سراج سے کچھ ایسے منتخب اشعار نقل کرتے

جس میں کو پڑھ کر آپ آئے دہلے دور کے بہت سے شعرا کی آوازیں سن سکیں گے۔ یہ سب آوازیں آپ کی جالی بچالی ہیں:

شخط رو، جام بکھ، بزم میں آتا ہے سراج
گردن شمع کوں کیا راک ہے ڈھل جانے کا

میرے ہجر کے درد کا چادر کب آئے گا
بک بار ہو گیا ہے دوبارہ کب آئے گا

ہر صفحہ اس کے حسن کی تعریف کے طفیل
مکمل ہو ، بہار ہو ، یونہی ہو

مجھ میں ہم دست و گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
چاک سینے کا نگاہاں نہ ہوا تھا سو ہوا

قبیلہ رو رجم کیا مجھ پہ خط آفاقی کا
کافر ہند مسلمان نہ ہوا تھا سو ہوا

جمیل جاوید نے عشق اور تصوف کو الگ الگ طور پر دیکھنے کی کوشش کی ہے جو سراج کی شاعری کا قوام ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں میں کوئی حد حاصل قائم کرنا ضروری نہیں بلکہ تصوف کا یہ خیال ضرور درست ہے کہ:-

”دلی کے کام کو سراج نے آگے بڑھایا۔ سراج کے ہاں بمقابلہ دلی کے جذبات زیادہ صحت کے ساتھ جان بھر رہے ہیں۔ دلی کے اشعار میں اکثر لہجہ پارہا سا معلوم ہوتا ہے لیکن سراج کے یہاں یہ مکمل جاتا ہے اس میں تیزی اور شغلی زیادہ آ جاتی ہے۔“

میں سمجھتا ہوں کہ عشق کے حوالے سے سراج اردو کے ایک اہم شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے اثرات دور رس رہے ہیں۔ واضح ہو کہ سراج کا کلیات ضخیم ہے۔ اس کا مقصد ہر صورت عشق پر جاری ہے۔ کلیات سراج ۱۹۳۰ء میں مجدد القادری سرور دلی کے ذریعہ مرتب ہوا۔ پروفیسر سرور دلی نے کلیات کی بنیاد و مخطوطات پر دلی۔ اس میں شعری ”بوستان خیال“ بھی ہے جو چار مخطوطوں کے حوالے سے اس کلیات میں مرتب کی گئی ہے۔ اس کا

انتخاب محمد حسن نے پیش کیا ہے جہاں سے کچھ اشعار میں نقل کر رہا ہوں:

اے آفتاب تری عکس چھائی میں
سراج آہ کوں آخر چرخ شام کیا

بہار آئی لباس تو نہالاں کیوں نہ ہو رنگیں
بھرا ہے رنگ غیبوں کے گلابی آنکھوں میں

اس لب کوں کب پسند ہیں دلی کنواریاں
لاک کے پھول کی ہیں جسے قہر خودیاں

دے مجلس وصال میں پردا گئی مجھے
جتن ہوں تیرا سراج بردہ کی انگلی میں

دش دشت محبت ہے دل زار سراج
حک دیکھ اس کوں تار کا کل میں کرا

تجھ لب کے قہم میں ہے اجاز سبھا
اے جان سراج اس دل ہے جاں گول جلا دے

پاک کھول کر منہی پلک کی موند لیتے ہیں
مرنی آنکھوں نے شاید غراب میں کوئی لعل پالا ہے

جھ زلف کی غریبی جو سنا باغ میں سنبل
کھا چھ اسی غم میں سے پوش ہوا ہے

دل کے پردے ہونے اب ایک ورق باقی ہے
سب تو آخر ہوئی کتاب ایک سہی باقی ہے

بار کی وضع ہے محال بنے

جان دیتا ہے ترے لہر کی نغنی میں سراج
آشتابی سنی اے جان ورق باقی ہے

خیر خیر مطلق سن نہ جنوں رہا نہ پہلی رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

خود کی ہے کفر اگر ہم انھیں تو یہ جادے
ہمارے بعد خود کی جانے یا خدا جانے

زباں میں شہد و شکر دل میں زہر رکھتے ہیں
کسا ہوں سب کو جیسے آشتا ہیں بیگانے

گویا دکن سے جو ادبی روایت شمال میں پھیل ہوئی اس کے بنیاد گزاروں میں دلی کے بعد سراج اور محمد آبادی
ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ دلی کے بعد نئے تخلیقی جہات تلاش کئے بلکہ شاعری کے نئے مضمرات سے بھی آشنا کیا۔ ان
کی مثنوی "یوسف خان خیال" اس امر پر دل ہے۔



سودا، میرا اور دوسرے شعراء

کہنا کچھ غلط نہیں۔ گرد بازی انہیں سپاہی قرار دیتے ہیں تو یہ ابتدا کی بات ہوگی۔ اس سلسلے میں کاظمی اشغال حسین لکھتے ہیں کہ:-

”والد کے اشغال کے سبب جب فارغ التحصیل کا درختم ہوا تو سودا نے فوج میں ملازمت کر لی۔ میر تقی میر، مرثعہ علی گزندی، حمید اور ملک آبادی اور قاسم نے ان کی اس ملازمت کی توثیق کی ہے۔ لیکن فوجی ملازمت کا زمانہ غالباً بہت مختصر رہا۔ ان کو اچھی زبانیت اور شیرازی طبع کا یہ سودا قبول نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد ملازمت چھوڑ دی۔..... تو کمری کرنے کے بعد سودا نے امر کی مصاحبت اختیار کی۔ باپ کے قول اور شاعری کی شہرت نے امر ایک رسائی کو سودا کے لئے آسان بنا دیا۔“

سودا کی علمی صلاحیت کے بارے میں ابھی اختلاف ہے۔ مصحفی نے انہیں مردِ علم قرار دیا ہے۔ لیکن کاظمی صمد اور دو کا خیال ہے کہ ”عبرت الغافلین“ کا مصنف جاہل نہیں ہو سکتا۔ قاسم نے اپنے تذکرہ ”مجموعہ نغز“ میں اس کا احساس دلایا ہے کہ مرابع الدین علی خاں آرزو کے گھر منتقل ہونے والی شاعری کی تقریبات میں سودا شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں خاں آرزو کا شاگرد بنایا ہے۔ محمد حسین آزاد کو اس سے اختلاف ہے۔ لیکن ہے کہ ان کی صحبت سے فیض اٹھایا ہو۔ سودا پہلے قاری میں شعر کہا کرتے تھے لیکن آرزو کے مشورے پر اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ ان کے استادوں کے سلسلے میں چار نام لئے جاتے ہیں خاں آرزو، شاہ قاسم، سلیمان علی خاں و دادا اور نظام الدین احمد صالح۔ یہی سلسلہ تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ وہ قاسم کے شاگرد تھے۔ ان کے ”دیوان زادو“ کے دیباچے میں شاگردوں کا ذکر ہے اس میں سودا بھی ہیں۔ قاسم ہی کے حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودا اپنے زمانے میں ایک شاعری حیثیت سے مقبلاً رکھتے تھے۔ غور ش کا بیان ہے کہ اگر سودا کو رنڈہ گوئیوں کا ملک اشعار خیال کروں تو ہاتھ ہے۔ مصحفی نے بالواسطہ چوت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض لوگ سودا کو رنڈہ گوئی کے فن میں ملک اشعار کہہ کر بچتے ہیں اور بعض اشعار صریح اور توہین صاف میں جھلی اور مرتے کا مرتب بناتے ہیں۔

ان باتوں کی روشنی میں گمان غالب ہے کہ سودا کو ملک اشعار کا خطاب کسی بادشاہ سے نہیں بلکہ اہل ذوق نے ان کی استادی کے پیش نظر دیا۔ محمد انور حسین حلیم سہانی نے کلیات سودا کے مہلوہ مدنی بخش (۳۷ء تا ۱۹ء) کے حاتمے پر لکھا ہے کہ:-

”سودا کو ملک اشعار کا خطاب شاعرین نے دیا تھا۔“

سودا مسلسل سفر کرتے رہے تھے۔ نواب خاں الدین غلام الملک کے مراد فرخ آپ بھی آئے تھے جہاں مصحفی موجود

تھے جب وہ مہربان خان کی ملازمت میں تھے اور مصحفی کے مطابق سودا وہاں اس وقت موجود تھے۔ یہ بحث بھی طبعی آتی ہے کہ مرثعہ آباد نواب شجاع الدین کی دعوت پر آئے تھے لیکن عام طور سے اس خیال کو غلط سمجھا جاتا ہے۔ سودا غالباً ۱۶۹۷ء تک مرثعہ آباد میں رہے اور جب نواب احمد خاں بکاش کا انتقال ہو گیا تو فرخ آباد چھوڑ دیا اور فیض آباد آ گئے جو نواب شجاع الدین کا پایہ تخت تھا۔ یہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی لیکن جب شجاع الدین کے انتقال کے بعد صرف الدولہ سید آرا ہوئے تو انہوں نے لکھنؤ حکومت کا مرکز قرار دیا۔ لہذا سودا بھی وہاں آ گئے۔ صرف الدولہ نے بھی سودا کی بڑی عزت کی اور ان کیلئے دھنپے کے علاوہ چائے عطا کی۔ بنگلہ ان راس ہندی (مقبولہ ہندی) کے مطابق نواب شجاع الدولہ نے ۲۰۰۰ روپے ہوا روپا مقرر کیا تھا جسے صرف الدولہ نے چار روپے دیا۔ اس زمانے میں ان کی ملاکات برطانوی ریونیو کے عہدے سے ہوتی تھیں۔ اس میں ایک شخص ۲۰ روپے چاہئے اور شاعری سے وہ کچھ نہیں۔ سودا نے انجاناً ان اس کی خدمت میں پیش کیا۔ کچھ دنوں میں انہیں شوق نے سودا کی وفات پر ایک قلعہ کہا تھا وہ یہ ہے:-

نعلو چ میرزائے رفیع
چو تھی رجب کی جان میں گزرتے
جب کہ (کہا) گیا ہوئی تاریخ
ہائے سودا بچان میں گزرتے

گویا ان کا انتقال ۱۷۹۱ء میں ہوا۔

سودا کی شاعری کی بحث میں ان کے افادہ طبع پر روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف نے صرف خوش گفتار تھے بلکہ تعلقات عامہ رکھتے میں مہارت تھی۔ کسی کو خوش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خوش گوئی کی وجہ سے لوگ ان کی قدر کرتے تھے۔ اس پر ملر دان کی جاسٹ تھی جس میں ایک کنش تھی۔ طبعیت میں طراقت کو کٹ کر بھری تھی۔ ایسے فرد کا علاوہ لازماً وسیع رہا ہوگا۔ شاید ان کے اسلاف کی حالت ان کی اپنی طبیعت کی وسعت کی وجہ سے ختم ہوئی کہ ہر کسی کی مدد کرنا چاہتے ہوں گے۔ یہ تو بچہ نہیں چلتا کہ انہیں تر کے میں کیا کچھ ملا تھا لیکن اکثر لوگ لکھتے ہیں کہ انہوں نے دوستوں میں بہت کچھ دیا اور منہا جیت کا پتہ اختیار کر لیا۔ اب ان کے حلقے میں سلاطین و زرا سے لے کر دھرمے رہے۔ لوگ بھی تھے۔ سودا غلطی زندگی گزارتے تھے، جس میں وسیع انہیں اور فراخ دلی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سودا کی خوشی اور طراقت رنگہ الہی، چنانچہ ان کی شاعری کے دونوں ہی عناصر قوام ہیں گئے۔ اب انہیں کہ سودا نے کسی سے جنگ نہ کی۔ وہ تو نوکرا معر کے کرتے رہے۔ سودا اور قاسم کا معر کہ مشہور ہے۔ انہوں پر انہوں نے کچھ بھی

تجربہ کاروں کو چھوڑ کر سورا کی تخلیقات کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:

(۱) اردو غزلیات کا ایک دیوان جس میں متحرق اشعار اور سلیقہ منظر بھی شامل ہیں۔

(۲) تمیں چالیس سے زائد اردو قصیدے۔

(۳) شمس سے زائد اردو مثنویاں۔

(۴) تمیں سے زائد اردو مجلس۔

(۵) ستر سے زائد اردو دیباچیاں اور چند مستزاد۔

(۶) پچاس کے قریب اردو قطعے۔

(۷) دوا پنج بند۔

(۸) ایک ترکیب وند و اسولت۔

(۹) تحقیق کے چند مسودے۔

(۱۰) کئی مرثیے اور سلام۔

(۱۱) اردو نثر میں ایک دیباچہ جو میر تقی میر کی شاعری کے مرثیے پر تنقیدی نظم کے پیش نظر کے طور پر لکھا گیا ہے۔

(۱۲) فارسی غزلیوں کا ایک دیوان۔

(۱۳) فارسی میں لکھے ہوئے چند قطعے و دیباچیاں، مجلس اور ایک قصیدہ۔

(۱۴) فارسی نثر میں ایک رسالہ "معبرۃ العاقلین" جس میں فاضلین کی شاعری اور دوسرے شاعروں پر

اصغر اصناف کو لکھنا انتقاد کیا گیا ہے۔

(۱۵) تقریباً ایک سو چوبیس پہیلیاں۔

(۱۶) ایک پنجابی غزل جو لکھنؤ کی لکھی ہوئی ہے۔

سوردا کی شہادت کی بحث میں ان کی شہادت و طرہ امت کا ذکر یاد آتا ہے۔ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ شہادت دہلوی

اس ماحول کا نتیجہ تھی جس میں وہ سانس لے رہے تھے۔ ایک اور امر جس کا اظہار کیا جاتا ہے وہ ان کا فارغ التحصیل ہونا سمجھا

ہے۔ یہ سب باتیں ایسی جگہ پر درست ہیں لیکن طرہ نگار یا شہادت کے لئے سب سے اہم سمجھو یہ ہے کہ وہ تاج کی ان

ہمواریوں پر کتنی نظر رکھتا ہے اور اداسی یا ہمدردیوں سے اس کا دل کس حد تک متاثر ہے کہ دھڑکیاں ان کی طرف دھکی ہو کر ان

کی اصلاح پر کمر بستہ ہے اور یہ بھی کہ اس کی ذاتی دشمنی اس کا بغض اور اس کا غنا کس حد تک اس کے قلب و فکر کو گرفت

میں لے سکتا ہے اور اپنی جو میں ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے ہوئے اس کے حدود کیا کچھ ہوئے ہیں؟

سوردا کی شہادت کوئی میں کچھ موضوعات کے اعتبار سے اہمیت دے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کی بھی کوشش

کی ہے۔ مثلاً سماجی اور معاشرتی نیز اخلاقی خرابیوں سے متعلق نظمیں، حکومت کی بدعنوانیوں اور بے اختیارلیوں نیز خدایوں سے متاثر ہو کر ان کی تخلیق کی جھوپ جہاں نیز افراد و اشخاص کی بے ہودگیوں یا ان کے مصائب یا ان کی طریق زندگی وغیرہ۔ لیکن میرا الہی خیال ہے کہ یہ سب دائرے ایک دوسرے میں ملا جلا ہیں۔ اس طرح موضوعات کے لحاظ سے ان کی شہادت کی تقسیم بہت دور تک نہیں لے جاسکتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر کسی ایک شخص کو لکھتا ہے مگر اس میں کسی دوسرے پہلو اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کہتا تو کچھ چاہتا تھا لیکن اس کی تخلیق قوت فرسٹر (Transcend) کر گئی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب شاعر ان قوت بہت تیز ہوتی ہے اور ان میں طبع معمولی نظمیں کا مالک ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ موضوع تو بہت وسعت رکھتا ہے لیکن شاعر کی قوت تخلیق ایک خاص نقطے پر پہنچ کر دہلوی رہتی ہے۔ نتیجے میں وہ وسیع موضوع بھی سکر جاتا ہے۔ سوردا کی شہادت میں یہ تمام صورتیں نظر آتی ہیں۔ یہاں میں چند نکات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے سوردا کے ان موضوعات کو دیکھتا ہوں جو بالکل ذاتی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً شاعر کے سلیقے کی شہادت یا فاضلین پر ان کے سلیقے یا قیام الدین قائم کی شہادت یا میر تقی میر کی شہادت یا ایک بات بہت آسانی سے کہہ دی جاتی ہے کہ سوردا شخصی شہادت میں اجتہاد کی حد تک پہنچے ہیں اور کبھی کبھی دلفنا قائم کرتے ہیں جو حساس طبیعت کو کمزور کرنے کا باعث بنتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شہادت کا کس سے پیدا ہوتی ہے اور کس کا کس اور اجتہاد میں بال برابر کفر ہے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ شاعر اپنے تخلیقی منصب سے گھر جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس باپ میں اس کی تخلیق قوت اسے کہاں لے گئی ہے۔ اس لئے کہ شخصی شہادت عصب اور عوار کا نتیجہ ہوتی ہے اور دشمنی میں الفاظ خصوصاً شہادت کے یہاں غایت احتیاط سے استعمال نہیں کئے جاتے بلکہ انہیں مبالغہ، غلو، دافراق کی منزلوں میں لے جا کر ان سے اجتناب جوتے کا اثر اخذ کرتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ عالمی شاعر کی خصوصاً انگریزی میں شہادت کے جو شہادت کارسولے سامنے آئے ہیں اور جن کا تعلق ذاتی نہیں دھندلے ہوئے ہے وہ سب کے سب اجتہاد کی سرحدوں کو چھوئے نظر آتے ہیں۔ میں یہاں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ذرا مزید ان کو شہادت سے نکال دیتا ہوں۔ یہ شہادت افاق طرہ شاعر اس کے سلیقے میں متعدد نظمیں لکھتا ہے۔ جس میں سے ایک Absalam and Achitophel سمجھا ہے۔ یہاں شہادت کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ تیز ہو کر سامنے آئے تو رکاوٹ کی اس انداز میں سوردا کی "تخلیل لکھ" سے کہیں آگے لا جاوے۔ ایک جگہ شہادت کے سلیقے میں اس قسم کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ خداوند کریم کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو کائنات کا سب سے غنی شخص قرار دیا جاسکے۔ چنانچہ اس معاملے میں اس کے کسی شہرے پر ایسی نظر نہ پڑی جاسکے کہ اس کے اسلاف میں کسی بھی شخص کے یہاں عقل کی قربانی موجود نہ ہو اور اس امر میں اسلاف کے سارے افراد یکساں ہوں کہ ان کے یہاں دانش کا ایک شہرہ بھی موجود نہ ہو یعنی شہادت میں اس کے یہاں نہیں بلکہ اس کے تمام افراد خانہ میں بھی ایسی ہونے کی عقلی قربانی صلاحیت موجود ہو۔ فریقیت یا مسمومیت کے جوہر اس کے تمام رکھوالے کا یہ خلا جاننے کے لئے معلوم ہو سکے کہ Dullness جس اسی خاندان کی میراث

ہے جہاں فراست بڑا سر پاؤں مارے مگر بارشیں پانچتی۔ فرشتے پر ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ شیطان کا خاندان اول تا آخر فراست سے خالی رہا ہے اور شیطان آج اس کا سب سے بڑا ائمہ ہے۔ نظم کے متن میں جہاں کئی تفصیلات آئی ہیں طر کے حیروں، سنے دکا کت کے کہتے ہی پہلو اچا کر گئے ہیں۔ پھر دوتیں منزلیں بھی سامنے ابھرتی ہیں جنہیں میں نے غلو اخراق اور مہالے سے واضح کیا ہے۔ اب سورا کے بارے میں یہ کہہ کہ وہ مہالہ ذاتی میں آج آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان کے بیان پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے ایک غلط بحث ہے اور یہ بھی صحیح نہیں کہ مہالہ جو کو خلیف کرنے کا سبب ہے۔

انگریزی میں ایک ادبی اصطلاح Tapinosis آتی ہے اس کے ذریعہ بڑی بلاغت سے مہالے کے انداز میں بڑی چیزوں کو خلیف اور خلیف کو اعلیٰ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ایسا کرنے میں کچھ مضمحل کی بھی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا جاتا ہے کہ کسی شخص کا چوں مذاق اثر اتنا سب نہیں ہے لیکن بھوک شریعت میں یہ مذاق خامعا غلبہ دیتا ہے اور شاید کردار کو چادراں بھی بنا دیتا ہے۔ جان ذرا غفلت نے انکار کیا ہے کہ اس نے شیطان کو اپنے طر پر تیر سے چادوں بھی بنا ڈالا۔ ٹھیک اسی طرح سورا نے ضاحک کو چاہے دوام عطا کرنے میں غایت کامیابی حاصل کی وہ آج ضاحک کو کون چاہتا؟ شاید یہ سرچ اس کا لڑ بھی متعلقہ موضوع پر تحقیق کرنے سے گریز کرتے۔ سورا نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ وہ جس طرح اس کردار کو چاہے ملامت بتا رہے ہیں وہ اس کی واقعی زندگی کا باعث ہو سکتا ہے اور سورا کے ساتھ ساتھ چلے گئے اعلیٰ بھی۔ ضاحک کے سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مگر میں اب جس کے دیگے کھڑے

وہ ہے اس کے یہ بیٹھے ہوں اذ کے

گھر سے پھر جو رستم اٹھ کر آئے

جیسے اس کی اٹھائے یا نہ اٹھائے

جس جگہ کر کسی کے گھر سے وہ

ایک دور بھی گر کرے ہے نمود

لوگ تو دوڑے ہیں، بچھائے کو

دوڑے یہ لے رکابی کھانے کو

ہر کسی بچے کی دکان ہے جا

اپنی باتوں میں اس کو لے ہے لگا

۱۱۲

آز کھاتا ہے جا کے بانٹے

یہ ناسیر اپنی کے دانے

کہا جاتا ہے کہ عقیدہ خصوصاً مذہبی عقیدہ جو کا عنوان نہیں بن سکتا۔ جس طرح شادہ لی اٹھ محدث دہلوی کا مذاق اڑایا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ موصوف نے اصغر معاویہ کے اوصاف کھائے ہیں، کچھ مستحسن نہیں معلوم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جو چٹاری میں یہ پہلو ایک صیب کی طرح ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اگر اس میں بھی شعری قوت ہوتی اور اس قوت کا شعری اظہار طر میں یہ لہو تو ایک بات ہو سکتی تھی۔ شاید یہی صیب ہے کہ بہت کم لوگ اس بیچ سے آگیا معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں اگر حکیم محمد غوث کی بھوک لطفیت پر غور کیا جائے تو یہ بات از خود ثابت ہو جائے گی کہ جس انگریزی اصطلاح Tapinosis کا میں نے ذکر کیا وہ یہاں اس قدر واضح طور پر متعلق ہے۔ بات بس اتنی ہی کی گئی ہے کہ حکیم محمد غوث تھے تو حکیم مکرطب سے قطعی واقف نہ تھے۔ چنانچہ ان کے طلاق سے جو صورت پیدا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نتیجے میں جو کہن اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں کا کاروبار میں طر چمکتا ہے وہ سورا کی آنکھوں سے دیکھنے کی چیز بن گیا ہے۔

ہر طور اندیشہ یا کئی اختلافات کے سلسلے میں سورا کی جھجک نظر میں آتی ہے۔ مولوی ساجد کے سلسلے کا یہ شعر سنئے:

کھن تو بعض یہ شرابیہ راہن زاد

جو ہے مولوی ساجد تمام اعانت باد

اس مرحلے پر معاملہ ختم نہیں ہوتا بلکہ مذہبی بحثوں میں خاندانی اور سیاسی عظمت کی بھی خبر مل جاتی ہے۔

ساجد اکیوں نہ یہ پر از کرے جب ملک

تو بیچ بھیجیں سے ہوں نصف کی حلت جس تک

ایک راہی میں چل کر، کھجک، جھجک اور خیر کا ہوں ذکر کیا ہے کہ یہ سب ان کی خوراک ہیں۔ اسی طرح فرد سے آگے بڑھ کر پوری قوم سے سورا رہا ہم ہیں اور وہ قوم ہے کشمیری۔ ان کا خیال ہے کہ کشمیری حضرت علی سے برگزیت لکھی کرتے بلکہ بلوچ، سکے دشمن ہیں۔ میں نے اوپر لکھا ہے کہ دکا کت وہاں پیدا ہوا ہے جس سورا نے انھوں کی بہو انھوں کو لٹا دیا ہے۔ ضاحک کی بیوی اور جالوی عورت کا کشمیری کی انھوں۔ عجیب اتفاق ہے کہ ایسے دو ایک مصلوں میں شعر بھی معیاری نہیں ہو چکا اور ستر کی ہی کلیت رکھتا ہے۔ لیکن جب سورا ایک دوسری منزل کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں، یعنی اپنے عہد کی سیاسی، معاشرتی اور انتظامی اشری کے احوال کو بھر دیتے ہیں تو وہ شاعر کا حلق کرتے ہیں۔ ایک مشہوری "غیدہ فیلا دغاس کوڈال" کی جھجک میں ہے لیکن وہ دراصل اس زمانے میں شریک ہدائی کا حال ہے۔ "خار رشوت غوری، غوری، اکینتی و خیر کو مپاں کیا گیا ہے۔ اس کی نظموں کا سلسلہ ان جھجک شرا غروب میں بھی ہے جن میں شریوں کی حالت نامکلف پہ پائی جاتی ہے اور عمومی حالات میں دلی کے باشندے مقلد نظر آتے ہیں۔ ایک قصہ "پیرہ" پچھلے ہے۔

ظاہر ہے کہ اس میں بھی عوام کی پریشانیوں کا حال رٹم ہے۔ کچھ بھریے نظمیں تو ایسی نظر آتی ہیں جیسے وہ آج کے حالات پر تفسیر کی گئی ہوں۔ آج بھی سرکاری عہدے سے ملاصورت پر نہیں بلکہ دوسرے معاملات کے سبب حطائے جاتے ہیں۔ سودا کے عہد میں بھی یہ صورت مختلف تھی۔ چنانچہ:

خانہاں کے بچے لے کر
شہر کے بچے کو قتل دے

شہر چاند کھینچے ہیں کہ دہلی کے دور اور اٹھارہ کا نقشہ جس مہنگی سے وہ نظموں میں "شہر آشوب" کے عنوان سے دکھایا گیا ہے اس کا بڑا بڑا ہماری ادبیات میں نہیں۔ ہندوستان کی زوال یافتہ ملکیت کے امر کی زبوں حالی کا ذکر یوں ہے:

لمحہ زاریوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ بکھڑے سر پہ ہے جس کا قدم جھک ہے طول
ہے ان کی گود میں بچے کباب کا سا پھول
ہے ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیے مول

دلچسپ امر یہ ہے کہ سوائے ٹھوڑے پرستند و جھوٹا باغیچہ و تلمیذ کے ہیں۔ ایک طرف حضرت علی کے ٹھوڑے کی تعریف ہے تو دوسری طرف سیف الدہلوی کی ٹھوڑی کی عظمت۔ لیکن میں ٹھوڑے کی جھوٹ سے عام طور پر سبکی متعارف ہیں وہ ہے "تہذیب و تہذیب و زنگار" کا ٹھوڑا۔ حقیقتاً یہ فوجی نظام کی خرابی کا ثبوت ہے۔ جہنگ اس ٹھوڑے کے حالات سے ہم سب واقف ہیں اس لئے زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں بلکہ بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ دانہ نہ گاہ نہ سوار نہ سیمیں
بکھتا ہو جیسے اسپ گلی غفل شیر خوار

باغیچہ کا اس کے کہاں تک کروں شہر
ماتہ نقش فغلی زمین سے بھر قفا

ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے بچتا ہے اس کا حال

گرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں عجز
تصاب پا پھرتا ہے مجھے کب کمر کے پار

آپ اور کیفیت رکھتے:

اک دن گیا تھا مانگے پہ گھوڑا رات میں
ٹپٹا ہو بیٹھے کو چلا اس پر ہو سوار
تیرے سے خط بیاد و سید سے ہوا سید
قہر سرد سا جو قد سو ہوا شاربہ دار
پہنچا غرض عرس کے گھر تک وہ نوجوان
نخرو خیمت کے در سے سے کر اس طرف گزرا

ٹھوڑے کا یہ روپ بظاہر کسی خاص ٹھوڑے سے (جسے معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہ تھینک روزگار ہے اور زمانہ کے فوجی نظام کا حال ظاہر کرتا ہے۔ غرض کہ اس کا ضعف اس کی ناتوانی، اس کی سست رفتاری، اس کی بھوک کی شدت، میدان جنگ میں پیچھے پیچھے اس کی ناتوانی، یہ سب اس نظام کی خرابی کی پر تو ہیں اور حضرت علی اور سیف الدہلوی کے ٹھوڑے سے اس کا مقابلہ کیجئے تو نہ صرف دونوں کا فرق ظاہر ہوگا بلکہ شعری قوت کے اعتبار کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ اب ایک دوسرے جانور یا تھی کی طرف رجوع کیجئے تو کم از کم وہ تھی آئے منہ منہ ہوتے ہیں۔ ایک علامہ الملک کا اب تھی ہے اور دوسرا لہر نہ پت ٹکھ کا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جس کی تو صرف سے بھوک طرف سوار رجوع کرتے ہیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ کچھ یہ شاعری حلقی اختیار سے زیادہ اہم میں کرنا بھرتی ہے۔ اس لئے کہ تاریخ کے جو پہلو ہوتے ہیں ان میں مبالغہ، غور و افرات و تاثر پہنچائیں کرتے ہو کچھ یہ شاعری میں لازماً پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رہا نہ پت ٹکھوں کو کڑوا دیاں کو فوجی کمر مضامین کمر زائیدہ یہ سب کے سب کردار میں جاتے ہیں۔

لیکن قصیدے کے وہ کردار جو محسوس فنی پیکر رکھتے ہیں وہ جانور اس کردار کی صورت میں ذہن و دماغ کو متحرک نہیں کرتے۔ محمد حسین آزاد جو اس سو کا موزعہ خائیں سے کرتے ہیں وہ بھی کچھ کو نہیں بھولتے، بلکہ سوار کو اس فن کا بادشاہ کہتے ہیں۔

در اصل سودا الماطل کے بادشاہ ہیں۔ الماطل ان کے ہاتھ میں گلی گلی کی طرح ہیں اور وہ جس طرح کا بیوی چاہتے ہیں، غصہ کر لیتے ہیں، الفاظ کوئی صحت دیتے ہیں اور اپنے فحش کو بھڑکے ایک ایسی دنیا آباد کرتے ہیں جو سراسر ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اس معاملے میں ان کا تعریف آج تک پیدا نہیں ہوا اور سودا آج بھی بھوکے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

سودا کی شاعری کے تنقیدی چاکر نے جس عام طور سے وہی نکات نہ پر بحث رہے ہیں بلکہ "آپ دیا ہے" میں لکھتے ہیں: محمد حسین آزاد ایک زمانے تک لوگوں کے ذہن و دماغ میں اس طرح سوار رہے کہ ان کی ہر بات سے پتہ چلتا دیکھنا کھانا آسان نہ تھا۔ یہ عجیب ہے کہ انہوں نے بعض نکات میں طرح پیش کئے ہیں وہ سودا کی تنقید میں معاذ اللہ ہیں

نگین کی غور پر دق لگاتے رہنا ہوں تو بات آگے بڑھائی نہیں جا سکتی حالانکہ سواستقرخ وہی دور رخ کے ایک ایسے شاعر رہے ہیں جن کی رہنمائی و دست دہشتی ہے۔ اس وقت میں مختلف رنگ ہیں جن کی شادست کے لئے تجسس اور حسرت اور ڈر نہ بنی کہ ضرورت ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ سوانح نگاروں میں شعر کہنے کے لئے نگاروں کی کٹاں نکل رہا ہے کہ اس کے مزاج کا تصور کیا جاتا کوئی غیر عقلی بات نہیں تھی اس کی ہوا بھی اس سے بہت بڑا فائدہ دے ہوا کہ اور وہ شاعری کی دنیا پہنچ ہو سکتی۔ فارسی کی اپنی مضبوطی و بات کے سوائے پہلوؤں سے استفادہ کرنا اور غرض اس میں مشکل کرنا اپنے وقت کی ضرورت تھی۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو جس مخصوص مزاج کو اس سے وابستہ کیا جاتا ہے وہ تصور نہ ہوتا ہوتا کہ اس کا ہوتا ہے کیا کہ اس کے سوائے کسی اور سے وابستہ نہ ہو اور اپنے اشعار کو فارسی کے جس خطر میں ہوں غرض کیا کہ اس کے بعض فی بیلو بھی اردو شاعری میں منتقل ہو سکے تاکہ اسے نیکو روئے لانا فارسی کی دست مکرر ہی جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور انکار کرنے کی ضرورت تھی نہیں ہے۔ اس لئے ہر فنکار اپنے اثرات کو بردہ کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ ملی اثرات لکھتا اور ایک ہی کر کے نہ لکھیں وہ کرنا میر سے مخلد نظر سے بالکل غلط ہے۔ لہذا سوانح کی شاعری اپنے وقت کی چیز ہے وہ غیاد کی طور پر تصدیق سے جو اس کے شاعر ہیں۔ ان کی غرضوں کا آج کل کے شاعر کی جڑی اور غار کی ہے لیکن اس جڑی اور غار کی کیفیت میں ایک ایسی صورت ہے جو پر کشش ہے اور اپنے وقت کی چیز ہے اس کا یہ منہ نہیں کر رہے تھے یا آج کل کے جس کو اس کا نام غزل کا آج کل کے ہیں سوانح کے یہاں نہیں سنا ان کے کہانیاں کا تصور رکھا گیا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہو گا کہ سوانح کے یہاں دیکھا جویو بھی موجود ہے لیکن اپنے اشعار کی کڑے نہیں ہے۔ جو اشعار ہیں وہ قابل فائدہ ہیں اور ان کا مطالعہ آج کے معیار غزل کے یہاں ممکن ہے بعض اشعار جن کی شاعری کی گئی ہے اور ان میں منتقلی، دھماکے، انفس کی ساتھ دہلی و گنگ و آج کل کے ان میں سے کچھ اہل میں چھٹی سکا جاتا ہے۔

ساقی مکی بہاد پ دل میں رہی ہوں

و منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ نہیں

سوئے جسم تریج ہے آلودہ گھر سے

دل خاک ہو گیا ہے کسی سے قرار کا

برسات کا تو موسم کب کا نکل گیا ی

مراں کی یہ گلائیں اب تک بڑھیاں ہیں

دیکھئے اُردو کے بدن کو ترے مہا

کھوئے کھوئے شرم سے بند خائے گل

دہانہ کون تھی ہے تڑا جس کو بارغ میں

انگھر کر کے سوئے جسم شرم مری

مزم غرضی نہ کر مجھ سے کہ مالہ پتار

اپنی ہی آگ میں میں آپ جلا جاتا ہوں

خجائے یاد کر دے کہ ہے دل کے صدمے کو

کبھی کھرا بھی سوا کو نظر آتا ہے ششمے کا

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سوانح نگاروں کے قصیدے اور غزلیں کا حصہ نہیں ہے بلکہ غزل میں بھی جدید رنگ لگایا جاسکتا ہے۔

سوانح کی تصدیق نگاروں کی طرف آئے تو مصنفین کا وہ قول دہن میں آ سکتا ہے کہ تلاش اولیٰ نظم، قصیدہ اور زبان رنگت اور یہ سب بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ سوانح کے پہلے بھی قصیدے تھے لیکن ان میں وہ توجہ نہیں ہے جو سوانح کے یہاں ہے۔ یہاں بھی اس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سوانح کی تصدیق کوئی کوئی کے لئے خاص تھی، غزلی، غزلی اور غزلیوں کی تصدیق کوئی کوئی کے لئے خاص تھی۔

فنا ہے سوانح کے نگاروں میں ان ہی سے کتاب کیا۔ یہی وجہ ہے ان اہل نگاروں کی زمینوں میں ان کے تصدیق سے ملنے ہیں اور کامیاب بھی ہیں۔

ہوا چپ کلر ثابت ہے وہ تمنائے مسلمان

نہ کوئی شمع سے زور شمع شہبانی

اگر دم سے نہ ہو ساچو فکر روزی کا

تو آپ دانات کو لے کر گھر نہ ہو پتہ

سکر ہوا سے کہوں نہ غلیوں کی ہو لہاں

چپ شہر سے سرے ہو ملا اس اس تصور جہاں

(نہانی)

سوائے خاک نہ سمجھوں گا صحت و صبر

کہ سر نوشت کھن ہے مری ۲۱۷ خد خد

(مرقی)

یہ کہ مولوں سے سب سے پہلے
کہ لکھ کرے بات گو مولوں

دست میں اور شاعری تو یہ
یہ بھی سب صاحبوں کی ہے دولت

وہ طوالت جسے نہ کوئی ہوں اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ سوز کے کلام میں تہ رادی کا فقدان ہے۔ خیال میں نہ وہ نہیں، نہ کوئی ایسی انفرادیت ہے جو ان کی اصیت واضح کرے۔ ان کے متعلّق میں وہی کیفیت ہے جو بعد میں لکھنے والوں کا طرہ امتیاز نہ بن گیا۔ ویسے یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ دیوان سوز میں روایات و متعلقات بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے ساتھ اور ایسے شعر مضمون بھی ہیں۔ لیکن ان کا دیوان غالب نہیں ہے۔ کچھ غزلیں و کچھ نثری ہوتی ہیں۔

سوز کی شاعری کا موضوع بھی متعلّق ہی ہے لیکن اس میں سنی آموزی بھی ملتی ہے۔ لہذا میں چند اشعار نقل کر رہا ہوں، جن سے ان کی شاعری کا عمومی انداز واضح ہوا کرتا ہے:

و چال = قامت = من یہ شرار

ہوتا ہے کس شکست سے لگ دیکھو خدا

کس کی لالی دیکھو اس حسن آفریں کو

یہ چند اس کا جلو ہے عالم آفرین

یار میں میں کو تھا اور یاد تھ میں تھا

کیا کہوں اب قیر ہے جو تھا لب سرد تھا

کہا تھا ہے ہر میں اس جہاں سے جھ گیا

پھر ت کیا اس طرف کیا جانے کیا ہو گیا

خواجہ میر درد

(۱۶۲۰ء تا ۱۶۸۲ء)

خواجہ میر درد نقشبندی سلسلے کے ایک اہم صوفی شاعر ہیں۔ خواجہ میر نام اور تخلص درد ہے۔ ان کے سوز کی اشعار میں غزلیہ طرز نقشبندی صوفیہ اور گزلبہ میں خدا سے دلی آگہی۔ دارنا و نقشبندی سلسلے کے روایتوں سے بے اعتنا عقیدت گوہاں سلسلے کے یہاں ان کی خاصیت ثابت ہوئی رہی۔ خواجہ میر کا ہر کلام شریعت کے پیچھے غور و فکر کے بعد ایجاد ہے، جس کی شادی ہر شاعر شاعری کو اپر سربلند عالم کی پہن سے ہوئی۔ انہی کے مضمون سے خواجہ میر درد کے دیوان

”اسم کتاب“ خواجہ میر درد ص ۸۳

ترب تلخ جہان کو پہنچا ہے۔ جس کے سینے غوی نے دھڑکنا سب غویہ درد کے والد تھے۔ غزلیہ دارنا و نقشبندی سلسلے قدرت رکھتے ہیں۔ قرآن و احادیث و فقہ و کلام و کلامی تصوف میں جدا جدا بزرگ کہے جاتے تھے۔ اس سلسلے کا ایک بہت دلچسپ واقعہ: اکثر شاعر نقشبندی سلسلے کے دیوان کا یہ: نقشبانی طوٹا ہے لیکن شاید یہاں اور بھی کہنا ضروری ہے۔

”ہر قسم کی تشریف اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے ناسخ محمد یوں میں پہلا جہان دیکھے حکم دیا

گیا کہ میں ہو جاؤں۔ یہ وہ تھیں جو اسلام اور اہل بیت کی بیعت کی بھرے باپ کے

ہاتھ پر اس طریق پر جو وہاں اعلیٰ مقام پر آ کر ہی ہے ہر سب تشریف اللہ ہی کے لئے ہے۔

انہوں نے ارشاد فرمایا کہ اس کے ہم کو کھائے ہیں وہ ہر گز خوشیاں نہ کر کہ اللہ تعالیٰ نے ہم

محمدیوں کو عجب عزائوت سے نوازا ہے اور ہر گز کی شرف فرمایا ہے کہ حضرت امام حسن علی

مقدس درجہ نے نزول فرمایا تھا اور وہ یہ سارے دن وہیں ساتھ رہے اور خاص اہمیت سے

میرے دل میں یہ باتیں بات آئی اور فرمایا یہ بیعت دیکھو جس نے تک پہنچا ہے خدا سے

ہا تا قریب بہت کچھ کہ اس وقت آغاز ہوا ہے بعد از آفرین میں کے عبور کے وقت اپنے کمال

کو پہنچ جائے گی اس کے بعد فرمایا کہ میں نے عرض کی کہ اسے امام علی مقام کا یا میں جس

طریق کا ہم جی طریق دیکھو ان کیوں کہ یہ آپ ہی نے ارشاد فرمایا ہے۔ اور میرے کی بات

یہ ہے کہ جنگی کامات امام علی ہم نے انگشت حیرت نہ میں دباتے ہوئے فرمایا کہ جنگی

ہمارا کام نہیں ہے۔ اور وہیں کا کام ہے۔ اگر ہمارا یہ ارادہ ہوتا تو ہم پہلے دلوں میں دوسروں

کی طرح اپنے طریق کو اپنے نام کی وسالت سے نکارتے۔ ہم تمام قرآن و حدیث اس

نقشبندی میں ہم ہیں اور سلسلہ میں مستحق ہیں۔ ہمارا نام ہی نام کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا نشان

بھی نشان ہے۔ ہمارا ہی بہت بلی بہت تھ ہے۔ ہر ہماری دولت بھی ہماری بہت ہے۔ اس

طریق کا طریق ہماری کہنا چاہئے (ان پر خدا کا نام) کہوں کہ یہ بھی حضور پاک کا طریق

ہے۔ جو نے اپنی طرف سے اس پر جو نہیں (احادیث) ہمارا مسلک بھی مسلک نبوی ہے اور

انہا طریق بھی طریق مسئلہ ہے۔ یہی نام کہہ سکتے ہیں ہمارا شیخ اور چکا ہے۔

(اسم ضمن Bidhineeli) کی رائے میں یہ واقعہ ۱۶۵۷ء کے لگ بھگ ہوئی آیا

تاریخ

روایت کی ہے ۱۶۲۰ء میں اسی میں ہوئی۔ یہ فرمایا ہے وقت میں ایک اسم دلی کہتے ہیں تھے اور نقشبندی سلسلے کے تھیں۔ فرمایا کہ زور کے مرید تھے۔ (اس میں ہوئی سلسلے سے جدا اور نقشبندی میں بھی نقشبندی تھے ان کے کچھ مریدی

”اسم کتاب“ تاریخ خواجہ میر درد ص ۸۳-۸۴

بھی گویا میرا دل غیبِ نظر میں سجھئے۔ میں کا سلسلہ حضرت علی اور حضرت فاطمہ تک پہنچتا ہے۔ "تو کہو مراد ہے" سولہ میں سلیم حاتم میں ہے کہ وہ جو سے عشقِ خواص اور صاحبِ مہنی تھے۔ لطف نے بھی "عشقی" میں لکھا ہے کہ اگر شیخ فرید الدین گنج شمس کو قتل کر دیا تو بیشک ان کا لکھتے فرما کہ تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ سوانحِ الدین میں بھی خاں آزاد نے خوب مزہ دکوان کی چرائی میں دیکھا تھا اور تب یہ رائے قائم کی تھی کہ وہ ایک مرتضیٰ خیمہ (کا جہان ہیں۔ جو کجماں میں دیکھتا ہوں اگر شخص میں آسمانی طاقت اور انسانی صفات میں دیکھا جائے۔

میر درد نے افسانہ اپنے والد ہی سے تعلیم حاصل کی تو دلت احمد نے "مجموعہ نثر" میں لکھا ہے کہ "سلطانی مولانا مراد" "عشقی" دلت مرحوم سے چٹکی اور چند دہری کی عمر میں علمِ ادب کا مقام حاصل کر لیا۔ پھر حسین آزاد "آب حیات" میں رقمطراز ہیں کہ۔

"اولیٰ چند دہری کی عمر میں بحالتِ اطفال، سالِ اعلیٰ دیکھا۔ شخصیت کی عمر میں دانات و دانات اور نام کا ایک اور سال دیکھا اور اس کی شرح میں علمِ الکتاب ایک پانچ سو گری کی عمر میں ایک سو گیارہ سالے ہیں۔" کچا جاتا ہے کہ انہوں نے ۱۸ برس کی عمر میں "عشقی" نامی کتب خانہ کھولی لیکن یہاں تک کہ میر درد کی گڑبادی۔ شری خود یہ زندگی گزارتے رہے، لہذا ان دین سے قائل ہوئے نہ جاسے، لیکن انسانی سیر کی سیر کر لیا انہیں وہ نے۔ ان کا انتقال ۸۳ عیسوی سال میں ہوا۔

نقشبندیہ طبعی میں "ساز" کو بہت زیادہ اہمیت تھی، دلی جاتی۔ میر درد ان سلسلے میں "سوانح" اور "ادب" کرتے ہیں۔ وہ عقیدے کے اشتباہ سے اسے قول نہیں کرتے لیکن دوسروں کو اس سے روکنے بھی نہیں۔ عشقوں کا خیال ہے کہ موسیقی اور "ساز" سے ان کا تعلق فطری تھا اور یہ شہوتِ انہیں سحرانہ کشش و طرب سے مہی تھی۔ لیکن خواہ موسیقی پر خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ اسی بنا پر انہیں سرورِ دلی بھی کہا جاتا ہے۔ خود میر درد نے "آسرا" میں لکھا ہے کہ "عشقی" کو موسیقی میں بہت اثر تھا۔ وہ جب بچے کے خواہ میر درد نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھنے کے باوجود کسی سلسلے پر مہتمم نہ ہو سکا۔ اس سے دلچسپی لینے دے۔ "مستی" نے اپنے تذکرے "تذکرہ ہندی گویان" میں موسیقی سے ان کی دلچسپی کا حال قلمبند کیا ہے۔

اس فنی طرز میں ان کی گفتگو روشنی کی تصویر شکل نہیں ہے۔ اس کی وجہ خاص یہ ہے کہ انہوں نے ایک طرف اپنی فاندانی روایت کو پاس رکھا اور دوسری طرف شعرِ عرب کے جھلکے جھلکے بھی چھپا دیے۔ ان کی کوشش کی۔ تاہم یہ ایسے میں ان کا مراد استعلاقی تصوف سے ہو ہی تھا۔ میں سوچ رہے کہ جہاں بھی ان کی شاعری کا ذکر آتا ہے ساتھ ساتھ تصوف و مصلحت بھی مل جاتا ہے۔ وہ اصل تصوف بذاتِ خود ایک عجیبہ اصطلاح ہے اور اس کے کتنے ہی رنگ ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ وہ تصوف کی رو سے معرفتِ الہی کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا رجحان اور مصلحت، دلِ عرفان آگے کی طرف لوٹ کر جذب کر لیتا ہے اور ایک ایسا وجدانی کیف شعر میں مدخل جاتا ہے جو ان کی کا حصہ ہے۔

"مجموعہ میر درد" یہ لکھتے تھے کہ شاعری سے زیادہ ہفتی کی کسمپرسی بھی لگتی ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے رسالہ "گلہ درد" میں شاعری کو قیہ الحسنت اور شانِ آدمیت سے فہم کیا ہے۔ گویا انہوں نے اپنی شاعری میں اپنا مصروفیت بھی برتنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شاعری سے کوئی جملہ کی ادبی سطح تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ لہذا بے مقصد اور ان کی شاعری جو اطلاقیات سے پر ہے وہ ان کے قصور سے باہر ہے۔

خوب میر درد سے کی تصانیف یادگار ہیں۔ اور وہ میں ایک دوجان اور ایک دوجان قدر کی عمر ہے۔ قیہ دوسری کتابیں انہوں نے فارسی میں بھی ہیں۔ "اسرارِ اعلیٰ" میں ان کی پہلی تصنیف ہے۔ لکھا جاتا ہے کہ یہ رسالہ انہوں نے چند برس کی عمر میں لکھا تھا۔ دوسری تصانیف ہیں "دارِ امان"، "عالمِ الکتاب"، "آسرا"، "دردِ دل"، "آب حیات"، "عشقی" ہیں۔ "عالمِ الکتاب" اور اصل تصوف اور معرفت کے شعبے کی کتاب ہے۔ اس میں پیچیدہ مسائل کو نہایت آسان سے تصوف، عشق اور شری سے ہم رنگی بہت افسانہ ہے۔ دراصل تصوف کی راہوں کو اور دہری اور گندار نقشبندی ہے۔ ہر چند کہ وہ کے یہاں زندگی کی بڑے نمایاں اور بحریمیاں مہم ہیں۔ لیکن انہوں نے "گلہ درد" میں اس کا اظہار کیا ہے کہ عدالتِ خداوندی کام زندہ لکھتے ہیں اور اللہ کے مشول روشن طبع قلم چاہتا ہے کہ

شعر ہے اور درد ہے عشق
دلت میں عود جان پڑتی ہے
مردان کا بیان ہے کہ۔

"ہر چند کہ جس کی طرح ہر شخص کے سامنے ہر وقت ہے کہ ہر دین میں کوئی بھی اس پہ خاص کارہن حال نہیں جو اس اور اس نام اس کے معرخی انہیں چھوڑا۔ و عظم دینا میر سے سوزِ باطن کو لکھتی ہے اور وہ ان کا گوشِ خواہ میری زبان حال کی بات کہتے ہیں۔" ان میں درد کے دیگر اشعار نقل کر رہا ہوں جن سے ان کے دارِ امان تھیں اور مزاج دیمان کا حشری اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

کچا جاتے کیا دل پہ مصیبت یہ پڑی ہے
اک آنکھ کی نگاہ ہے کہ وہ چنے میں گڑی ہے
ہر آہ شرد یاد ہے جہاں سرِ چراغان
کیا آنکھ الہی مرے چنے میں پڑی ہے
اس طرح ہے یک لبتہ جو آنکھ نہیں تھکتے
مطلوبہ عیا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

پچھو مت کاغذ عشق کو مہر جاتا ہے
راہِ رو آپ سے اس رو میں گزر جاتا ہے
گو پہنکا ہے مرا مالِ حق کے دل سے
جو نہ کہ کام تو اپنا بھی یہ کر جاتا ہے

لغتِ بحرِ سب آنسوؤں کے ساتھ رہ گئے
کچھ بارہ ہستہ دل ہیں کہ چکوں میں رہ گئے
کہا کس طرح سے ان نے بھی کن کن کے ہلیراں
بر چہ ہم بھی باتوں میں جو کچھ تو کہ گئے

اس کی نظر میں درد یہ کچھ بات بھی نہیں
دانت میں ہم اپنا جو کچھ میں کے سہ گئے

ان اشعار کے مطالعے سے دوسری باتوں کے علاوہ میرداد کی زبان کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان میرداد سے مختلف تھی نہ مسائل اور شے میرداد کے دوسرے کا استعمال۔ پھر بھی انکی زبان کو ان کی شخصیت کو بخشنے میں لے کر Diction میں تالیف کا اثر بھی اجڑا ہے اور یہ بڑی اہم بات ہے۔ اس لئے کہ کبھی بھی شاعر عام سے قریب ہونے میں اپنے شعری سلیب کو گرا رہا ہے۔ یہ صورت میرداد کے یہاں خلق نہیں ہے۔

میر تقی میر

(۱۷۲۲ء — ۱۸۱۰ء)

میر تقی میر کی شاعرانہ شخصیت اور بلندی کی کبھی کسی زمانہ کی کسی عہد میں کوئی طرف گیری نہیں کی گئی۔ ہر عہد میں انھیں "مستم" اشیات سے اندازہ کیا گیا ان کی عظمت پر ہر عہد میں جیت جیتی رہی۔ لیکن ان کی زندگی کے اوراق بہرہ نگاہ پریشان نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ سلسلہ سب بھی انتہائی ٹوٹنوں سے نکال نہیں۔

خیر میر اپنی طویل و شست سوانح "ذکر میر" میں برادار اور ان کا نام نہیں لیتے، جس پر سب کی بڑبا ہے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ میرداد کا ذکر ان کی زبان سے سب سے اعلیٰ حق ظاہر کرتے ہیں۔ "ذکر میر" کے احتیاج ہونے سے پہلے ذکر میرداد کے نام سے ان کے والد کا نام میرداد بھی لکھا ہے۔ مولوی عبدالباقی آفرین اپنے اس کتابت میر میں رقمطراز ہیں:-

"دوسرے میر صاحب کے والد جن کے والد کا نام میرداد بھی ہے صاحبانہ حق اور طوطی منی ان کے

جو کا جیلا میر صاحب قور"۔

یہ نام بالکل ملاحظہ ہو، روح کیا تھا کارہا۔ میر نے اپنی طویل و شست سوانح میں اپنے خاندان کے حقائق لکھا ہے کہ ان کے اسلاف قبائل سے اندازہ کیا جاسکے۔ پہلے کن میں انکسارت اختیار کی مگر وہاں کچھ انکی بھڑپاں چلیا گیا کہ بارہا ہواں تک حدود کے نو صحتا بارہ (گورنٹ) پہنچے تھے۔ لیکن یہ سزا میں بھی اس منافی اور کششِ آب و ہوا انھیں ان کے آباد (آکر) کھلی لائی، پھر انھیں دفعہ میں گئے اور اسی سزا میں ان کے آقا میرداد جو عطا ملک ہوئے۔

ان کے دادا اکبر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ چھ ماہ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ مرحوم میرداد کے دادا کے ہونے ایک نو جوانی ہی میں اشکالِ دماغ و جنون کا شکار ہو کر انتقال کر گئے دوسرے مرحوم تھے، جن سے اس خاندان کی نسل اپنی رہی۔ یہ میر صاحب کے والد تھے۔

میر کی حیثیت پر سوچیں کہ ۱۷۲۲ء کی نہیں ہے۔ یہ موضوع بھی متنازع رہا ہے۔ ہر فرد کو بہت بلند آگہی سے سید جانتے ہیں اور اس امر کا قریب اندازہ میں اپنی غزلوں میں ذکر بھی کرتے ہیں۔ مگر ان کا کوئی عام طور پر مورخین کو مطمئن نہ کر سکا۔

میر کے سب کے حقائق آزادانہ لکھا ہے کہ یہ شرف نے اکبر آباد میں سے تھے۔ اپنے کو سید کہتے تھے لیکن ان کے زمانے میں کچھ لوگ اس دعوے پر قوف زان بھی تھے۔ "ذکر مشرق" میں ہے کہ خطاب سید ان کو شاعر کی درگاہ سے عطا ہوا "آب حیات" میں آزادانہ لکھا ہے کہ پندرہ گین سال بزرگوں سے سنا گیا کہ میر کے والد نے ان کو مشابہ کیا تھا کہ میر گھٹس کر لے سے سید بن جائیں گے۔ اس کے بعد میرداد کا ایک شعر آزادانہ نقل کیا ہے جو کلیات میں نہیں پایا جاتا اور دوسری شرافت کی نشانی ہے:

بیٹے خود طبع کو بہت گرم کر کے ہر

کچھ غیر مال سامنے کچھ جان بامِ خیر

میرداد کا ایک دوسرا شعر جو حضور میرداد جس میں میر ان کے خاندان کی طرف اشارہ ہے وہ ہے:

میری کے اب تو سامنے مصلحت ہیں مستعد

چاہ تو گنہگار اور آپ کا خمیر

چاکھی غیاث کے ذات پر حملہ کرنا ایک عجیب غریب بات تھی۔ ملاحظہ حال کے نام نکلیں آزادانہ اس شعر پر مستعد کرتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ میر میرداد اپنے کو سید کہتے تھے اور "ذکر میر" میں بھی اپنے کو سید لکھا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا لقب میر مشہور تھا۔ انھوں نے ان کو سید سبب بیان کرتے تھے۔ میر کا بھی ایک شعر ہے

ہاں "میر" لکھا ہے میر "مولوی عبدالباقی آفرین"

”کتاب“ معنویات میر کا تخلیقی جائزہ ” متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ تفصیل کے لئے اس سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ میر انھما کے ساتھ چند اور بھی شاعر تھے، جن میں ایک صاحبزادہ بھی تھے۔

میر کی شاعریوں میں دیکھا گیا کہ کئی عقوبیاں ہیں جن کا تعلق کسی ایک طرح سے میر کی زندگی سے ہے۔ ان میں بعض شہزادوں کے عشاق، اہل نظر کا خیال ہے کہ یہ ان کی آپ بیتی ہیں۔ خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ حکیم کا صوفیہ مت قبول ہو گیا۔ ان کی زندگی کے واقعی وہ سچے واقعات ہیں، جن کا یہ شہزادہ کوئی شخص نہیں تھا۔ یہ ان کے لئے ہے جو اسے جمع ہو گئی ہے کہ میر نے اپنی جوانی کے درمیان دور میں کئی عرصہ عشق کی حالت میں ہی گئی۔ اس لئے آپ بیتی کا شہزادہ دیر سے دیکھ رہا ہے۔ یہ ان کے جوانی میں لایا گیا فرق ہے۔ ایک کھلی کتاب ہے۔

میر کی ایک مثنوی ”مولانا مثنوی“ ہے جس کے اشعار کی زبان نہایت شاد و دلدار ہے۔ مثنوی کی خوب سے محروم و صوفیہ ہے۔ ایک اور شہزادہ جو کسی نہ حکومت تھی میر صاحب سے اس کی راہ میں ہوا۔ میر کی زبان رفتہ رفتہ چلا یہاں تک پہنچا کہ صوفیہ دہم و مہم میں نہ تبدیل ہو گئی اور اس طرح کے شگفتگی سے گھٹیں گئے تھے۔ گیس تھیں کسی کی نگاہ کی سے صحت کے بھی کیا کرتی۔ نتیجہ میں شہزادہ کو اس سے میر کا یہ چارہ چارہ اور ہونا کام قدر کرنے کے وہ اس کا ریاش آئے تھے ہر صوفیہ پر ان کے ہمدردانہ تھے۔ اس لڑائی میں جو کچھ ہو گیا ہے، اسے یہ اثر ملا۔ اس کا کھانا ہے۔

”دو پائے عشق“ کا ہفتہ فارسی کی ایک مثنوی ”عقاد و قد“ ہے جس سے چہ چہ چلا ہے کہ اور تک زب کے بعد میں نظم بگلا شائستہ قد کا کام دہشای و بار میں تھو لے کر جا رہا تھا۔ راء میں تھی بہت کا طرح ہو گیا اور اس کو کوئی کچھ مدد نہ ہو سکی۔ مثنوی کے دوران سے پر ترجمہ۔ چاروں ہی جہاں کو اور مثنوی میں غزلوں سے وہ بدل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس فارسی مثنوی کا یہ انگریزی نام مصلیٰ کو لگا اور انہوں نے ”بافتہ دو پائے عشق“ کے نام سے ایک مضمون دیا۔ ”اردو“ میں شائع کیا۔ اس مثنوی کا پہلا شعر ہے:

ایمیر باد ہے عشق بیکانہ
پر خود تھلف مٹھو زبانیہ

”دو پائے عشق“ کی ”افغان“ شہزادہ میر کی دیگر مثنوی شہزادوں کی طرف سے ہے۔

”فصل عشق“ میں جو واقعہ ظہر کیا گیا ہے اگرچہ کہ بات ۱۱۱۰ھ کو ہوئی تو حقیقہً تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ سن سے اس کا تعلق ہوتا ہے کہ میر کو شہزادہ جو چاہے کہ جو اپنی ملی کی طرف مڑا رہا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے عشق سے عاقل کرتے ہوئے اس دور اور مصلحتانہ کے خیال میں یہ مثنوی شہزادہ کی جانتی ہے۔ جبکہ مقام زندگی کی تکلیف کی جاتی ہے۔ ایک نوشتہ چٹائی کا چاہا ہے۔ اسے تو کیسے مانے انکار کیجئے تو کیسے کیجئے۔ اگرچہ اپنی کہانی میں کہی ہے کہ اس نے جو واقعہ یہ یاد رکھتا ہے کہ میر کی طرح چٹائی کی حالت ہے کہ عشق جہان دہ جاتی ہے۔

اس واقعہ کو ۱۱۵۰ھ تا ۱۱۵۱ھ کی مثنوی دیکھ کر حسن اور حسین سند کے دریا میں لکھا ہے۔ اگرچہ احمد قادیانی نے بھی اپنی کتاب ”میر صاحب اور شاعری“ میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ شہزادہ کے عہد میں ہی تسلیم کیا جا

کے عہد چھوٹی شہزادی میں واقع ہوا۔ مثنوی ”فصل عشق“ کے ذکر کا مضمون اس میں چہ چہ چلا بھی کسی قافی ہے۔

”آفاقہ“ وہاں کا کہ رحیم محمد شاہ نے حکیم آباد سے دیکھ کر شریف شہر سے ہے۔

شوقی مثنوی لکھنے میں کہ ایک ہیں داستان ہے۔ یہ تقریباً ۱۸۰۰ء کے دور میں لکھی گئی ہے۔ واقعہ حکیم آباد میں پیش آیا۔ مثنوی نے اپنے خیالات کو خود لکھتے تھے۔ اس نوشتہ کو میر کا تالیف تسلیم کیا گیا۔ اس کے بارے میں ۱۸۰۶ء میں دہلی کے شہزادہ شہزادہ شاد کے پاس لکھا تھا۔ ”زبانیہ مثنوی“ کے نام سے حکیم آباد کی کے لکھنا دیکھا ہے اور اس کا ان کے لئے لکھنے کے لئے کیا ہے اس میں اس خط کی کئی کاپیاں ہیں۔ حاضری عبداللہ اور دیگر لکھنے میں کہ:

”دو پائے عشق“ ”مولانا مثنوی“ کا مجموعہ ہے اس میں پہلا شعر ہے۔

”دو پائے عشق“ میں اس خط کا دوسرا ہونا کی شکل میں لکھا ہے۔ یہ لکھنا کہ اسے اپنے مجموعہ مخطوطات میں تالیف کے یہ مخطوطات بھی جمع کرنے میں اس کے دو پائے عشق ”مثنوی“ کے لئے لکھے ہیں۔ اس کے لئے پہلا ”زبانیہ مثنوی“ میں ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔ ”دو پائے عشق“ میں لکھا ہے۔

رام پور میں ادیب محمد علی خاں ۱۲۰۹ھ میں متولد ہوئے لیکن شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے وہ جہنم میں
 اپنی کوشش سے اندر کر کے اپنے غلام بھگت کو کشت گھسی کر پانچ بھائیوں کے بعد محمد علی خاں گھر کے گئے۔ یہ ہمارے
 بگڑے ہلوے ہوتے رہے مگر آصف الدولہ نے جب اس کے کس ہلوے کا ذکر کرتے ہوئے کہا تو ہم نے کہ خوش ہو گئے۔ مگر
 کھٹائی بہادر مہرب چپ دہندہ افغانی و فوجی مقابلہ کو روانہ ہوئی۔ آصف الدولہ کو فوج نے کہ بڑا چنگی ملبوں نے چنگیے میں
 در کی۔ انہی دن کی فوج جلو میں پڑاؤ لے ہوئی تھی کہ گرجیوں نے دو دیوں کو گھست دے دی۔ اس انکاش آصف
 الدولہ بھی فوج سے چلے۔ پھر اس سفر میں آصف الدولہ کے مراد تھے۔ یہ فتح جس کے کرت و جہر تاگر پہنچے اس کا سرا میر
 نے آصف الدولہ کے سر ہاتھ حاصل ہے۔

مشہوری "کھارہ چار" بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے کام ہے۔ صدیق علی و تیر اندازی و تیر بازی و تھک زنی،
 مشکل ایک لہو ہے اور اس کے کچھ اصول ہیں مگر اس طرح کا کوئی مضمون اس میں نہیں ہے جو اس کے ایک بڑی نوع نظر
 سوج بھنگ کے جانوروں پر ملے ہوئے غور و خیر جانوروں کو بھان پایا اور جیسے چٹا مارا ملا۔ خدا جہان کو چھوڑ دے نہ ہو نہ
 در ہے۔ جو سامنے آیا موت کے گھاٹ اتر گیا جرج۔ ہے بھنگ چھوڑ کر اگلے بھاگے۔ غرض جانوروں سے بھنگ خالی کر
 کے آصف الدولہ اس بلاست آخر علی کے بعد اہل فتح مطلق کو لے کر گھرا دیں آئے اور اہل بیعت سے میں جانوروں کی
 لاشیں ملائے۔

میر کی دہلی مثنویاں نہ صرف انسانوں کی مدح و تحسین ہیں بلکہ جانوروں کی تعریف میں بھی درج نہیں
 کرتے۔ ان کی کئی مثنویاں ہیں جن میں انہوں نے کتے، بلیا، بچھو، بکے، بچے کی تعریف کی ہے اور وہ بھی اس لحاظ سے
 قابل توجہ ہیں کہ جانوروں کے اندر انکسیر عہد کیا ہیں اور ان کو میر نے کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ لیکن طوالت کام کی وجہ
 سے قلم انداز کی جا رہا ہے۔

جو یہ مثنویوں پر غور کر لیتے کہ ان میں آج بھی ہے۔ پھر اس میں ان کے آدلی نہ تھے۔ بچھو کے لئے جن عناصر کی
 ضرورت ہے وہ ان میں تھے ہی نہیں۔ شباب یا بھنگت، بھول کی وجہ سے بھول لیا اور بات ہے اور فطری عقیدہ حوزی،
 ظرفیت، جلال و تعالیٰ جو ہے یہ میدان سوزا ہی کے ہاتھ سے رہا۔ ان کی مضمونی مبالغہ آمیزی بھی دل کو اپنی طرف کھینچتی
 ہے اور لہجہ صریح کے باوجود انسان جو کہ اصل قصہ کو پالتا ہے۔ لیکن میر جب کبھی کہہ کرتے ہیں کہ صومالیہ جھکی
 پر غاش کا شیوہ ہوتی ہے اور اس کے بعد کہ وہ ہے اختیار ہو کر غشت و دست پر آتے ہیں اور صریح کا استعمال باقی نہیں رہتا۔

خواب چاہے ہم مضمون کی گھر میں آج بھی نہ گئے ہیں کہ انہیں اپنے منصب کا پاس دیا ہے نہ حرف کے شان اور ہے کہ
 سوزا حیرت انگیز نظم، نظم، شاعری کا نام ہو اور انہیں ہر اعتبار سے ذرا دہانت و احرام، خود میر کا معاہدہ ہم نظم،
 معاہدہ چنگ ہے الگ ہو کر ان کے کمال کو قدریں۔ لیکن میر صاحب جب اس کی بھول گئے بھٹو نہ ہم بھی کے
 تمام مثنویوں کے مطابق دیکھ کر کہیں دکانست چہ آئے وہ کی طرح غایب جان نہ تھا۔

ان مثنویوں میں ان میں ملیش یا نظم و نظم نہیں، بلکہ کچھ مثنویوں میں غزلت کا رنگ غالب ہے، مثنوی "سرخ رازاں"
 مثنوی کی جانتی ہے۔ کہ کہ اس میں مرزا زنی کا جراثیم کچھیں گیا ہے اس میں غزلت کا بہار بہت نمایاں ہے۔ میر صاحب
 نے اپنے شعرا میں یہاں طراز سے کام لیا ہے وہاں وہ اپنی حسن و بکریا ہے۔

میر حسن

(۱۷۳۷ء - ۱۷۸۹ء)

میر حسن کا پورا نام بھگت میر حسن تھا۔ یہ طباطبائی کے انکسیر تھے۔ میر حسن کی تاریخ پیدائش نہیں
 ہے۔ محققین میں اختلاف رائے ہے۔ لیکن ایک اندازہ کے مطابق ۱۷۳۷ء میں ہوئی۔ جنس ہے یہ تاریخی غلطی ہو۔
 میر حسن پانی پور کے محلہ سید والا سے پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں ہوئی۔ آگ یہ کیا پائے کہ انہیں
 باسما جہلیم دی گئی اور گریہ اسلئے بھی نہیں رہا۔ لیکن عربی و فارسی میں انہیں کچھ نہ کچھ دل ضرور تھا۔ ان کی شکل و صورت
 کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سچا تھے، خوش انعام اور رنگ گورا تھا، چھوٹا سا جسم تھا، خوب تن کرتے، دیا گئی مثنوی،
 زیب کا کرتہ اور پانچ تیشیں بچھتی ہوئی بوتلیں دار کرتے پٹیاں دیتے۔

جس وقت میر حسن نے انکسیر کھولیں، انی انکسیر سے وہ چار تھیں۔ دار السلطنت میں سازشیں خباب پر چھیں اور
 خاتون شکیں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ دلی کسیر بھی اہل ظلموں نے نکال دی تھی۔ میر حسن کی طرف اور آخر سے ایک
 انتظار کا عالم تھا ان حالات میں دلی کے لوگ ایک طرح سے انتظار اور دلی میں وقت گزار رہے تھے۔

میر صاحب کی فطرتی اور فطری بول چال پر مشہور دی ہے لیکن انہیں بھی خاندان کا بار تھا، ایسی خوار لیکن وہ دنیا یہ
 کام نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے کسٹن خان کو بھی یہ بار تھا، خاندان دار کے لیے کہتے ہیں کہ انہیں حالات میں سرائے علم بن گئی
 خان آزاد نے دلی سے ہجرت کر لی۔ اب یہ کام میر حسن نے کیا۔ ترک وطن کر کے پورا خاندان دلیک، بیٹا اور وہاں چہ
 بیٹے تمام کے بعد کہیں پورہ پورہ آئے۔ لیکن بھگت میر حسن کو کتا یہ پندرہ تھا۔ مثنوی "گلزار ام" میں ایسے احوال دیتے
 ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسن کو پورا پورا تعلیم و علم تھا۔ ایک اندازہ کے مطابق وہ ۲۵ برس کے تھے کہ
 تھکے سے فیض آباد آ گئے۔ خواب سارا جنگ کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا اور اسی دہلیے سے ان کا وطن ستر ہو گیا۔
 سارا جنگ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے آدلی میں خاں سے وابستگی ہوئی۔ مثنوی "گلزار ام" میں ان کے آدلی کے ہیں ہے
 جس میں فیض آباد کی تعریف کی گئی ہے۔

فیض آباد میں انہیں کسی خاتون سے عشق ہو گیا لیکن چان کا دوسرا عشق تھا۔ دلی میں بھی ان کی محبت تھی
 چنانچہ "گلزار ام" میں خود انہیں نے یادگار ہے:

ایاں بھی میں نے اک بھگت چاہا

نوریت دل کا وہ مرغوب چاہا

میراث اسٹوری کے تھے کہ ان کی وفات ہوگئی۔ وہی میں دیکھ رہا تھا۔ سچے سے وفات کی تاریخ ۱۲۰۷ء
 برآمد ہوتی ہے۔ میرزا کے یہ قیاس تاریخ ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ سچے ہو۔

میراث ایک ذہنی علم شخصیت کا نام ہے۔ عقلی حقیقی اور منطقی معنای دونوں ہی کی حقیقت ان کے کلام سے عیاں
 ہے۔ لیکن ”میراث“ سے مراد وہی کی مشرقی ”غراب و خیال“ مشہور سبیل۔ جس کی تحصیل آئے کے کی۔ اثر کی غرضیں
 عام طور سے چھوٹی کر لیں ہیں اور بہت صاف و شفاف ہیں۔ ان کی زبان و لہجہ چال کی زبان ہے، جس میں سادگی گہنا ہے
 اور پکارنی بھی بہت چارہ لگاوا دیتے۔

م سے کو طرح نہ کہنے کی شب فراخ

اس پر نہ جا کہ روز کیا ظام کر چکے

الہ کیا سب جہاں سے قول و قرار

وہ وعدے کیا کر چکے

لوگ کہتے ہیں یہ یاد آج ہے

دل تجھے انتظار آج ہے

کر دیا کچھ سے کچھ ترے لم نے

اب یہ دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

لیکن شعر اور ادب کی اپنی منطق ہے۔ شعر اور ادب کے مزاج و ماحول ممکن ہے کہ اس کی وضاحت سے ممکن نہیں
 کھاتے ہوں اور جات سے ان کی اپنی منطق کی جڑیں ہیں۔ میراث پر لکھنے میں ان کی تمام خصوصیات عیاں ہیں۔ لیکن جاننے
 ہیں کہ میراث کے صرف یہاں نہیں بلکہ مرے بھی تھے اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ وہ کی وفات کے بعد مسطورہ اور میراث
 بھی ممکن ہوتے ہیں۔ میراث کے مرے تھے، مرے دماغی سلسلے کے چاب میں ہر گھنٹہ کی ہے اس میں ہر شعر میں مشرقی ”غراب و
 خیال“ کے مشتملات تحریر و عبارت سے نکلتے ہیں۔ عقلی و شعری کے سلسلے میں نکل کر میراث اور میراث کے تیار کرنا ایک
 عام غرض کی ضرورت ہے اور جانی سلسلہ مضبوط ہو اس سے توقع ہے لیکن یہ ہر شے کے کوئیوں کے بیان میں ہو جائے
 اور لکھتے بار بار جانے تو یہ مقام تحریر ضرور ہے۔

عقلی و ہرگز دماغی نہیں ہوتے کہ وہ اصل میراث کے معاملات کو جسمانی سطح پر برت کر وہاں سرحدیں بنایا گئے
 جائیں جو ان کے منصب کے موافق ہو۔ میراث بھی کہ اس کا کوئی ایسا مشق ہو جس سے ساتھ و میل کی باتیں گزرائیں گئی
 ہوں۔ میراث کے سلسلے میں یہاں تک معاملہ پہنچتا ہے کہ ان کا صحیح تعریض اور ادب ہے اس لئے کہ آخری مرحلے میں جب
 ماضی اپنی آواز داری کے ساتھ اُسے دیکھا ہے تو وہ مسطورہ بن جائے (بلکہ یہ مشورہ بھی ہے)

حسرت مرے تھے کے سلسلے کوئی شاعر ہی جس بہت پہلے خوش ہو چکے ہیں۔ ملا دھکی کی انقلاب مشنری میں
 اصل و ہر کے احوال پیدا کی سے پیش کر دے گئے ہیں۔ اور سلسلے آگے بڑھتا ہے اور وہ ان کا خیالی تصور میراث کے انقلابی
 تصور میں مہل ہو جاتا ہے۔ میراث خیالی میں جسمانی لطف اور طرا کے تصور کے معانی میں میراث اپنے آگے
 اور پیچھے کے کسی شاعر کے کہیں نہ لیں۔ تاہم انہوں نے میراث کے ”غراب و خیال“ کی ایک تقریباً ہی ہیں اور وہ جات
 کا ایک طویل سلسلہ قائم کیا ہے۔ راضیاتی، جنسی زبان کے عقل کے اس طرز پر آئے ہیں۔ قرآن کے تصور ہی اور یہی
 گھنٹہ کی گئی ہے اور اس کا اطلاق میراث کی مشنری پر کیا گیا ہے۔ لیکن ایک مرکزی خیال بلکہ سوال قائم رہتا ہے کہ خاوار
 اور یہی قریب ترین شخصیت اس صورت میں ممکن کر دی ہے جس کی قسمت میں مسطورہ اور میراث چھٹن ہو چکی ہے۔

عقلی کے عقوبات سے آزاد ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق اور ایک قانون کے عقلی میں اگر گزرتا ہے۔ لیکن یہ مشنری
 راضیاتی کمی واری کا تصور سامنے نہیں آتا۔ اس لئے کہ راضیاتی عقلی اور احوال کے سلسلے سامنے آتے ہیں۔ وہ عقلی لہجہ
 قانون خاص یا مشق کے ایک ایک کے سلسلے سے چلا ہے اور اس کے احوال میں اس کے معنی جان کے تو گئے معلوم
 ہیں۔ اور ان کی جہازات سے اس حد تک واقف ہے کہ اس کے کلام سے عدم آگیا کا کوئی موقع فراہم نہیں کر سکتا اور
 قانون کے مسطورہ میں مسلسل شادی کرتا ہے۔ ظاہر ہے مشنری کی انصاف پر ایک طریقہ جس سے نہیں جواہر اور خوب صورت ہوا
 عقلی کے عقل میں ڈال دیا کہ اس کا اطلاق اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ مشنری تمام حقائق کے سلسلے سے گزری۔ چند اشعار
 ہوں گے کہ انصاف کے لئے چند کلامیاتی کی اس مشنری کو دہلی میں بھی جاتے ہیں۔ لیکن اس میں سے عقلی و مجرہ
 کر رہے ہیں۔ وہ تو لہجہ و لہجہ کے اس لئے ہزاروں مشنری کے بارہ و دھکی میں شہادت کا کوئی بیانیہ نہیں آتا۔
 اب ان کے کہیں کیا کہتے تھے۔ لیکن یہ سلسلے سے عقلی و خاوار میں مشنری کو جانی کا خیال کہ اس کے سلسلے میں صرف میراث ہی نہیں
 ہوا تھا۔ اور جب ان میں وہاں کر سکتے تھے وہ انہوں نے کیا۔

وینے عقلی و غیرت مشنری کے کلام ہے۔ ہر گز ادبی نو ہے۔ اس میں اس میں ہونا کہ شاعر کے پاس
 جہازات کی حکایت کے لئے اٹھا دیتے ہیں۔ وہ ہر سو تھے کے لئے نہ صرف نہ کہیں نہ خیال کرتا ہے۔ یہ کہ اس کے گھنٹے میں
 اس کا گھر بھی شامل ہے اس لئے روایات کے میں نہیں کہیں نہ خیال میں ہے۔ ہر گز میراث پر لکھنے ہے۔ صوفی کیف سے بھی یہ
 مشنری تصور کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کہیں نہ خیال میں ہے۔ ہر گز میراث پر لکھنے ہے۔ صوفی کیف سے بھی یہ
 ”غراب و خیال“ اور غراب و خیال سے کمال کر لیں۔ جس میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ صوفی صوفیت ایک کے دیکھیں اس
 جانے کا کیف ہے کہ اس ہے۔ اس فحاش کی مشنری کو اس میں اور خواہش میں بھی قبول ہوا تھا۔ ہونا ہی نہیں کہ اس نے اس
 کے بعض اشعار کا سوا اور میراث اور عقلی و دماغی میں اس کے چند اشعار سے کیا ہے جس میں اس میں بھی نہیں کہ اس نے اس

غراب و خیال - میراث
 بہار عشق - مرزا شوق
 تیار پانی میں ہاتھ جاتا
 دھوا پانی میں ہاتھ جاتا

اور شاعری کے معاملے میں کی طرح کی مشکل پیدا نہیں ہو سکتی۔ صرف وہی سادہ صریح سے اچھے بڑے اور جیسے میں وہاں سے ایک دوسرے کی بھی نہیں تھیں۔ چونکہ صریح کا آدلی پیش نظر تھا سو اس نے اس کو بھی نشان چھپ دیا۔

بہر حال صورت جو کہ ہر ماہ کوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ قصیدہ کو نہ صرف زبانی ہی مانتوں میں انہیں یہ طواری حاصل تھا۔ یہ خیال معقول کا ہے۔ ان کی تحریر سادہ سلیس کی بھی اکثر داہلی سے مصحفی اور شیخو نے مکمل کر انہیں دار تحسین دئی ہے۔ اکثر نو راسخ انہیں نے ۱۹۶۶ء میں حالات صریح مرثیہ کے خلاف کر دیا ہے۔ اس میں ان کی ہر خطی مشقی طواری نہ ملتی ہے۔

گویا صریح بنیادی طور پر قوال کے شاعر ہیں۔ ان کے پہلا قصیدہ اور شعر ہاں بھی ملتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صریح کے یہاں لکھی گئی کئی قصیدہ ہے۔ وہ ان کا اس کی طبعی میں بھی بعض لوگوں نے اس کی ترقیہ کر کے دیں۔ ان میں وہاں کی دہائی کا زمانہ ہے۔ لیکن انہیں دہائی سے شعر نہیں بھی کہہ سکتے۔ وہ دیکھا ہے۔ ان کی قزاقوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد اس لطف قصیدہ کا کریں کیا حاصل

آج کام فقہ آپ قزاقی یاد کے ساتھ

یک ایک یاد تباری جو مجھے آتی ہے

لی لقا جانے ہے جو کچھ دل پہ گزرتی ہے

جس کی جدائی مجھ کو خیال رول قی

رہتا ہے کام اب مجھے اس کے چاہیے

مری بات سنا ہے اس طور سے

کہ کچھ میں سمجھا بھی اور سے

ہم کو دیا کے ترہش سے پہچنے ہی

لب مرے شک سے چتر مری تم ہو

رہے ہے نقش میرے چشم دل پہ یوں قزاقی صورت

صورت کی فکر میں جس طرح تصویر پھرتی ہے

نظیر اکبر آبادی

(۱۸۳۶ء - ۱۸۶۰ء)

نظیر اکبر آبادی کے حالات زندگی کی کچھ تفصیل تو ملتی ہے لیکن انہی تفصیل کہاں تک درست ہے کہ مشکل ہے اس لئے کہہ کر دیکھنا اس نے انہیں نظر انداز کیا۔

عقیدہ یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا ذہنی دماغ کھلا ہو اور نہ سیکڑا ہوا اپنے زمانے میں سادہ اور گہرا سمجھا گیا۔ اس کا کیا جانتا ہے کہ وہ علم و ادب کا فن اور شریعت کی حقائق میں شائستگی بھی تھی۔ اپنے میں اس کی پوری حقیقت کا اصرار تھا کہ اس کو سمجھ نہیں ہے۔ "گفتن ہے خار کس شیعہ تو نے گھاسا ہے کہ اس سے بہت سے اشعار اس کی زبان پر جاری ہیں اور ان اشعار پر نظر رکھتے ہوئے اسے شعر کی صفت میں شمار کرنا چاہئے۔ لیکن اسے دانتے نے یہ بتایا کہ شیخو بعضیت شاعر نظیر کی عمر کا بھی نہیں پہنچتے۔

تاریخ اکبر ایک بہت بڑا ایسا ہے کہ نظیر کی تعریف تو صریح کرنے والا پہلا شخص بہت دستان کے ہاں ہے۔ میری مراد انگریزوں سے ہے۔ لیکن اپنی خود ستانی و تعریف و تعزیر کے پیش نظر اس نے یہ ہے۔

"صرف ایک ایک شعر ہے جس کی شاعری اہل قزاق کے خطاب کے مطابق لکھی گئی ہے۔

ہندوستان کی لفظ پرستی اس کو صریح سے شاعرانہ تسلیم نہیں کرتی۔ صرف نظیری ایک ایسا شاعر

ہے جس کے اشعار نے عام لوگوں کے دلوں میں راسخ کیے۔ اس کے اشعار ہر رنگ اور لہجہ

میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ وہ حقیقت میں آزاد ہے اور اس کا..... وہ اصل میں وہ

سے بے تعلق مولوی تھا جس کا اردو اس کو صرف طواری ہی ملتی ہے..... جس قسم کے اشعار

قیادت اس نے ان مولوی بچوں سے بڑے لکھے ہیں۔ انہیں چار ہندوستانی شاعروں نے لکھا

بات کہ مرزا کا کھانا ان میں کھینے کی قابلیت ہی نہ تھی۔ انہیں کہ ہندوستانی شخصیت کا وقوت سے

اس بات کا کہانہ تو کئی شے خیال کرتے ہیں کہ وہ کوئی شاعر تھا۔ یہ حقارت لڑکتے ہیں

کہ اس نے اس قسم کی مبتلا ہی اس پر لکھا ہے۔ آزاد ہی نہیں شعر..... اس کا بیان اس

خاصا قصیدوں کا بیان ہے جس میں ہندوستان کے رہنے والوں کے خیال و احساسات،

تفریق دماغ، غم، دل، دماغ سب کی اپنی اپنی قسم میں نظر آتی ہیں۔ بعض شاعری شہادت

کے نقش ہیں مگر عشق جو بھی اور جاندار غرضی کے لئے ایک جز ضروری ہے اس طرف اس کے

کلام میں کی ہوئی ہے کہ نظم، نکل نظر نہیں آتا۔ صریح ہاں کے طریقے اور کلمات چھائی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انجمنیں جماعت پر دلی کے ماحول کا اثر اس کی روایت کا اثر ہے۔ لیکن اس زمانے کی شاعری میں سوز و گداز اور حسرت کی کیفیت پائی جاتی ہے اور اس جہاں سے یہ صورت بدلتے گئی ہے۔ پھر علامہ بھٹی کی تصنیف آگئی۔ لیکن اب جماعت کی شناخت اس قدر کی باسرت ہو گئی ہے کہ ان کی جگہ نہیں بلکہ علامہ بھٹی کی جگہ سے ہے۔ سو بھٹی سے واقفیت اور اس کا واقفیتوں سے ان کا شغف اور ان کے مزاج کی تشکیل انھیں ایک نئی راہ پر لگا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے یہاں بھی اسرار و انداز پائے گئے ہیں اور وہ کلی کیلئے کے انداز میں شعر کہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اتفاقاً کے دربار سے بھی وہ اپنے محلات میں بھی جو کس فقر آتے ہیں اس لئے کہ میر نے جو انداز اختیار کیا تھا وہ انداز بیان بہت سے شعرا کو متاثر کر رہا ہے جس میں جماعت بھی ہیں۔ لیکن یہ ماحول ہی جو صورت نظر آتی ہے وہ غنی مطلق ماحول سے جماعت ہے۔ چتر شاعرانہ حلقہ ہوں:

کیا رک کے وہ گئے ہے جو تک اس سے لگ چلوں

میں نہیں پر ہے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں

حرف مطلب کو مرے سن کے بھرم باز کیا

ہم کھتے نہیں کہتا ہے تو سوا کی کیا

جس نے پاؤں بھی ہونے نہ روا وصل کی رات

اور ہم کیوں کہ بھلا اس کو گوارہ ہوتا

اس صاحب سے کیا کیجئے ملاقات کبھی اور

دن کو تو طوغم سے دو رات کبھی اور

انھیں شعرا کہتے ہیں جو تہذیبی حلقوں سے جدا کر جاتے ہیں۔ اور اصل قرات نسائی سہی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں اس کے شعروں کی قدر کرتے ہیں۔ پہلے میں محروم کے مصداق کی نگاہ میں رہتے ہیں اور ان کے شیب و قرار میں جو ناخوشی ہے انھیں شعری انداز کی کٹھن کرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جماعت کے یہاں صاحب صاف صاف طریقے پر محروم ہے۔ اور محروم کے گھنے میں جس طرح داخل ہو جاتے ہیں وہ انداز شاعری کا ماحول حجاز نہیں۔ یہاں تو انہی بہت ہیٹھ محروم کے حوالے سے ہوتی ہے۔ مگر شاعری میں انکی صورت شعری غمی لیکن بد میں انہی کی تصویر کے تحت اس قدر پہنچ گئی کہ ایک لفظ پر ان کی اور محبوب کی ذکر کی صورت میں سانسے لگتا۔ جماعت ایک طرح سے اپنے محلات کی لٹی کرتے ہیں اور اپنی حیات میں محروم کی دلکش اداسی کو اپنے شعر کا لازمی حصہ بناتے ہیں۔ کاش کہ وہ اپنے احساسات میں کمر لگاتے اور تاریخ کی صورت بن گئے۔ لیکن یہاں کی سطح کی شاعری ہو۔ چنانچہ ان کی شاعری ہو کہ وہ جاتی ہے۔ یہی وہ ہے کہ میر نے کی فکر سے استعمال کیے ہیں جو شہادت پہ گئے ہیں کہ یہ علامہ اور آزاد گروں کے پسند و ناپسند

اور حالانکہ یہ بیانات کلی طور پر درست ہیں۔ یہ ہے کہ ان کے یہاں اپنے شعرا بھی مل جاتے ہیں جو محلات بدلی سے رہتے ہیں۔ پھر مگر ہزاروں شہادت کی جانچیں ان کے کہان کی ضرورتیں گوارہ ہیں کہ مزاج اور طبیعت میں گرووں کے لٹھی ملاپ کی خواہش ہو جو ان راقی ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

وہ ہے چہ ہٹا لائی جائے کتاب کبھی کر

وہ دن کے واسطے ہو کوئی شراب کبھی کر

کلی واقف کار اپنے سے ہو کجا تھا یہ بات

جماعت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم

کیا ہاتھ کھینٹے نے کیا ہم پہ کیا عمر

جو بات نہ تھی مائے کی ہنسی گئے ہم

گو وہ نہ ہو رہے تھے اس آئندہ میں

میں کس طرح کی ہاتھ اپنی زبان پہ میں

دل جتن کو طواضل سے تھماتے وہ چائے کی

ہوا سے ہے لیکن بات کہتے ہو گئے کی

نہ جواب لے کے قصور باز پھر شتاب لیا

میں زخمی پہ ہاتھ مارا بعد اضطراب ان

قرے اور میں دو باتیں کوئی کیا خاک کر چوبی

اور ہے شکل جو دھرا اور تراج شراب ان

یہ افانی میں ہے جس پہ کھٹے کھٹے ہے دقا ہو

مری بندگی ہے صاحب پہ عا خطاب ان

چھوٹی مسی بھینچا کامل بیز ما کان کا یا ہے

جماعت ہم بچوں گئے کچھ دال میں کالا کالا ہے

جماعت نے پھر آشوب بھی لکھے اور خوب لکھے ہیں سے متعلقہ اداسی کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

اور حالانکہ یہ بیانات کلی طور پر درست نہیں ہیں۔ یہ ہے کہ ان کے بیان ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو محالہ ہند کی
سے بڑے ہیں۔ مگر یہی ہزاروں شیعہ کی دشمنی نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ ان کی شہرہ رس گواہیوں کی مزاح اور خوبصورت
میں غوروں کے لطیف ملاپ کی خواہش جو بڑی راقی ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

دل ہے چہ ہٹاؤنی جائے شباب کہوں کر
وہ دن کے واسطے ہو کوئی شباب کہوں کر
کلی واقف کار اپنے سے ہو کجا تھا یہ بات
جرات کے جو گھر رات کو مہمان ملے ہم

کیا ہائے کینے نے کیا ہم پہ کیا عمر
جو بات نہ تھی مائے کی ہنسی کے ہم

گو وہ نہ ہو رہے تھے اسی آرزو میں
میں کس طرح کی ہائیں اپنی زبان پہ میں

دل چٹک کو طواضل سے تھما دے وہ چائے کی
ہوا ہے دھن جو بات کہتے ہو گائے کی

نہ جواب لے کے قصور دار خرا شباب ادا
میں زخمی پہ ہاتھ مارا بعد اضطراب ادا

قرے درد میں دو بکاش کوئی کیا خاک کر چوبی
اد ہے عقل جو دھرا او تراج شراب ادا

یہ افانی میں ہے جس پہ کھٹے کھٹے بے وفا ہو
مری بندگی ہے صاحب پہ عا غلاب ادا

پھوٹی مسی بھینا کامل بیز ما کان کا یا ہے
جرات ہم بچوں ملے کچھ دال میں کالا کلا ہے

جرات نے ہر آشوب بھی لکھے مگر خوب لکھے ہیں سے حسنہ کی کہانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

ایسا محسن ہوتا ہے کہ اجناس بھارت پر دلی کے ماحول کا اس کی روایت کا اثر ہے۔ لیکن اس زمانے کی
شہرہ رس میں سوڑا گودا ہندوستانی کی کیفیت پائی جاتی ہے اور آج سے آج سے بدلتے گئے ہیں۔ مگر حالہ ہند کی کتب
آنکی۔ لیکن اب جرات کی شائستہ اسرار کی داسرے اس کی ہے جس میں کتب حالہ ہند کی کی جوتے ہے۔ سوچتی ہے
واقفیت اور اس کے واقفیت اور اس کے مزاج کی تشکیل انہیں ایک ایک ہی راہ پر لگا رہی ہے۔ جس کی وجہ
سے ان کے یہاں بھی اسرار زیادہ پائے گئے ہیں اور وہ کلی کھینے کے انداز میں شعر کہنے کے طاری ہو جاتے ہیں۔ اتفاقاً
کے دربار سے میں رو اپنے حالات میں بھی جو کس تقرارتے میں اس لئے کہ میر نے جواز ادا کیا تھا وہاں بیان بہت
سے شعر کو کچھ ذکر کر رہا ہوں جس میں جرات بھی ہیں۔ لیکن یہ وہی طرز پر جو صورت نظر آتی ہے وہ غنی مطلق ماحول سے عبارت
ہے۔ چند اشعار دیکھ لیں:

کیا رک کے وہ گئے ہے جو کج اسی سے لگ چلوں
میں نہیں پر ہے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں

حرف مطلب کو مرا سن کے بھم باز کیا
ہم کھتے نہیں کہتا ہے تو سوا کی کیا

جس نے پاؤں بھی ہونے نہ روا وصل کی رات
اور کچھ کہیں کہ بھلا ادا کو گوارہ ہوتا

اس صاحب سے کیا کھینچا ملاقات کتب اور
دن کو تو طواضل سے دو رات کتب اور

افضل اشعار دیکھ لیں۔ میں جو چند ہی مثالیں سے قیاد کر جاتے ہیں۔ اور اصل قرات ساری سہی سے بہت مختار
تقرارتے ہیں اس کے متنوع قسم کی تقررتے ہیں۔ پہلے میں غوروں کے مصداق کی نگاہ میں رہتے ہیں اور ان کے شیب و قرار
میں جو ناخوشی ہے انہیں شعر میں ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور کتب ہائے کہ جرات کے یہاں خوب صاف صاف
طریقے پر جرات ہے۔ اور جرات کے لکھے میں جس طرح داخل ہونا چاہتے ہیں وہ انداز شاعری کا طوری حراں نہیں۔
یہاں تو انہی بہت ہی غوروں کے حوالے سے ہوتی ہے۔ مگر شاعری میں انکی صورت غنی نہیں لیکن بد میں انہی
تصویرات کے تحت اسرار پختگی کی بھی ایک نمایاں ادائی اور خوب ذکر کی صورت میں ہاں کے کتب۔ جرات ایک طرح سے
ایسے حالات کی لکھی کرتے ہیں اور اپنی حیات میں غوروں کی دلکش اداس کو اپنے شعر کا لازمی حصہ ہے۔ کات کہ وہ اپنے
اداسات میں کبر الہیہ کر سکتے اور تیغ کی صورت دکھاتے۔ لیکن یہاں کی سطح کی شاعری جو پھوٹی کی شاعری سے کہہ کر دیتی
ہے۔ یہی وہ ہے کہ میر نے کی فکر سے استعمال کئے ہیں جو شیعہ چاہتے ہیں کہ یہ تمام اور آزاد غوروں کے پسند و ناپسند

شاہ عالم اور سید نوید کے شعر و نظموں کے تراشے پر بھی اثرات مرتب ہو سکے لیکن اس باب میں سوانحی اہم ترین ظہرتے ہیں۔ ایک سوانح کے چند اشعار درج ہیں:

ہاتھوں میں لگاوت سیر، غضب، جھگڑوں کی جھجک، بھڑکیا ہے

دل، جھگڑنے لے گا، کی گھڑ جھین، بھر دے گی، چمک بھڑکیا ہے

وہ ہتھی، ہارک، ہارک، رنگ، ہار دیکھو، بھرے وہ دھارے

صورت یہ، انگ، بھائی کی، دھیرے پہ، دنگ، بھڑکیا ہے

تھک، ماتھے پہ، کھرے بال، ہار کا، فرے وہ، ہڈی، جڑے کی

کھوے، پہ، شربت، شہری، ہوئی، دھڑکیا، میں، بھڑک، بھڑکیا ہے

ان، ہڈے کے، دم، ہڈے ہیں، وہ، ہار، دے، سب کو، ہار

اک، سوئی کی، سرین، ہاتھ میں، اور، زوہ کی، جھک، بھڑکیا ہے

وہ، گردن، ان کی، سوانحی، داد، ہار، اس پہ، صفائی، ہے، عالم

ج، گنگ، میں، تمام، غوثی، سلطانی، زنجیر کی، بھڑک، بھڑکیا ہے

ہر، عضو، لڑا، کت، بھرا، ہار، تپ، ہار، سب، ہمدرد

قامت، ہے، قیامت، سر، پا، پلنے میں، کلک، بھڑکیا ہے

بران، ہے، ان کی، آن، فی، ہار، سامو، ان کے، سب، ہاتھی

ہے، ہار، گردش، اور، مشو، ہارے کی، تک، بھڑکیا ہے

کہ، بیٹھے، سب، پر، اک، بھیجی، کوئی، بھکت، سے، خالی، ہاتھ نہیں

پیشاک، میں، ہاتھ، ہاتھ، پتا، ہارے کی، چمک، بھڑکیا ہے

انشاء اللہ خاں انشا

(۱۷۵۶ء - ۱۸۱۸ء)

انشاء اللہ خاں انشا، دہلی انکسلی کے اہم شاعر تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کا سلسلہ امام جعفر صادقؑ تک پہنچتا ہے۔ والد میر انشا اللہ خاں، اندھ رنگ تھے۔ والدہ بھگت تھیں۔ بچپن تو قائد ملی و شہر طبرست تھا لیکن شہر

شاعری بھی خاندانی روایت میں تھی۔ ان کا آبائی وطن بنگالہ مشرق قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے دادا سید نور اللہ قرغیہ سیر، بادشاہ کے طبیب و دکنی آئے تھے۔ انھیں کے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا۔ ان کے والد بھی آ گئے۔ ان کے علاج سے بادشاہ کو بہت ہو گیا اور سید نور اللہ خاں کو کچھ رقم خوشی میں عینانے کی۔ قرغیہ سیر کے وزیر لکھ، ایک سید مبارک خاں کی صاحبزادی سے نور اللہ خاں نے شادی کر لی۔ یہاں کی دوسری شادی تھی۔ اس طرح ان کا رابطہ شاعری خاندان سے ہو گیا اور وہ تمام جہتیں متفرق تھیں۔ جب ایک دوسری اساطیر سے گزرتی تھی۔ لیکن دلی کو نہ بارہوئے ہوئے بھی رہے تھے۔ اس کے والد مرشد آباد چلے آئے۔ یہاں انہوں نے وہ شادی کر لی۔ ایک بچی بچھل سے تعلق رکھتی تھیں۔ والد اب کی صاحبزادی تھیں۔ دوسری بچی سے شریک سید اللہ خاں، ظہیر پور آئے۔ دوسری بچی کی ماں سے بھولتے تھے۔ والد مرشد آباد کی والدہ بیوا ہو گئی۔

انشاء اللہ خاں نے کتب، اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ایک اندازے کے مطابق مرشد آباد میں ۱۷۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم فقیر ملی، زمانے کے اصول کے مطابق صرف، غراور، منطق میں مدرس حاصل ہو گئی تو خاندانی پیشہ باب کی طرف مائل ہوئے اور اس میں بھی کمال پیدا کیا۔ زمانے کے درج کے مطابق یہ بڑی عمر میں صاحب حاصل کی۔ لیکن اپنے تمام اوصاف ان کی شعر گوئی کے آگے چلے ہیں۔ چونکہ انھیں لادری، عربی، پرگ، و مدرس تھی اس لئے ان کی شاعری کا نکتہ میں ان زبانوں کی خوب آگئی۔ چنانچہ قادیان، بھولتے، دلی، زبانوں میں شعر کہنے لگے اور رشتے میں بھی۔ "مستور لہذا صحت" کے حاشیہ میں درج ہے کہ ان کے صرف سولہ سال کی عمر میں اپنا بیان مرتب کر لیا۔ جب تک ان کا کوئی استاد نہیں تھا۔ اس رجحان میں عربی اور فارسی اشعار بھی تھے۔

کہنا ہوتا ہے کہ شاعر الدولہ کے اقبال کے بعد انشا اللہ خاں اور انشا اللہ خاں اور مرزا بنگالہ خاں کے نظموں میں علامہ ہو گئے۔ ان کے بعض مراثی کے، پہلے سے ہی زمانے میں دلی آئے اور اقبال خاں خاں خاں اور "مطلع پورہ میں قیام کیا" جب وہاں شعرا کی انھیں خاص تعلق آ رہا تھا۔ ان میں ایک، ہار، شاعر ہو گئے۔ شاہ عالم کی قرینہ انھیں حاصل ہو گئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ایک شاعر عظیم سے ان کی اولیٰ حرکت آ رہی ہو گئی۔ بعض نے لکھا ہے کہ عظیم عظیم انسان ٹھیک نہیں تھے اور مصداق ہیں کہ ہار کے اندر بکھڑا رہا، یہی قلماء ان کے زمانے میں دلی میں ان کی ملاقات مرزا سلیم خان جان جاناں سے ہوئی تھی جس کا بیان انشا کی "اور ہائے لطافت" میں موجود ہے۔ دلی میں انھیں انکا، دیکھو، اور انھیں بھی ملے جن کی صحبتوں نے ان کے ذہن کو اور بھی جانتی۔ لیکن ایسے حالات میں بھی عظیم سے ان کی ملاقات جاری رہی، چنانچہ ان کا وہ تک پہنچ گئی۔ مرزا اور مرزا نے جوئے سے منع ملانی کر لی تھی بات کہیں تھی۔ جب والد کا انتقال ہو گیا تو ان کا لڑکا آ گیا۔ ان کے اور جو کہ دہلی کے نظری میں تھے۔ ہرچہ وہ بھلو پلے اور اناس علی خاں کے ملازم ہو گئے۔ ان کے ہر سہیلان شاعر کی خدمت گئی۔ ان کی دست فرما بہ سعادت مل خاں کی مصاحبت بھی جاری رہی۔ سلطان شہو جب لکھنؤ آ گئے تو وہاں دلی خلیفہ مرام ہوئے لیکن۔ ان کا بھی لکھنؤ آ کر ان خلیفوں میں شریک ہوئے۔ انھیں انکا شہزادے کے ساتھ تارکین ہو گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ

دراغ ہماری جگر اور ہر غم کرتے ہیں اور عظیم آواز میں انہیں میر کی کیفیت دہی جاتی ہے۔ لگتی جس طرح بکالی کے لوگ دھشت کو غالب دانی سمجھتے ہیں تقریباً یہی صورت ہمارے دراغ کی ہے لیکن دونوں میں فرق ہے جس لئے کہ کسی کے اسلوب و مزاج کی جو پوری مصلحت ممکن کے حوالے سے اس کی ایک ہیجان تو جاتی ہے لیکن ایک دوری کے ساتھ۔ لیکن صورت دراغ کے یہاں بھی ہے۔ میر کے ہاں لہریں اٹھتی ہیں تو کھڑا اور سرست نہیں بلکہ ان کے چہرے کی رنگ سے شگفتہ ممکن ہے ہر شکل ان کے اپنے احوال و کردار پہلی ہو سکتی ہے۔ میر کے یہاں گہری داخلیت میں وجود کی ہے اس کی جیسے کی کہ دراغ کے یہاں نہیں ملتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سادگی اور بے تکلفی دراغ کا مزاج ہے۔ اس میں دہشت دار کی نہیں جو میر کا طرز کا تمام لے۔ میر کے یہاں ہے کہ جہاں کہیں میر نے مانیات کیوں نہ ہو مصلحت اختیار کی ہے اس کا تعلق دراغ کے یہاں اور درونگہ نہیں ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ دراغ کے یہاں درد ہے۔ میر کے یہاں میریت کا نظریہ انہماک ہے۔ لطف ارضی اس کا احساس دلاتے ہیں کہ دراغ کے سوا اور درون میں قطع اور آواز نہیں بلکہ اہل فحاشی اور کشش انگیزی ہے۔ ان کے تفرق میں اختصار پسندی اور ادا بہادری بولی نیز سادہ دہشت اور میریت کا پتہ ملتا ہے۔ میر سادہ اور خوشگلی بھی ہے۔ ان کے یہاں صوفیانہ پیمانہ بھی ہے جو وحدت اور دکھ کا بیان دیتا ہے۔ یہ سادگی نہیں اپنی جگہ پر لیکن کلام میں وہ ناچیز نہیں جو میر کا خاص رنگ بناتا ہے۔ میر بھی دوسرے قریب کیے جاتے ہیں لیکن یہ حد فاصل بعد اہم ہے اور دونوں ظاہر و ادراک دوسرے میں غم نہیں کرتا ہے۔

غزلیوں کے علاوہ دراغ کے مشغریاں بھی تھیں ہیں جن کا ذکر ہم نے کسی اور جگہ تفصیل سے کیا ہے یہاں اس کی تحریر کی صورت میں لیکن جو تفصیل لطف ارضی کے کلام کے ”دراغ عظیم آبادی“ میں ہے دوسرے طرح ہے۔

”[۱] عشق [۲] داز و نیاز [۳] کھنکھوت [۴] شعل مشعل [۵] لیرنگ مہر [۶]

جذب مشعل [۷] اعلیٰ مشعل [۸] خور و افکار [۹] گلیچہ سن [۱۰] مرات ابرمال [۱۱] بکوب

شوق [۱۲] شرع حال [۱۳] شرع غلب [۱۴] مشغریہ [۱۵] [۱۶] [۱۷] [۱۸] [۱۹] [۲۰] [۲۱] [۲۲] [۲۳] [۲۴] [۲۵] [۲۶] [۲۷] [۲۸] [۲۹] [۳۰]

بقول میرزا احمد مشغریاں اور جہاں [۱] [۲] [۳] [۴] [۵] [۶] [۷] [۸] [۹] [۱۰] [۱۱] [۱۲] [۱۳] [۱۴] [۱۵] [۱۶] [۱۷] [۱۸] [۱۹] [۲۰] [۲۱] [۲۲] [۲۳] [۲۴] [۲۵] [۲۶] [۲۷] [۲۸] [۲۹] [۳۰]

اکثر گزراں چند کا یہ تجر ہے کہ کم از کم چھ مشغریاں انکی مشغریاں ہیں جہاں میں میر کا نہ بے حد کمال کی مشغریوں کی تعداد دو ہے۔ دینے دوس کا اشارہ کرتے ہیں کہ دراغ اور میر کے مزاج میں شگفتہ ہے۔ دراغ کی اکثر مشغریوں میں شہد و سادگی بد حال کا پتہ ملتا ہے۔

دراغ کے سر میں ن میں مولانا مسک کی جھک لہاں ہے۔

دراغ نے قصہ سے بھی لکھے ہیں لیکن قصیدہ و لہری میں ان کا کوئی اشارہ نہیں ہے جب کہ ان کی رہا میاں افغانیات پہنچی ہیں۔ دراغ کے علاوہ مولانا حسن خاں فیضی اور فرحت خان بولی اس خواب سیر میں بھی ملے ہیں۔ بیچم میں ان

• مولانا ”دراغ عظیم آبادی“ (ترجمہ) لطف ارضی ص ۵۸

میرزا احمد اور مرزا علی مراد کے ہم لئے جاتے ہیں۔ ذیل میں دراغ کی غزلیوں سے چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

دے جاں آفریں میں نے جہاں جاں کا بچا

کھٹ خاک سہ سے گوبر انسان کا بچا

زور سے پوچھا کہ شادی تھی اس عالم کی ہے

کچھ کہا اس نے نہ لگتی اک جسم سا کا

کچھ پڑتے ہیں آواز دراغ

دل سے کتنا گمراہ میرزا

لاگ ان پلک کی آہی تو معلوم ہے کہ آہ

کالا سا کچھ جگر میں ہے اپنے بچھا ہوا

میلوی جاتی ہیں پاں آنگھیں رخ زیا نکھڑا اب

یہ صورت ہے عاری اعلیٰ صورت صفت چھپا اب

غلط میں گئی حیرت بظاہر ہوئے ہم

سوئے ہی رہے آہ نہ بیدار ہوئے ہم

مرست چشم کم سے دیکھ مرلی چشم ڈر کہ ہے

اے ہر اس صاحب دل دنیا بچھا ہوا

بے وفا ہے وہی تازگ عرواق سے وفا

گو ہوئے دراغ گمراہ میرزا ہیں اب ملک

کچھ فروری لہیں آبادی مصروف دہر

میں جگہ شہر تھے وہاں ہم نے بیابان پائے

مرزا احمد تقی ہوس

(۱۸۶۱ء - ۱۸۲۵ء)

بقول میرزا شمس الدین حسین مرزا احمد تقی ہوس لکھنؤ کے، بستان شاعری کا آجہا کہنا جاتے ہیں۔ ان کا پورا نام مرزا احمد تقی ہوس تھا۔ ان کا پیدائش ایک انداز کے مطابق ۱۸۶۹ء کے آس پاس ہے۔ آباد میں ہوئی۔ بعض تذکرہ نگاروں میں

اوں کا اگر یہ شخص ذی علم نہ تھا کیا ہے۔ اخلاق و آداب کی کبھی سمجھنے کی گئی ہے۔ نہ تو نگار مردانہ حسن خاص نہ صبر نے اس کا اظہار کیا ہے کہ میر حسن مولیٰ و معنی الہی کی سرکار میں ملازم تھے۔ گویا ایک امیر تھے اور لازماً یہ قابلِ لحاظ امیر رہے ہوں گے۔ ہمارے اپنے ٹوکرے "فوش مرکزہ" یا "فشی کھڑے"۔

"شاعر معنی نفس مرزا میرزا فتح محمدی ہندو غلاف اصفیٰ قوای مرزا علی خان دہلوی قتل و کمال سے آراستہ اور علی اندر حسب اور حسب الہی کا کمال شریح و بیان کا نہیں۔ چند خاص امیر و اس سرکار میں مثل حسن و طالب علی خان معنی "میان" معنی ذکر ہے۔ چند کتاہ شوقی لکھی جہوں اور دیوان فتح محمدی امیر نندار سے یادگار ہے۔"

ہوں میر حسن سے اپنے کام پر اصرار پتے تھے۔ نگارہ معنی کے طائرہ ہو گئے۔ معنی نے ہوں کے یہاں معتقد ایک مفاہرے کا ذکر کیا ہے "ذکرہم" کے بیان میں ہے اس مشاعرے کا ایک ٹکڑہ یہ بھی شامل ہے اقلہ جس میں حدود نام شاعر کی فزلیس تھی مفاہرہ اور اعترافی خاں اصفیٰ دہلوی مرزا فتح محمدی فرمایا تھا جس پر ہوم ہوم معنی۔ ہوں کا انتقال کس حال ہوا اس کی صراحت کرتے ہوئے "ذکرہم" میں اس طرح لکھا ہے۔

"میرزا فتح محمدی ہوں بہ کھنڈھے شوقی ہوں۔ مصلوں سوز و گداز کی ٹھٹھ۔ روزے پنداست گیارہی درویش و زلف۔"

اسی ذکر سے کہ سال تصنیف قتل و فاضل عبدالودود دہلوی الف ۱۲۳۷ھ اور ربیع الثانی ۱۲۵۱ھ کے درمیان ہے پانچ سید سلیمان حسین نے ہوں کے انتقال کی تاریخ ۱۲۳۵ھ کے آس پاس بتائی ہے۔

ہوں کا ایک عظیم کبیات ہے جس کے قلم نے بعدِ عثمان اور پانچ سو کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ حسرت موہانی نے ہوں کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ سید سلیمان حسین کا یہ ان ہے کہ۔

"ہوں شعر ہے قدر بجز کی طوطی کا گھر تھے۔ ان کا سلسلہ معنی سے ملے کہ بہتان میر تک پہنچا ہوا ہے۔ لکھنؤ کے علاوہ اہل اہلک، اجرات اور تھیں کی خاکِ بیت سے پیر شہر کی طور پر متاثر ہونے کے باوجود میرزا فتح محمدی ہوں مرزا میر حسن اور معنی کے قتل کی شان کی جس خوبی اور طواریطی کے ساتھ لکھنؤ میں اوں نے چلائے اس کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ ان کے اشعار سادہ اور عام فہم ہوتے ہیں جس میں باریکی دکھائی اور لافیت چلی جاتی ہے۔ اشعار جہاں بات اہلکار کی مضمون، جتنی، بدش، بکلی تکیہ بات و کنوایت اور خوبی زبان و دہار میں ہوں کا کام آپ الی مثال ہے۔"

۱ "ذکرہم" شاعر کا "میرزا فتح محمدی" ۱۲۳۵ھ اور ربیع الثانی ۱۲۵۱ھ کے درمیان

۲ "ذکرہم" شاعر کا "میرزا فتح محمدی" ۱۲۳۵ھ اور ربیع الثانی ۱۲۵۱ھ کے درمیان

ہوں کی شوقی "شعری" مشیر ہے جس میں انہوں نے اعلیٰ ادبی کبیات کا اظہار کیا ہے۔ چہ شہور ترین شوقی "میرزا فتح محمدی" کے رنگ میں ہے۔ خطی بار اس کی اشعار طبع بعدِ وفات لکھنؤ سے ۱۸۳۵ء میں ہوئی تھیں۔ اس میں میرزا فتح محمدی شہزادی کے حسن و جمال کی سربلندی کی گئی ہے۔ جذبات و احساسات کی وضاحت میں بھی زور دیا گیا ہے۔ تیزی میں ان اشعار میں ہیں اور ان کے شائع کا ذکر ہے۔

غزلوں میں ان کا رنگ نگار اور اظہار ہے۔ قصیدی حواج و متعجب کا اظہار ان کی ہر غزل سے نکالیا جاسکتا ہے۔ کہیں کہیں غزل کی پہچان بھی ملتی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار لکھ کر باہوں ہمارے یہ اعلان ہوتا ہے کہ ہوں کے کام میں جذبات و احساسات کی شہ آگے کے علاوہ الفاظ کے رواج کی کچھ خاص گنج ہے۔ اشعار کا خط یہاں:

آئے ہیں بہت دور سے عشاقِ جہاں ہم
عزیز ہو تو کہ رو مٹوئی دم لے لیں یہاں ہم

صدا ہے نہ ممکن ہے نہ ٹھوکر میں دلف
گھر ہو لے ہیں مرد و عورت بھرتے ہیں یہاں ہم

انوارِ جہاں ہر خدا کوئی بنا دو
ہاں آئے تھے کہ واسطے چاروں گے کہ ان ہم

جاگم گھٹن ٹم کھانے کی منزل ہے ابھی ایک
کچھ پیش دلی کرتے ہیں اے مسلمان ہم

اے غلام! سمجھو تو فنا میں ہے
فلت ہے کہ جو جاتے ہیں آنکھوں سے یہاں ہم

شیخ امام بخش ناسخ

(۱۸۵۴ء۔ ۱۸۹۹ء)

شیخ امام بخش ناسخ کے سلسلے میں انہیں بھی ایک واضح نہیں ہو سکی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ کس کے بیٹے تھے۔ ان کے آقا و جد اکابر کا نام "ابا" ہے۔ والد کے سلسلے میں خدا بخش اور میرزا قاسم کا نام ہے۔ لیکن بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ناسخ ان کے بیٹے نہیں تھے بلکہ وہ تھے کہ ناسخ کو اس امر میں کہنا چاہئے کہ جس خدا بخش کی میرزا علی اس لئے وہ ان کے بیٹے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

قربان قرعے کچھ سے اور بھری رنگات سے
 لہر لہر دے رشتہ بانم یہ بہت کا
 رنجی کھلی اڑی دھمکی کی یہ ایجاد ہے
 نہ چڑا ہے سوا انکا بیا کس واسطے
 ہنسنا چاہا تھا دھمکی میں چڑ
 اس کو قہقہوں نے آقاوت کیا
 تھو ایسے دلی اس کی جودا نے نکالی
 اور کہا ہے کچھ سچ یہ قہر ہائی
 قلب کے ہاتھ سے ظاہر تاک میرا ہے ہم
 کہ کھا کے سر دھوں کچھ ہی میرا ہے غل کی قسم



انیسویں صدی عیسوی کا ادب

انیسویں صدی کا سیاسی منظر نامہ

انیسویں صدی کے سیاسی منظر نامے کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا اہم واقعہ ۱۸۵۷ء تک اور دوسرا ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد۔ پہلا سمر دیکھئے "نجات میں" اہم واقعہ انیسویں صدی کی پہلی صدی سے جڑ کرے ہوئے آچکے ہیں، جن کی اگر کوئی نثر لکھی ہوگی تو مضمون ہوگا۔ لیکن مختصر کا آگے میں وہاں سے کرنا چاہتا ہوں جہاں ایسے اثرات کہلنے لگے جو ہندوستان میں پہلی بار قائم ہوئے۔ اس میں دو ایک قیمتی چیزیں بھی ہیں جن کی بات یہ ہے کہ ان کی کٹوتی کے انداز کے ان کے اثرات کا ایک ہی حقیقت رکھتے تھے۔ اس کے تحت مختلف مذاق یا مینڈا میں قائم کر لی تھیں۔ اس میں یہ کہنا کہ انہوں نے نہایت کمال پر کاروباری سے منتخب پارلیمنٹ کا ایک دستہ بنایا تھا جس کی وضع قطع بعد میں کی گئی تھی۔ اس میں اس کے مطابق ملک (۱۸۷۳-۱۸۷۴ء) نے ان کے سفر سے ملیا چکا تھا کہ ان کے شہر میں ان کی گورنر ہاؤس قیام سے پہلے سے بڑا رہا جس کو دیکھا تھا۔ یہ صورت حال تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے اثرات میں ان کی ہندوستان میں کیا پارلیمنٹ بنی ہوگی۔

یاد رکھئے کہ اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں رابرٹ کلائی نے آئین کو حیح کر لیا تھا جبکہ انیسویں صدی کے وہاں حالات کوئی شکل تھی اور ۱۸۷۳ء میں اس کی شکست کھلی ہوگی۔

پارلیمنٹ کی شکست کے بعد صورت حال اور بھی خراب ہو گئی۔ اس میں کوئی حیرت خیز چیز نہیں تھی کہ ملک کے اندر کوئی نثر لکھی ہوگی۔ اس میں کوئی حیرت خیز چیز نہیں تھی کہ ملک کے اندر کوئی نثر لکھی ہوگی۔ اس میں کوئی حیرت خیز چیز نہیں تھی کہ ملک کے اندر کوئی نثر لکھی ہوگی۔

[illegible]

..... "وہ عرض نہ کر سکتا تھا، اس کا کلمہ بظاہر تو صحیح تھا کہ دیکھنے میں تو وہاں انگریزوں کا

[illegible][illegible]

۳۰۔ بے تکلفی اور خیالی مرزا کے عریضہ خطوط میں پائی جاتی ہے۔ وہ ان کی فکر مضبوط اور بے پناہ ہے۔

میں نہیں ہے۔ لیکن مرزا کو اس میں مبتلا رکھنا چاہیے۔ چونکہ تقریباً ہی اس وقت پہلی کی تقریبیں کرتے ہیں انھیں اس تکلف سے باز رکھ کر مرکز خوش ہونے والے نہیں رہے۔"

غالب کی طرح اس سرسری جائزہ کے بعد غالب کی شاعری کی بنیاد سے بحث اُٹھتی ہے۔ اس وقت میر سے انہی میں شاعری اور فلسفے کے اختلافی ماحول اخذ ہوتا ہے۔

لکھو یہ کس کی اشرافیت کے واسطے جو کہ گنہ گری ہمیشہ اللہ کی تعزلی میں ہی عیاں کرتی ہے اور ان کے لئے کہ جو بے اور باطلے جاتی رہتی ہے۔ سراسر کی کوئی شے ہوتی ہے کہ ان کا طے سے متعلق کرسے اور ان کے تعزلی کے مطابق نہ شکال نہ بے شک۔ اس کے واسطے ہماری ہوش میں نکلنا اور ہوتی رہتی ہے۔ اور مری کے الفاظ ہمیشہ

[illegible]

اگرچہ شامری کا مواد ہوتا ہے، مگر اس کا نقل مضمون و طرزِ نگارش اور ہر اقاہ کے شوی

[illegible]

قالب میں تصویر کی جگہ پر ایک دائرہ لکھیں اور اس میں تصویر لگا دیں۔

آئیے اس وقت سے پہلے -

غالب معریہ نمبر اول کے سرورق ہے

اس علمی کیفیت کا اندازہ اس سے کیا کر سکتے ہیں کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ ہر روز صبحوں پر ان کی کچھ باتیں لکھ کر پڑھتا ہے۔ یعنی اگر ان کی ایمانی کیفیت طاری نہ ہوتی تو شعر کہنا محال تھا۔ یہ لکھی اور مستعدیت کی کیفیت تھی کہ ان کے کلام سے ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ ہر روز صبحوں پر ان کی کچھ باتیں لکھ کر پڑھتا ہے۔

وہی ہے جس نے ان کے لئے

2.1) $\frac{1}{\sqrt{2}}$ ہے۔

تو ان کا مطالبہ وہ بھی نہیں مقرر کیا۔ اقوام و امان کے معاصرین جتنے جوش و خروش کو سامنے لائے ہیں، دیکھنا چاہیے ہے کہ وہ کیا کام کر رہے ہیں۔

تعمیل کے لئے دیکھو، تمام الحروف کی کتاب "مرفحہ حرف الخاء" (نسخہ کفیل) و کتب خانہ ملی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۱۔

Complex تعلقیں لگاتی رہے چنانچہ وہاں کی طرف غالب کی لپک کا راز بھی یہی تھا۔

طرزِ بیدل میں رنگت کہیں

اسد اللہ خاں قیامت ہے

اسد پر جانوں نے طرحِ بارشِ تازہ ڈالی ہے

مجھے رنگے بہارِ اچھندی بیدل پست آیا

عربِ دل نے مرے ہر نفس سے غالب

سوت پر رشت پئے نقشِ بیدل بدعا

مجھے وہ سخن میں خوف گہرا ہی نہیں غالب

معاذے خطر میرا ہے غالب بیدل کا

ایکے عقیدے پرورد آتا ہے کہ جب تک مرزا اس روشنی پر گامزن رہے ان کو گامِ قبولیت عام حاصل نہ کر سکا۔

نواہت خیال اور پار کی مضمون کے کوئی تعلق نہیں کرتے اور اپنا جو پرکھانے کے شوق میں لگے تو اس جہ سے قاریت ان

کی طبیعت پر غالب بھی اور انھیں اس خیال سے کہ وہ سخن کو لکھ کر افغانا کھلی میں ادا کرنے پر تیار اور مستحقِ آفرین کے دریا

بہار سے کے قابل ہوں گے وہ غیر مانوس نہ کہیں اور چونکہ اسلوبِ بیان کی دلیل میں ایسے پھنس گئے کہ ان کے ذہن

میں افکار پیدا ہوا اور اس وجہ سے بعض صورتوں میں مضمون شعرائی میں لکھ کر وہ گہرا لکھنے کا عقیدہ کرنے والے اس بات کو

فراموش کر دیتے ہیں کہ بیدل تک آتے آتے غالب نے کئی مضمون بھی لکھے۔ غزل گوئی کے مضمون میں یہ انھیں ہے کہ

غالب نے مرے شعر انصاف لادتی شعرا کے حکم سے انھیں نہیں تھا۔ غزل کی جو روایت رہی تھی غالب نے صرف اس سے

آٹھ تھے بلکہ اپنی شاعری کا توشہ بخشے کے لئے ایک سو چالیس نظریہ مرثیہ لکھا۔ عالمِ بروی نے ایک نظم میں چالیس

کے نام شعرا کے نام لے غالب نے ایک شعر کا اضافہ کر دیا ہے۔ وہ مصلحت اشتہار کیجئے۔

تقدیم کہ در در گاہ کہیں

شدہ عنصری شاہِ مہاسبِ سخن

چہ اورنگ از عنصری شدہ جہی

چہ فردوسی آمد گاہِ مہی

چہ فردوسی تہود سر در کتب

چہ تاقالی آمد بہا و سخن

چہ جہاننی از در جہانی گزشت

نکائی بہ تک سخن شاہِ گشت

نکائی بہ چار اہل در سکین

سر چہ راہیں بہ سعدی رسید

چہ اورنگ سعدی فرشتہ ز کار

سخن گشت بہ طریقی خیرا نگر

ز خیر چہ نوبت بہ چالی رسید

ز جانی سخن ما تاقالی رسید

ان اشعار پر غالب نے ایک شعر کا اضافہ کیا ہے:

ز جانی بہ مرنی ا غالب رسید

ز مرنی ا غالب بہ غالب رسید

مضمون کیا جاسکتا ہے کہ غالب کو اپنی انفرادیت کا احساس تھا۔ چنانچہ اس کا خیال ہے کہ بیدل کے تنقید سے پیدا

نہیں ہوا تھا بلکہ ان کا مظهر یہ ان کا ذہن اور چارہ پختہ تھا:

ات برونگ جنتِ مرتبہ راضی غالب

شعر خوارِ خیانتِ اں کہ کہ مرزا قہر ما

غالب کا یہ شعری رویہ جو چھپکی کے کٹاڑ سے نکلتا کرتا ہے کچھ تنقیدیں ہے بلکہ ایک سو چار چھاپہ ہفتہ ہے

جہان کے قادی کو بہت دھڑکاتا ہے۔ اس کے انداز کی جتنے کے طور پر غالب کے بیان ایک خاص قسم کے اشتہار سے جو

نہیں لکھ کر کیوں کا چال بچھا ہے۔ ملاحظہ:

چینے خیر مرزا کا کو کہیں اسد

سر گشتِ طہار دوم و قہود قہا

غالب نے بڑا کام کیا کہ ان سے دو سو دو ترقی کے معانی لے کر لکھا ہے:

جہانیں کہ ہے ذابِ اں قہود جس بارِ مہاں کا

وہ تک گشت ہے ہم بے طوروں کے طاقِ لہیاں کا

اہلِ کلام کی لہیاں کے گھونٹے سے قہیر کیا ہے:

بھوں کو دیکھ کر ہی گھٹسے ہیں۔"

"غالب کا نگار ہر الفاظ کے درمیان عمل ایک کے قائل تھے۔ ان کے اسلوب میں ایک دقت عقلی ترتیب اور ہر لفظ کی تہذیب کا احساس ہوتا ہے۔ الفاظ ہوں یا تفسیلات و استعارات پر ادنیٰ مشغول وہ ان کو اپنی حکیمانہ لہرزا آگے اور حسن کارانہ شعور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ غالب کا فارسی کی قیام قرآن کے تمام نظری اعتبار اور انفرادے کے ہاد ہوا ہیں۔ اسلوب کی نامور اہل سے کسر پاک ہے اور اس میں کبھی کوئی غلطایہ نہیں ملے گا جو محقق سے بھونڈا ہو اور کالوں کو گراں گزرتے دیکھیں اور وہ ان غالب میں گنتی کے چند اظہار ضرور نگل آئیں گے جن میں یہ قافیہ افلا استعمال کے لئے ہیں جو کربہ الصوت ہیں اور صحران کو یاد آئے گا۔ یاد ہے ہیں یہاں شعر ایسے الفاظ سے مرتب ہوا ہے کہ ان کی وجہ سے شعر حسن اسلوب سے جاری ہو کر دکھاتا ہے۔"

حسن شعری حریفانہ فیض کو یا دیگر کے مقابلے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ ان کی فنی از حد اور ضرورتی دانندگی کے ساتھ دوسرے اصحاب و خرافات اور دیگر کے لئے غالب کی طرف توجہ دے گئے ہوئے ہے۔ غالب کی شاعری کی حلیت کا راز حیات و کائنات کے باب میں ان کا شعری بیان ہے جو ہر جہت بھی ہے اور ہر گہر بھی۔ ان کا گریہ یا غنا یا غمزہ یا سیر حاصلہ یا تجرید مشاہدہ تشکیل دے یا ایمان و ایمان نظر ہو یا توصیف — یہ موضوع کے لئے ان کا بیان ان کے اپنے چہرہ کا ہے اور ہر جہت پر گہرا اثر پیدا کرتا ہے، جس پر دقت کی گراں گزرتی ہے، چہ گنتی نکلی، اس لئے کہ شاعرات: تجربات سامنے میں داخل ہیں اور ہر دور میں، شاعرانی ان کا وصف خاص ہے۔ ان کے شعرا مختلف کیف اور آہنگ کے ذیل میں پیش کر رہے ہیں اور ان میں ان پر غالب کی شاعری کے باعث قسم کرتا ہوں:

مٹوں کے گاد ہار پہ میں خندہ ہائے گل

کھٹے ہیں جن کو عشق مٹل ہے رداغ کا

ہم کہیں کے رات تھے، کس جرم میں بکتا تھے

ہے سب ہوا غالب دشمن آہوں اپنا

عشرت تھوڑے ہے اور یا میں تو ہوا

دور کا صبر سے گزرتا ہے دہا اویا

ان جملوں سے پاؤں کے ٹھہرا تھا قاسم
کی خوش ہوا ہے راد کو بڑھاد رکھ کر

غم ہستی کا بند کس سے ہو یا مرگ علاج
شیخ پر دیکھ میں پہلی ہے عمر ہونے تک

میراں ہونے کا لو تھے چاہو میں دقت
میں کیا دقت نہیں ہوں کو نظر آئیں نہ سکوں

رج سے خوش ہوا اتناں فرست جاتا ہے رنج
دھنکوں بھ پڑھنا آگے کہ آستانہ ہر گھبرا

تیر حیات و نظم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آئی نظم سے نجات پائے کبوں

دلزاری پہ شرط استودی اصل انہاں ہے
مرے بت جائے میں تو کتب میں کاغذ برسمی کو

ہوا کبھی، کہاں کا عشق، بے سر پھوڑا ضمیر
تو پھرائے تک دل حیرانی تک آستان کبوں تو

میں نے غرض افلا ہے کس دلیلا کو
اک گھوڑے بے غوی تھے دن رات پانچے

کاغذ کی زباں کو تک گئی بکس سے غلاب
اک آئندہ پا دوائی پر خار میں آوے

ہوا کبھی کے اب سے دوا نظر یار کی
آخر کو زحمتی ہے دوا کو اثر کے ساتھ

باز پہ افلا ہے دیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز کٹاں مرے آگے

انجام اپنے پاس سے باہر نکل کے چل
دیا ہے نکل چلاؤ کا دستہ سنبھل کے چل

شہادہ محمد نصیر

(۱۸۴۰ء تا ۱۹۲۰ء)

شہادہ نصیر اپنے زمانے کے انجمنی اہم شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مدنی کے نامور مسلمان شاعر ہیں ان کا شمار ہوتا ہے۔
ان کا پورا نام محمد نصیر الدین ولد محمد گوٹھی ہے۔ اسے عرب کہتے ہیں۔ ان کا رنگ چمکنا، چہرہ حسن نے لوگ سب کو
کھینچے تھے۔ سید تھے اور انصاف سے ان کا تعلق تھا۔ شاعر، ممد، جہاں پھر میر کی اولاد میں سے تھے۔ جب ان کے والد کا انتقال
ہوا تو سب سے شمس بھی ہوئے باپ کے والد شاعر اب اللہ تھے۔ ”دیوبند“ میں شاعر طرب اندھ تھے۔ ان کی نئی اور شرافت
مشہور تھی۔ شمسین آزاد نے اس باب میں یہ لکھا تھا ہے اس کا ایک انقباض ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

”والد شاعر طرب نام ایک دربار تھے کہ ان کی طرف سے ملی ہوئی کلامی مزاج کی جدت نام باقی

تھے۔ ایک نئی کثرت تھا کہ ہم کی قریب انصاری میں شمر کرتے تھے۔ شمس کے بھی دھیر سب اب
کرتے تھے۔ محمد گوٹھی نے اس وقت میں پیش کیا ہے۔ مستور میں گوٹھی جوت کرتے رہتے تھے۔“

شہادہ نصیر نے بھی بیاد ہوئے تھے۔ کسی تذکرہ نگار نے ان کی بیاد نہیں یا سوت کی تاریخ نہیں لکھی ہے۔ زاکر
حمزہ کوٹھی نے اردو سے قیاس ان کی بیاد لکھی ہے۔ ۱۸۷۰ء کے درمیان دہلی ہے۔ شہادہ صاحب کی تعلیم دہلی میں ہوئی۔
اس سلسلے میں ان کے والد نے خصوصی تعلیمی کی۔ لیکن قاسم دہشتی اور بیکار کی خدمت کے بارے میں ابھی نہیں۔ شہادہ
نصیر نے اپنے والد کی وفات کے بعد شعر کہنا شروع کیا۔ ایک ایسے کے مطابق شہادہ طرب کا انتقال ۱۸۸۲ء میں
ہوا۔ افسانہ کے مستور میں شہادہ کی بلی کا نام آتا ہے۔ اپنی شعر گوئی کے آثار میں ان کے آثار ہوئے۔

مدنی کے مطابق شہادہ نصیر کی طبیعت تھی اور جو غرض سے بہت جلد دہلی کی ادبی مکتبوں اور مقاصد میں
ان کے نام اور کام کو چکا اور یاد و خور و ہوا۔ ان کی یاد کا ہو گئے۔

پھر ایک زمانے میں جب ان کی اور شاعری سے وہ شکل ہو گئی تو شہادہ صاحب کے علاوہ مرزا ام کلثوب بھی ایک گیت
کے مطابق ان کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں۔ شہادہ صاحب کی موت تک شہادہ نصیر کی عمر ۸۰ سال تک پہنچے جاتے تھے تھے
اور ان کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ شہادہ نصیر نے کالی دار جیو دیا کا سفر ۱۹۰۹ء کے بعد کیا۔ اس باب میں محمد حسین آزاد
لکھتے ہیں:-

”گوٹھی صاحب ان چند دلال کا دور دورہ تھا مگر کمال کی قدرانی اور سخاوت ان کی عام تھی

مکرم دلی دلالوں پر انگریزوں دلی خاص رکھتے تھے اور بہت مراد سے پیش آتے تھے۔ وہ اپنی خوش
نعمتی سے بھی کہ شہادہ نصیر کا دل دلتا رکھتے تھے۔ شہادہ صاحب کے چہرہ بہت سے نہ خیر خواہ تھے
پانی جنس دلی کا تھا اور دیا بھی نہیں کہ انسان بھول جائے۔ انعام و اکرام سے مال مال ہو کر
پھر دلی آئے اور تین دلتے ہو گئے۔“

سید آزادان کی شعر گوئی اور اسٹار کی کاٹھی ہوا اور دلی میں ان کی شاعری انصاف کے نیک ہوئے۔ ان کے
بار بار کے سفر سے دہلی شعر گوئی کو ایک طرح کی تحریک ملی۔ پھر شہادہ نصیر نصیر بھی آتے جاتے رہے۔ دہلی ان کے دلی
جوانے بھی ہوئے۔ ان میں ان کا یادگار ہیں۔

شہادہ نصیر ذی علم ہی نہیں بلکہ ان میں بھی تھی۔ ان کو ایک قصہ کہ دوا انہیں شعر و ادب کے
حقائق پرانی سے آشنا کر گیا اور یہ تھا بھی اس لئے کہ ان کے کام میں اسٹار اور رنگ بہت نمایاں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے
کہ دہلی کے ادبی حوزہ سے اس حد تک آگاہ تھے کہ انہیں ان کی ذات میں ایک ادارہ دیکھتے تھے۔

لیکن انہی بات مانگنی ہے کہ شہادہ نصیر کی شاعری میں اور دیکھا جیو بہت نمایاں ہے۔ شعر گوئی میں کوشش کرتے
ہیں اور اپنا لگاتے کہ شعر گوئی میں ایک ایک لفظ کا پانی جگلاتے ہیں۔ قلمی خدمت کرتے ہیں۔ اس اعزاز سے جہادیت خم
ہو جاتی ہے اور شہادہ نصیر دلی ہو جاتا ہے لیکن اسکی حد سے دوا جو دلی کی استاذانہ شخصیت نہ کسی نے صرف گیری نہیں کی اور
ان کے جہاد یا صلاح و زبان کی دوا دلی گئی۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ شہادہ نصیر ایک مرے تک شاعروں کے مریدانہ رہے۔ لیکن انہوں میں شعر
گوئی کا شہادہ نصیر ان کے دلی سے کہ نہ شاعری کرتے تھے۔ ”آپ جانتا“ میں اس کی تفصیل بھی ملتی ہے۔

یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ شہادہ نصیر دلی کی مٹی نصیر گوٹھی اور شہادہ صاحب سے دلی میں شہادہ نصیر نے ہوئے۔
سال ۱۹۰۳ء میں متعین کیا جاتا ہے۔

آخر میں چند شمار شاعری مختلف غزلوں سے لے کر کے طور پر درج کر رہا ہوں:

۱۔ عشقِ الہ رضاں کوئی نکلنا رہا

یہ دلی دلی ہی جو دیکھا تو نکلتا رہا

۲۔ دم جیو سے کہاں ہے چاک دلی سے دیکھ بھال

جان مکن تو نے غلام سلاہ چلا خیر کا

۳۔ آنکھیں دیکھنے کے بارے میں دیکھیں ہیں گویا

یہ طرفوں سے ہم بھی کف انہوں میں گویا

تم اپنے صحن پر مقرر دست ہوائے شوقیں
یہ دلی عارضی کلید جاہوں ت غبرے کا

پردہ کی طاقت نہیں یاں تا سر ایدار
کس کر ہو بختیں یہ لب ابر ہارا

مذہم کی طرح آگے ہی میں دل بکھر گیا
کیوں آگے سوئیگ قمری پھلتی پہ دل کیا

میں جہاں ہوں کہ تمس بھوکریا دھم اس کا
نگاہ کلی لڑکھان سے کلی باہام لیا تھا

اس کی سڑکوں سے دوڑے غبار سرے سر میں سودا
میں طرح کرتے ہیں تیار کہ بریں سودا

و کیا عکس اور دیکھتے دلدار پانی میں
بج ہر موج سے چلتے کلی کوار پانی میں

کیا وہ رخ لوں میں کہ پالی کی ترے موج
بے نیل زلی میں مجھے کلام سے تیرا

دل کا کیا مول بھلا زلف چلیا غبرے
تیری کج گاہ گھر میں ہو تو سوا غبرے

چکا ترے فانی کا موتی یہ راستہ کو
مہ بانک میں ہے اختر دہلہ دار کا

خولید حیدر علی آتش

(۱۹۷۱ء - ۱۹۷۷ء)

ان کا پورا نام خولید حیدر علی آتش تھا۔ ان کے والد خولید حیدر علی تعلق کا سند نسب قریہ بھڑاٹہ جہانگیر
تھکا ہے۔ اسلاف کا وطن بٹوار تھا۔ "راغی انصحا" میں ہے کہ ان کے چہرہ رنگ دھن کے شامیں آج پلے آتے تھے

اور پرانے قلعے میں سکونت اختیار کی تھی۔

آتش کی پیدائش ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً اٹھ سال کی تھی۔ ان کے والد بھڑاٹہ جہانگیر کے زمانے میں تعلق آباد
آگئے۔ آتش بھی پیدا ہوئے۔ انھیں باقاعدہ طور پر کوئی تعلیم نہیں دی گئی تھی۔ ان کی اولیتوں سے انھوں نے بہت کچھ
سیکھا اور اپنی محنتوں سے ان کی آتش لاری مہم نہیں ہیں۔ اس زمانے میں انھیں آباد میں ایک دھن خواب مرزا خانی خاں
تھے۔ آتش نے ان کی ملازمت اختیار کی۔ راج بھی ان کی خدمت میں تھے۔ وہ اب تھی خاں ہسپتال آتے تو آتش بھی
ان کے ساتھ نکلتا آگئے۔ اس واقعہ کو "کریہ" میں انصحا میں موجود ہے۔

اس وقت محکمہ میں چھٹی کا ۱۰ کاٹا راجا تھا۔ آتش ان کے شاگرد ہو گئے اور اردو اور انگریزی میں شعر کہنے لگے۔
جب پانچویں (۱۹۷۶) سال کے تھے تو اردو میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ان کے سلسلے میں ان الیٹ مرد قلمیے ہیں۔

"قلمی کا خاندان خود بخود زاد دل کا خاندان تھا اور سندھ لٹریچر کے ساتھ جڑی سر کیا کا
سلسلہ بنی قائم قرار طبعیت میں لٹریچر غالب تھی۔ کسی کے بارے میں قلمی پیرا نہیں کیا۔ وہ کسی
کی تحریف میں تفسیر سے کہے۔ آزاد کی روایت ہے کہ ایک غم نے پھرنے مکان میں جس پر
کچھ بھرت کچھ بھیر سارے کے خوار اور بچھا رہا تھا۔ اس پر ایک لگی یا تو مجھ کو نکالت کے
ساتھ پیچھے رہتے۔ کوئی متوسط الحال اشرافہ کوئی غریب آواز موجود اور کچھ بھی کرتے
تھے امیر آواز دھکا دیتے۔ وہ سلام کر کے کھڑے ہو کر آپ فرما کی تو بیٹے۔ یہ کہنے کیوں
مرا صبر دیر سے گواہ گئے ہو کر بڑے خراب ہو جائیں گے۔ یہ لٹریچر کا تھی یہ یہاں سندھ کیوں۔
ابھرے طریقہ تک اسی فقیرانہ گئے میں آکر سلام کر گئے۔ انکو روکتے میں کہہ دو انکی وجہ
بھی اسے تعلیم کرنے میں آئی تھی کہ پانچوے کو طبعیت میں قیامت۔ ۱۰۱۰ کا بارہ خوار"۔

غیرت کا کیا استقامت ان کے کلام میں بھی ستا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ آتش نے اعتراضات نہیں کئے گئے۔ ایک
قلمی کی نام نہاد قلمی کا زور دھڑ سے ڈکا کہ ہوتا رہا۔ پھر یہ بھی کہ انھوں نے زبان، دھان میں بہت اعتماد نہ کی۔ اس حد
تک کہ بعض الفاظ وہ من مانے طریقے پر لکھتے رہے جو عربی اور فارسی کی اصل کے خلاف ہیں۔ اور اس بات پر یہ بھرتے ہیں
کہ علم انسانیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ الفاظ کا کام دے دوسری زبانوں میں ڈالتے ہیں تو اس زبان کے حواص اور مبالغہ
کے مطابق اہل صورت کو اس کے موافق جاتا ہے ہیں۔ مگر انسانیت کے اس کلمے کی طرف توجہ کی جائے تو آتش نے جو
بھی کیا اور سوسن ظہیر کے ساتھ اس سلسلے میں ان کی سرانجام مہم ہوگا۔

آتش کے یہاں اردو دھن کی لٹریچر نہیں۔ دھکا کہ اور بھارتی کا گر نہیں اور بھارتی کا کسی شاعر نہیں ہو سکتا کہ یہ

دل میں انھوں سے خاندان پاٹ کے
نہانگوں کی سے کھوئے اس نے
گلوں جیسا ہوا ہے پاں سرے
ہوٹن آئے ہوئے بھی جائے ہیں
پیش میں فرقت صیب نہ ہو
دوسرے اور اب یہ نام ہے
خان تھکڑہ جان زار کریں !

خون نے نکالے کے انداز میں عاشق و معشوق کے مابین جو تھکڑہ مانتے لائی ہے جو مصال کے سطلے سے
معشوق ہے بظاہر ایسا کہ نہ رہے اور اندھرا کا پہلو پاٹ ہے۔ متعلقہ اشعار "غریب شخص" کے ہیں:

خس کے کئے گئی یہ وہ سطور
ہم ترے گھر میں یہ رات کریں !
سب سمجھن ہوں میں تجھی میرے
رو بھی جان لی کریں آنے کی رات
اور مست ہوں اور ہوتی ہیں
غریب تھا ہیں نہیں کر سوتے
رات ہوئی ہے وہ تھیں پہ گڑی
کچھ بھی بھائی کا ملائی نہیں
چہ مری بات کہ تو مانتا ہے
معشوقہ جہاں کا بد ہے
سب زائل ہے "عادت ہے
الغرض بعد متعلقہ کثیر
ہم تو دشمن ہیں جمل ساتویں کے
ہم نہیں، ہم کوئے اور کوپار
قول و اقرار اس کا کیجئے آپ
ذکر نگہ یہ بھی نہ کیجئے گا
نہ ہے گا یہاں، آپ کا ام

گر چہ نہ اس کا کیجئے آپ
میں کہ میں نے دیا یہ ان کو عتاب
اکھڑے بھی سے کیا ہے ضرور
اس سے آگے ہے اور کہا بدو کر
تھی جو ان سے لگے وہ منظور
فرق اتنا تھا اس میں اور ہم میں
نہ رہی وہاں میں سب تھکڑہ

ذاکر ابوالفتح محمد علی ہیں "آطر از جہاں":

"اگرچہ جہاں اس مثنوی میں نظم ہوا ہے وہ مثنوی و عاشقی کی جگہ ہوسا کی ایک قسم ہے۔ دیکھیں
یہاں یہاں میں رکات اور ابدال کیں ہیں۔ یہ جگہ بظاہر انہیں خاص کر بعض مثنویوں کے طور سے
نور تھکڑے نہایت حسرت اور مصائب کے ساتھ استقبال کے لئے ہیں۔ اس میں بھی زبردستی کی طرح
کوئی غیر معمولی اشعار نظم نہیں ہوئے۔ تاہم غلط جملہ سے بدلی گئی ہے جبکہ اس عیب کی
زیدی کی قصیدہ شاعرانہ طبع کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ قصہ کی طرح انداز بیان بھی لطیف اور
سلیس ہے۔ اس کیفیت سے یہ بھی اندازہ لانی کی اولیٰ اور چکی مثنویوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔"

مرزا شوق نے فرمایا بھی کہیں ہیں جنہیں عام طور سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ چونکہ ان کی شہادیات آج
مشہور ہو گئیں کہ ان کی مولفگیں بکثرت پیش کی گئیں۔ اس پر فوجہ ہوئی ضرور ہو گئی ہیں۔ ذاکر ابوالفتح نے غزلوں کا جائزہ
پیش کیا ہے اور کتاب طالع ہو چکی ہے۔

دانشجو نے شوق کا مجدد ہے جب انشاء اجازت دیکھیں، آئینہ، جلیق اور مصحفی وغیرہ اس مثنوی کا عربی و ہندی
تھے۔ اسے شوق کا ایک مستقل جگہ ۱۹۵۶ء ہے۔

شوق نے یہاں فراموشات بھی لکھے لیکن ان کی شہادیاں ہر صنف پر عتاب ہیں۔

نواب سید محمد خاں رند

(۱۷۹۷ء - ۱۸۶۷ء)

نامہ سید محمد خاں قضاہ رند تھے۔ نواب قضاہ خاں ان کے والد کا نام تھا۔ یہ نواب چوری تھے اور بانی
مملکت کوہستان و قضاہ خاں رند ان ملک کے تعلق ہوا تھے، ان کے والد کا نام تھا "نواب" آج کے۔ رند کی یہاں بھی ایک یاد میں

۱۷۹۷ء میں ہوئی۔ خود ان اور قرابت داری خواہوں سے تھی، چنانچہ اسے بھی اسی طرح ہوئی۔ اپنے ہی ماحول میں شعرا، شاعری بھی شہسوار کی۔ ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جسکی ”کل رہا“ میں ہے کہ اسے چاک کر دیا۔ ۱۷۹۳ء میں قصصہ آگے اور آتش کے شاعر ہوئے۔

دہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک حسینی شخص تھا، عاشق حلاج بھی تھا۔ دہلوت مندو تھے ہی بہتر نہیں زادوں کا جو حراج قادیانی کا حراج بھی تھا۔ پیش و عشرت سے بڑی رجحان تھی اور ان کی کاپی ناخلف لکھتے تھے۔ آخر عمر میں شراب نوشی ترک کر دی اور پیش و عشرت سے باقی ہاتھ کھینچ لیا۔ شعر گوئی بھی ترک کی اور سچ اور راست کی طرف راغب ہوئے۔ لیکن ۱۷۹۷ء کے خود کی وجہ سے طبعی نہیں ہو سکے۔

ان کے کلام میں گورابت اور روزمرے کی چاشنی کو نہ کر بھری ہوئی ہے۔ عشق اور طر جہاد کی کام کا دھمک خام ہے، فصاحت و سادگی سے بہرہ ور سادگی بھی پائی جاتی ہے اور آتش بھی۔ معاملات زاد و نیاز میں ذاتی تجربے کا بڑا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں دیکھا اور محققانہ لکھ بھرا ہوا ہے۔ کہیں کہیں شعور کا رنگ بھی ملتا ہے۔ اساتذہ کے کئی رنگ ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً میر حسن کا رنگ اور جرات دھمکی کا رنگ۔ کلام کا رنگ ”گلدستہ عشق“ کے نام سے مرتب ہوا اور دوسرا ان کی موت کے بعد۔

محمودی طور پر دیکھتے ہیں، دیکھتے ہیں شاعر ہیں۔ آتش کا رنگ کہیں کہیں تیز ہو گیا ہے۔ لیکن اپنے تمام اسراف کے باوجود وہ صریح ہے کہ شاعروں میں شمار ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ کلام کا بڑا حصہ بیکار نہیں ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

دہل کی شب دیکھ دیکھ ہم غریبوں کو یہی ہے اسکو دہ

ایک دن را مضرب نافہ کمر ہو جائے گا

درا ہوا ہوں اک بے ہوشی خصال کا

زیرت ہے ہر چراغ تو چشم غزال کا

مور پہ آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا میرا

سب سے بچاؤ ہے اسے دوست نکاساتیرا

ہر ادا ہے شبانی نے زلی

بستی لانی دیا دھکا دیا

طبعیت کا میری کردار تم نہ دیکھنا

کسی اور سے اب بکل چائے گی

حکیم مومن خاں مومن

(۱۸۰۰ء - ۱۸۵۱ء)

حکیم محمد مومن خاں ۱۸۰۰ء میں دہلی کے محل کو چڑھایا گیا تھا۔ وہ اپنے والد کا نام حکیم خاں ہی خاں تھا، جو طبیب شہسوار دہلوت تھے۔ ان کا مطلب بھی اسی مطلب تھا۔ ان کے زمانے میں سلاطین و مہاراجوں کا ایک مرتبہ تھا ان کا دربار مشہور تھا۔ مومن کی پیدائش نہ دہلی بلکہ گئے اور ان کا نام انہوں نے لیا رکھا۔ دراصل شاہ صاحب اور مومن کے والد دوست تھے اور ان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام اختیار کر کے ہوئے تھے۔ چنانچہ مومن نے ان کا نام حکیم شاہ صاحب مومن رکھا۔ اس سے حاصل کی، اس کے بعد ان کو طب کی تعلیم ہوئی۔ ان کے زمانے میں بھی ان کی طبیعت تھی۔ مومن کو طب تعلیم سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی مہارت کا شمار دہلی مونتقل سے بھی کیا جا سکتا تھا۔ خاص تھا، شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ لیکن یہ ساری باتیں فردوسی ہیں۔ دراصل ان کا کمال شاعری میں تھا جو کہ ان کے ہندوستانی شاعرانہ طرز میں کی خاص اہمیت ہے، ان کے شعر بھی اچھے ہیں۔

شاعری کے سلسلے میں چنانچہ ان کے شاعر ہوئے۔ لیکن یہ سادہ ایک دہلوت سے آگے نہیں بڑھا۔ بھراہوں نے ان کا اسطرانہ نہیں لیا۔

”مومن ایک عاشق صادق بھی تھے۔ ان کی شاعریوں سے ان کی عاشقی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ نے ”عشق ہے ناز“ میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ میرا ہواؤں کے درمیان زندگی گزارتی۔ ایک صاحب نے الفاظ سے ان کے عشق کا حال مشہور ہے۔ چنانچہ نے تھیلے میں اس طرح بیان کی ہے:-

”مردب جھلس عاشق مرد الحاضر حکیم مشہور بہ صاحب جی کہ وہ آستان کوئی است آفتاب

مفت الاشراف بہ جانب مشرب آفتاب یہ تکریب وادارہ مومن خاں کا دربار تھا اور اسے چند

کار بار روز دہلی اور۔ حالہ بہت کہ باز یہ معلولیت۔ عشق تو دل میں کہ اسے اوقات خاں

میر سے اسے شرح خود حسن وصال خاں مومن قد صحت۔ اکتھ بہ صحت شان آتش بہ

شعر و شاعری میں کمال۔ مومن دہلی کا صحت بہ مومن شیخ کرانہ بہ اور آتش راغب پریشا بہ

سوداگنی اشعار و صحت۔“

ہر حال اس کے بعد یہ بڑی قدر ان کی سرپرست تھیں لیکن حالہ دل کا شہسوار تھے اس واسطے کہ مومن خاں مومن کی شاعری پر اس شخص کے اثرات دیکھ کر کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہے بھی کہ مومن نے بعض اپنے اشعار کہے ہیں جو بالی مثالی آپ ہیں۔ ان کے ایک شعر کے سلسلے میں مشہور ہے کہ غالب سے جب یہ شعر نہ تو کہا کہ وہ یہ شعر ان کو کہے ہیں اور ان سے

”عشق ہے ناز“ پہلے خاں چنانچہ میں ۱۳۳

کے وسیلہ پر اپنی سہیلیں پر چڑھ کر اس میں راز اسباق ہے لیکن انداز ہوتا ہے کہ اس شعر سے وہ کسی حد تک متاثر تھے:

تم سر سے ہنس رہے ہو گوی

ہب کوئی دھرا نہیں ہوتا

مومن کا عشق حقیقی نہیں بلکہ کھڑائی ہے۔ ان کا محبوب گوشت چمکتا ہے۔ جس کی اداؤں کو، بالکل عیسوی کی جا سکتا ہے۔ مومن نے کوئی کہنے کو ان کی سرشاری بھرا دی ہے جو کسی محبوب کو دلکش بنانے کے لئے کافی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ شاعر نے عشق شاعری میں انداز کا طرہ سر کر تصور ہی نہیں۔ میں نے بہت پہلے مومن پر ایک مضمون لکھا ہوا ہے ان باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ چند امور کا انداز کرتا ہوں۔

مومن صاحب اسلوب شاعر ہیں۔ شاعری اسلوب کا حصول آسان نہیں ہے۔ اس کام میں ایک ایک لفظ کی نفس شاعری لازمی ہے۔ روایتاً مومن لکھنوی ہیں لیکن ان کا رویہ تو یہ تھا کہ سکا ہے وہی صاحب اسلوب بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لفظ کا جلد سخی اسے اپنی راہ ہانے سے گار مومن اس امر میں جوئی طاقت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ سبکی مضمون کے دیوان دار ان کا ایک بار بگرد کیجئے:

نہر پارہ انھیں میں سرستے تیرا

دنگی پارہ در تیرا ہاں ہے

مجھ کا طغیان اٹھائے لوگوں سے

منہ نہ تھے بھائے لوگوں نے

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، قصیں یاد ہو کر نہ یاد ہو

وہی بخت وعدہ یاد کا، قصیں یاد ہو کر نہ یاد ہو

اپ اور سے لو لگائیں گے ہم

جوں شمع تھے ہوائی کے ہم

تم کہاں چائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کرے

ہم تو کل خواب ہم میں شب بھر میں گئے

مومن مومن کے اسلوب شعر کی دو واضح جہتیں ہوئیں۔ ایک مشکل اور پیچیدہ اور دوسری سلی اور روان۔ لیکن یہ دونوں سے ہم کنار۔ بھول غریب سمجھا دیتی سمجھ کے یہاں سچ اور نصیر دونوں کا انداز ہے۔ ان کا پیچیدہ اور سادہ و کدہ کم سے کم فنون کے تعارف اسلوب سے مل کر نہیں کھا ہو بعض جگہ ان کا تہہ مراورہ غرض کہ ان کے دل و دماغ سے لفظ اور اعلیٰ ہے۔

میر کی رائے میں اگر مومن فنون کے تعارف اسلوب کی پیروی کر سکتے تو حقیقی اپنے منصب سے کر جاتے۔ ان کی آخری بخت تو یہی ہے کہ دونوں طرح کے اسلوب میں انھوں نے اپنی راہ ہانے کی کوشش کی۔ وہ وہ ہیں میں اور شاہ نصیر میں کیا فرق رہتا ہے۔

بائش دل کا کہنا ہے کہ مومن کی دنیا محدود ہے اور ان کے شعراء میں ان کے عشق کی نوعیت اعلیٰ ہوئی ہے۔ وہ کسی نہ کسی نوعیت میں جڑے تھے۔ اصل و پھر کی عقل و ماہر کی قیاس و تقییر بھی ہر جگہ موجود ہے۔ میں لکھا ہوں کہ ان کی محدود دنیا ان کی اپنی دنیا ہے۔ میں میں وہ رہے ہیں جو ہوئے تھے۔ وہ جتنی دھن تھے کہ انھوں نے اسے شعر گفتی طریقہ است۔ لیکن ان کی محدود دنیا میں راز و نیاز کا قیاس عشق پہنچ نہیں سکتا تھا اس لئے کہ مجازی عشق کا قیاس ان کی اپنی دنیا قیاس کر چکا تھا۔ وہ اپنی فکر میں سرشار تھے اور اس میں بند رہنا چاہتے تھے۔ اگر وہ عشق حقیقی کی طرف سے گامزن ہوتے تو ان کا ایک Idealist ہوتا۔ اور اس کی غیر خیراتی فضا میں سخی رہتے۔ لیکن ان کے یہاں عشق کی کیفیت کا شہادہ اعلیٰ ہے اور جہت انھیں طوط پر شاعرانہ بھی۔ اس بات پر ضرور توجہ دینی ہے کہ ان کی بہت معرفت ہے۔ ایک خارجی قیاس میں ان کے اشارہ بہت اعلیٰ ہیں۔ چند شعراء پیش کرتا ہوں:

تا وقت است دلیر من از دیار من

از اور د غم بہ حالت مراد دہدہ ام

آں آہوئے حرم کھا، صحنی بختی

از من و میداد است اسکا از طور دہدہ ام

ہم رہا از تا وقت ام از پاس عرض از

تا جھک رہا دشت و چارواں غایب ام

جاد ہم گفتہ از دانش من گوشت

قول یاد جذب رہی کہ بہ غریب دہدہ ام

اسے تیرا رہا بہر رخ مر و بہ سیاہ

یعنی کہ روئے از دم دقت نہ دیو ام

لے گھٹہ ام بہ یاد غم رہی کہ بہ غریب

نے حزل چاہی غم ز لب او شیدہ ام

لے شب وصالِ لیلِ بھی کافی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

غیر کے حرا وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کوئی تہ سے ہر جا ہے

چہ چائے ظلِ کنی آپ کے خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کہ اپنی شبِ دراز میں

اسیر لکھنوی

(۱۸۰۰ء - ۱۸۸۱ء)

ہر نامہ سپہ مظفر علی خاں تھا اسیر تھیں کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں چلے آئے ان کے والد سید علی کا حلیہ نسب
معرفت علی تک پہنچتا ہے۔ یہ اثری دلش کے صاحبِ مثنوی میں پیدا ہوئے۔ یہاں ان کی تالیف بھی۔ اس طرح بھیجیں میں ہی
اسیر مثنوی آگئے اور کسی فتح گھرانے میں ان کی شادی ہوئی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر اسیر متالی کے
شاگرد ہوئے۔ اسیر نے مزید تعلیم کے لئے فرنگ علی کے ملا سے رابطہ قائم کیا۔ پھر مولوی سیال سے بھی بہت کچھ سیکھا،
جوان نے پچھلے محسوس ہوئے کہ اسیر لکھنوی اپنے وقت میں اپنی علمی صلاحیت کی وجہ سے بہت محترم رہے ہوں گے۔
اسی وجہ سے ان کے شاگردوں کی تعداد خاص ہے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں آٹھویں تک وہ اشعار دے رہے تھے
اور بعد میں شاد کے وقت میں میر تقی کے مہر پر پڑا تو رہے قبلہ احمد علی شاد نے اپنی حکومت میں بہادر جنگ کا خطاب
دیا۔ بعد میں شاد جب ملک کے تو بہ معلوم کیا اسیر کا کہنے کے ساتھ دے گئے۔ دشمن کا گھبراہٹ میر پر ہوا کرتے رہے۔ اور اہمیت
صدیقی تھیں تھیں۔

”اس زمانے میں نواب یوسف علی خاں دہلی رام پور کے والد نواب محمد سعید خاں بہادر ان
کے شاگرد اسیر چنانچہ تذکرہ کلاں نامہ پور ۱۸۰۵ء (۱۲۹۰ء) میں ان کی عمر ۷۰ سال کی
تاکتے ہیں۔ نواب مدد اللہ ۱۸۰۰ء (۱۲۱۵ء) قرار دیا گیا ہے۔ کسی نے اسیر مثنوی لکھا
ہے لیکن اسیر کے شاگرد اسیر متالی نے یہ بھی لکھا ہے۔ یہی سب معلوم ہوتا ہے۔ تذکرہ کلاں
رام پور میں اسیر مثنوی میں ختم تھے۔ انہوں نے ان کی علمی قابلیت اور تہذیب کو کہہ کر اپنے صاحبزادگان
کے ادب کی حیثیت سے ان کو مقرر کیا۔ جب نواب یوسف علی خاں خود مدینہ میں ہوئے تو
انہوں نے گھر بھیجے ان کو اپنے مقرر کردہ پانچ کے بعد نواب کلاب علی خاں کا دربار آیا۔ انہوں

نے ازراقتہ مدنی لکھنوی سے بلا کر رام پور میں رکھا اس زمانے میں چہ لکھنوی اور رام پور
میں رہتے تھے۔ ان کی بدولت آخر تک الطینین سے لڑائی ہوئی۔ ۱۸۸۱ء (۱۲۹۹ء) میں
لکھنوی میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔“

لیکن اسیر لکھنوی کے سلسلے میں تو بات یاد رکھنی چاہئے وہ ہے کہ ان کا کلام پوری طرح لکھنوی رنگ میں رنگ
اور انہوں نے۔ حالانکہ اس اسکول کے کئی تھیں۔ اسے رنگت اور اہل کلام کا جو دماغ دیا پلٹے ہیں۔ اور صورتیں
بہت نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مورتوں کے چہرہ اور ان خصوصیتوں کی جاتی ہے۔ غزلوں میں خواہش سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن
اپنے پیلو اسیر کے ہاں کم سے کم ہیں۔ یہی کیا جانے کہ ان کے ہاں یہی تھیں۔ اور

اسیر کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد کافی ہے۔ ان کا ایک دیوان فارسی ”گلشنِ شمس“ ہے۔ اس کے علاوہ
”گلستانِ غزل“ ”تراجمِ مصنف“ ”تکلیفِ امانت“ ”دیوانِ اسیر“ اور ”دیوانِ شاعر“ ہیں۔ مثنویات میں ”مثنوی درۃ الکلیج“
حاشیات کی تہ تک تھیں۔ یہ ایک مثنوی نواب امین الدولہ کے ذریعے چھپی ہے۔ کئی اور مثنویاں ہیں۔ دوسری کتابوں میں
”زر کمال عباد شرح معیار الاشعار“ ”رسالہ بیان اختلافات“ ”رسالہ تشریح الحروف“ ”تذکرہ میں“ ”تواہید منظریہ“ ”معلم
توہینہ بیان مرقی“ ”زمانہ مرقی“۔

اسیر نے کچھ مرثیے اور سلام بھی کہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں ہوا فوج ہو جاے سے دہر ہوگی
دل ہوا زنجی اگر راز آفکاز ہو گیا

کہاں ملک نے نہ بدامنی کر رہا ہے
چلے سفر کو جو ہم گرم انقلاب ہوا

کہاں کہاں نہ ہمارے مرگ سے ماتم
اسیر خانہ زنگر تک خواب ہوا

لوگ نہ آسمانے غم ہیں اسیر
میں سمجھتا ہے مرثیہ میرا

میر میر میر میر میر میر میر میر
اب کہاں جا نہیں ہم رہا ہو کر

غلاب تھا کہ انہی نسیم کا مہمان
کہ راجہ اچھر آیا اچھر راجہ ہوا

فقیر محمد خاں گویا

(۱۸۵۱ء)

غلاب فقیر محمد گویا کے نام کے آگے شہید جنگ اور مقام الدولہ لکھا جا رہا ہے۔ باغخانی میں ہی تھے اور قریبی قیلے سے منتقل رکھتے تھے۔ ان کے دادا کا نام میر رفیع تھا جو بدوہہ دلچ کے سردار تھے۔ انہیں کے چھوٹے بیٹے محمد یونس خاں جو گویا کے والد تھے، قریب عس کے ایک قیلے کے ساتھ تھوہریوں میں بدوہستان آئے اور قائم کئے۔ غلاب فرخ آباد میں آباد ہو گئے۔ بعد از فرخ آباد چھوڑ کر شیخ آباد آ گئے۔ یہاں تو ان کے بیوی و بچے کا پونہ بیس چار لکھ ان کی مشہور تھیلیف "مہمان حکمت" کے دیباچے میں جو امور لکھے ہیں ان سے تاریخ مصنفین کی جانکتی ہے۔ سب سے پہلے ان کی بیوی کا بھی سفر اختیار کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲-۲۳ سال کی ہوئی۔ بقول انہیں شیخ آباد کی گویا کی بیوی انہیں بدوہستان کے انعام پر ہوئی ہو گی یعنی ۱۸۰۰ء کے قریب۔

گویا کی ماہی زبان پیشو بھی لکھن اور زبان پانچوں کی جو حسن ظنی اسے سبھوں نے تسلیم کیا ہے۔ ان میں انہوں نے راجا لکھنویاں کے کے یہاں لکھنویاں ایک اچھی جگہ پائی۔ اس کے بعد وہ ٹوٹے بچے آئے مگر قصور آگئے کہ غازی اللہ نے حیدر نے دلچسپی کی تھی۔ انہیں ۲۵ ہجری رسوا اس کا سارا دفتر رکھا۔ ان کی سہ سہری کی تقریب عام طور سے کی جاتی رہی ہے۔ ان کے بارے میں انہیں بھی تمہاری سمجھتے ہیں:-

"ابو سعیدان قلم بہر حق تھا بدوہی سے فقیر محمد خاں کو کہ کے اعلیٰ اوصاف ذاتی و ان کی شجاعت، تہذیب و جاہلیت، حکمت، بے غریزی و حق گوئی، تدبیر و ذہانت اور شرافت و سخاوت کی کافی دلیل ہے۔ قصور سے آتی ہے۔ لیکن جو بیچ انہیں ان کے تمام معصراں کو پناہ اور اہل راجہ سے ہٹا کر کرتی ہے وہ ان کی اعلیٰ علمی و ادبی صلاحیت، جو در سطح اور کار کا ہے۔ ان کی شخصیت علمی، ادبی و جاہلیت و ذہانت کا ایک ایسا علم کی جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ انہوں نے ایک وزیر امور مملکت اور ایک بلند پایہ شاعر و نگار و بدوہی مشیتوں سے جو روح کے ساتھ ہے۔ اپنے لکھنوی شہت کے ہیں۔ ان کی شاعرانہ حکمت اور ادبی بصیرت کا اعتراف ان کے ہم عصر شاعر اور بدوہی نگاروں نے بھی کیا ہے اور ان کے بعد کے ادیبوں اور نقادوں نے بھی۔"

گویا کو یہ نظارہ حاصل ہے کہ ان کے استاد شیخ امام بخش شیخ انہیں بڑی بصیرت دیتے تھے۔ اس لئے کہ گویا کو تمام

شہر پر کمال حاصل تھا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ گویا نے کے اور جو ایک ایسی طبیعت پائی تھی جو صرف غلاب کام کرنے والوں کے لئے تھی۔ جس کوئی سب سے پہلے انہوں نے انہیں بڑا کبھی ٹا کر لکھا ہے۔ لیکن یہ سب نہیں ہے۔

انہوں نے اپنے گویا کے استاد شیخ شامری بدوہی بکرا بان کے مسلح بھی تھے۔ یہ عراق کو جانے بھی پڑا تھا۔ گویا کی شامری زبان سے سیاری شامری بھی جانتی ہے۔ ان کی زبان سے جن شعرا کے نام ہوئی ہیں ان میں گویا بھی ہیں۔ ان کا شمار بدوہی میں ہے کہ انہیں بدوہی کے اعلیٰ ہیں۔ انہوں نے گویا کو پائی ہیں۔ بعض آثار تشبیہیں اور استعاروں سے ان کا کلام پر رنگ ہو گیا ہے۔

گویا کی ایک صفت میں بدوہی زبانوں سے مختلف معنوں میں طرح طرح کی کثرت سلام بدوہی، قصائد اور غزل، قصائد ان کی قوت و جان کی مثال لائیں کر لے ہیں۔ ان کی تشکیلی اور ادبی مہارت پائی جاتی ہے۔

"بستان تختہ" کا دوسرا کہ وہ چلا ہے۔ اس خطبہ میں سرور چ لکھا ہے کہ یہ تھیلیف نہیں بلکہ ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ فارسی تھیلیف "انوار شمس" کا ہے۔ انگریز زبان میں "انوار شمس" کے کی ترجمے ہیں لیکن انہیں "انوار شمس" کے فارسی "انوار شمس" کہتے ہیں۔ ان میں آخری ترجمہ انگریزی ہے۔

انگریز گویا کا انتقال بدوہی ان کے دارا بھر میں ہی ہوا۔ اصل ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں انہوں نے کے طبع پر چند

انہوں نے لکھا ہے:

سر کلم کیا مرا نہیں تھو کہ خبر ہوا
ہوں آرزوئے قتل میں حیدر ہیر ہوا
جب بیدار آئے تو ہوتا ہے ہمیں جوش جنوں
میرتے گل جاگ کرتے ہیں گریبان ہر برس
اتھ بھر جھٹنے نے دوز اسے گریب کی طرف
بھر تھے چلا پڑا کوہ و چالان کی طرف
خبری کی تیر کسی میں پائی
مارے چلوں کو سرنگھا ہوں
راحت کے ساتھ مرغ بھی ہے روزگار میں
چنے پ گل کے بدلتی ہے غم بیدار میں

مصحف خاں شیفتہ

(۱۸۰۶ء تا ۱۸۶۹ء)

ان کا نام مصحف خاں تھا جس دور تھے مسرت اور شیفتہ حضرت نادر علی کے لئے اور شیفتہ اردو کے لئے۔ ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق میں اختلاف دلتے ہیں۔ "رجوان شیفتہ" کے مرتب صہب اشعر نے ۱۸۰۶ء لکھی ہے۔ مگر تاریخ عدلیہ شاہ ولی کی بھی لکھی ہے۔ لیکن مگر راجپوری نے اپنی کتاب "دکن میں شیفتہ کے متعلق میں لکھا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۸۰۳ء میں ہوئی۔ لیکن ایک قاس کے مطابق ۱۸۰۶ء تاریخ پیدائش صحیح کی جا سکتی ہے۔ ان کے والد نواب مرصی خاں صاحب جاگیر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد جاگیر ضبط ہوئی اور خاندان بدالوں کے لئے بنیاد رکھی۔ سالانہ راجپور ہوا۔ یہ سالانہ راجپور بھی ۱۸۵۹ء تک ہی جاری رہا۔ ان کے والد نے ایک جاگیر بھی خریدی اور بی بی قاسمہ کی شیفتہ کے لئے بنی۔

شیفتہ نے دلی کے ایک بزرگ سیال کی ملاقات نادر علی کی چچی اور بی بی قاسمہ سے راجپور ہوا۔ ان کے دور میں سے۔ لیکن جب شیفتہ کے لئے قریب قریب مہاراجہ مرصی خاں سے راجپور کیا اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ پھر وہ اپنے شیفتہ عاید سندھی سے مدد لے کر تھے۔ اس کے علاوہ دلی میں انہوں نے مولوی کریم اللہ سے بھی استفادہ کیا۔

ابتداء میں شیفتہ نے شریفہ خاں کی زندگی بسر کی۔ یہ سلسلہ تاریخاً تمام دلی میں داخل ہے۔ شیفتہ دہشتہ رہے اور شعر و سخن کی نظر میں بھی نمایاں رہے۔ رنگین ساقی ساقی، عشق، عاشقی کا بھی سلسلہ رہا۔ لیکن شہزادہ نادر علی سے ان کا تعلقی اس جہت سے زیادہ بڑھ گیا۔ وہ گئے شہزادہ نادر علی سے بھی کثرت کلام کی بنا پر دلی میں ان کا محبوب رہا۔ شیفتہ نے خود شیفتہ نے اپنے تذکرے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور بھی مولویوں کے نام ان کی زندگی میں آتے ہیں۔

شیفتہ کے چچا گھبراہٹ کے قلعے پر ۱۸۵۵ء میں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور دلی کے حالات میں آگ لگادی تھی۔ اس آتش زلی میں کتب خانہ بھی جل گیا۔ مگر ان کی بیعت کے متعلق میں وہ خود گراؤ اور نے لیکن دلی پر گرنے کے۔

شیفتہ کی قادیانیت تصدیق کے لئے "سفر نامہ کاز" کو اہمیت حاصل ہے۔ ایک اور تصدیق "مجموعہ دلتہ" ہے۔ جس کا دوسرا نام "مثنوی امرت" ہے۔ اس میں بھی وہم غلطی ہے۔ یہ غلطی غالب نے ۱۸۵۵ء میں اعلیٰ حق خیر آبادی و لیبر کے نام لکھی۔ لیکن دوسرے لوگوں کے نام بھی چند غلطی ہیں۔ لیکن ان کی کتاب شیفتہ کا ہم تنقادی ہے۔ وہ ہے "مکتبہ نادر"۔

پارا شاہزادہ اس کا تذکرہ ہے۔ اس میں ۱۸۵۶ء قمریہ لکھ آئے ہیں۔ بحیثیت تذکرہ کے اس کی خاصی اہمیت ہے۔ یہ ۱۸۳۷ء میں دلی سے شائع ہوئی اور مصنف نے اپنی شاعری کے بارے میں بھی بہت کچھ تصدیق کی ہے۔ انہوں نے اپنے رجوان کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ اس کا شیخوہ اس وقت لکھا گیا جب ان کی عمر تیس سال کی تھی۔ انہوں نے قادیانیت کو شیفتہ نے اس کا اہلکار کیا ہے کہ ان کا تذکرہ ۱۸۳۹ء میں مکمل ہوا۔

شیفتہ کی شاعری کی طرف نگاہ ڈالنے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کم عمری ہی میں ایک اہم شاعر ہو چکے تھے۔ مسرت کے اثرات ان پر تھے۔ ان کے اس کا ذکر تو شیفتہ نے کیا ہے۔ لیکن مسرت ہی ایک اثرات محمد رفیع، میر تقی میر، طالب کرم جرات کے بھی اثرات کی بنا پر دلی کی جاتی رہی ہے۔ ان کے کام کے بعض حصے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شیفتہ کی نظر میں ان کی شاعری کا ایک رخ رہا ہے۔ گویا شیفتہ کی شاعری کا کوئی ایک رنگ نہیں بلکہ کئی رنگ ہیں۔ ہم آہستہ آہستہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کے ان کی لغزوں میں حسن و مثنوی کی بچھڑات زیادہ ہی ہیں۔ لیکن کبھی انفرادیت اور بہت کچھ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کی بعض مسلسل لغزوں میں حسن و مثنوی کی وہ کیفیت ملتی ہے جو اردو شاعری کا طرز امتیاز رہی ہے۔ غرض کہ ان کے بعد جو جرات رہے تھے ان کا بھی کبھی کبھی حکم ملا ہے۔ کہ تھے ہیں کہ شیفتہ اردو کے کمالیہ شاعروں میں ایک ہیں۔ چشم اشعار نقی کہہ سکتے ہیں۔

ہنسے میر تمام کی جان پر
میری جان ہے میرا ہے اب ک

اے شیفتہ ہم وہی سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوق مہم و طواغیل صہب نہیں کرتے

قفا کیا جہم میر زیارت ہزار کا
مگر نہ گیا چارم ہمارے مزاج کا

شیفتہ مراد بانی نے نہیں چھپایا
دلت صحت میں بہت لوگ ہیں بہتر ہم سے

آفتاب زلف، چاک قہر، نیم باز چشم
ہیں صحبت شہد کے کاہل نکل بخور

شہد ان کا نام میرت ہے شیفتہ
اکہ آگ تہ ہے چہ کے اندر لگی ہوئی

نارے اپنی بہت کے چا چہ ہر کچھ
بہتر ہم سے ہیں ہم تو بہت راستوں کے لئے

"مکملہ" ہے جس میں الفاظ اپنی اپنی جگہ پر مناسب طریقے سے چپکے نظر آتے ہیں۔ گویا ایک نیا اسلوب ہے جو کہ ہم اسلوب سے بہت مختلف ہے۔ شاعر صاحب نے اس کا اضافہ کیا ہے کہ لازماً تھا کہ یہ نیا اسلوب چائے انداز سے ہر صورت مختلف ہو۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ساز کے کیا کہ کہ کہ کیجئے لفظوں کا بیض کہہ کہہ معلوم ہو گا کہ ہم نے بھی یہی رنگ بنو کر کیا رنگین اس کی راہت۔ نے خوش - شگنی سے شوق لفظ نہیں کیا اور اس طرح اپنے لئے ایک ہی راہ نکالی۔ انہوں نے لفظوں میں ایک خصوصاً رعایت لفظی کا پابا مشہور قرار دیا لیکن ان کے پہلچے نے اس کے لفظوں کو بے کیفہ تبدیل کر کے اس کے ساتھ معنی آفرینی کا ایک پابا ایجاد کیا۔"

سیم کا یہ لفظوں کی جامعیت اور شاعر کے ساتھ استعمال میں مضمیر کے ظہور ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ معنی بیان کرنے کے لئے لگے۔ وائے وائے۔ وائے ان کا صاف اور مختلف ہوتا ہے کہ ہاڑ کی ایک خاص فعالیت پر قائم ہو جاتی ہے۔

ایسا ایسا ہے کہ یہ مشرقی صاحب سے پاک ہے لیکن شاعر اور جامعیت نے سیم کو خوب خوب سمجھا ہے۔ ہندو کشمیر اس کا بہت عرصہ نہیں ہوئی۔

اس مثنوی کے سنے میں ایک بحث یہ بھی چلی آتی ہے کہ کیا ان کے ساتھ انشائیے نے چپکائی ہے۔ گویا ایک طرح کا اہرام ہے جو سیم کی گایا جا رہا ہے۔ لیکن انشائیہ کی طرح ہر قول کے شاعر جتنے علم نگاری یا مثنوی نگاری سے ان کا قطع دیا ہو نہیں سکتا جیسا سیم کا قول عام طور سے ہے۔ دیکھو کوئی بھی قصہ خلیل ہو یا قصہ اس کے مزاج میں تشبہ کا مضمیر بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ہندو کشمیر کی کچھ ہی لکھتے تھے۔ اس طرح کے یہ مثنوی کی شاعر کی گراں قدری کے حوصلے سے گرا رہا ہے۔ یہ اہرام بھی ناقص تھا۔ آج ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے اعتراضات نکلتے ہیں۔ مثلاً کہ مثنوی کے سنے میں وہاں دوسرے کے یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ نظم پہلے طویل تھی لیکن بعد میں انشائیے سے اسے قصہ کر دیا۔ ایسا ممکن ہے لیکن یہ کہ انشائیے نے یہ مثنوی کو ہر تار میں لیا ہے۔

دوسرے قولوں کے علاوہ انہیں شاعر نے بھی اس مثنوی میں اعتراضات کئے ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر ابوالفتح صدیقی لکھتے ہیں:-

"شاعر کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ زیادہ دروزی بہترین مثنوی ہونے کے جس قدر محبوب اس میں سوچ رہے ہیں وہ ان کی کسی دوسری مثنوی میں نہیں۔ یہ اعتراضات شاعر کے لئے کہ اس کی زبان کی مثنوی کی مشہور زبان نہیں۔ وہ اس میں بہ کثرت عمارت اور تہ کی بنا لکھ رہے ہیں۔ آخری دروزی میں اعتراضات بھی لکھے۔ ان شاعر کے بھولنے یہ مثنوی انشائیے کی تبدیل ہے۔ جہاں کی

زبان میں مثنوی کی مشہور زبان ہے اور اس میں زبان و انداز کے الفاظ کا حسن ہے۔ اس بحث نے باطل میں سمجھا دیا۔ مگر شاعر کیلئے اس سے نام سے اب تک ایک نیا اسلوب شاعر نے گراں دیم کے علاوہ اس مقدمہ پر بھی بحث اعتراضات کئے ہیں جو پبلکس نے "مکملہ" پر ۱۹۶۰ء میں لکھا قرار دیا ہے۔ وہ جنس ہو لکھیں اور وہاں ہر طرف سے عجیب اعلیٰ اعتراضات اور رائے کی حیات: دے گئے۔"

مثنوی "مکملہ" میں ہر گز اور سناٹے آتے ہیں ان کے لفظ بہت واضح ہیں۔ کہیں کوئی کلمات کو ہر اس کی ضرورت بھی پیش آتی ہے لیکن یہی مثنوی چ کر اور کے واسطے سے اعتراضات کا افسار کے ساتھ چلی کر رہا ہے۔ اصل میں اس کا اس کا حال کے دراز کو تو ہے۔ لیکن میں دوسرے کو دار بھی ہی غلط سے مانتے ہیں۔ نیچے میں کہیں عمارت بھی ہے تو پہلے سے اسے اسے سمجھا ہے کہ وہ اس لکھنے میں جذب ہو گیا ہے۔ لکھنے کی رضا ہے۔ ان کی سچ پوری سنے کی ہے۔"

"بکالی کا ایک عالمہ ملتا ہے۔ یہ سیم مضمیر ہے کہ بکالی قرصا کی چٹاوت سے یہ اسلوب کے عمارت لیکن نگار میں یہ ان اسلوب کے مطالعات کر کے بھی ہے۔ اور خود ان اسلوب کی زبان سے بھول کر اس کا اور اس کی بدست سے بھالے جانے کی باتوں میں آگیا ہے۔ چنانچہ بکالی کریم میں مثنوی کریم اسلوب کو کچھ لکھیں ہے اور اس کی بے وفائی کا لگا کر ہے۔ یہ ان اسلوب سے بیجا پس لکھتے ہیں:

ملا کو بھیجے آ کے لے جائے

شام مجھے تھوہ لے کے لے جائے

میںجا د اسے آ جان لینا

آسان ہے یہاں بھی جان لینا

بکالی انہی خلاف جاری مثنوی کی کہ وہاں دیم میں بھیجے آ کے لکھتی ہوگی۔ بکالی کو گراں دیم اور شاعر کی مثنوی سے بھول کے صاحب دے گئے کہ واقعہ حوالہ آگیا۔ چنانچہ اس نے انہیں ان کلام سے حوالہ کیا:

پہچا کہ دی تجھے لہر سے

لکھنا مرا کون سا بشر ہے

حرفہ بہ حرفہ، آخر کار ہر طرف سے اس کا حوالہ ہے۔ اس قسم کے سوالیہ کلام،

تھی۔ چنانچہ اس نے جس خاکسراں و موزیات اور مصوصات کچھ میں بگاری کا مسودہ کرنے کی کوشش کی جس کی تصویر دیکھنے کے لائق ہے:

نصرت ہوئی کیا بلا توں
ہے دیکھے کسی کا نام کیا توں

وہ اس بھی واضح ہوئی چاہے کہ اس مثنوی کی ہیئت اس لئے تھی ہے کہ اس کے نگار نگار تھوڑی سی بڑا اپنے وقت کا چیز ہیں۔ بعد از مسلم تہذیب کی حکاکی بھی اس مثنوی میں ایک خاص انداز سے ہوئی ہے۔ نیم بندہ روایات اور اساطیر سے پر خلی واقف تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے تمدنی کیف و کمالات میں اس طرح شہ کرنا ہے کہ وہ کوئی فتح ہو جاتی ہے۔ واضح نہ کہ گوتم رشی کی ہلکا جسم شراب کے نتیجے میں پھر کونسا جاتا ہے۔ دیکھ بگاری بھی شراب ہی کی بنا پر پھرتی میں جاتی ہے۔ پر توں کے بعد جسے وقت ان کے کپڑے چاہیئے کہ واقعہ کئی کرشم اور گویوں کی یاد آ رہا ہے۔ چہ دونوں نے بہتر کر کے یہ سب بندہ قصوات سے مداری نہیں۔

اس ضمن میں یہ ذکر کریں ہمارے بکواسا جنس کی ہیں۔ مثلاً احمد سہا۔ بگاری کا طوطا میں پیدا ہوا۔ سنگھن دھیب کی مانی چند روایت خاص بندہ حاضر ہیں۔ بگاری دو بارہ کسان کے یہاں بیٹھ سوتی ہے۔ اس سے آواکمن کا مستفید ذہن میں یاد رہتا ہے۔ دلیر شاہ احمد کھلتی ہے۔ یہ بندہ مثنوی کہیں دج کا ہوا ہے۔ مثنویں جانا بھی بندہ مثنوی نگار ہے اور ہر بندہ کے کے شکوہ مثنوی سے ملتا ہے۔ یہ دیکھو۔ گویا اس مثنوی کی ہیئت اس لئے تھی ہے کہ اس میں بندہ مثنوی تہذیب کی نگاہ جس صورت خوب ابھرتی ہے۔

منیر شکوہ آبادی

(1813-1881ء)

ان کا پورا نام سید اعلیٰ حسین منیر شکوہ آبادی ہے۔ غری نے جب گجرات کو دوبارہ فتح کیا تو ان کے یہاں بھی ان کے مانتے سے شکوہ آباد آئے تھے۔ انہیں کی دلاوری میں جو شرف الہی بھی ملے ان تھے جنہیں شکوہ آباد کا سوادہ یاد پایا گیا۔ قندھار وائے انہیں فیروز آباد کی مہر داری بھی دی گئی جو مولاہ عالم کے وقت تک قائم رہی۔ ان کے بیٹے سید احمد حسین شاہ تھے۔ وہ قتل کے زمانے میں معمولی جاگیر رکھتے تھے۔ اس سلسلے سے منیر کے والد سید احمد حسین بھی شکوہ آباد میں رہے۔ ان کا انتقال ۱۲۵۵ھ میں ہوا۔ منیر کی ولادت ۱۸۱۳ء میں ہوئی اور انتقال ۱۴۰۱ھ میں۔ عربی و فارسی کی تمام اچھے والدہ سے حاصل کی۔ ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابراہیم حسین ایک مجتہد تھے۔ ان سے ان کی دریافت کی تمام ہوئی۔ منیر کا بچپن انگریزوں میں گزرا لیکن ایک زمانے میں جب ان کی شہرہ شاعری کا چہ چہ ہوا تو کلام الدولہ نے انہیں شکوہ آباد لے کر اپنے

ملازمت میں رکھا۔ اس وقت پنجیت شام راج کی ایک بیوی جو بچی تھی اور وہ بیویوں کے استاد اور کچھ تھے۔ چنانچہ منیر شکوہ آبادی نے بھی انہیں استاد بنو کر چاہے کہ ان کے خط و اثر سے باہر نہیں نکل سکے۔ جب حالات خراب ہوئے اور منیر کا کمسن بھوڑا بچہ اس مثنوی کے واسطے دھک سے لایا گئے۔ جو راج کے خاکروٹے سے کاہر ہے کہ ملک نے بھی راج کی رادہ اپنا لئے جوئے اصلاح زبان کی پوری کوشش کی تھی اور مرقعات پر نگاہ رکھی تھی۔ کیا جانتا ہے کہ جب منیر زبانی ہی بہتر والی ہندو کے ملازم تھے ان زمانے میں ایک طوائف سوادہ خوب چاہی کے قتل کی سازش میں ملے۔ یہ سوادہ کلا پانی کی مزارع جولائی ۱۸۶۰ء میں دریا ہوئے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ان کی رنگین کا منیر پر گہرا اثر تھا۔ ایک طوائف زہر سے ان کے اعتقاد کا چارہ دیا۔ اس کی موت پر انہوں نے ایک نغمہ بھی لکھا تھا۔ ایک جگہ یہ بات بھی مانتے آتی ہے کہ منیر شکوہ آبادی دراصل ۱۸۵۵ء کے خوار کے ایک غلام ہے۔ یہ تھوڑے چار بچان کے خالقوں نے انہیں حاصل کر کے بھڑا دیا تو منیر یہ ماضی قصداً کی طیلے کا غلام منیر نے خود کو جس حقوق کے جردہ دات تھے انہیں شہر کے دیگر غلاموں سے جدا کرنے والے احوال رقم کئے ہیں۔

منیر شکوہ آبادی کے قصائد میں ہیں "مختب عالم"، "نور و اشعار اور" "مکرم منیر"۔ ایک مثنوی "مرتبہ اشعار میں" بھی ہے کہ ایک "کتاب زبان"۔ ان کے قصائد کی تعداد میں بڑا بڑا مل جاتی ہے۔ ان کے دماغ "امان حق" اور "مرتبہ اشعار" وغیرہ بھی معروف ہیں۔

منیر کے یہاں استادانہ کمالات کا استعمال خوب خوب ہے۔ مثنوی اور مثنوی گری کو بھی شعری انداز کے لئے ضروری رکھتے ہیں۔ اور اصل ان کے استاد خوب اس طرح اشعار کہتے تھے، اس میں کا منیر رنگ دیا۔ منیر کے بارے میں ان کے یہاں بھی قاری بہت ہی پائی جاتی ہے۔ مشکل روایات اور قافیہ میں شعر کہتے ہیں۔ بعض جگہ کاست کا پہلو بھی ہے۔ لیکن منیر سادہ سادہ مثنوی اور نثری مثنوی بھی ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے نصیر لکھا ہے کہ میں باپ کے قصیدہ اور مہر صحت عظمیٰ کی نسبت میں ہے اور خاصگی کہتے ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

بچے ہم سے ناخوش ہائے منیر
ہر جگہ کتب میل رہ مستقیم تھا
منیر کے قلاموں میں منیر اپنی ہے کئی
جہول کی تسخیر میں ہے وہ ہمارا
منیر ہم و راج سے لگا نہیں جاتا
پھر جانتے ہیں ۲۲ کے کناروں کے بار

دینا کی کھلی ملک دینا کو چاہے
 مردمان کو ہے مافیٰ خدا سے غرض
 کھڑے کھڑے دولت پدیدار ہے
 اعداد بھی پکار رہے ہیں خدا ہے ایک

واجد علی شاہ اختر

($\rho_{\text{LAC}} = \rho_{\text{LFF}}$)

ادھل مشواہقز کی برساتی پچھل کے بارے میں یہ اختلاف ہے۔ کچھ مسعودی ص ۱۱۱ ص ۱۱۲ کے بعض روایات سے ان کا سال پچھل ۱۱۳۰ یا ۱۱۳۱ مقرر کیا ہے۔ ان کے والد عالم الدولہ اور مرزا محمد علی خاں بن ناصر الدولہ پچھل کے نواسہ تھے۔ ان کا عرصہ ہوتا ہے کہ ادھل علی شاہ کی تعمیر بڑھتے کا بطور خاص انتظام کیا گیا ہو اس لئے کہ انکی زبانوں پر موسی رکھتے تھے۔ عربی فارسی کے علاوہ مشترک تھے۔ کچھ انھیں تھی۔ عرب اور دوسرے علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ ان کے استادوں میں غیاث الدین اور دہلوی کا بطور خاص اہمیت ہے۔ انھیں سے انھوں نے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ محمد علی کا کمال یہ تھا کہ حضرت مولیٰ کے بعد قیام میں ایک کتب خانہ بنا کر لایا تھا جس کی کچھ کمال غلوہ تھی اور ان کے بعد سے تھی۔

[illegible]

انٹرنیٹ پر پورے دو دن تک نہ مل سکا۔ ۱۹۵۶ء کی کیم یونی کو درجہ ملی شاہ سے ملنے کے بعد خود سے یہ پتہ اور صفحہ کو دیکھ کر اچھا لگتا۔ یہ درجہ ملی شاہ نے نہ صرف یہ کہ دیکھا کرتے تھے انھوں نے کلاس میں دیکھے تھے کہ وہ انٹرنیٹ پر مل گیا۔ ان کی کتاب پر اسے دے دیا۔ تھے انھوں نے ۱۹۵۶ء میں سسٹم کے تعلیمی کا اعلان کیا کہ وہ شاہ کو معزول بھی کر دیا اور اس طرح تمام خواتین اور دفتر پر قلعہ بھی ہو گئے اور شاہ کو کچھ نہ کیا۔ اس ضمنی شاہ کو ان کی شہریت کھینچ لی۔

”اچھا! ہم اپنی اپنی اہلیہ پر کھانے کا تہہ نہ بنا دیں۔ بلکہ یہ قفس ہو جائے گی کی گھیر ہو جائے گی۔“
 ہادی کی گلی پر کھڑی ایک ماہی کار تھوڑا دیر روک کر کچھ چپاٹے تھے جو کھوپ کے پاس حاضر
 نہ تھے۔ گھوڑہ بھول لانا، ایلوڈیا کو کھانا دینے پر تھکن چھوٹا کر دے گی۔ مٹی کی آڑی آسانی سے ہو
 جائے گی۔ اس لئے اس نے خاطر خواہ طریقہ کا انتخاب کیا تھا۔ اور کسی بھی جگہ کی حالت کا متعلقہ
 کرنے سے لئے انتظامات کئے گئے تھے۔ کھیتی کے باغیچہ وارہ سے ٹھکرالوہ کے احقرات
 نکلتے اور انھیں لیتے رہے۔ یہاں سے اوپر شہر میں ایک عجیب سی جگہ تھی۔ یہاں پر ہادی جیسا
 کہ ہادی کر کے چپا کر جیٹ کے دروازے والی داہلی راہ روٹ کے باغیچہ نواب۔ یہاں
 علی چھ دروازوں کی انتھیمیں ایک آواز آتی تھیں۔ جن کے بعد ان کے چاہتیوں میں
 سے کسی کی بھی آنکھ میں ایسی سی جگہ تھی۔ وہ جے کھانے کی جگہ سے منسوب تھے۔ وہ اپنی
 کمرہ میں کوئی چکر تھا۔ اور رات کو فیصلہ پڑا تھا تھا۔ اور وہ کسی بھی جگہ لیتے آئے
 تھے۔ کھیتی تو کھیتی کے لئے ہاں پناہاں کوئی قسمی دفعہ وقفہ ہو جاتا۔ وہاں کے طرز زندگی کا
 ایک مستحق راہ تھا۔ جس میں ہادی نے جو یہ وقت ہادی اور وہاں کی حالت میں ہادی
 قلمی ماس کو کھانے کی حالت میں ہادی کی طرف راہ تھا۔ وہاں کے بعد ہادی کی
 تھوڑا سا وقت۔ یہاں پر کھیتی ہو لیتے تھے۔ ہادی کو کھانے کے یہاں اس سے نکالی جاتے تھے
 تھے۔ اس کے بعد یہاں کی حالت میں ہادی کو کھانا تھا۔

لکھیں ان تمام امور کے ذکر کے ساتھ ساتھ وہ بھی ملے گا انگریز کی طرف سے جو کچھ ان کے خلاف چاہئے کہ
موصولہ طریقہ تہذیب اور جادو اور اس کے سمجھنے اور دل میں لگے۔ ان کی خصوصیت کی رنگینی، ہوتا ہے اور اس سے ان کی
پیشگی، رانک و گچھوں سے ان کی خصوصیت، شاعری سے ان کی دلچسپی اور اس کا ان کی ان کی دلچسپی پر بہت زیادہ لکھا گیا
ہے۔ لیکن یہ چیزیں ہر شاعر کی کتابوں میں جو کچھ ملے اس کے ساتھ مل کر لکھا جاتا ہے۔ اور اس میں یہ دور ہے جب
انگریز اور اس میں قافلے ہوتے والے ہی ہیں جیسے میں اور اس صورت میں کہ ان کے ہاتھ میں شاعر کی ہوتی ہے
سارے پے پھولا تھا چاہیں اور جلد و جان کی مصلحت اس طرح لکھتے ہیں کہ ان کی طرف سے لکھیں۔ اور اس میں ان کی

$\Gamma_{\text{eff}} = \frac{\Gamma}{1 + \frac{\alpha}{\beta} \left(\frac{\partial \ln \rho}{\partial \ln T} \right)}$

سائل ہوئے کے بعد راجہ کنگ جیو ہے۔

جلال کے کلام پر ایک ڈاکو لے لے تو ایک ہاتھ جو نہایت داغ ہو کر ابھرتا ہے وہ دیکھ کر جلال داغ سے بہت زبردست متاثر ہے۔ ان کا کلام تاریخ کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ان کے ہنرمندی سے کہ جلال تاریخ کی طرح امتلاں لڑاں سے وابستہ ہے۔ ان کے یہاں آئینوں کی شامرواں ہے کچھ خیرات خاں سے تو کسی منتہاں پر جاتا ہے۔ اس لئے ان کے اشعار ہم آئینوں کی طرح سے اگر قدرے غمگین نظر آتے ہیں تو یہ غمگینی ہے۔ کچھ احساس ہوتا ہے کہ جلال اپنے حاضریں ایک دور پر مودعہ کے مقابلے میں افسوس شاعر ہیں۔ یہ غمگینی تو ان کی نہیں کہنے اور طوالت میں غزل کا حراجی نہیں گزارتے۔ جلال کی شاعری کے حراجی و بیان کو کچھ کے لئے ان کے چہرہ اشعار نقل کر رہوں:

جانے اس دور رسیدہ کی گئی تھی

نکلیں پہنچتی ہو جس سے کہ حال اچھا ہے

مصلحتی تر اصرار ہے دل کے پھلنے کے لئے

دل میں آٹھ کچھ مریاٹ کے لئے

اکیلے کا کھنکھ " سرخسوں سے دور چلتا ہے

" پتہ لاکھ جتنا ہے سنبھار سب چلتا ہے

دل چاہے کہ ہم کھو کے بہت چھوڑے

کام اس سے بھی نکل آتے تھے بیکار تہ قضا

بہت بہار کی آمد سے غرض میں سرخس

شکرتے دیکھیں انہیں کیا تہاں کرتے ہیں

خورد ہیں کے گلے میں بھی ہیں لاکھ جات

نکلیں اچھوں کی کوئی ہاتھ نہتی ہوتی ہے

انہی سا کرم دھڑا پیر کا ہے ہم

یاد دل کا ہے کھلا نہیں دماغ دھارا

ہم کو انہوں دکھا دو مٹھے کی

پھر مڑ دیکھو جاں فدا کی

نکلیں نے کھل کے ہڈیاں بھرا ہوا اپنا
ہمارے ٹوٹ کے پڑے ہیں کیا منگاریا

قبر پر میرے چڑھا جاتی تھیں غری
مات کے بار جو اس گل نے ادا ہے ہوتے

بچوں کے انہیں نکل آتے تھیں کہ وہ اور
کھلی رہا اسے بھی سوارے ہوئے

تم نے وہ اور ہانگ لال سر مصل
چل جانے کو سر پر ادا آئے گل آئے

یہ عزم کے ہاتھ سے کوئی ہست آئے بھی
چوڑا دل نہ کہیں کھ کھیاں کوئی

داغ ہو کر آئینوں سے ان کے کلام میں داغ اور اسیر کے رنگ کی بھی مثال کی۔ حال قہیدوں کے بھی مثال کی
تھے انہیں ان کے قصیدے سے اسے مشہور نہیں ہوئے۔ اور بیاد کی طور پر غزل میں کہتے تھے کہ جاتے ہیں ایک غزل کے
چار شعر صرف اس لئے نقش کرنا ہیں کہ اس پر داغ اور اسیر کے رنگ کی چھپ کر آئی ہے

مٹی تھی کہ کے کہ لائی ہوں زلف یار کی

بھری تو یار صبا کا داغ بھی نہ جا

توں کے عشق میں کیا ہوئی ہم سے یاد خدا

کہ دل بھی تھا نہ نکلتا، غرض بھی نہ جا

پھر آئے مصلحتی ساقی میں تھیں نہ آنکھ اپنی

" وہ یہ نصیب ہیں خالی اپنی بھی نہ جا

بال داغ ہیں میں وہ تھوڑے ہیں ہم

دھن کو پھول ملے ہم کہ داغ بھی نہ جا

شروع کر ٹوب جلا بیٹھے ہیں۔ ایسے کامز معاشرت کے بہرہ ور امیر جماعت کی سطح تک کو اختیار نہیں کرتے۔ ان کے یہاں عشق و عاشقی میں دور حکومت ہے جو مصیبت کا حصہ ہے۔ داغ کھل کھیلنے کے عادی ہیں انکے امیر جماعت اپنے جذبات کو سنبھالتے ہوئے اپنے اوپر حدیں قائم کرتے رہتے ہیں۔ محبوب کی جو سنان کے یہاں ایک خاص قسم کا ترشح ہے انوکھا ہے۔ ان کی تصانیف میں درد میں "میرزا غلیب" اور "اسلم خانہ عشق" بہت مشہور ہیں۔ "میرزا غلیب" اور "میرزا غلیب" بھی شعری احباب ہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی دیوان نادرش عشاق ہو گیا تھا جنہیں اس کے بعض اشعار ان اشعار میں سوجھ جی۔ امیر جماعت نے "اسرار" اور "مشرقیات" بھی لکھی ہیں۔ "مضامین دل آشوب" اور "مجموعہ اسرار" مشہور ہیں۔ مشہور ہیں کا رنگ چند ہی ہے۔ ان میں "میر کریم"، "لیلا لہو"، "شام و روز"، "نورنگی" اور "فیروزہ" ایک عشق پر حسن کی "میرالین" کے بنیاد میں لکھی گئیں اور اتفاقاً جواب دہ ہو گئی۔ فارسی میں بھی ایک دیوان ہے۔ ایک تفسیر دیوان "عالم خاتم عشق" بھی ہے۔

بہر طور امیر جماعت ایک اپنے شاعر ہیں جن کا ذکر داغ کے بعد ہر نگہ موہو ہے۔ موصوف نے نثر میں ایک شعرا کا تذکرہ کیا ہے جس کا نام "احباب یادگار" ہے۔ یہ تذکرہ دربار امیر کے شعراء کے متعلق ہے۔ ایک لغت بھی "امیر اللغات" معروف ہے۔ ان کے شاگردوں میں ریاض، طہیل، مظفر کوثر، حفصہ، لولاب، کلب علی خان، فیروز، عرف ہیں۔ امیر کی غزلوں سے چند اشعار پیش کیا کہ بہرہ

فیس ممکن ہے سوزا ہر میں بند آ نہیں نکلے
ظاہر مگر رہا ہے آنکھ میں طوق طائی کا

عجب عالم ہے اس کا وضع سہادی شکل بھولی ہے
تکھی جاتی ہے دل میں کیا رکھنا نرم ہولہ ہے

انگوٹھی بھی تھی یہ نئے پانی کی ہمارے
بہرہ سے کھینچ لئی ہے کھوار ہو گئی ہے

ظہیر تھا ہے ہمارے دل میں ہزار موت سے وہ واقف
مگر یہ ڈرے نکل نہ جائے مکان کی گلی سے گلہ آکر

کرتے گا یاد اے تم ہم کو بعد مرے تو برسی
کھارے ہے جگر برسی پٹایا ہے لبو برسی

بہر ایسی ہوا میں خود ہلاک میں کہاں ہوں گی
رہے گا غلہ میں بھی یاد ہم کو کھنڈ ہر سو
دشمن چراغ برقی ہے دینا ہے رات بھر
پھٹے ہوئے صیغہ مرے انہیوں کے ہیں
نئے دق تو زرا کھی تانی، طہر علی
یوں مر کھ گئی ہے اسی اضطراب میں
جانوں نے دکھائے جو اپنے ہاں کے داغ
رہا ہوا کتاب جان سے لگی سمجھ

محسن کا کوروی

(۱۸۶۵ء - ۱۹۰۵ء)

محمد محسن نام دار کا کوروی تھا۔ پرنسپل اور اعلیٰ پڑھا اور ۱۹۰۵ء میں انڈیا گیا۔ ان کے والد مولوی "حسن" تھے جن کی زندگی میں نہ وقت نیا نیا داخل تھا۔ پندار آئی تھی۔ محسن ان کے زیر سایہ رہے اور عربی، فارسی، منطق وغیرہ سیکھے۔ وہ۔ انگریز بھی پڑھی "کالت کا تھانہ" پاس کیا اور منصف ہو گئے لیکن انہوں نے ملازمت ترک کر دی۔ محسن کا کوروی کا نام ایک شاعر کی "ثبیت سے تیار اور صرف ہے۔" شہس نے مولوی بھی ملی اشک کو پناہ دیا۔ محسن نے عشقِ نصیب سے دل کا پانی سے کچھ نہیں۔ "عجب رات ہے کہ درازت کے کھانا انہوں نے ہندی (یا) کا خاصہ استعمال کیا۔ پندار گئی، برعائن وغیرہ ان کے یہاں "تا ظفر کی کھیل میں بہت پائزہ کر رہے آتے ہیں۔ موصوف کے مدح و ذیل اشعار ملتا ہے جو ان سے اتفاقاً ہو گا کہ کسی طرح انہوں نے ہندوستانی ثقافت و معاشرت اور ادب کو اپنی شاعری میں استعمال کیا:

سوت کائی سے چلا چاہ سحر ہاں
برقی کے کاندھے پہ لائی ہے سیا گلاب

مگر میں اٹکان کر کے مرہ قدان اکمل
جا کے جتا پہ نہاں تو ہے ایک قول ال

دل میں قوت نگہ میں صاحب کہاں
 لب لباب پہاڑ سا اضطراب کہاں
 کوئی آواز نہ کیا سوا سو حیا
 کہ انہوں نے زولِ بلا سو حیا
 تم اک جھک ت دیکھ کے موت اے کلیم
 وہ جلوہ برقی گہنی صبر کوہِ خدر تھا
 مجھ سا دیگا نہ محضے جان کوئی
 کہ شب بھر میں بیتا ہوں میں

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بکروج نے دہلی کی حلقہ کا مال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہی سبب سے انہیں مختلف جھولی پر منتقل ہونا پڑا تھا جس میں اندر ابھی مثال ہے۔ ان کے دل میں ایسے واقعات لازماً نظر آئے ہوں گے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے اثرات ان کی بعض غزلوں کے صفحات میں اصل ملے۔ اس ضمن میں چند شعر دیکھئے:

م ہر لے کے کہاں جاؤں گے دکھائیں
 جیسی ابھی ہے پہ لب کوئی غریب نہیں

بلکہ آگے نکلیں باپچاں بھول میں
 جتنا اوزار لب کلوں گہاں ہوں میں

خداوند نہیں لے مرا جو ہر مٹا دیا
 میں اک کتاب غریب کہاں پہ آجید ہوں

اسے یہ شعر بھرنی آتی تھی کہ اردو و مرید شاعران میں کہ:

"غزل کے علاوہ بکروج نے نعت، مثنوی، سلام، غزل اور غزلیں وغیرہ بھی اپنی شعری توانا میں صرف کی ہیں۔ یہ یہاں لکھنا اور لکھنا: "میں غزل کے نزدیک نظم و نثر سے زیادہ قریب ہے۔ بکروج نے بکروج کے لیے اپنے زمانہ کی فکر نہیں، اکثر کتب خانوں میں موبائلنگ کرتا تھا۔ فیروز نے ان کا تذکرہ کر کے اپنی کتاب "شہرہ ہدیٰ بکروج" میں ان پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ بکروج کے پہلی کارنامے انھیں دیکھنا غافل کیا ہوا جانتے۔ دہلیات بکروج میں نعت کے بارے میں جو نمونے موجود ہیں۔ دہلی بکروج میں انکس مختلف نمونہ ہیں جو غزل کی ہیئت

میں نظر آتی تھی کہ انہیں یہ نہیں آتھیں کہ بکروج کی محبت اور ان کی ذرا کم صلاحیت کا بکروج نے اس طرح ہیں۔ مثنویوں میں بکروج کو مثنوی کی شکست دہر کی سے متعلق مثنوی اور مثنوی صبر و یک امور خاص قابل ذکر ہیں۔ بکروج نے مثنوی کے لئے چھوٹی بحر میں مثنوی کی ہیں اور ان سے پہلی دہلی ذکاوت اور خوش اسلوبی کے ساتھ کام لیا ہے۔ وہ ان بکروج کے قصائد زیادہ تر ہر گاہ و دین کی مدح میں کہے گئے ہیں۔ بہادر اور بہادر خواجہ رام پوری، قریب میں بھی ایک ایک قصیدہ کہا ہے۔ بکروج کی تصنیف پہلے دہلی اور حلقہ دہلی ہے۔ شاعر نے انہیں دہلی کی شہریت و استعارات سے سنوار دیا ہے۔ بہادر اور بہادر خواجہ رام پوری کے بانی مثنوی اور بکروج کی ستائش کرتے ہوئے بکروج نے قصیدے کی روایات کی پادشاہی کیا ہے۔ بکروج کے قصیدے درمیان مثنویات اور دہلیات اور ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں اور ان میں بکروج کے شاعرانہ ہر روز سے کہتے ہیں۔ بکروج کی خوش گوئی کی وجہ سے حالی نے ان کی شاعری کو "مثنوی کے ذرائع" سے تعبیر کیا ہے۔"۵

بکروج کا ۱۸۵۵ء میں ۱۸۵۳ء میں انتقال ہوا اور وہ گوارا قدم شریف دہلی کے دروازے کے ایک محلے میں دفن کیے گئے۔ "خانہ کاغذ" میں "ماہنامہ" سے لکھا ہے کہ "بکروج میں ان کی زبان پر انگریزی کا اثر تھا۔"

عبد الحمید پریشاں

(۱۸۲۹ء - ۱۹۰۵ء)

ابن کا پورا نام عبد الحمید اور تخلص پریشاں تھا۔ مدنی پریشاں کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق تھان سادات کے زبانی بھٹائی سلسلے سے تعلق رکھتا تھا۔ عباسی مدنی پریشاں کے سلسلے کے ایک اہم رکن تھے۔ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۵۷ھ میں اپنے کزن میں اپنے چچا سید فاضل شاہ سے چاہیں۔ جب ان کا تعلق تھان کے سلسلے سے ہوا تو ان کے تھان کے والد سید احمد شاہ نے انھیں مدنی پریشاں کے خاندان میں رکھ دیا۔ ۱۸۵۱ء میں مدنی پریشاں نے مدنی پریشاں اور ان کے سلسلے میں گراما کر کے تھان بھیج دیا گیا تھا۔

جب چھٹا چھٹیس (۲۶) سال کے ہوئے تو ان کا والد علی شاہ مدنی سے مدنی و مثنوی کی تعلیم حاصل کی۔ مدنی پریشاں نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی اور صوبہ علیہ ہوئے۔ ان کا کام طبائع پر لکھا ہے۔ لیکن فارسی کا کچھ "شیراز شہ" میں ان کا صاحب کا پورا ہے۔ "الطیفا" سے ان کا خاص تعلق تھا۔ ان کی دہلی غزلیں کلیم جہاں سے اپنی کتاب "بہار شہ" اور "طائرانی کاغذ" میں "شیراز شہ" میں دہلی بھی لکھتے ہیں کہ کلیم صاحب نے سرگرم کے دربار کا نام لیا

"مہر پر نگار" "ادھر ادھر" "دیوان مہر بکرا" "اردو" "گلی" "الکے سے سینگل" "تعلو" "گلی" "مہر" "دیوان" "دیوان غزل" "تہذیبی ایمان" "مغربی انقلاب" "لاری" "مثنوی خست گم ہر" "تکلی" "مثنوی مہر" "الطاف" "تکلی" "بستان خیالی" "ارور ہر" "مرآی مہر"۔

مستخرجہ ہاں تصانیف سے اس کا مطالعہ ہوتا رہی جاتا ہے کہ مہر بکرا کی ادبی لحاظ سے تاثیر روزگار تھے۔ اپنے وقت میں ان کی شہرہ و حرکت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص ان کے آگے ذائقے سے سب تہذیب کا دار و مدار لادنے کے وسیعہ وطنی مسائل کے باب میں ان سے رجوع کرتا تو اس کے بعض اصول سے متعلق انھوں نے ضمنی میں لوگ ان کی طرف راغب ہوئے۔ ان کے تحریر طبع کا شعور و ادراک ہر حال میں ان کی قلم و کتابت سے ان کی شہرت و عزت کو مزید تقویت بخشنا ہی لیکن بہادر شاہ دوم کی شخصیت ممتاز اثر ہوئی اور لوگ "مہر بکرا" اور شاہ "ابو گنگوہ" اور اصل یہ جھگڑے دونوں کے شاگردوں کے دماغی ہمارا دار و مدار یہ سلسلہ خور و قیوم آہستہ آہستہ جاری ہے۔

مہر بکرا نے راجستھان کی طرف بھی توجہ کی اور ملکی دوسری شخصوں کی طرف بھی۔ لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ مہر بکرا ہندوستان کوئی حقیقت سے حلیم کے لئے اور تہذیبی ادب نگار کے طور پر۔ ان کی قلمی اثر پر یہ اس ادبی تاریخ کا ایک جزو ہیں۔ ان سے زیادہ کچھ نہیں۔ چشتی بخش شاہ قیوم آبادی سے منسوب "سعود خیالی" کے طبع سے بھی ہوئی رہی ہیں وہ بھی مہر بکرا کی ملکی کتاب کے بارے میں نہیں ہوتی۔

مطالعہ حقیقت سے مراد یہاں کے معاملہ ہیں۔ لیکن ان کی تمام مصنیفوں پر غالب کا شمار ہوتا ہے اس امر پر یہ ہو گیا۔ حالانکہ انہوں نے اکثر مصنفوں میں طبع آزمائی کی، ان میں اعلیٰ شاعری کے بھی بہت سے نمونے عجیب سے جاسکتے ہیں۔ غزل جو کہ مرثیہ کی مثنوی ان پر بھی بہت اچھی نہیں ہوئے۔ اس کی جہاں تک یہ کہی ہے کہ تمام آثار پر وہ کہتے ہیں کہ اس کا مطالعہ کرنا اور بھر پور جانی مرحلے سے گزرنا آسان کام نہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ مہر بکرا ان کے قلمی حیات پر اکثر مختصر ادبیاتی کے حقیقی مقالے کے ساتھ وہ قائل لکھ کوئی بھی گزرتی ہیں۔

میں نے اپنے سالانہ شمار "مہر" پتہ کے بہار ۱۹۵۹ء میں ایک مضمون "مہر بکرا اور شاہ قیوم" کے عنوان پر لکھا تھا اور اس پر کچھ بحث ہے۔ میں اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی بجائے انھیں کے خیالات انھیں کی اہم میں رقم کردہ ہوں۔ اس لئے بھی کہ مہر کے باب میں میرا ہر راستہ مطالعہ اس طرح کا نہیں کہ میں کوئی رائے ذاتی کر سکوں۔ ان کی شاعری و عظمت کے قائل ہونا قیوم آبادی میں انہوں نے اس لئے کہ انھیں اس کا صحیح اندازہ تھا۔ لیکن وہ انھیں ہندوستان میں شہرہ آستانے تھے اور اس سلسلے میں ہندوستان کی صورت موجود ہے۔ لیکن قیوم تاریخ کے حالات سے اب تک غائب رہے ہیں۔ سیدہ محترمہ بھی اپنی ادبی حیات میں شاعر کے تصنیفی ذکر میں جس طرح مہر بکرا کی تصویر کشی کی ہے وہ بھی حیرت کی بات ہے۔ بہر حال قیوم کی کی تعمیل رائے کا حوالہ:-

"مہر بکرا تمام اصناف شاعری سے کم و بیش مراد و غبار ان کی خود ہی شاعری میں ہو، لغت مرثیہ،

مقام کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ غزل کوئی حقیقت ہے، وہ آخر دیوان کے کرم لوگوں کے سامنے آئے ہیں۔ اصناف کلم میں بہت سے اعتبار سے اس "ثالثت مرثیہ" کا مطالعہ کرنا ایک بڑا مسئلہ، غرض کہ کبھی سے ہم انھیں دلچسپی لینے دیکھتے ہیں۔ ادب مہر کی غزل کوئی نظر نہ لے دے ان کی شاعری کی ادبیاتی ضرورت کہ ہم سمجھ سکتے ہوں۔

مہر کی غزلوں کو جب ہم پیش نظر رکھتے ہیں تو ان میں عشق بھاری اور عشق "ملکی" دونوں کی چاشنی پائے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی بیشتر غزلوں میں آپ غزل کے نظریات کے سبب گہر کا مختصر نہیں کے برابر نہیں کے رواق کی طرح ان کو ان کی اپنی استادوں کے مطالعہ سے کام نہ شوق تھا۔ چنانچہ مشکل ان میں پہنچ کر ان کے لئے میں ان کے غزلوں میں چھپکا ہوا "دھنکپان اور سہا پان" تک آگیا ہے۔ مہر کی مشکل پندلی ملاحظہ ہو:-

ہا ہے دل غم ساقی لا جواب میں آپ
ہ شیشہ آپ ہوا صورت شراب میں آپ
عرفی ہے رنگ ہے تو رنگ کا ہے نہیں رویا میں
ہ آپ میں ہے گلاب اور ہے گلاب میں آپ
یوقت فصل نہیں سوچوں سے لپٹی ہیں
شہزادی دلف سے رہتا ہے پتہ دہاب میں آپ
مختصر شہرت دھار سے کریم میراب
پاؤں مور مانگ نے میں خواب میں آپ
شہزادے رنگ کی پائی کیوں سے آگ نے جب
شہزادے چہرے کی آئی کیوں سے آپ میں آپ

غزل کی دنیا دل و دماغ کی دنیا ہے۔ تاریخ والوں کی بھی یہاں کچھ نہیں ہے لیکن شہزادے کے کہ وہ اہل دل بھی ہوں اور انسان کی، تاریخ سوزی کے تجھے میں غزل کی کلی لپیڈ ہونے لگتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم شہزادوں میں داخلی کیفیت کی مدد کی کرتے ہیں۔ لہذا آجے تاکسی مسئلہ شاعری میں نہیں۔ تاریخی حالت کی پیش آہنگی ہے لیکن اس ضمن میں نہایت ہی ناچاند سے دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مہر کی غزلوں میں "اعلیٰ" کے نام اور قاریت بہت زیادہ قائم موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنی استادوں کا ذکر جہاں کی فکر میں اور اپنے دل کی دنیا کا صرف سرسری طور پر جائزہ لیتے تھے۔ مہر کی غزلوں کا خارجی پہلو ہیں یہ اپنے اندر

کہتا ہے۔ "راحت مدح" کا کچھ بھی سواغ و غرضی کی "سب دس" سے کیا جاتا ہے۔ لیکن "راحت مدح" غیروانی طور پر تصوف کی ایک کتاب ہے۔

صوفی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ایک نہ عمل فارسی زبان موجود ہے۔ اس کتاب میں مالک نام لکھے ہیں۔

"صوفی کا خط بہت پاکیزہ اور خوبصورت تھا۔ ان کے خط ان کے خاتون میں سونے

ہیں۔ ملازمین بھی بہت اعلیٰ دستہ رکھتی۔ ان کی بھی اچھی جانتے تھے۔ کارخانہ کوئی ملک پر مبنی

حاصل تھا۔ نظم و نثر میں شہداد اور غرضی خاصیت دکھائی دیتی تھی جس میں سے ظہور الملک

شاہ شرف الدین کی سوانح غریب۔ بلا شرف "مشہور تصنیف ہے۔ راحت مدح" اور غرضی میں

تصوف کے مضامین ہیں۔"

اکبر و انانپوری

(۱۸۳۳ء - ۱۸۹۳ء)

ان کا پورا نام سید شاہ کبریا انانپوری تھا۔ ان کے والد ابراہیم سید محمد آباد تھے۔ راجہ رشاؤنی، پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ دادت کے درمیان ۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۰ء کے والد کے انتقال کے بعد مالک اور اصحاب سید شاہ وانی راجہ رشاؤنی کے حوالہ دیکھیں ہوئے۔

شاہ اکبر انانپوری نے والد ابراہیم سے کلمہ حاصل کیا۔ لیکن ان کی راجہ رشاؤنی سے سلوک اور تصوف کی راہ پر نکلے ہیں۔ اس واسطے سے ان کا سلسلہ روکی شاعری سے تھا ہے۔ "صوفی کا پورا کام تصوف میں ڈال دیا ہے۔ کیا جاسکتا ہے کہ یہ صوفی شاعر تھے اور مسلک ڈھونڈنا تھا تو ان کے مزاج میں ظہور سے بھی تھی اور فکر و تدبیر بھی۔ انھیں اصحاب سے ان کی شاعری مشہور ہے۔

اکبر انانپوری نے نظم و نثر کا ایک مجموعہ سوانح چھڑا ہے۔ انہوں نے نگین بھی لکھی، مگر میں بھی افسردہ تھی۔ راجہ رشاؤنی اور نقباء میں ان کے خط میں سوائے انہوں میں غزلوں اور غزلوں کے، کہ ان کے چھپ چکے ہیں اور ان کی علم نہیں۔ "پسے کام" "جہاں بات کبر" اور "سرا" "تجلیات عشق" ہے۔ ان میں ایک غزل بھی ہے کہ انہوں جس سے ان کی تحقیق و ترقی کا بھی بہت چٹا ہے اور تصوف سے اپنی اصلیت کا بھی

تھی جہاں جسم سے ہم سے جان میں کیا

بہت شمع جگہ گئی تو رہا انجمن میں کیا

پیشے ہوئے ہیں انھیں کہ دل چاہتا تھا

نکلتا تھیں ہمیں کہ ہے اس انجمن میں کیا

شہم نے جو دے ہیں سحر رنگ رنگ میں

سوئی لڑائے موسم گل نے جن میں کیا

ملکت میں نادیاں کھڑی اچھڑا ہے تو

آنکھیں تو کھول دیکھ تو ہے انجمن میں کیا

غربت میں اس طرف کی نہ آئی کبھی ہوا

بوسے وفا بھی اب بھی اہل وطن میں کیا

انے اہل تھی اس کا مزا وہاں نہ آئے گا

دیوانہ ہو کے دیکھو ہے دیوانہ پانی میں کیا

۱۸ کے گونے پار میں یا کچھ اپنی خوش

کہا جانے اچھڑا ہے میں فرشتے کون میں کیا

اکبر انانپوری کے بارے میں اپنی کتاب "ہمارے اردو شاعری کا نقشہ" میں حکیم جہاں نواز قلم لے رہے ہیں۔

"اکبر انانپوری صرف صوفی شاعر نہیں، وہ صوفی، مسلک، یونٹس، طائیفہ، دشمن بھی ان کا اس

رنگ میں دکھائی دیتا ہے اور جسے صاحب کمال بزرگوں میں تھے اور ان کے عقیدہ مندوں کا

مصدقہ و ہوا سے مغرب میں صوبہ احمد اور مشرق میں بنگال کے اکثر اخبارات میں پھیلے ہوا

قرارداد میں بنیادیں الہ آباد اور آگرہ و دہلی ان کے دوست و مندرجہ کامر کا تھا۔ الہ آباد میں

اکثر قلم چم رہا تھا۔ انہوں نے سلسلے سے مولانا صدیق آبادی سے تعلقات قائم ہوئے۔ مزاج

کو طبع چمکاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیؑ سے ۱۸۶۰ء میں انھیں کے مولانا رنگ کو چمکانے میں

سب سے زیادہ کامیاب ہوئے۔ اکبر کے مزاج میں وہی ماسر تھے جو نثر و نثر تھی، جگہ بہ جگہ

استعارہ کو تھوہرے لکھتے ہیں، مزاج میں اکبر علی صوفی نقشبندی تھی اور شاعری سے بھی تو سب سے

لگے تھے اس لئے جہاں اکبر کے یہاں یہاں اچھڑا ہے۔

چاد دیوانہ نہیں اپنے لئے صبرا ہے

ہم سے دیوانوں کو ہے رہا سے صبرا اچھا

اور: اہل ہے تو ہم کو بھی اٹھا لیتا ہے

باتوں کے لئے ہے وہ سہارا اچھا

انہیں کی ہر گز نہیں آتھیں۔ میں ہم ٹھنک کر
قزاقی دل خانہ خراب دیکھے کون
ہم اور شیخ دونوں چہرہ پرانہ ہمیں
جس انہیں میں وہ ہے اس انہیں میں ہم
رو بہ چار بلبل و گل ہم سے چمچے
رگس کی آنکھ میں کے رہے ہیں جی میں ہم

ان کا کیف و حال بھی کبھی ان کے انداز گفتگو کو سنا اور محسوس کر لیا تھا کہ جتنا ہے:

بچے ہیں مضر ہماگ میں ہم گئے تھے کسی کو کھانچا ہے
طارا جہاں صحبت کسی کی اتری ہوئی تھا ہے
گل ہے ایسی گلن کسی سے کہ بیچہ لبا اب نہ چھتے گئے گی
یہ دل گل دل لگی تھی ہے جو ہم تھے ہیں قزل لگا ہے
نارا جوسہ طارا دل ہے چائیں کے ہمار ہر کسی کو
ہوئے شوق اس کو لے لڑنے کی بھی کھڑی ہوا ہے۔
اکبر راجہ پوری کا سال ۱۹۱۳ء میں ہوا اور اوپر کی خاکہ خود میں قلمی ہوئے۔

شاد عظیم آبادی

(۱۸۶۱ء - ۱۹۲۷ء)

سید بلبل محمد نام انھیں شاد قطاب قادی بھارہ۔ ۱۸۶۱ء کو شہر عظیم آباد پڑھ لکھ پورہ وراۓ الہ آباد
ذیل میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید عباس مرزا تھا اور ان کا شاد عظیم آباد کے عالی خانان درہ سرائے سے تھا۔
پانچ سال کی عمر سے کچھ پچھلے ذیل میں شاد کا کتبہ ہوا جس کے بعد الہ آباد وراۓ پڑھ لکھ جاتی رہ گئے۔
یہ قادی بھارہ میں عظیم آباد میں عزت و قدر شاد کے نام لائی نہیں مگر کے بارے میں نہیں گھٹتے ہیں۔

”آپ کا خاندان نہ درہ قزاقی وراۓ قزاقی ہے۔ ان کے خانا خاں سید تخلص علی قاس
حضرت سید اللہ باب قطاب سید اللہ سید علی امام زین العابدین کی والدہ ہیں۔ سید اللہ امام
محمد باقر کے ہم وطن تھے اور دونوں کی والدہ شہر حضرت امام حسن علیہ السلام کی صاحبزادی

تھیں۔ اس لئے شاد سادات حسن کی کہنے سے ہیں۔“

”شاد کی پہلی شادی انہیں سال کی عمر میں سید میر آغا عرف میر علی خان صاحب مرحوم غلط
میر حسن علی خان صاحب (جو عقب پھلوانی شریف علی بیگ کے حوالے سے حضرت سید اللہ مراد
سید علی اعظم صاحب دستار الخلیفہ کے بھائیوں میں تھے) کی بیوی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان
کے کئی اور بیوی ہوئیں، لیکن صاحبزادہ سید آپ سید حسین خان صاحب کے سوا کوئی بھی زندہ
نہ رہا۔“

شاد کا پانچواں بیٹا ہے۔

”سید صاحب کی شادی ۱۸۶۷ء میں سید میر آغا عرف علی مرحوم رحیم و دوہندہ عالی خانان
سائیکہ صاحبی بیگ کی بیٹی صاحبزادی سے ہوئی۔ سید صاحب کو ان بھروسے آغا اور بیوی
جو گھر۔ حالت نے بچے بعد نگہے ایام مضاعف ہی میں انتقال کیا۔ آغا بیوی سید حسین
خان ہیں۔ ان کی والدہ کے ایک دن کے بعد ان کی والدہ سے انتقال کر گئے۔ ان کی رطبت کے
چار سال بعد سید صاحب نے غلٹ میں شادی کر لی۔ سید صاحب کی شادی کی۔“

نورس کی عمر میں شاد علی تھے۔ مولوی سید فرحت حسین کے بھائی اور مولوی بیگ آغا جان مرحوم بیگ علی
یا قر آباد مولوی سید محمد اللہ صاحب قاضی علی بیگ کی والدہ سے تھے۔ شاد کا نظر وراۓ علی عرفی اور
آغا محمد نے بھی علی بیگ کی۔ انگریزی تعلیم دینے کے لئے سسٹرن پورہ منتقل ہوئے تھے۔ لیکن انگریزی تعلیم کے حصول کا
سلسلہ کچھ روزوں تک نہیں چلا۔

ان کے علاوہ شاد کے اہل خانہ میں جن سے شاد نے قادی بھارہ اور الہ آباد وراۓ پڑھ لکھ میں اور شاد کے
یہاں کا تعلق بن جائے۔ چنانچہ انہوں نے قادی بھارہ (الہ آباد) میں ان کا تحصیل سے کر لیا ہے۔ مختلف اشتہار ہیں

| | |
|----------------------------|---------------------------|
| رہا داتا گدا ہے علی و ابیہ | کے از اہلہاں دیگر ز شیراز |
| یہ ہم سعد و رضی کشا جند | زبان پارسی را دار دادند |
| مرا کو در مراٹی اورجا است | اور کتہ دلی قری بہا است |
| اسلے چوں دبیر دہا علی من | انھں آند کہ بود چاہی ایمن |

- ”کمال“ شاد عظیم آبادی اور ان کی بیوی شاد علی“، باب اشرفی، ایچ بی بی پبلیکیشن، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱
- ”کمال“ شاد عظیم آبادی اور ان کی بیوی شاد علی“، باب اشرفی، ایچ بی بی پبلیکیشن، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱
- ”کمال“ شاد عظیم آبادی اور ان کی بیوی شاد علی“، باب اشرفی، ایچ بی بی پبلیکیشن، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱

کئے ہوئے است زانجا صوفی تمام
طریقہ نامور کاظم حسین است
میں بکرا کی کہتہ مخالف
نفاذ مابہر سر فنی ہوا
اگر پری زخمی گویم اہل جاہ
زہے کانی چرنی استادانی
اور ہوشم یکہ چہر بکلی
نظام و زنجی فرخندہ فرجام
پس خود علم در شرفین است
تکلیف و صفت دے در ہند اوراق
خدا رحمت کلمہ استاد فنی ہوا
مردم رتب شاگردانی مٹاں
سپاہن بندہ پری زانقل گمائی
نمودم وقتہ ٹیٹہ لڑائی

لیکن میں کی شاگردانی پر شاگرد کیلئے ذرا دوسرا شاہ وقت نہیں لرایا ہے۔

آپ کے کلمات اور بیانات میں خلی غماض است کہ غرض میں چار آپ نے اپنی فن پر ہاتھ نہیں کے درجہ ہائے وطن کی
کی ہیں، مگر غرض ہے آپ کو ۱۸۵۸ء میں حاکم بہار کا خطاب عطا کیا۔
شاہ کا آبدی دراصل قریب لاکھ لاکھ چندہ جو کہیں جا پاس میں دولت کی آتی رہی، سب سے بڑی بہ شاعری میں
ان کا انہماک تھا کہ کوئی بالغ نظم میں بھی سوچو نہ تھا کہ چاندی اور دیگر کی کرتا۔ سراسر ہاں نیکو بھی کم نہ تھی۔ لیکن شاعری غفلت
اور ہنگامی کی غور ہو گئی۔

شاہ کا انتقال ۱۲ رجب المرجب ۱۲۹۷ھ میں ۸۱ سال کی عمر میں ہوا۔

شاہ کا نظم آبادی اور کے متعلق ہیں شاعروں میں ایک ہیں۔ کثرت غزل گوان کا شمار اور کے چار چپ غزل
گو زبان میں ہوتا ہے۔ عظیم آبادی احمد نے اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ اردو غزل میں ہر اور قلم کے ساتھ ساتھ ہاتھ
ہیں۔ واضح ہو کہ ان کی یاد کے اس وقت آتی جب وہ کام شاہ شاہ اور ان کا دلی دہرے کے لئے مرتب کر رہے تھے۔ لیکن یہ الیہ
ہے کہ موصول کی تصنیف "اردو شاعری پر ایک نظر" میں شاہ کا کہیں ذکر نہیں اس کی کچھ وجہیں ہیں جن کی مثال میں درج
زانا نہیں جاتا۔ لیکن شاید ہی اس امر سے کسی کا اظہار ہو کہ شاہ عظیم آبادی اپنے وقت میں بھی دھم تھے اور جیسے جیسے وقت گزرتا
ہاں ان کی کامیت تھیں غزل گو دھن میں جاتا ہے یہ ایک زمانے میں ان کی طرف اٹھ ہوئے، ان کے ان میں ضربت ہوئی،
ان کے ان کی ادبیات کی قابل بھی تھی۔ یہ سب کے سب شاہ کی قدر و منزلت سے مراد ہے، آج تھے یا بعض شعری
ملاحات میں ان سے دیوار بھی کرتے رہے تھے جس کی تشکیل شاہ کے مکتوبہ خطوط میں سوچو نہ ہے اور جس پر تمام اعراف
کی تہذیب کی کتاب "شاہ عظیم آبادی اردن کی نظر گذارنی" میں بھی درج ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ شاہ عظیم آبادی اردن غزل کے آہر
رہے ہیں اور عظیم آبادی اردن (انگریزی) اسے بدلتے سمجھ کر کر چاہتے اور کرنا چاہتے، تو اس کے سب سے بلند قمریت
شاہ مرشد تھی، یہ ہے اپنے وقت میں بھی آج بھی۔

تعمیل میں جانے کا موقع نہیں لیکن میں شاہ کے چھ اکتھا میں دیکھو یہ ایک۔ سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کرنا

میں۔ شاہ عظیم آبادی کی پرورش غزلیہ و غزلیہ نیز ان کی اہمیت کے ساتھ ہوئی تھی۔ چونکہ ماضی اور ادبیت میں اور
ادب کی کی شاعری انہیں ملی تھی انہیں تیار سے انہیں شعر کہنے کا ملک حاصل ہو چکا تھا۔ لہذا ان کا انہماک ہے کہ وہ اپنی سال کی
عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ اسے باغی بھی جانا جائے تب بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے کم عمری میں شعری استعداد بچھرائی اور
جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کے کام میں کھار اور بڑھتی آتی گئی۔

غزل گو زبان کا اکتھا میں اور اقوال میر اور غالب سے کام لیا ہے۔ میر کے متعارف کام کے ساتھ ساتھ ان کی
اچھے اور جزان سے ان کا ایک خاص سہہ ملایا کی اور غزل آہنی کی تیار ہو چکیوں میں سے انہیں انہوں نے اپنے کام کو اور غزلت
اور وہ غزلت جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ غالب نے اپنے مختصر سے کام میں (اس وقت کو موصول نہیں کیا ہے
صرف نظر کرنا ہوں) ان کو جو میر کا اور حیات کا نکات کے لئے، یہ خصوصیات اپنے خاص اسلوب میں بڑھاتے ان کے
بھی مثال کشیں اور جیسے ملتی۔ ایک نظم میں ان کے آیت و شاعرانہ کے سوچ پر اس طرح مانتے آج ہے کہ جیسے اور اس
موقع کے لئے مرتب کیا گیا ہو میری مراد اس متعلقہ زبان کے اشارے ہے۔ مگر چہ چہ میں دو چوں کے ساتھ تمام آگے
نکل جاتے ہیں تو قلم پیچھے میں بھی وہ کیونست مانتے لگتے ہیں، ہوائیہ یاد دلائی کہیں اور بکلیں گئے۔ غازی شعرا کے علاوہ
چاروں اہم شاعروں کی شاہ عظیم آبادی کی نگاہ میں رہے تھے۔ مگر حاضرین کے جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا۔ دلی اور کھن
کے رہنما ان کے شاعروں نے جس طرح اور شاعری کو رکا شاعرانہ کی قیاد انہوں کی نگاہ میں درج ہوا تھا۔ شاہ نے وہاں
اپنے کے ایک فن اور منتخب کی اور وہ شاعری ان کی ان کے یہاں دلی اور مشتق مراحل اپنی تشکیل اور شیرینی سے ملی
ملے ہوئے ہیں۔ شاہ ان کے یہاں بھی کہنے کا انداز ہے کہ میں کی صورت ہے۔ راہ اور درج جو کھن کا مروجہ جانا ہے یا دلی
کی تشکیل پیدا کرتے ہے یا دلی ان کے خاص شاہ کی شاعری سے کوئی رچا نہیں۔ کھن۔

شاہ عظیم آبادی کا نظریات و کائنات کی تعمیر سے بھی متعلق ہے صرف کہ قلم اور اس کے بھی اور میری زندگی کی
ماں سے بھی۔ لیکن میں نے یہ تو میں ان کے یہاں تھا ان کی نشست و اقامت مکتوبہ میں کوئی جگہ ان کے اشتغال میں
ایک انہیں جلد اپنی فوج کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ سب سے سب سبھی اعلیٰ کی لکھی دیا یا یاد کرتے ہیں۔

میں نے غازی کے حوالے سے یہ لکھنے کی کوشش کی کہ شاہ عظیم آبادی کسی شاعر سے سب سے زیادہ قریب عظیم
ہوتے ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ شاہ کا دیار دلی سے کسی مانتا ہے۔ حوالہ کی شریں جاتی، سبک دلی میں کہتی
معتوبہ، مثلاً واقع کے چاروں میں دلی انگرا اور دلی و مکتوبہ کے اکتھا میں گوی وہ دلی نصیرت میں طرح پرند پرند
شاہ عظیم آبادی کا بھی خاص ہیں۔ چند اشعار کے حوالے سے میرا چاہو اور انہیں جہت سے کسی اہم اور لارے لکھی "شاہ کا جہر
اور انہیں" میں اپنے لکھتے کہ شاہ ان لڑکھا ہے۔ چھ اشعار مکتوبہ میں۔ یہ ہے شاہ نے خود کہا تھا

شعر کہتے ہیں کے بزم شاہ میں کھن جاسے گا

شاہ آکا نہ کھن مانتا شہر تو

ہر طور کی مطالعے کے لئے پورا شعرا نقل کرتا ہوں:

یہ بوسے تانے کا فرمایاں طرہ کھتا ہے
لڑا بہ چند شکستیں، چہ تھیں آثار در دنیا

(حافظ)

کھتا ہے جام پر چڑا سہا کس چادر ٹھکیں کا
مگر ابھی تک بوسے گیسو کا رداں درکاراں بکلی

(شار)

دل کی رو دردِ حتمِ صامیہ رداں خدارا
وردا کہ رازِ پندیں خواہ شد آفتاب

(حافظ)

کہاں یہ چہب و طاقت ہے کہ ہم تھیں وہاں کھولیں
خزانے کی طرح دل میں لئے بیٹھے ہیں راز اس کا

(شار)

شبِ تاریک و قیامِ صبح و گریبِ چشیں جاگن
کیا رازِ حال : سکھارنا سائلِ با

(حافظ)

کہا چھوڑا ہے ابھ ویشی کو کاشی غم جاں تو نے
انہی ہری رات، حالے کا عالم، بولا دلی کو

(شار)

آئینہ شکوہ، جامِ جم است نگر
کارِ تو عرصہ دارد، احوالِ ملکِ ناد

(حافظ)

تا قیامت رہے آئینہ سلامتِ یارب
پر مہمیں کو ہے یہ بولی کہ شکوہ ہم ہیں

(شار)

عاشقِ یازم مرا یا کفر یا انکار چہ کار
کھتا دردم، مرا دل و یا بھریں چہ کار

(حافظ)

بہرام : کفر کچھ نہیں بھاتا خیال میں
دست سے جتا ہیں میں آپ اپنے حال میں

(شار)

زبان از دہق بھی مثالِ داسے تو بہت
اے ڈھرم تو بد لہجہ کر چٹاٹش

(حافظ)

وہی رنجش، وہی لڑائی، وہی نازک بولی
بھول نے لکھن آرا ہے سراپا میرا

(شار)

بابِ مثنوی امید، چسِ طاقتِ نر از اسرارِ غیب
راشد اندر ہند بازیِ باسے پندیں لم نور

(حافظ)

جنا بچیں ان کی ہیں یہ مصلحت، بھولوں کے ناخنوں
اب ایسے کیا، دیکھ لے ہیں کہ بے سوچے جاتے ہیں

(شار)

اپنے درج کے علاوہ شاعرِ عظیم آبادی کے یہاں، رومانی فنکار کا ایک ایسا احساس ہوتا ہے جو دوسروں کے یہاں
کیا یہ ہے یا کو کھم شاد سے ڈالیں، ہی جاگیر تو طاقت کا خوف ہے پھر بھی میں کیا کہیوں؟

اپنے گما کو خود رو پکارے، ابھ مرے کالی کھلی داسے
ابھ میرے عاشق ابھ مرے پکارے، ابھ مرے کالی کھلی داسے

چاند کی رنگتِ اردو ہے چاند سے، سچ کے دیکھ آوار، ہیں ستارے
ذوب چلے ہم ہر میں ستارے، ابھ مرے کالی کھلی داسے

دل کو بے سیر سے تھو سے محبت اویسے تیرا وہ چاہن کو کلفت
چو نہ ہر دم آسین بارے ، اٹھ سرت کا کئی کئی واسے
رو کے اطراف ہم جو رہے گا ، چل شب سے کام جو رہے گا
نوٹ نہ چلی کے غرض کے چارے ، اٹھ سرت کا کئی کئی واسے

شاعر کے یہاں عرفان و آگہی کے اشعار کی کمی نہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کی شاعری کی بچی بھری ہیں۔ ان کے کام کا سرسری مطالعہ بھی ان کے متنوع حراف کا پتہ دیتا ہے۔ ایک طرف تو انہوں نے گہرے فکرمندانہ انداز کے ہیں تو دوسری طرف ہستی و معاملات سے ایسے ہمدرد کی مکاری کی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی شاعری میں صرف ایسے مثال پیش کرتا ہوں۔ ان کا ایک مشہور مسطرہ ہے:

یاں مارا تری آنکھوں نے جوئی پھر کے نکاح

نہ لی دل کو نہ

یار کی قبر سے پتہ نہ پوچھا نہ پوچھا

لاکھوں کا نہ

اس پھر کی ہائے وہ آنکھیں تری کا کئی کائی

سے بیٹھے سرائی

ماں لاؤ گئے ملک ، نہ چڑھا مات جنا

الک کہیں دھیان لگا

وہ تری کی دوش کی گئی بھی ، کینہ داری

دلیری ، ہشو ، گرگی

کون عشق تھا کہ مراد نہ

پھر کے دیکھ لکڑا

ماہر علی مرحوم لکھتے ہیں :-

”شاعر کی اکثر قریب تر نظم اور نثر کے اعتبار سے اپنی مثالیں آپ ہیں۔ مصحفوں کا انداز ان کی آج تک اس بات کا سراغ دیتا ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ ، شے کی طرح اہل رہے ہیں۔ انہیں دلائل کے سانچوں میں احوال جاریا ہے ، درست اور گتہ کے لئے۔“

نئی قبل کے کئے ہی اشعار ہیں۔ میں نے ان میں صرف ایک شعر نقل کے طور پر پیش کر رہا ہوں:

شب کو ، بھٹی سے ان کا رخرا کے چھوٹا آنکھوں کو
داغوں سے دم کر ہنسا ہے کہ کھوٹے کئی کاروبار

ان کے علاوہ چھ ایک غزل زبان و ذوق عام ہے۔ اس میں بھی انہی شیرگاہوں کی چابکی ہے:

کے ایک ختم اور لاکھوں کی غفاری جہاں بائے زمانے
نہ گئی ٹاچیں تک تو کیں اف ، رہی جہاں بائے زمانے
ارلی اور سے آپ مجھ کو ، اپنی اور سے آپ نکلتا
چال میں غرض جس نے کیں الہ دی جہاں بائے زمانے
کلی گھٹا کیں باغ میں کھولے دھانی دوپٹے لٹ چھٹا
مجھ پہ یہ قدر کیں آپ نہ آئیں الہ دی جہاں بائے زمانے
بچھڑے پورا تھو اٹھ کے نماز میں تاکہ رگڑ لیں جہاں آپ سے
جو نہیں جانتا اس کی دعا کیں اف دیا جہاں بائے زمانے

شاعر عظیم آدمی نے اقربہ تمام اصناف میں شعر کہے ہیں۔ سب سے اہم ان کے قصیدہ و مثنوی و مرثیہ۔ جن میں ان کا احساس یہ تھا کہ وہ مرثیہ میں کوئی نیا مثال دے رہے ہیں ، اور ان میں سے اکثر ایک نیا نیا خیال ہے کہ کچھ حد شعور و کوشش کی جائے تو ان کے مرثیے بہت اذنی نہیں سمجھتے۔ انھوں نے ان کی کیفیت کو ”تسکین اور انقلاب“ کے درمیان میں نظر نہیں آتی۔ لیکن اور مولف کے اندیش ان کا شعریہ حال ہوگا۔ ان کے چند اشعار اور انتخاب درج کر رہا ہوں۔

و ہم بے یاس کلام دیتی میں ہے عمر ہی

جو بازو کے قہر اٹھائے ہاتھ میں پتا ان کا ہے

نکھر یا مدعا جس کو جو دلوں ہی کیاں جو

حققت میں دلی سکھار ہے پتا ان کا ہے

تاہوں کی کشاکش۔ یہ ذرا قدر نفس ہی نوٹ کیا

اک مرے قہر کی کیفیت شے کھڑی شب کو ہوتی پھرتی کہا

کاروان میں قہر نہ ہم سے ، مسلمانوں میں قہر

یاں اگر انان قہر تو میرے دلوں میں قہر

جو کچھ پچھو تو خدا اپنے کئے کچھ بھی نہیں ہوتا
خدا کی دیکھ ہے انسان کا مشہور ہو چکا
جب اہل ہوش کہتے ہیں اللہ آپ کا
بیت ہے، دیکھ دیکھ کے دیکھو آپ کا
اب بھی ایک حجر میں بیٹھنے کا نہ انداز آیا
زندگی میوز دے چھپا سرا میں یاد آیا
اس خرابے میں تو ہم دونوں ہیں یکساں ساقی
ہم کو پیتے تھے دینے کا نہ انداز آیا
امیر ہمس ہوا معیار نید الا معلوم
یہ کس سلاخ کی پاداش ہے خدا معلوم
سنی شکایت سنی تو دریاں سے سنی
تو ایتھا کی خبر ہے نہ انجا معلوم
دل حشر سے بچھ سے راتی ۱۴
میں غور آیا نہیں لایا گیا سہلا
دھونڈو گے اگر ٹکڑے ٹکڑے کئے کئے نہیں دیاب میں ہم
شعبہ ہے جسکی حسرت دہم اے ہم قصود و خراب میں ہم
معا حیرت و حسرت کا ہارا ٹاٹا ہوش کلرا ہوں ساقی
دراے عبت کچھ ہے آکھ بھی ٹکڑا پایاب میں ہم
مرجان قفس نے چوہوں سے اس شاد یہ کھلا بھیجا ہے
آپنا دھرم کو آنا ہوا پیسے میں دھن شلاب میں ہم
دے کے جی سو مجھے میر کا حوصلہ دیا
جس کی طب خفی ساقی اس سے کہیں حوا دیا

شاہ تعلیم آبادی نے مٹھ میں مدت کام کیا ہے مٹھوں پر فتنے سے ان کی کتابیں ذرا ملی ہیں ان کی تفصیل میں مشر
یہاں چار کتابیں مل جاتی ہیں۔ ان کے بابت تفصیل سے ایسے امور پر اپنی کتاب "شاہ تعلیم آبادی اور ان کی مٹھ آبادی" میں بحث کی
ہے۔ پہلے قاضی مہارود نے "اشتر و سون" میں ان کی بخش مٹھ تحریر کیا کہ وہاں قاضی مہارود نے ان کی ایک ٹھکانے
داروں اور سوانح نگار نے ان کو نگار کا خوب نگار حضور بنو دیوں اور ان کو مٹھ کی ہے۔ چار کتابوں کے ہم مقدمہ ہیں:

(۱) "شاہی کمالی شادی دہائی" (۱) ان کی خود نوشت ہے (۲) "بیات لریاد" (۳) ان کے استاد شریاد کی سوانح حیات
ہے اور بہت تفصیلی ہے (۴) "نگر بلخ" (۵) "میں میں" (۶) "انگلش پانچا" (۷) "میں بلدی" (۸) "تاریخ صوبہ بہار"
(۹) "توڑے ملن" (۱۰) "مٹھ و اصلاح دیان کے لئے مٹھوں کی لیکن اپنے زمانے میں جدید زراعتی ثابت ہوئی ہیں ان کی کتابوں
میں (۱۱) "دش گار" اور (۱۲) "اور تعلیم" بھی ہیں۔ (۱۳) "مٹھ و انجیل" (۱۴) "میں جلہ میں اور (۱۵) "مٹھ و
توال ہیں۔ (۱۶) "مٹھ و حال" بھی ایک کتاب ہے۔ (۱۷) "مٹھ و ایک بار ہے۔ اس طرح کی کتابیں کہہ سکتے
ہیں ان کے مٹھ و کتابت بھی شائع ہو چکے ہیں۔ نام ہے "مٹھ و شاد" ان کی ایک کتاب "توڑ و اصلاح" ہے۔

میں نے ان تمام کتابوں پر برہم حاصل بحث کی ہے اور تمام تفصیلی بحثیں سامنے لائے ہیں۔ اٹھارہ سال سے کہ
شاہ تعلیم آبادی ایک صاحب اسلوب نگار تھے۔ میں نے ان کے اسلوب پر اپنی مٹھ کو سمجھنے کوئے ہونے کے بعد اس طرح
تصویر کر کے ہے کہ شاہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، انھیں قسم نہیں لیتی کہ چاہتے ہیں، جو ان کو ہادی کے ذہن اور اسلوب پر مرم
کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے ان کے پاس مخصوص اسلوب ہے، جو حالات کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے۔ شاہ کے
سامنے الفاظ پھر یاد سے نکلتے ہیں ان سے جو کام لینا چاہتے ہیں، لیتے ہیں۔ ان کو وہ لکھتے کہ انھیں ہم مٹھ و انجیل
اسلوب کے مختلف انداز آکر لکھتے ہیں تو "مٹھ و حال" کا مطالعہ کافی ہے، جو شاہ کی مٹھ و انجیل کے لکھتے دھاروں کو
اپنے اندر دیکھنے دے ہے۔

اکبر الہ آبادی

(۱۸۶۶ء۔ ۱۹۱۱ء)

پورا مہاراجہ اکبر حسین قادری گھر تھے۔ ۱۱ اوت کا سال ۱۸۶۶ء ہے۔ ان کا ایک لقب دار میں
ہو رہا ہے۔ ان کے والد سید حسین شرقی علوم سے دار علم تھے بلکہ بعضی ہیں ان کی دوسری بھی تھی۔ ابتدائی
تعلیم والد شرقی کی گراں میں ہوئی۔ انام لکھی میں بہا کے ایک گاؤں اور گراں میں کچھوں سے بہا گراں کی طرف ان کا تعلق
راہان تھا چنانچہ ان کی کوششوں سے زبان و دوسری حاصل کر لی۔ کم عمری میں ان کی شادی ہو گئی۔ ان اہل حق رہا ہے۔
تھے کہ انھیں ان سے چھوڑ چکا تھا۔ ان کے رخ سے مٹھ و انجیل ہو گئے۔ انھیں انھیں نے وکالت کا حقان پاس کیا اور مختلف
مہاراجہ پر ناز ہوئے ہوئے رہا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں جبکہ وہ رہنے، سرکاری حکومت کے سلسلے میں انھیں ۱۹۱۰ء میں

کما یہ لعلی بختی طریقت
کما غولی بختی جڑوں کا استیلاں
بختی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہوں یہ لعلی بختی ہے کہیں گھاس
یہ ابھی قدروانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرجاں ہاں
دل اپنا غریب کرنے کو میں تیار
بھی مقرر مقرر کا آہاں

مغربی تعلیم و تعلیم بختی تہذیب کے سطح پر آکر ہمارے جیسا کہ وہ بھی ہو سکتا ہے اس لیے ہر مصلحت کے برعکس اس کی شاعری مفہوم میں لگتی، اس کے لئے بھوں نے خزانہ نگاری کا سہارا لیا کہ اور شاعری میں حراج کے شمار سے ایک ایسی جگہ رکھے ہیں، جو صرف انہیں کے لئے مخصوص ہے۔ اب تک ان کا کوئی ترقی پیدائش ہوا۔ دراصل حراج نگاری ان کے حراج سے خوب لگا کھاتی ہے اور ان کا ذکر نہیں رہتا انصاروں کو اس طرح عاشق کر لیتا ہے کہ شاید وہ اپنے نتیجہ سے کہ ان کو ہر امر کا دلیل کا یہ وہ عاشق کرنا چاہتے ہیں۔ اسے استہدائیں اور کرنے کے اور ہے جس اور اس سطح میں آگے ہو۔ انداز بھی اختیار کرنا ہوتا ہے وہ استہدائیں رکھتے ہیں۔ لیکن کیا ایسی قوم ضرورتوں کو ان کو ان کی صورت میں قبول کرنے کے قابل ہیں؟ چاہے گی میں ہے۔ ان کے ہر دہرے کتاب کا ایک خاص نمونہ ہے، خطبات و خطبات کے اظہار کے لئے اس کے تیار ہیں اور وہ یہ جہاں اللہ کے تیار استہدائیں سے حاصل کرتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں انہوں نے تہذیب کے تھام کے لئے کھانسی سرسبز شمع کرنی ہیں اور آپ ہیں استہدائیں کوئی جگہ بھی جو آگے ہے۔ خط انہوں نے مغربی تہذیب اور دین کو لکھا، لیکن بھٹوں کا استہدائیں قرار دیا اور ان کے ہاں کے سطح میں بات لکھی ہے تو گئے اور بھٹوں کے لئے کھانا تیار کیا۔ مسلمان اذیت اور تہذیب سے ہمارے ہیں ہر عقل محمد اذیت یہ ہر عقلیہ جو لایع انہوں کو یہ وہاں دیکھ رہے ہیں اور فرمودہ خدای تعالیٰ ہے کہ یہ ان کے تہذیب سے استہدائیں ہوتے ہیں اس طرح کہ ان کو ان کے انداز اور لکھی پڑتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

مجلس دل کو علم دیکھ کالج ہو گیا
دین کو تہذیب آگلی تہذیب کو کالج ہو گیا

زمانہ کہہ رہا ہے سب سے گھر یا
خدا بلند جا نہ مسجد جا نہ گھر یا
وہ گئے تا آگیا اصحاب صاحب ہو گئے
ہم غم نہ ایک جا پائی تھے صاحب ہو گئے
باطل کم ہو گیا اسلام کے جانوں سے
دب گئی آخر مسلمان مرے بطن سے
ڈوٹے سے تہذیب مرنا ہے = ہوا
دائیں اس کے دل لا توپ =
لوہیت شکست انہیں آپ کی اسٹیج برتی ہے
مرا شربت کا دے جاتی ہے کوہ چٹائی ہے

انہی آؤنی کے استعمال کی بھی ہے مثال ملے گی بختی کرتے ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ اس انداز سے شمر کی کڑی دور ہو جاتی ہے اور وہ پورا پورا پورا اثر ہو کر سامنے آتا ہے۔ انہی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے طریقہ زندگی کے لئے اور ان کا الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ ہی لفظ اور استعارے کو قیادت دیتے ہیں جو ہمہ پہل حال میں ہیں۔ انہی کی شاعری میں انہی نے استعمال کے سطح میں ہی خاص اور مختار ہے۔ ان کے بعد کے لوگوں نے ان کا شیخ خرب خرب کیا ہے لیکن انہی کی کلیتہً کو کوئی بھی انہی کا سہارا ان کے یہاں انہی کی الفاظ یا لکھ رہتے آتے ہیں۔ یہاں لکھا ہے کہ انہی اس موقع کے لئے خاص تراشے گئے ہیں۔ یہاں انہی کا نام مزاحیہ اشعار لکھنے والوں سے ممتاز کرتا ہے اور ان کی انفرادیت کا وہ پورا سا مطالعہ ہے جو انہی کی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

چمچے میں نہ تہذیب کے نہ نصہ والی ہے
ہمچے میں ابہ انہی کے اور آؤنگی ہے
مسح کا ہے خیال نہ پڑائے چمچ ہے
جو کچھ ہے اب نہ کالج، انچر پہ خرب ہے

کھٹی میں جمع ہے نہ اپنا ہے چٹکی میں
خانی کر دیا مجھے وہ چہرہ چٹکی میں

ان کی راحت ہے۔

غویہ تھوڑی کی نادری اور مری پر بڑی دھڑکن تھی۔ علاحدہ مری کی تعظیم قابلِ ملاحظہ نہیں ہوتی تھی۔ لیکن صحابیوں نے انہیں سب کچھ سکھایا تھا۔ مزاج میں ایسی بھی اور نہ کہ مری تھی کہ مصداقیت کا پیشہ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ نواب واجد علی شاہ کی عزت پر بھی ان کے پاس نہیں گئے اور چاری کا حقہ کر دیا، لیکن بعد ہے کہ ان کے کام میں ایسے مزاج کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اور باراداری کی عداوت ہو۔

شرعاً سے دور کہ دھبت ان کے عہد مقلی سے تھی۔ لیکن وہ ہے کہ کم عمری میں ہی شعر کہنے لگے۔ وہب نوح کے شاگرد ہوئے تو ان کی اہمیت اور بڑی تھی۔ اس لئے کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتیں ان کے ہر شروع ہونے کی تھیں۔ شریعت بھی حاصل ہوئی اور نوح کے شاگردوں میں انہیں امتیاز کا درجہ حاصل ہوا تو ان کی اہمیت اور بڑی ہو گئی۔

ایسا لگتا ہے کہ اپنے دربار کی طرف سے جنسی اعتبار سے تھیں۔ وہ ان کے پاس کی نہیں تھیں۔ ابتدائی کامیابی کے وقت ضابطہ ہو گیا۔ پھر ایک مہرے تک دربار کی ترویج کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن ان کے دوستوں اور شاگردوں کا مصارفِ شاعری کے ذریعہ کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ یہ مہرے بھی کیا کیا، جو ان کی وفات کے بعد ۱۸۹۴ء میں مطبعہ مصطفائی سے شائع ہوا۔ رام بابو سکین نے اس دربار کا تاریخی نام "دفتر فصاحت" لکھا ہے۔ لیکن درباری میں یہ رقم ہے کہ انصوری عارف نوری انجیر ۱۳۷۷ھ مطبعہ مصطفائی سے شائع ہوا۔

قریباً ہر کلمے میں محفل کی بڑا کثرت کا سکھوں نے احساس دلایا ہے۔ زبان بھی صاف ستھری ہے اور کامیابی جتنی میں کہیں کام نہیں۔ لیکن عام طور سے اشعار خشک ہیں۔ ان میں زندگی کی تڑپ مفقود ہے۔ یوں تو دورِ بری مزاج کے سب سے مشہور شاعر ہیں لیکن کام کی تنگی کی وجہ سے دل پسند نہیں بن سکے۔ علاحدہ فصاحت ان کے کام میں بڑی بدیہی ہے اور کہیں کہیں اشعار ایسے بھی لگ جاتے ہیں جن پر لگا چھٹا لگ جاتی ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں دیا ہو نہیں سکتی۔

دورِ عام طور سے عربی قول نہیں کہتے ہیں۔ ان پر ایک ڈھنگ لگے تو محسوس ہو گا کہ ایسی قولیں بھی رعایتِ تنقیح سے ترقی یا مقلود ہیں۔ مثلاً ان کے کلام کا نمایاں وصف ہے۔ اگر مزاج ترقی بھی ہوتی تو دورِ ہمت و شاعر ہوتے۔ یعنی ہر آواز ان کی زبان تھی۔ ان سے بہتر ہوتے۔ ہر حال ان کی قرائلوں سے چند اشعارِ ذیل میں نقل کر پادوں میں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کامیابی کمال کی نعمت کیا ہے۔

ہوا جویں قولوں خط سے سے دوائے جان کا

یہ احساسِ آہوی رمل سے حسن اور قرآن کا

مگر کس نے چمن سے جو دم کو آنکھ دکھائی

غزلِ چقم پر ہوا جو طیرِ نیستان کا

ایلا حاکمے تھوڑے پہ اب بھی سوار ہے
روشِ سہا پہ دلچسپ کے ہرے سوار کو

ہم امیروں کو قلم میں بھی ذرا تھکا نہیں
روزِ دھڑکا ہے کہ اب کون رہا دوتا ہے

چلا ہے اور دلِ راحت طلب کیا شانیں ہو کر
زمین کوئے جاہاں مرغِ دے گی آسمانِ دو کر

اچھ دے حسنِ مرغِ گلے سے حور
ہے چشمِ خداوند چہاں سے حور

نظروں میں الفت نے عملِ دل لئے پیرا
اچھ سے عشقِ بیدار ہے نئے حور

کرتی ہے گلِ عشقِ خداوند نہیں کہتے
دلف ہے کہ تاک ہے بہت فرقے حور

اسد علی خاں قلی

غویہ اسد علی خاں نام تھا اور قلی تھیں۔ واجد علی شاہ نے انہیں آفرید اللہ میں بھگت بہادر کا خطاب دیا تھا۔ ان کے والد غلام بہادر حسین بھی شاعر تھے اور اسی تھیں کہتے تھے۔ قلی کے استاد غویہ زور تھے۔ ان کے قلم بھانجے تھے۔ بعض تاریخوں میں ہے کہ قلی واجد علی شاہ کے شاگرد تھے لیکن شاید یہ غلط ہے۔

قلی ایک گھولنی مزاج کے شاعر ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ وہ ہیں جو اس نے اپنے حور میں مرزا فتح اللہ کی تحنیف میں ایک درباری ہے جس کا نام "منظرِ عشق" ہے اور ایک منظوم "ظلمِ لطف"۔ "دوستی یہ مثنوی تھی ان کی شاعرانہ عزت و توقیر کا باعث ہے۔ اس کی زبان کی تعریف دیا مختصر جسم نے کی ہے۔ لیکن اس مثنوی پر گہکائی کرنے والوں میں جان اور مولانا عبد السلام ندوی بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ قلی نے اس مثنوی میں خوب غلطی کیا ہے معلوم کئے ہیں لیکن اس مثنوی میں صحتِ ہزارہ اور مولانا غلام علی خاں کے مثنویات میں بھلا مولانا خاں "محررِ اہلکار" اور "گلزارِ حسن" دونوں ہی کے رنگ کا کام ہے۔ ایک عجیب اس مثنوی کی یہ توجہ ہے کہ مولانا کے سب اس میں داستانِ گولی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ایک قصہ بھی لکھے دے گئے ہیں۔ اس مثنوی میں ایک طرف ہے کلید اور دوسرے طرف مثنوی صبرِ صاف ہے تو

کچھ کہ ہے ریاض میر کا مجھ
کچھ نشان ہے ہم میں مصطفیٰ کی
اشق ہے اب جہاں سے میر کی طرز
کہ ریاض اب جہاں سے اعلیٰ ہے
یا جگر اس وقت ہم بھی ہیں زمانے میں ریاض
ماتے ہیں سب ہمیں ہم مانتے ہیں میر کو

مگر ایک طرف ریاض میر کے رنگ کی ذات کرتے ہیں اور دوسری طرف مصطفیٰ کی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے یہاں میر کی تھیں وہ ریاض کا وہ نہیں تھا۔ وہ اصل وہ میر جو نالی کے دائرے میں رہے اور وہ بھی کیا جاتا ہے کہ جب تک اپنا کام اور کام نہیں لینے تھے انعامت کے لئے نہیں جیتے تھے۔ ریاض کا رنگ بھی انہیں یاد جاتا ہے لیکن انہوں نے استعمال کیا۔ وہ ان کی طرح مکمل کیلئے ہے پر کڑ کرتے رہے۔

اس زمانے کا چلن تھا کہ معاش کے مسئلے میں شعرا اور ادباء کی قربت حاصل کرتے اور ان سے وابستہ ہو جاتے۔ ریاض نے ریاست محمود آباد سے رابطہ قائم کر لیا اور ایک طرح سے وال ریاست محمود آباد کے قریب ہو گئے۔ ایسے وہ میر جو نالی کی دولت سے اب تک علی غرض کے دور حکومت میں رہا۔ پھر بھی جیسے لیکن زیادہ نہیں تھے۔ ریاض کو میر کا یہ علی غرض بہادرانی دکن نے وہاں آئے کی دولت دتی لیکن ریاض وہاں نہیں گئے۔ میر اب بھی پڑا تھا لیکن ہاتھ تھے لیکن ان سے بھی واقعی قائم نہیں کی۔ اہل محمود آباد کی ریاست سے ان کی وابستگی بہت بڑھ رہی۔

ریاض نے ان کا شاعری شعور میں لیکن ان کے زمانے "توسیر اور گلزار" بھی ہیں۔ انہوں نے "ریاض اور نیا" "نقد معرکہ" "غیر آباد" سے ۱۹۱۵ء "ریاض اور نیا" "گورکھ" سے شائع کرنے لگے انہیں گو کچھ سے بڑی بہت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد گو کچھ دہلی میں سرکاری ملازم تھے وہ ان کی بی بی تھیں۔ وہاں گورکھ دہلی میں ریاض پائس سران سے وابستہ ہوئے۔ "دہلی گو کچھ دہلی میں" ان کے مسئلے میں "ادبی میر کے قابل ذکر ہیں۔ ایک تو "میر و حق" کا سرکہ اور دوسرا میر تقی میر کے اخبار "دہلی ہفتہ" کے ایڈیٹر سے ان کی ہفتک۔ لیکن ریاض بہت سخیل اور ان کے یہاں لیکن صحیفے نہیں پڑھتے۔

ریاض کا کام ان کی دماغ سے اور شاعری بہادرانی کا "ریاض و زمانہ" "غرض" میں انہوں نے ان کے اخبار کی تعداد آٹھ ہزار چھ سو کے قریب پہنچی جاتی ہے۔ محمود اور انہوں میں ہے۔ ایک شعری، چند تصانیف اور چند داستانیں بھی ان کی ہاگہا ہیں۔ بنیادی طور پر ریاض غرضی کے شاعر تھے۔ ان کی فراوانی میں انہوں نے ایک دو ایک مبالغہ کیا ہے لیکن یہ رنگ اور انہیں جو کہ انہوں نے شعرا کو پورا پورا مکمل کیلئے اور پورا دہلی میں۔ ریاض نے ان سے گریز کیا ہے۔ ان کی صورت

مصدق لکھتے ہیں۔

"تکلیف پہلی انہی کے ہاتھوں کے بکارت مرض کے کام میں لگے ہوئے ہیں ان میں اداسیت نہیں پائی جاتی اور انہوں نے انہیں نہیں مانا ہے۔ وہ ان کی وجہ بقیہ ایک یہ نہیں مانا ہے۔ یہ لیکن انہوں نے بندھا ہے انہیں ان کے یہاں ان کی اپنی ہی استعمال کی ہے۔ یہ لیکن انہوں نے مرض کو روک دیا ہے اس کے مسئلے کے متوازی سے لیکن۔ مصطفیٰ میر اور میر کا انہیں انہوں کی ہے تاکہ یہ دور اور انہیں بھی یہ انہیں میر اور انہیں میر کی امر پر ہی پر کیا جاتا ہے۔"

ریاض کا کام ناقدانہ ہے اور انہی اور میر کی اس کا خاصہ لیکن یہ بھی ایک قابل ذکر پہلو ہے کہ ریاض کی موت صحیفہ سے ہو گئی تھی۔ ان کی یہاں عقل ایک پاک جذبہ کا ہے جس میں ایک طرح کی بہادری ہے۔ ظاہر ہے یہ لیکن ان کے عام حراج سے مختلف کیفیت ہے۔ ان کے یہاں دماغی میر بھی جو ایک پانچ سو تھے وہاں وہی حصہ ہے یہاں بھی اضافہ کا خاصہ بھی انہوں سے گھر لے لیکن پانچ ہے۔ ایسا خاصہ یہ ہے کہ ریاض مقصد اور اس کے ذمہ قابل ہیں۔ انہیں امر پر ہی رہا لیکن انہیں میر کی کیفیت سے ان کا کام ایک ہے۔ انہیں بھی ہے کہ کیا جاتا ہے کہ ریاض اپنے طرز کے سید میں اور انہیں۔

غرضات کے مسئلے میں بھی ان کا سوا نہ تھا اور انہیں جم سے کیا جاتا ہے لیکن ان کے غرضات کے اشعار حاد کی اور ان کی کیفیت انہیں میں نہیں کرتے۔ حاد کے یہاں عقل میں جو عقل ہے وہ ریاض کے یہاں نہیں ہے۔ پھر میں غرضاتی رنگ پڑا ہوا ہے۔ ایسا اشعار ان کا عقل اور اور انہیں سے ہے وہ بھی حاد کے یہاں ایک دوسری انداز سے سامنے آتے ہیں انہیں غرضات کے پہلو میں جو سرکاری کا کیف ہے وہ ریاض کے یہاں معدوم ہے۔ کہ سب سے انہیں جم اور ان کے ذکر سے انہیں ایک ریاض اور انہیں حاد کا کیف خصوصیت کیا جاتا ہے۔

ریاض کے یہاں جو کیف ہے وہ یہ ہے۔ جس زمانے میں انہیں اشعار تخلیق کر رہے تھے اور انہیں کی سب تک پہنچ سکتے تھے لیکن انہیں جو انہیں کی حاد ہے۔

غرضات سے ریاض کا عقلی حاد سے پہلی ہے اس لئے کہ وہ بھی جا بجا ہے بہادری سے انہیں حاد تھے۔ انہیں انہوں نے حاد کے حاد ہے۔ انہیں انہیں حاد کے حاد ہے۔ انہیں انہیں حاد کے حاد ہے۔

لے آغوش میں غم ہے ان کے اٹھنے ہر جگہ

جوانی گور میں اپنی کھائی ہے لیکن کو

تجھتا نہیں پہچانے سے عالم اہلدار کا
انگل کی تہ سے دیکھو نمودار کیا بنا
ار سے چھ اٹھے ات قہی کیا کہے تو
کیا شب بھل کسی کا کوئی ارواں لا
کوئی جاتا ہو مجھ سے پیچھے کہیں
مگر میں اس کو اٹھا لاتے ہیں ہم
آزی چل کر ہم لے گی
وہ چیز جو اچھی اچھی ہے

یہ ریاض اس سب سے پہلے آئے کہ یہ شرف دار کا ہے۔ لیکن شریات کے شعراء کا نظریہ:

اچھی پانی کی شراب پانی
بھری پانی شراب پانی
پانی ہم نے شراب پانی
اچھی قہی حق آپ پانی

مست ہوں رو عالم اہلدار
دا یا دب آداب پانی

قہ کے بعد اب یہ ہے حلی
بھلے سے کبھی شراب پانی

دلی کی نہیں ریاض اب عزم
جب ہاتھ ہے صاحب پانی

ایک دن تو شراب میں آہ لے جاں طہر
یاد کے قرآن مگر ہم نے جسے بھلا تو اب

تا صبح نیند سے رہی ہو گئی کی راحت
بہس کہیں یہ کالی گھٹائی کلام مات

یہ بلا میرے سر چھٹی ہی نہیں
میں نے کچھ گھڑے کی لپا ہی نہیں

یاد ازم و جام جانی ہے
میں کہاں سے کا دن سرور کہیں

ریاض کے یہاں حسن کا المیہ ایک خاص طریقے سے جہاں جس شہوٹی بھی ہے اور جتن بھی اور جس کی کھٹ
بھی رنگوں کا قوت ہے اور۔۔۔ ان کے یہاں تاریخ کے رنگ کی تلاش کی جاسکتی ہے لیکن ان کی شاعری میں جو اثرات ہیں وہ
اس کی کسی کیفیت کا کچھ نہیں دیتا ہر حال کا حصہ ہے۔ ان کی گلوں میں مسائل سے آنکھیں اٹھانے کا انداز ملتا ہے لیکن اور
اس لحاظ سے بھی ہر اہل فانی احساسات سے روشنی قرار دے۔ کچھ میں ان کی شاعری ہر طرح قابل ملاحظہ رہی ہوتی
ہے۔ واضح یہ کہ ریاض کا کلام "ریاض و مضمون" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ریاض کو اب سے جامع کلیات کہتے ہیں لیکن
یہ حقیقت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس شاعر میں شاعر کا سارا کام نہیں ملتا۔ خصوصاً آخری دور کا کام اس میں شامل نہیں ہو سکا
ہے۔ کئی چیزیں اب بھی ان کی فکر میں رہ رہی ہیں۔ ریاض کا انتقال ۱۹۳۷ء میں پیشے سے سارا اور ان کی تہ فہم ان کے
خاندانی قبرستان خیر آباد میں ہوئی۔

مظفر خیر آبادی

میر محمد اختر حسین، ۲۵ مئی ۱۹۰۷ء کو مظفر خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ انھیں اعتبار الملک، اعتبار الملک، اعتبار الملک کا خطاب ملا۔
قد۔ یہ میر کے شاگرد تھے۔ ایک مضمون ان کے صاحبزادے جے جے اختر حسین نے لکھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میر کا شعر اور
ہونا چاہیے۔

مظفر خیر آبادی اس دہائی میں پیدا ہوئے تھے کہ ان کی والدہ ان کی شاعری
کی کئی اصناف سے بہرہ ور تھیں۔ اس لئے کہ انھوں نے کام کرنے سے پہلے ہی دیکھا تھا۔ اور اصل میں ان کی والدہ کا لفظ "خیر آبادی"
کی بنیاد تھی۔ اور اس اصطلاح میں ان کی قرآنی کی باتیں۔ کما کر ہے۔ چلی خاندان کاظمی۔ یہ مظفر خیر آبادی کی والدہ ہیں۔
سہ ماہہ تھیں۔ والدہ لفظ "خیر آبادی" کا نام تو مرزا غالب سے لیا۔ اس کا کیا جاتا ہے کہ خیر آبادی نے ان کے والد کی کام
کے سلسلے میں کہ مظفر خیر آبادی کا نام ہم ہم گھنٹی دے گا۔ سے مختلف ہے۔ میر ان کی شاعری کی کلیات کے
والی اشعار بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے اور جو ان کی کی علامت نہیں ہے۔ مگر بھی کہیں کہیں جرات کا انداز دکھ

جاتا ہے، لیکن قدرے اعتیاد سے۔

راہنہ قیر آبادی تو قمریات کے مشہور شاعر تھے۔ مضر بھی اس طرف، بلکہ لیکن ان کے یہاں رنگ اور سستی نہیں، مگر اعداد و رنگ بھی نہیں۔

حسن کا کردار کی طرح ان کے یہاں لہجہ کا بھی ہوتا ہے جس میں اندر خالی صوفی کا انداز لگایا ہے۔

مضر بحر آبادی کے کام میں قصوں بھی ایک لہجہ میں لکھے گئے ہیں۔ یہ تو جو سلسلہ صحیفہ تک پہنچا ہے جس کے کی شاعر و حصار کام کرتے تھے۔ اس سلسلے سے مضر بھی اس رنگ کا بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ماضی و ادب بھی شاہ سے ان کی در حالی نسبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قصوں ان کے کام کا بھی ایک حصہ ہے۔ انکی تمام باتوں کے بار جو پر نہیں کیا جاسکتا کہ مضر کے یہاں قدیم لکھنوی رنگ بھی ہے لیکن ان کے یہاں اپنے انداز کی تعداد بہت کم ہے۔

ایک خاص چیز جو مضر کی شاعری میں نمایاں ہے وہ یہ بھی ہے ان کا قصہ ہے۔ بدلتی کیفیت سے ان کا کام درجہ بالا نظر آتا ہے۔ لہذا ان کا روشنی نگاہ ٹھیک ٹھیک ہے۔ انہوں نے بعد وہاں کے بعض توجہ وار بھی اشعار تصنیف کئے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعد وصالی ماسٹر کی کارفرمائی ان کی شاعری کو ایک اعتبار بخشتی ہے۔ جس کی وجہ سے مضر آج بھی ایک اہم شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے چند اشعار بھی خدمت میں:

لڑائی ہے تو اچھا رات بھر بونگی بھر کرلو

ہم لپکا ملہ اور کرلیں تم لپکا ملہ اور کرلو

اور کی ماضی حصار نہیں

دیکھ لیتے ہیں دیکھ بھال کا کیا

مضر اس نے سوال اعلیٰ ہے

حسن ادا سے کہا خدا نہ کرے

تھکے میں بی بی کے سے دل تو چپ رہتا ہوا

بات جب لگی تو سوتی کہ خدا کہتا ہوا

ساقی کی صحبت میں دل صاف ہوا ادا

جب سر کا ہنگامہ میں شیشہ نظر آتا ہے

نہ وہ مردی نہ شاپ وہ نہ وقت وہ نہ زمانہ نہ

اچھ میری دھاکے غرض تیری مجھے ان کی چٹا کاٹا نہ

مرزا محمد خاں برق

(۱۸۵۷ء۔)

ان کا پیدائش مرزا محمد خاں قنداور برق تھیں کرتے تھے۔ والد کا نام کاظم علی خاں قنداور برق تھا والدہ رقی الملک گیلات تھیں۔ یہ خطاب تھا جو انکی تواب احمد علی شاہ کی سرکار سے ملا تھا۔ برق خواب کے مصنف خاص تھے اور استاد بھی۔ ان کا انتقال ۱۸۵۷ء میں بنارس میں ہوا۔

برق اپنے وقت کی بے حد اہم شخصیت رہے ہوں گے اس لئے کہ ان کے شاگردوں میں جلال اور عمر بھی تھے۔ حسن کا کردار کی آواز اشک بھی برق سے ملتا دیکھ لیتے تھے۔

برق کی شاعری یا ان کی شاعری ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پاک اور غوث سے انکی طرح بحث تھی۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے اور ایک شعر و شاعری بھی انکی تصنیف کے حال دارم قصیدہ کا تھا۔ اس میں بے اندازہ نظم پایا جاتا ہے۔

دیوان میں غزلیں بھی ہیں اور دوسری نظمیں بھی۔ انہوں نے جامعہ سے تاج کی بی بی کی ہے جن کے یہ شاگرد تھے۔ ان کے یہاں لکھنوی طرز کے اشعار بھی ملتے ہیں اور خوب خوب ملتے ہیں۔ نسواری حسن پر یہ انداز خاص تھا۔

دیکھتے تھے۔ حالت لکھی نہ لگاؤ تو لیکن زبان پاک صاف تھی۔

کہا جاسکتا ہے کہ برق کی شاعری تکلف و تزیین سے عاری تھی۔ چند اشعار اہل میں نقل کر رہے ہیں، جن سے

کلام کے رنگ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

بکلائی رنگ سرخ نے دلی بہار حسن

مربان زلف کا فصیح شام ہو گیا

عربی رنگ بھی دلدار اس پرستم ہے

حسن سے لعل کینا بھرے گاندہ ہو گیا

سارے عالم کو ادا ہرے جوش افک نے

بارغ عالم پر غم قریب میں پائی بھر گیا

رنگ باغی کو پہننے نے وہ چھان کر دیا

جام ہم وہ کہ سونے کا چلی بھر گیا

جھک جاتی ہے پتے میں سر اسے پتوں

تازہ ہے شجر رنج و غم کا بھی الف

دور فرقت میں زہر ہے لازم
آوی کہب بھگ دولت کرے
شب فرقت بھی گات دے یتا
کیا کریں غر اگر دلا نہ کرے

غلام امام شہید

(۱۸۷۶ء-)

غلام امام شہید کے والد کا نام مولوی شاہ غلام احمد تھا۔ قصبہ اٹکلی میں پیدا ہوئے جو تریہ ریلوے میں ہے۔ تاریخ پیدائش صحیح نہیں ہے۔ مرہٹوں اور فارسی کے ایک علم کی طبیعت سے مشہور تھے۔ انہوں نے فارسی کی تعلیم اس زمانے کے جید عالم آقا سید محمد اٹکلی ہمدانی سے حاصل کی۔ جب فارسی میں شعر کہنے لگے تو مرزا قیش کی شاعری میں آگے۔ اتحاد سے متعلق اور سید احمد سے رابطہ ہو گیا اور ان کی صحبتوں میں ان کی صلاحیتیں مزید متکمل ہونے لگیں۔

مولوی غلام امام شہید اصحابوں اور تلامذہ کی خدمت میں رہے تھے۔ خصوصاً خواب کلب علی خاں دانی راجپور، مرہٹا راجک، ڈیرا فہم حیدر آباد، سید عالم خاں دکنی سورت وغیرہ۔ حیدر آباد سے انہیں لکھنؤ لے گئے، پر ۱۳۰۳ھ میں مرہٹا علاقہ سے لے کر ان کی موت کے بعد ہی متوفی ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ مولوی غلام امام شہید رسول اللہ کے واسطے کی شخصیت سمجھ رہے تھے اور سارے درجات سے حصول کرامت اللہ کی برکتوں سے محروم کرتے تھے۔ جامعہ فارسی تھیں ہیں کہ:-

"میں کی تامل نہ اختیار اس وجہ پر سمجھتی تھی کہ گفت شریف سمجھنے اور پڑھنے کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ اسی سبب سے اس کی اور عاقبت رسول کے بارگ انتخاب سے مشہور تھے۔"

غلام امام شہید کی طبیعت ایک سادگی کی تھی۔ انہوں نے میر کا وسیع مطالعہ تھا۔ خصوصاً آثار و مراد آباد، راجپور اور راجہ رام کے علاوہ دکن میں ان کے مرچ شہر سے ہوئے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں انتقال کیا۔ غلام احمد نے پیر غلام احمد کی تدفین کی۔

"دائے امام شہید شہید = ۱۳۵۳ھ بمطابق ۱۸۷۶ء"

مولوی غلام امام شہید کا ایک نظم نکالتے ہوئے ہے کہ "علی تہ شہید" کہا جاتا ہے۔ اس میں فارسی کے قصائد و خیالات وغیرہ ہیں۔ اور وہ ان کے خطوط اور مضامین میں اہم ہیں۔ ان کا قصیدہ "انکاشے بہار ہے نثر" کے نام سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا۔ ان کی دوسری کتاب "سولہ شرط شہید" (سیرت) ہے۔ یہ کتاب مسلسل لکھی رہی ہے۔

یہ شہید خود قلموں میں پیر غلام احمد کے تھے۔ اس کتاب میں غلام احمد وغیرہ ہیں۔ بعض مقامات پر سادہ سے متعلق ہے۔ لیکن سادہ عبارت بھی ہے۔

لیکن یہ بات بہت اہم ہے کہ شہید قلم چابی اور عبارت آرائی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ اپنے اسلوب کی نوآوری و تازگی پر توجہ دیتے رہے تھے۔ انہوں نے ایک مضمون "مواضع تالیف" کے آخری نظم کا جو بہت مشہور ہوا تھا۔ آج کے لئے بھی نثر ہے۔ اگر ان کے مضامین کا جائزہ لیا جائے تو ان کی ایک فن طبیعت متکمل ہوئی ہے۔ مضمون نگاری کا کوئی خاص خاکہ کم ہی ان کے ذہن میں ضرور رہا لیکن آج جس طرح مضمون نگاری کی طبیعت سے ان کی اہمیت انہیں پر گزرتی ہے۔ وہ اپنی اس طرح کی ان کے مضامین کا خاصہ ہے۔ حالانکہ یہ بھی سمجھنا ہے کہ ان سے پہلے بعضوں نے مضامین لکھے تھے۔ جس سے ان کی اہمیت ہوئی۔

غلام امام شہید کو خط و کتابت سے بھی بڑی دلچسپی تھی چنانچہ وہ اپنی نثر میں اس کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ ہر حال بعض اوقات کہ ان کی نثر نگاری اپنے وقت کی چیز ہے۔ جسے اندازہ نثر نگار کی ادبیت میں ایک خاص جگہ حاصل ہے۔

علی اوسط رشک

(۱۸۷۷ء-)

رشک کا پورا نام اور لقب والا جاوید علی اوسط رشک ہے۔ ان کے والد میر علی خان کاوش بخش آباد تھا۔ یہ مضمون نہیں کہ رشک کہاں پیدا ہوئے لیکن یہ یقین ہے کہ جاسکا ہے کہ ان کی تربیت کنوئیں میں ہوئی۔ ان کے والد کی ہم آہنگی تھی۔ ایسے میں ان کے والد اگر ایسے ہی رنگ۔ بے ہوش گئے۔ رشک کو بھی ایک ایسی صحبت نصیب رہی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان صاف تھری نثر کی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تاریخ کا کوئی بدلہ نہ تھا۔ ان کے کام کے رنگ و آہنگ کوئی کہ انہیں تاریخ کا انہیں بھی کہا جائے گا کہ وہ یہ کہ جاسکا ہے کہ رشک کے شاگردوں میں ان کا بڑا اہلی استاد تھا اور اس خیرین تاریخ اصحاب کو ان کی طرف متوجہ تھے رشک نے بھی ایک صورت اپنائی تھی۔ گویا یہ براعت ہمارے اپنے استاد کا نسخہ کرتے رہتے۔

رشک کے تین دیوان ہیں۔ پہلا دیوان "اعظم سادک" دوسرا "اعظم مرہٹا" اور تیسرا دیوان بھی تمام کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔ شاید پندرہ بھی ہو گیا۔ لیکن ان کے صدر جی لکھتے ہیں کہ:-

"مولوی گلبرہ لکھتے ہیں کہ ایک ہمارا دیوان اور تھا جو فارسی میں تھا۔ اس کے لئے یہ کہاجاتا ہے کہ یہ ان دونوں سے اچھا ہے۔ غرض شہسکی سے دوران مطالعہ میں قائم اسلوب پر بڑا بے گلی دیوان جواب تک تاہم سمجھا جاتا تھا کہ یہ دیوان یہ مصنف کا اپنا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کو

کلام ان کے استاد کے حسبِ پند و اثر سے دیکھتے ایک غزل میں کس طرح عاشق و معشوق کے راجح و خدخال نمایاں ہوئے ہیں اور تہذیبی و ادبی ہے جو تاریخ کا ہے:

مرد بھیر کے "و" کہتے ہیں نہیں مان جائے
اس شرم اس لگا کے قربان جائے
یوں ٹانگ میں ملا کے نہ لڑائی جائے
نہ کہ تھوک دیکھتے نہیں مان جائے
آئینہ دیکھ لیجے جو میری نگاہ سے
میری طرف سے آپ بھی قربان جائے
یہ کہہ کے میرے سامنے ملا رقیب کو
وہ سے کہی کی جان نہ بچان جائے
میرے دفا ہوں اور وفادار آپ جہا
کیا حق کہا ہے آپ کے قربان جائے
آگے ہے مگر رقیب کا میں سمجھتا ہوں چکا
اب آپ کا خدا ہے تھپان جائے
اللہ بنا کے دوست کو دشمن بنا لیا
نادر تھپان چھل کے قربان جائے

کچھ کہیں بخیر و بد بھلائی اللہ اس میں اس طرح شعر کہتے ہیں کہ مصوبت و مخرجاتی ہے:

شیر مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا
تم میں ہے درد ہے تھے یہ کس کا خوار تھا

یہاں دوسرا مصرع جس طرح سامنے آیا ہے وہ مطلب ہے۔ کہیں کہیں عمار کے کہہ رہے تھے کی وہی صحت لگی ہے جو تاریخ کا طرچہ ہے:

دل چھالے مگی خدوہ نظر دیکھ لیا
ہم نہ کہتے تھے کہ ان چور نے گھر دیکھ لیا
ای طرح کا ایک اور قصہ دیکھتے

دور غزل تھا سر کو شہر شہر رکھ دیا
تھا کو کیا کریں ہم بدو گدگد کا آثار آئے

کچھ ہی طور پر بخیر و بد بھلائی اللہ اس میں اس طرح عاشق و معشوق کے راجح و خدخال نمایاں ہوئے ہیں اور تہذیبی و ادبی ہے جو تاریخ کا ہے:

خود بھلائی کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا ان کا چھوٹا بیٹا کاہنہ بھلائی اللہ کی میں رہیں ہوا۔

شوق نیوی

(۱۸۶۰ء - ۱۹۰۳ء)

شوق نیوی علامہ شوق نیوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۶۰ء بتائی جاتی ہے۔ وفات ۱۹۰۳ء کو ہوئی۔ ان کی پیدائش صابا پور ضلع چنڈیاں ضلع کے جہاں ہوئی۔ ان کا نام بھگوان رام دیکھا گیا۔ کہیں کہیں ان کو "دھرم پور" بھی لکھا جاتا ہے۔ نیوی کی اصلیت ایک دہلی میں رہا تھا۔

شوق است مخلص طبع حسن ہم
در قریہ افکار نہیں است مقام
شہر از پے کیم ، در افکار ہمام
جہان تو کرم طبع اسلام

ان کا اصل لقب حضرت ابو کرم صوفی تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ان کے والد نے ان کی تعلیم میں دینی و دنیاوی دونوں کا اہتمام کیا۔ ان کے والد اس میں عربی اور فارسی کی کچھ اہم کتابیں پڑھا دی گئیں۔ بچپن میں ان دونوں زبانوں پر خاص قدرت حاصل ہو گئی۔ لیکن پندرہ کے بعد علم کی چھٹی انہیں غازی پور لے آئے جہاں انہوں نے مولانا صاحب خان صاحب غازی پور سے فقہ و حدیث کا درس لیا۔ وہ وہاں نے اپنی ابتدائی زندگی گزار کر غازی پور کے جلسے میں اس طرح اظہار کیا ہے:-

"مولانا غازی میں خدا نے عبادت الہی مولانا جلی تھی کہ جب میں گھٹاں زور پڑھا تو
فی البدیہہ شعر مولانا کر لیتا تھا۔ ان میں لفظی تو مولانا میں کی گئی تھی کہ میں نے غازی پور کو
تہذیب کر لیا۔"

والد مولانا نے بیت بازی کے لئے بہتر تہذیب مولانا لگی اساتذہ کے بہت سے مشور
تبع کر دئے تھے۔ جن کے آخر میں پائے پہلے تھے اور وہ اشعار تھے یا دیا دئے تھے۔
میں جب کسی برکت کے ساتھ پھر تھی میں جاتا اور وہاں کے لائے بیت بازی کے لئے پہنچتے

جس کو دیکھ کر ہم روئے خوب اچھی یہادوں کو
بکھر کے داغ یاد آئے جو دیکھا لالہ زادوں کو

کچھ کہ نہیں سن کے جسے تم ہوئے بے یمن
تھا سزا کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صبرا کا

دل شوق صیباں سے لگا نہیں اچھا
ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا

دیکھ کر غلہ جی بھر آیا شوق
یار آئی کسی کے گھر کی طرح

شکایت کیجئے کس کی جائیں نام ہم کس کا
کریں فریاد کس کی جب اسی پر فیصلہ ٹھہرے

دامن کبھی بھلتے ہیں کبھی ملتے ہیں وہ ہاتھ
اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

ان کی شاعری کے باب میں ڈاکٹر حفیظ الرحمن لکھتے ہیں:-

"ان کے یہاں وجود شعور و حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔ اگرچہ اصطلاح کے اعتبار سے الگ
الگ ہیں کیونکہ سند کا ایک قطرہ ہو یا ایک معمولی گلاس ان میں سے کسی کی کوئی الگ حیثیت
نہیں ہوتی بلکہ دونوں اسی میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کائنات کا خدا سے کوئی الگ وجود
نہیں۔ چاہے آپ اس کا نام وحدۃ الوجود رکھیں یا وحدۃ الوجود۔ علامہ فرماتے ہیں:-

ہو گیا تم جو کوئی داریائے وحدت میں چڑا

بکر ہے پاؤں میں مٹا ہے پتہ سب گم کا

ایک ہی ہیں باب وحدت میں وجود و شعور

ہے یہی مسلک جناب شیخ حق آباد کا" ۵

شرق نیوی نے چارے عشقیاں تحقیق کی ہیں۔ "غیر راز"، "سوز و گداز"، "درد و جدائی"، "صبح و صبح" اور "شام و شام"۔

ان میں سے "سوز و گداز" اور "غیر راز" اعلیٰ طرزِ شاعرانہ ہیں۔ "غیر راز" میں بے غشقی "سوز و گداز" علامہ کی صحت سے مشہور

مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا قصہ اصلی اور تاریخی ہے جس میں محمد حسن اور شام سند کے عشق کی کہانی رقم کی گئی ہے۔
عاشق یعنی محمد حسن نے اپنے حالات بذات خود لکھے جس کو تاہم عظیم آبادی نے اپنے خط میں نقل کر کے شہزادہ نواب مرزا
جہاں بخش جہاں دار شاہ بہادر کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ اس واقعہ کو تاریخی حقیقت کی بنا پر ہی مصر و بلوی نے کچھ روایات
کے اشتقاقیت کے ساتھ اپنی مشہوری "عشق و عشق" میں رقم کیا اور سر داستان میں مرقی لکھی ہے:-

"آج قصہ چاکو کو در عہد محمد شاہ در عظیم آباد و رور و وضع و ظرف ظہور دیکھو۔"

عشق ہاشر علی خاں باقر گھنوی نے اس کی تائید کی ہے۔ قصہ کا قوام اس بات ہے کہ:-

"محمد حسن ایک خواہشور تہ لڑکا تھا جو چاند سنی کے محلہ جھولی میں رہتا تھا۔

اور شام سند ایک نہایت خوب و اور پنی پیکر لڑکی تھی جو چاند سنی میں چنک کے قریب محلہ سند

یا راز کی ہاشمہ تھی۔ یہ محلہ مہاجوں سے آباد تھا اور شام سند اسی محلہ کے ایک مہاجن کی لڑکی

تھی۔ دونوں کا واقعہ تھا۔ عاشق نہایت حیرت انگیز ہے اور نہایت دلچسپ بھی۔ اسی بنام

علامہ نیوی نے اس واقعہ کو سوز و گداز میں نظم کیا ہے۔" ۵

یہ فیض مظہر اقبال نے اس مشہور کو مرثیہ کر کے شائع کر دیا ہے جس میں مشہور کی مختلف جہات پر تحقیق اور

تحقیق روشنی ڈالی گئی ہے۔ واقعہ کی سچائی پر جتنے بھی ثبوت پیش کئے جائیں لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایسے حقیقی

واقعہ کو مشہور کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس مشہور میں جو عجیب عقل و احساس ہیں وہ واقعہ کی صداقت کو ضرب لگاتے ہیں۔

لیکن سچائی میں وہ ان کا عنصر نہ ہوتا پھر شک سچائی شعر نہیں بنا سکتی اس لئے اس مشہور کی اپنی ایک ہیئت ہے۔

شوق کی دوسری مشہور یاں بھی اہم ہیں اور مشہور نگاری سے ان کی دلچسپی ظاہر کرتی ہیں۔

شوق نیوی نے قطعاً اور با مہماں بھی لکھی ہیں۔ شعر و شاعری اور الفاظ کے سلیسے میں جلال سے ان کا شعر کر

مشہور ہے۔ ان امور کی تفصیل طویل بحث ہے اس لئے میں نہیں قلم کرتا ہوں، اس اصرار کے ساتھ کہ شوق نیوی کو

بہشت شاعر و جگہ بھی تک نہیں مل سکی جو ملنی چاہئے تھی۔ ویسے اپنی اور قریبی امور میں ان سے استفادہ کرنے والوں

میں تو مولانا ابوالکلام آزاد تک تھے۔

سرور جہان آبادی

(۱۸۷۰ء-۱۹۱۰ء)

پلوت درگاہاے سرور جہان آبادی اردو کے اولین نظم گو شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی تہذیب و انکاد

۵ "نور" علامہ شرق نیوی نے "حیات و بعدیات" "اکثر متفق الرحمن" ۱۹۷۰ء میں ۱۳۳

وہ داغ ہوں کہ لالہ برقی نکا ہوں میں
وہ اٹک لوں ہوں میں کہ ہوں طوقاں طراز عشق
پردانہ ازل ہوں میں اسے شمع انجمن
مجھ سے نہ پوچھ قصہ سوز و گداز عشق
نہ اور محو حسن خیر فزا مدام
میں اور ایک شیوہ بخیز نیاز عشق
ہر آنید میں نکس ہے اس کے جمال کا
اہل نظر ہے شرک مگر اقتیاز عشق
وہ روشاں سوز محبت ہوں میں سرور
پہلو میں داغ عشق ہوں دل میں گداز عشق

نسیم قریشی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

”سرور کی شاعری اس دور کا آئینہ ہے جب شعر و ادب کی پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں اور فکر و خیال کی نئی طرحیں پڑ رہی تھیں۔ اس عید کی دور میں بہت سے شاعر اور ادیب تصعب اور ناروا آزادی عشق کے سبب حقیقی جادے سے بہت دور چلائے۔ سرور کا کمال یہ ہے کہ وہ وہ طریقہ قدیم سے لپٹے رہے اور نہ جدید کی رو میں خس و خاشاک بن کر رہے۔ سرور سچے وطن پرست تھے، ان کے دل میں ہمہ گیر محبت کی حقیقی تڑپ تھی اور ان کے مزاج میں صحت و سرشاری کی دلیہانہ کیفیت تھی۔ ان کے کلام میں اردو اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اس لئے ان کا کلام جذبات نگاری کا بہت جانتا و مرتفع ہے۔ ان کی ایک اہم خصوصیت حب الوطنی ہے۔ ان کی وطن پرستی اعلیٰ انسانی تصور کی ترجمان ہے اور اس میں شاعری نگاہ، لگائی فکر کی کوئی محفہ دیتے نہیں۔ ان کی قوم پرستانہ انگلیں بڑے مہر کی ہیں اور سب حب وطن کے سچے جوش اور اعلیٰ فضیلت سے ہمہ روز ہیں۔ سرور کی تاریخ اور زندگی نظمیں شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر اس لحاظ سے بڑی قدر عزت کی مستحق ہیں کہ انہوں نے چندوں کے تاریخی واقعات اور مذہبی تصورات کو خنثی کر کے اعلیٰ کمال کے ساتھ چاند شعر پینایا۔“

سرور نے منظر کشی میں بھی ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے۔ ان کے خیالات بڑے سیر معلوم ہوتے ہیں فطرت سے متعلق ان کی بعض نظمیں حسن ازل کے مظاہر سے ہمہ روز ہیں۔ مگر بڑی کے درمیان شاعری کے اثرات اس

باب میں نمایاں نظر آتے ہیں لیکن یہاں بھی ہندی اور سندھستانی ایک متضاد نہیں کیا جا سکتا۔ موسم پر بار، جسم حرکتی آمد و خبر کے ایسے مرتبے ہیں جو پرکشش معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی مذہبی شاعری سندھ و اساطیر سے بھری پڑی ہے۔ دیوی و دیوتاؤں اور تاروں، مذہبی مقامات اس کی شاعری کا اہم ہوتا ہے جس لہذا اس باب میں اور شاعری کا دامن وسیع تر ہو گیا ہے۔ لیکن سے متعلق ان کی غزلیں نظم کے چھ اشعار نگار ہا اول:

شہ سہووت وہ عجب تھی وہ عجب شہ گمن
کہ جب آکاش سے اتر آقا ترا سکھائیں
نظر آئی تری صورت میں عجب حسن کی جوت
تو نے دیوی ہمیں اپنے پر دکھائے روشن
ایک پکا چوند کا عالم ہم نکادہ تھا
گورا گورا تن نازک تھا سراپا کنڈیاں
تھی چمک خوب ترے چاند سے دھاروں کی
کسی صندوق میں تھے یا تھی کے دے وہ روشن
ترجمی بالی کما میں تھیں کڑی دھڑوں بھری
لے پھرتے کبھی دن میں چٹنیں رام و بھمن

انہیں مرتبہ سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے شخصی مرتبے ایک خاص کیفیت رکھتے ہیں۔ ان میں سچے جذبات کی ترجمانی ہے۔ ایسے شخصی مرتبوں میں لالہ لاجپت رائے کا مرتبہ، سوامی رام تیرتھ، پنڈت لکھن رام آریہ اور داغ سے متعلق مرتبے اہمیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح خواب، من، الملک، کبھی ایک مرتبے میں مزاج تصدیق عین کیا گیا ہے۔ گویا اس باب میں بھی انہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کہہ سکتے ہیں کہ رنگا سہائے سرور جہاں آپاری اردو کے ایک قابل لحاظ نظم گو شعرا میں ایک ہیں جن کی اردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص جگہ ہے۔

علی نقی صفی لکھنوی

(۱۸۶۴ء۔ ۱۹۵۰ء)

علی نقی نام اور صفی تخلص تھا۔ لیس اعتبار سے زیدی سید تھے۔ سرور علی کا وطن غزنی تھا، جن میں کچھ سید نور الدین شاہ اٹلی کے زمانے میں دہلی آ گئے اور یہی وطن غزنی ہوا۔ صفی کے پرانا سید امسان علی نے فیض آباد میں سکونت اختیار کی۔ ان کے صاحبزادے سید سلطان حسین مہر قصیر الدین حیدر شاہ لکھنؤ آ گئے۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی

جلیل ماسک پوری

(۱۸۶۷ء - ۱۹۳۶ء)

ان کا نام جلیل حسن تھا اور جھلس جلیل کہلاتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔ یہ جانتا بھی تھے۔ انہوں نے امیر کے ساتھ حیدر آباد کا سفر کیا۔ پھر وہیں رہ گئے۔ حیدر آباد میں انہیں اتحاد المسلمان ہونے کا شرف حاصل ہوا اور نصاحت جنگ کے خطاب سے نوازے گئے۔ ان سے اصلاح لینے والوں میں میر محبوب علی خاص تھے، جنہوں نے جلیل القدر کے خطاب سے نوازا تھا۔ اگر یہ کیا جائے کہ جلیل امیر خاں کے سچے جانشین تھے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ ان کے کام میں نعت و منقبت کا ایک خاص درجہ ہے، جس پر امیر کا رنگ نمایاں ہے۔ معرفت سے ان کا کام خالی نہیں۔ لیکن اس زمانے میں جو گھنٹہ کا حراج تھا خصوصاً عورتوں کے سلسلے میں وہ ان کے یہاں بھی ملتا ہے، یعنی رکی مضامین۔

بعضوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ جلیل کی زبان تاریخ کے مقابلے میں زیادہ صاف اور رواں ہے۔ لیکن یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔

جلیل خراگین کے حقیقی جذبات کی ترجمانی تو نہیں کرتے لیکن ان کے دماغ اول میں بہت سادے ایسے اشعار ہیں جن میں خواتین کی آراکشی کے سامان کے نام درج ہیں پھر بھی مثالی حسن سامنے نہیں آتا اور وہ جذبات جنہیں ہم داخلی کہہ سکتے ہیں وہ کہیں نہیں ملتے۔ کیا کیا جانے کہ معرفت کے ہفت کے بعد بھی گھنٹی شاعری میں عورتوں کا ہنس جس طرح فٹن کیا گیا ہے اسے ہر حال مغیبت ہی کہہ سکتے ہیں۔ جلیل امیر خاں جیسے خجود و شاعر کے حلقہ گوش ہونے کے باوجود کھنکھیلے سے رکھتے نہیں اور اسی غارتی احوال میں رنگ جاتے ہیں جسے عام طور سے گھنٹی مراح کہہ جاتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

انہیں تن کے بیٹے کا عالم دکھا
مجھے درد سے ان کی کمر دکھ لیتا

کھینچ کر پیٹو میں ہوس لے لیا
ان کا وعدہ میں نے خود پورا کیا

ایک ہوس پہ بھی پوچھا نہ کسی نے دل کو
آج پوچھا ہے بہت عشق کے بازار کا رنگ

پوچھا کسی نے مجھ کو تو اس شوق نے کیا

شاگرد تھے لیکن انہوں نے تسبیح میں ایسا وقت ضائع نہیں کیا۔ دراصل وہ سمجھتے تھے کہ تسبیح سے ان کی شاعری جلا نہیں چسکتی۔ اس لئے وہ آخری درجہ لائے کی سعی کرتے رہے۔ ان کے یہاں عاشقانہ ذرا ہے ایک خاص شمع کے ہیں جن میں ایک طرح کی قرینائی ملتی ہے۔ معاملہ بندی ان کے یہاں ملتی ہے لیکن ایک خاص سے۔ مضمون آخری پر خاصا زور صرف کرتے نظر آتے ہیں کہیں کہیں مشکل زمیوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں کثرت اشعار تخلیق کئے ہیں۔ سائل تقریباً ساٹھ سال شاعری کرتے رہے۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ بلا سائل ایک لاکھ سے کم ان کا سرمایہ نہ ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کاروبار ان کی مشغولی "نور علی لورڈ" ہے۔ اس مشغولی میں زور جہاں پیغمبر کی حیثیت سے مشافہت مکتوم ہوئی ہے۔ دوسرے مسائل بھی در آئے ہیں۔ پھر بھی یہ مشغولی ناقص رہی۔ سائل کے کچھ منتخب اشعار ذیل میں درج کر رہا ہوں:

دور ہے جفا کیا ہے وفا کیا
جو دل آئی تو پھر اچھا رہا کیا

مطمئن نہیں کسی سے کہانی مری سن لی
بھاتا ہی نہیں اب انہیں افسانہ کسی کا

بیش خون دل روتا ہوں میں لیکن سلیقے سے
نہ خطرہ آتش پہ ہے نہ وہبہ جیب و دامن پہ

ایک گھنٹن میں ہے اک خانہ میاد میں قید
گل و جلال کو میر نہیں سنبھالی کبھی

بات کر ہو کہیں خود سے۔ بہتر ہو پری سے
سیرت اگر اچھی ہو تو اچھے ہو سبھی سے

۱۲ جو دشمن ارباب اقا۔ عاشق کس
خط میں پورا ترا القاب رقم ہے تو سہی

آسمان نظر آئے ہر اک مشکل دنیا
سہرا چھو اگر جسے حیرت کھو کا

ان شاعر کو اور بھلی سے معرفت سے متعلق اشعار کو پڑھتے تو اعزاز و عوگا کو دوطرح کے مضامین یعنی بلند و پست کسی طرح ان کے یہاں بھی پار پاتے ہیں۔ معرفت کے چاشعار بھی دیکھتے:

پروہ وہ کیوں اٹھاتے نہیں کیوں ضرور تھا
آنکھوں میں تھا جو نور یہ کس کا تصور تھا

جلوہ یار سے ہر آنکھ کو روشن دیکھا
لاکھ آئینوں میں اک صورت نورانی ہے

علم ہوش کو اپنے ذرا سنبھالے ہوئے
کلام کس سے یہ جالائے طور ہے

کیا قیامت ہے کہ مشتاق بنا کر مجھ کو
اس نے دہار قیامت پہ اٹھا دکھا ہے

اسے مزاج کی طرحی کے علاوہ کیا کہہ سکتے ہیں۔

جیلہ خدا بخش

(۱۸۶۸ء۔)

ان کے ۲۷ اور کام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کا اصل نام رفیع خاتون تھا۔ جیلہ شخص اختیار کیا۔ کبھی کبھی راضیہ بھی لکھی کے ہی طور پر استعمال کرتی تھیں۔ چونکہ محترمہ ایک صاحب دیوان شاعرہ ہیں اللہ العالیہ پر قدر سے تفصیل سے گفتگو ہوئی چاہیے۔ حالانکہ یہاں اس کا موقع نہیں ہے اور خواص مانتے ہیں۔ پھر بھی چند بے حد اہم امور میں میں رقم کردہ ہوں۔

رفیع خاتون جیلہ خدا بخش خاں (موسیٰ خدا بخش اور بھل جیلہ لاہوری پٹنہ) کی بیوی تھیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔ ان کے والد خاں بہادر رئیس العلماء، امیر کیرا لہری تھے جن کا تعلق بنگال سے تھا۔ یہ کم عمر تھیں کہ ان کی شادی خدا بخش خاں سے ہوئی۔ ان سے ایک بیٹا اولاد ہوئی، وہ بہت بڑی والدین خدا بخش۔

ان کے چھٹے کے بارے میں کئی روایتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے چچا مرشد شاہ جمال اللہ رہے تھے، جو جنس لکھنؤ کیا کرتے تھے۔ جیلہ انہوں نے جیلہ پنا لکھنؤ رکھا لیکن کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ محترمہ مولانا مرشد علی جیلانی و بھلاوی سے وابستہ تھیں۔ لہذا وہی بھی شاعر تھے اور جمال لکھنؤ کرتے تھے۔ انہوں نے ترقیب دی کہ وہ جیلہ شخص اختیار کریں۔

جیلہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ ان کی تعلیم کو غلط فہمی لیکن شاعری کا شغف شاید انفرادی سے تھا اور ساری زندگی اس شاعری گیتی و چیں اور انہوں نے آنکھ و زبان چھوڑے۔ ان میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔ کم علمی کے باوجود کلام کا بیشتر حصہ صرف کے نکات سے ملنا نظر آتا ہے۔ عرفان و آگہی کا کلیہ نمایاں ہے اور ایسا غصہ ہوتا ہے کہ ان کے مرشد علی جیلانی کے ان پر گہرے اثرات رہے تھے۔ یہ بھی توجہ کی بات ہے کہ ہندوستان کے محققین ان سے غافل رہے۔ خود بہار کے اہم محققین والوں نے کوئی تفصیلی مضمون یا کتاب قلمبند نہیں کی۔ اس طرح ان کے سادہ لوح ان مغلوطات کی صورت میں خدا بخش لاہوری کی ذہنیت بنے رہے لیکن حال ہی کی بات ہے کہ لاہوری کے محققین نے ان مغلوطات پر توجہ کی اور اسے مرتب کرنے کی ذمہ داری مشہور افراد لاہور و روضہ شجر شقیہ مشہوری کو سونپی۔ طے سے کہی و یوں مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں اور ایک روپ نہیں میں ہیں۔

مجھے یہاں اس کا احساس ہوتا ہے کہ جیلہ اس طرح کی شاعری کرتی ہیں وہ معمولی درجے کی چیز نہیں بلکہ اس قدر ان کی خاصی مدد کی ہوگی۔ یہ گمان اس لئے بھی ہوتا ہے کہ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنا شعر ہی سمجھ نہیں پائیں اور اس کی تعبیرات کے لئے دوسروں سے رجوع کرتی رہی ہیں۔ پھر ایک اور بات یہ ہے کہ خدا بخش خاں خود شاعر تھے۔ ان میں شیخ کرنے کے علاوہ شعر و شاعری سے خاصی دلچسپی تھی لیکن ان کا کہیں کلام ملتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مغلوط لاہوری میں موجود ہے۔ ایسا تو نہیں کہ موصوف نے اپنا کلام بھی اپنی جیوتی ہی کے کلام میں ضم کر دیا۔ یہ بھی ایک سہ ہے کہ قاضی عبدالودود جیسے محقق نے جیلہ پر نہیں ہاتھ نہیں لکھا اور کچھ میں نہیں آتی۔ گویا ضرورت اس بات کی ہے کہ محترمہ کی شاعری کے سلسلے میں نئے محققین توجہ کریں اور قرارداد حق صورت سے آشنا کریں۔ لیکن یہ میرا یہ گمان سرسرا غلط ہو، میں اس پر اصرار نہیں کرتا۔ اس لئے کہ تحقیقی معاملات میں گہرے علم کی شایہ اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔

کلام کے سرسری مطالعے سے ابھی جیلہ کے شعور اور ایک کا تحریری اعزاز ہوا جاتا ہے۔ اکثر اشعار وہاں اور گہری معنویت سے ہمہ دورہ نظر آتے ہیں، جن میں اجدادی پہلو بے حد نمایاں ہے۔ میں چند شعروں میں پیش کر رہا ہوں۔

چشمہ فیض بھائی وہ سمجھ لے اس کو

اس گنہ گار جیلہ کا بڑا دانا پاسے

یکائی رب کی اور عبور رسول پاک

تخت دکھا رہے ہیں الف لام میم کا

جا ہے نور کا جامہ سیاہی، دسب رحمت نے

اپ اس پر آیت قلمبر کا رخشا لگایا ہے

تو چرخ خاک کوئے جمال ہے یہ جیلہ تیرا کمال ہے
نہ ہو کہیں ۱۵ ترا مرتبہ تیرا ہر صاحب حال ہے

بچہ ہے اک مرا جو سبک در ہے آپ کا
اس پر نگاہ لطف جو بہر خدا علی

شوہر مرا ضعیف ہے مجبور ہے شہا
پرہاں نہیں ہے کوئی بھی اب اس کے حال کا

انہوں تم نے رخ نہ دکھایا کسی طرح
ارمان دید طالب دیدار سے گیا

دل کو شرار آد رسا نے جلا دیا
پہلو کو کھج فدا کی کے دیراں عادی

کون کہتا ہے کہ بھنوں دشت میں عریاں رہا
تار ہزاراں نہ تھا یہ آنسوؤں کا تار تھا

جیلہ کوہستانی سے بھی دلچسپی تھی بلکہ خدا بخش خاں صاحب نے اس کی تربیت کے لئے ایک ایسی ہی مقرر کر رکھا تھا۔ اس سلسلہ کی بھی ایک کتاب ”ستارہ جیلہ“ ہے جو خدا بخش خاں لاہوری میں موجود ہے۔ رسالہ جغرافیہ بھی ان کی ایک کتاب ہے اس کے علاوہ ایک مشہور بھی ہے جو بے حد اچھے نام ہے ”احسن المطالب“۔ یہ حضرت علی کے سلسلہ کی ہے اور مشہور چھپ چکی ہے۔ اسے بھی شائع مطبہ دی نے مرتب کیا ہے۔ جیلہ کی ولادت ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔
دعیر خاتون جیلہ کے سوانحی نسخے کے امور ”مخاندہ شاد“ از سید نعمت اللہ صلی ۱۳۲۲ھ میں موجود ہیں۔ یہ کتاب کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ دیوان جیلہ جلد ششم بھی اشاعت کے مرحلے میں ہے اس کے مرتب شائع مطبہ دی کی رائے پر اپنی منتظر مقرر کیا ہے۔

جیلہ صوم و صلوات کی پابند تصوف اور طریقت سے متاثر ایک ایسی قادراں کلام شاعرہ تھیں جن کے کلام میں حمد، ثناء، منقبت، تعصید سے رہا محیات اور مشہور کا کراں قدر سرمایہ موجود ہے۔ خصوصاً طوری حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت عبدالقادر جیلانی غوث الاعظم اور اپنے مرشد

سے بڑا تعصید کہیں کہیں تو شریعت کے حدود سے بھی تجاوز کرنے لگتی ہے۔ دیہاتیں عظیم آباد کی
اس ممتاز ترین صاحب دیوان شاعر نے اپنی خدا داد صلاحیتوں کے جو جو پر دکھائے ہیں ان کا
اعتراف لازم ہے۔

جیلہ کے آنسوؤں اور دھڑکیوں کا ایک مجموعہ موجود ہیں۔

ان دنوں میں سے ایک ”غزل دل ریش از جیلہ درویش“ اور مشہور ”حسن المطالب“

کی ٹیڈ پیٹنگ اس خاکسار نے کی ہے۔

قزلباش ثاقب

(۱۸۶۹ء تا ۱۹۳۹ء)

ان کا پورا نام مرزا کریم حسین قزلباش تھا اور ثاقب تخلص کرتے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں آخر پریش
کے ایک شہر آباد میں ہوئی۔ ان کے والد بزرگوار علی نام تھے، مرزا انظار مہدی اور آغا محمد فاکتی۔ ان کا سلسلہ نسب حاجی
علی قزلباش معروف پہلی قلی خاں شاملو سے ملتا ہے، جن کا تعلق شاہ طہماس مغوی کے دربار سے تھا۔ ان کے اجداد میں
سے ایک شخص قمارت کی غرض سے ہندوستان آئے۔ چونکہ ہندوستان میں اس زمانے میں اچھی قمارت ہو سکتی تھی اس
لئے انہوں نے با شاہ کبیر آباد کا پناہ سکن اور وطن بنالیا۔ مرزا کے سلاف میں کی لوگ مغل دربار سے وابستہ رہے۔ ثاقب
کے والد کا نام مولوی آغا محمد عسکری قزلباش تھا اور عرف مرزا احمد حسین۔ قزلباش کے والد سرکار برطانیہ کے ملازم تھے۔

لیکن کچھ ایسا واقعہ ہوا کہ انہیں آگرہ چھوڑنا پڑا اور وہاں وہ عیال کے ساتھ کھنڈ آگئے۔ ثاقب اس وقت بہت
چھوٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھیں صوفی ہوئی لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے آگرہ آگئے اور سیت جانش کالج کے طالب علم رہے۔
پہلے ان کی ملاقات سر مومن حسین صلی سے ہوئی۔ جن کی صحبت کے فیض سے انہیں شاعری کا ادق ہوا۔ ثاقب کی زندگی
میں کئی انصیب و افراڑے۔ یہ معاشی طور پر بد حال بھی رہے۔ قمارت کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اسی دہشتہ سے راہ
محمود آباد کے یہاں رسائی ہوئی جب ثاقب کا دربار میں کام ہونے لگا تو کھلتے چلے آئے۔ ۱۹۰۵ء میں راجا محمود آباد کی
دعوت پر کھنڈ چلے یہاں ان کی تھوڑی سی ملازمت تھی۔ وہاں سے وہ واپس چلے آئے۔ ۱۹۰۵ء میں راجا محمود آباد کی
”اور ان گل“ کے مصنف میراجہ شاہی نے شائع کیا تھا) کے حوالے سے ان کی تخلص و اشعار اور ان اشعار کے بارے میں ایک
اقتباس نقل کیا ہے، جو درج ذیل ہے:-

”ثاقب کتابی چرے، پھر رے جسم اور دہائی قد کے نیک صورت، خوش اخلاق اور سن
رسیدہ رنگ ہیں، ہڈی نخی اور نرافت کی کھنڈوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے دوست دلائی،
مذہب کی پابندی اور ظلم و محبت سے ملنا ان کی لمبایاں عقائد ہیں۔ مرثیے سے ریاست محفوظ رہا

سے دیکھ لیتے ہیں۔ اشتیاء و زیادہ اور لفظ شعر و سخن میں مشغول رہتے ہیں۔

چاقب کے یہاں عام طور سے مشتق مضامین پائے جاتے ہیں۔ یہ مشتق مضامین دیکھی جاتی ہیں بلکہ ان میں ایک طرح کی بصیرت پائی جاتی ہے، جسے عارفانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ چاقب کے یہاں شاعری میں ایک ضخیم کیفیت کا پتہ ملتا ہے، جس میں تصوف کی آغ بھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاقب کا دل طور پر غالب سے قریب ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں شوق غالب کا نوع ہے نہ تجلی اور ترقی۔ لیکن انہوں نے جس طرح کی عشق شاعری سے پرہیز کیا ہے اس سے ان کی ذہنی کیفیت کا پتہ ملتا ہے۔ عام طور سے گھنٹہ کی عشق شاعری میں ہوسا کی کا پلاو ایک غالب شعر کی طرح سامنے آتا ہے۔ چاقب اپنے آپ کو اس ہوسا کی سے قفل جہائے ہوئے ہیں۔ بعض نے چاقب کے کام میں میریت بھی تلاش کی ہے۔ گویا چاقب وہ بڑے شاعروں کے حراف کے سچ کھڑے نظر آتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔ میر کے حوالے سے ہی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں ہرگز انداز ہوگا اور اشتیاء و دھبہ ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ گویا چاقب ایک ایسے شاعر ہیں جو گھنٹہ کی حراف رکھتے ہوئے بھی اپنی شاعری کو بہت حد تک اس گھنٹہ سے الگ رکھتے ہیں جو خاص خاصیت پر زور دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

چاقب کے کلام کے دھب سے تعارف کے لئے چند اشعار جو غالب اور میر کے دھب کے ہیں، پیش کیے جاتے ہیں:

اپنی قسمت سے گزر جاؤں کہ دور چرخ سے
میں تو وہ دھڑکا کیا جو جیب دیا میں نہ تھا
وہاں جہاں دیکھ لیا وہ سطر میں
بڑھتا ہوں اسی سمت کہ شاید مرا گھر ہو
گھنٹوں برا کیا جو یہ تھکے جلا دے
تھا آشتیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا
کشتی بہاد چہ تھا نیشیں بنا لیا
میں کیوں ہوا امیر مرا کیا قصور تھا
قریب دلا دیا ہے مجھے اپنے گھر کی بار
لیکن یہی کہ لٹ گیا وہ وہاں ہو گیا

ہاغبان نے آگ دی جب آشتیاں کو مرے
جن پہ تکیہ تھا رہی چہ ہوا اپنے گے
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
میں سو گئے راجاں کہتے کہتے
چاقب کی وفات ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔

مبارک عظیم آبادی

(۱۸۶۹ء - ۱۹۵۸ء)

ان کا اصلی نام مبارک حسین ہے۔ موصوف ۲۵ دسمبر ۱۸۶۹ء جمہ کے دن درہنگہ کے قصبہ ٹائی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید فراح حسین تھا۔ شعر کہتے تھے اور دانش نگار بھی کرتے تھے۔ مبارک مولوی حسن جان خاں صاحب حسن بہرائی سے اصطلاح لیا کرتے تھے۔ پھر حکیم عبدالمید پریشاں کے شاگرد ہو گئے۔ استاد ہی نے انہیں مبارک عظیم نام رکھنے کی تلقین کی۔

مبارک قدیم وضع کے شاعر تھے۔ داغ کا اثر ان کی شاعری پر بڑا گہرا تھا۔ شوقی اور بے باکی ان کے کلام کی جان ہے۔ عاشق و معشوق کی رواقی جھجھک چھاؤں ان کی شاعری میں بار بار ابھرتی ہے۔ عشق کے سلی مرحلے ہمیشہ جوانی کی دستکوب کی فضا پر کرتے رہے۔ دوسری طرف خرابات سے بھی ان کا کا ذکر ہوا ہے۔ باغ کی راہ پر چل نکلے۔ داغ کے اثرات کی ایک جگہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی پہلی غزل داغ ہی کے پاس اصلاح کے لئے بھیجی تھی۔ داغ نے اصلاح بھی کی اور مبارک ٹھیک مبارک ہونے کی سند دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کے حلقے میں آنے کے باوجود مبارک داغ کے دائرے ہی میں گھومتے رہے۔ مبارک کے بارے میں وحید گلگتوی لکھتے ہیں:

”ان کے کلام میں داغ کی ہی زندہ دل پائی جاتی ہے۔ وہی بول چال، وہی روزمرہ، وہی لطافت زبان، وہی روانی..... اور وہ ڈاکٹر مبارک حسین کے متعلق ناقدانے سخن تابع اشعار نوح تارائی یوں گہرا افشاں کرتے ہیں کہ:۔۔۔ ان کا ساتھ میں شمار ہے، جو کہو کہ یہی اس کو سمجھنا چاہئے۔ ان کا فرمودہ چتر کی گھیر ہے جو مٹانے سے نہیں مٹ سکتا۔۔۔ میرا یہ دھوکا ہے کہ ہلے خاصا شاعرانہ کلام میں موجود ہیں۔۔۔ یہ شعر کہتے وقت اپنے خیال رکھتے ہیں کہ استاد (داغ) کا رنگہ جانے نہ پائے۔“

مبارک کے چھ اشعار نقل کرتا ہوں۔ یہی اشعار ہیں جو ”عظم“ میں پروفیسر عبدالنور دہل کے مضمون میں

مثال کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔

خدا جانے کہاں سے کھجکے کے میٹھے میں آتی ہے
خیر اچھی تو ہے شے سے پچانے میں آتی ہے

نعل خزاں میں بھی جو پے جا رہا ہوں میں
موسم کو خوشگوار کئے جا رہا ہوں میں

بہار آئی ، کھلا ہیکہ ، جلی صحت
لڑائے خلد کو دھلا شراب خانے سے

یہ وجہ دیکھ یہ غرض قدم کی کٹی ہے
کچھ آ رہے ہیں مبارک شراب خانے سے

اس طرف وہ ہاتھ میں خنجر بھجیں تانے ہوئے
اس طرف ہم سرنگوں بیٹھے ہیں کچھ ٹھانے ہوئے

بڑ رہے ہیں خلق میں کالے ٹکلف بہ طرف
احمال دے ساقی مرے ساغر میں بے چھانے ہوئے

ان کا اقبال پانچویں ۱۹۵۸ء میں ہوا۔

مولانا ظفر علی خاں

(۱۸۷۳ء - ۱۹۵۶ء)

ظفر علی خاں ۱۸۷۳ء میں ایک گھاس کوٹ میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ یہ خلیج سیانکوٹ میں ہے۔ ان کے والد کا نام مولوی سراج الدین تھا۔ ایک کے ٹکڑے سے وابستہ تھے۔ ظفر علی خاں نے ابتدائی تعلیم دربارہ کے ایک اسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد پٹنالا کمر میزک پاس کیا۔ پھر شیگوجا گئے اور ۱۸۹۲ء میں انجیلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈاک کے محکمے میں ملازم ہو گئے، لیکن یہ ملازمہ داس نہ آئی۔ علم کی پیاس باقی تھی چنانچہ دوبارہ شیگوجا گئے اور لیالپور اسکول کے امتحان پاس کیا۔ جب وہ خواجہ محسن الملک کے پاس آئے تو سرکاری ہو گئے۔ اس کے بعد حیدرآباد، دکن میں دارالترجمہ کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔ یہیں وہ دو سو سرکاری کے عہدے سنبھالے۔ لیکن انہیں ملازمہ مستحکم نہ پائی۔ وہ ایک دہائی سے وابستہ رہے۔

گزارش پڑی۔ ۱۹۱۲ء میں کرم آباد میں بند کر دیے گئے۔ تجربہ ۱۹۲۰ء میں انہیں پانچ سال کی قید، شہت کا سامنا ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں دوبارہ تین سال کے لئے قید کر دیے گئے۔ اس زمانے میں مصوفی نے جو نظمیں کہیں وہ فرضی نام سے شائع کیں۔ جب گجرات قتل میں ملوث تھے تو ان کے ساتھ چلات ہوئی تالی تیرہ اور سید عطاء اللہ بخاری بھی تھے۔

حیدرآباد کی ملازمت کے دوران انہوں نے لاڈ کرزن کی کتاب "خیالیاں فارسی" کا ترجمہ بھی کیا۔ کچھ چاسوی ناہوں کے مرتبہ بھی کئے۔ ۱۹۰۹ء میں انہوں نے اپنے والد کی وفات پر ان کے اخبار "زمیندار" کو لاہور سے نکالنا شروع کیا۔ اس میں اپنی سوانحی تقریریں شائع کرنے لگے۔ یہیں وہ پہلا اخبار ہے جس نے نثر، انشائیہ کی خدمات حاصل کیں۔

ظفر علی خاں کی ایک حیثیت حیرت کی بھی ہے۔ چاسوی ناہوں میں انہوں نے "میر غلام" "نور اللغات" اور "سہری گھوگھا" کے نام سے مرتبہ کئے۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں "میر گندھب و سائیکس" "نظمیہ" "جنگ دس و چار" "امیت کی حاصل" ہیں۔

موصوفی نے شبلی نعمانی کی "الغاروق" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مولانا سمائی تو شعی انکی ایک بیہوش شاعر کی بھی ہے۔ رشتہ کوئی سے انہیں "لاکھو تھا" اس سلسلے میں انہوں نے جو بھی کام چیل کیا ہے وہ امتیاز کا درجہ رکھتا ہے۔ مولانا عشق رسول علیہ السلام سے مرثیہ تھے۔ ان کے جذبات کا عکس ان کی لغتوں میں نمایاں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کہش کرتے ہیں کہ لغت غلو سے پاک ہو۔ اس ضمن میں وہ خوبصورت تجویزات استعمال کرتے ہیں۔ ابتدا ان کے حضور سچے کی دوا بر لکھنے نے دی ہے۔ کافیے اور تقریریں ایسی استعمال کرتے ہیں جو صاف اور سہل ہوں۔ گاہم میں صوفی آجنگ اور خواجہ ہے۔

مولانا نے جس طرح قید و بند کی زندگی بسر کی تھی اس کا بھی عکس ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ ذیل میں ان کی نعت کے چند اشعار نقل کر رہے ہیں:

دل جس سے زندہ ہے وہ قہتا تھیں تو ہو
ہم جس میں ہیں رہے ہیں وہ دنیا تھیں تو ہو

چلتے ہیں جہنم کے پیر میں ہم
اس کی چھتوں کے شکار تھیں تو ہو

وہ اٹھا خاک بلحا سے سعادت کا امن ہو کر
علم برادر حق بن کر اپنے حلال دین ہو کر

پندرہ اشعار بھی دیکھئے۔

تھے۔ نام تھا "نغان آرزو"۔ ایک اندازے کے مطابق انہوں نے تقریباً تیس چار غزلوں کے اشعار کہے ہیں۔

آرزو اساتذہ کی صنف کے شاعر ہیں۔ چنانچہ ان کی غزلیں بھی ایسے ہی طور سے آراستہ ہیں جنہیں ہم کلاسیکی کہہ سکتے ہیں۔ ایک سنگ سے دوست اشعار ان کی فنی دسترس کا پتہ دیتے ہیں۔ آرزو کی نگاہ ایک شاعر کی جیسے میں ایسے نکات پیدا کر لیتے تھے جن میں تازگی اور ہ کاری کا احساس ملتا ہے۔ بعض غزلوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصوف کی نگاہ اساتذہ کے کام پر بطریق احسن رہی تھی۔ چنانچہ فنی نکات ان کے کلام کا طرز امتیاز ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے غزل میں تازگی اور جدت پیدا کرنے کے لئے کچھ نئے موضوعات کی طرف بھی رجوع کیا لیکن جسے اعتدال کہتے ہیں وہ قصین نہ ہو سکا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصوف محض پرانے شعرا کی تقلید نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ اپنی زمین خود بنانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے یہ مشکل کام ہے۔ ایسی کوششوں سے ان کے بعض اشعار تازہ و بہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ صورت ہر جگہ نمایاں نہیں ہے۔

آرزو کی شاعری کا مرکزی نکتہ ردِ مان اور عشقِ حق ہی ہے لیکن ایک اور نکتہ سے خالی نہیں۔ پھر بھی وہ حرانِ ثانیاب سے جویر کے یہاں ملتا ہے۔ ردِ مانم کے اشعار جمع کئے جائیں تو ان کی تعداد بھی خاصی ہو سکتی ہے۔

آرزو کے یہاں بعض ایسے اشعار کا پتہ چلتا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فلسفیانہ ذہن بھی رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی واضح فلسفہ یا فکر ان کے کلام سے کشیدہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن ان کا تصور ضرور وہاں ان کے فکری سیلابات سے غزل میں قدرے تازگی پیدا ہو گئی اور عقلِ مطالعہ بن گئی۔ بعض نقادوں نے ان کے جمالی کلیک کے ساتھ جمالی کلیت کو بھی نشان زد کرنے کی سعی کی ہے۔ میرے خیال میں ان کے کام میں ایسے نکات کم ہیں۔ بہر طور اردو شاعری کی تاریخ میں آرزو ایک امتیازی حیثیت کے حاشیہ شاعر ہیں جو سمجھوں کے ساتھ چلنے کے باوجود اپنی باگڑ آپ بنانے پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔ ذہنی میں آرزو کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں، جس سے ان کے مزاج و سیلان کا پتہ چل سکتے:

دش ان ہنکھوں کا سبہ کہنے کو ذرا سا پانی

ہنگڑوں ذوق مجھے پھر بھی ہے اتنا پانی

آنکھ سے بہ نہیں سکتا ہے بہن کا پانی

پھوٹ بھی جائے گا چھو تو نہ دے گا پانی

چاہ میں پاؤں کہاں آس کا مٹھا پانی

جس بھڑکا ہوئی ہے اور نہیں مٹا پانی

دل سے لگا جو اتنا آنکھ سے چکا پانی

آگ سے آج تھنہ ہوئے دیکھا پانی

مجھ سے ملنے کے لئے زنداں میں منصور گیا
وصوفتی تھیں جس کو پہنچیں چشمِ بدور گیا

جان پاؤں سپہ خانے میں خم کیوں آگئے
میں تو ہو کر پیچہ اس عادت سے مجبور گیا

بس کہ تہائی میں تھا شوقِ غزلِ خوانی مجھے
کردیا سست نے انگریزوں کا زندانی مجھے

جو مضامین آج تک تھے برقرار فکر و
پٹنے پٹنے سوچ جاتے ہیں یہ آسانی مجھے

آرزو لکھنوی

(۱۸۷۲ء - ۱۹۵۱ء)

آرزو لکھنوی کا پورا نام انور حسین ہے اور عرفیت پنجر اور پنجر آرزو والد کا نام میرزا کر ہے۔ وہ بھی شاعر تھے اور پاسِ قلص کرتے تھے۔ آرزو لکھنوی بارہوری میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ ولادت ۱۲۸۹ھ ہے۔ آرزو سید تھے اور ان کا سلسلہ نسب دھرت موی کاظم تک پہنچتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مصوف کے اسلاف ہرات سے ہندوستان آئے اور ان کے مورث اعلیٰ سید جان علی جوڑا بھٹو علی خاں کے نام سے معروف تھے۔ والدہ کے صوبہ دار ہو گئے۔ آرزو کی تعلیم پانچ سال کی عمر سے شروع ہو گئی۔ روایت کے مطابق سب سے پہلے قرآن پاک پڑھایا گیا، پھر فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ گویا ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ پھر مولانا سید آغا حسین کی درگاہ سے وابستہ ہو گئے۔ خطاطی بھی سیکھی اور موسیقی بھی۔ فنی سب نگری سے بھی بہرہ ور ہوئے۔

آرزو کی شادی اس وقت ہوئی جب ان کی عمر اٹیس (۴۹) سال کی تھی۔ لیکن ان کی بیوی کا انتقال بارہ (۱۲) سال کے اندر ہی ہو گیا۔ پھر آرزو نے دوسری شادی کی۔ لیکن یہ خاتون ان کے ساتھ شہرہ نگیں شب ایک اور عقد کیا۔ اس بار بھی سے شادی کی وہ شاعر تھیں اور رزمِ نظم کرتی تھیں۔

آرزو نے ابتدا میں امیدِ قلص اختیار کیا بعد میں وہ آرزو بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ آرزو کو قلعہ تاریخ جیسے میں کمال حاصل تھا۔ ان کی متعدد تصانیف یادگار ہیں جن میں "قصائد آرزو"، "جہان آرزو"، "شہن آرزو"، "جہان آرزو"، "نغان آرزو"، "آواز آرزو"، "ایک داستانِ امیرِ حرم کے طرزِ رنگی تصویر کی" انہوں نے دافقت کی بھی تخلیق کی۔ لیکن

کس نے جیتے ہوئے بالوں سے یہ بھکا پانی
 جھوم کر آئی گھٹ ٹوٹ کے برسا پانی
 پہلے دھوپ کا ہے روپ لڑکھن کا انجان
 دھیر اٹھنے ہی اترے گا یہ چڑھ پانی
 کئی سواہی تھا تھی کہ جوانی کی اسٹیک
 جی یہاں لے گیا برسات کا پہلا پانی
 ہاتھ جس چائے کا چھلا نہ کیجے کا جھوڑ
 آگ منی میں دلی ہے نہ سمجھنا پانی

آرزو کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا۔

شفق عمارد پوری

(۱۸۷۴ء — ۱۹۳۳ء)

ان کا پورا نام سید حسن مرتضیٰ تھا۔ شفق ٹھکس کرتے تھے۔ چار شفی نام منظر سید ہے۔ ان کی ولادت ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں ہوئی۔ ان کے والد سید رفیع اور ارا سید کرامت علی مفتی عدالت آباد مقرر ہوئے تھے۔ شفق نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ان کا وطن موضع عمار پور تھا جو ضلع گیاہی میں ہے۔ پھر وہ اپنے والد کے ساتھ ال آباد آ گئے۔ ان کے ایک اہم استاد علامہ شوق نبوی رہے ہیں، انہوں نے انہیں مدیت کا درس دیا۔ پھر تکیم مولانا کوثر علی خیر آبادی سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ شفق نو ہجری سال کی عمر سے تھیں اشعار کہنے لگے تھے۔ پہلے انہوں نے حسن ٹھکس کیا اور سوانح شوق کی انشاء پر اپنے ٹھکس بدل کر شفق کر دیا۔ اشعار میں وہ شوق سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ پھر کوثر خیر آبادی کی طرف ہنس ہونے کے بعد دھیر احمد امیر چٹائی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ شفق یوں تو مختلف لوگوں سے اپنے کام پر اصلاح لیتے رہے لیکن بقول تکیم حاجز لکھی اقبال سے حالی اور شبلی اسکول سے متاثر رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ:-

”امیر چٹائی یا شوق نبوی کی شاعری کے بارے میں اس عہد کے شعرا کے برعکس شفی کا مزاج اور ان کی شفی صرف قول گوئی کے دائرے میں مقید نہیں رہی۔ شفی نے عہد جدید کی اردو شاعری کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا اور ماحول کی عکاسی کی طرف متوجہ رہے۔ سماج کی کئی شاعری کا موضوع بنایا اور مختلف موضوعات مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور ملکی مسائل کو لکھ دیا۔

اقبال سے حالی اور شبلی اسکول سے متاثر ہیں اسی لئے اس عہد میں جب مولانا شعر انزل ہو گئی کہ اردو صاف بھڑکانا پڑے سوئے تھے شفی کا میلان طبع نظم نگاری کی طرف زیادہ تھا کہ چہ نظم نگاری کے میدان میں لعل حسن آزاد کی جدت طبعی ان کے یہاں نہیں۔ یہاں لئے تنگ ہے کہ آزاد کا جبر جس بحر میں تھا شفی کے یہاں انہوں کی جیتے ہوئے مسدس اور قطعات کے دائرے سے آئے نہیں جوئی لیکن بحر حال اپنے عہد کے نمایاں میلانات سے ان کی ادنیٰ نگاہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقبال اور طرا بس کی جنگ ملک کی غربت مسلمانوں کی بے عملی اور اس کے نتیجے میں ان کا زوال یہ شفی کے شعروں میں مضمر حالت ہیں۔“

دیسے شفی ایک پرگو شاعر تھے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ”ریاض شفی“ کے نام ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں نظم، غزل، قصیدہ اور رباعی ہے۔ لیکن ”ریاض شفی“ میں ان کا پورا کلام نہیں ہے۔ شفی کے سلیب میں قلم پھر کس لکھتے ہیں کہ:-

”شفق صاحب کی شاعری اپنی بعض قصصیتوں کی وجہ سے اردو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں مستحقی پیدا کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی عمدہ ہوتی شعر کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ شفی عمارد پوری کے کلام میں بھی یہ سب خوبیاں موجود ہیں اور وہ پھر اچھا ہے۔ اس کے پڑھنے سے دل پر چٹ سی تلقین ہے جو لطف سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کی زبان فصاحت، روانگی، سوز و گداز، مضامین کی جدت، تاثیر میں ایسی خوبیاں ہیں جو اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور دنیواد مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی و صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ہیں جس پر غبار بلند پروازیوں اور نازک خیالیاں قربان ہیں۔ یہ خاص امتداد شفی و موسیٰ کا ہے۔ مگر ان کا کلام حضرت داتا گانی بہر ماں دہلوی سے بھرا ہوا ہے۔“

شربتہ احساس مسیحا نہیں ہوتا
 اچھا ہے وہ چار جو اچھا نہیں ہوتا
 فریاد نہیں ہوتی کہ تار نہیں ہوتا
 اک تم نہیں ہوتے ہو تو کیا کیا نہیں ہوتا

کس ناز و ادا سے ترے ہونٹوں پہ جگہ دہی
شوقی نے جسم کو جسم نے حیا کو
آؤ کہ دم اٹھا ہے جو آنکھوں میں شب بھر
پیار نے وہ وہ کے پکارا ہے غفا کو
مرتا بھی شفق ان کا حیات ادنیٰ ہے
ہیں رکھے اللہ شہیدان وفا کو

شفق کی وفات ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔



آؤ گے یو نہیں کل جی تم آج ہو مجھے
ہونے کو تو کب وعدہ لڑا نہیں ہوتا
جس داغ کا مرہم ہو تو جس درد کا دوا
اس کی بچی صحت ہے کہ اچھا نہیں ہوتا
وہ رنگ ہوں جو بار نہ ہو دامن گل پہ
وہ پھول ہوں جس پھول میں کاٹا نہیں ہوتا
ہر شمع کی لہ برق چلی نہیں ہوتی
ہر داغ چراغ پہ پڑنا نہیں ہوتا
کھلتے ہیں شفق پھول بھی پھٹتے ہیں شجر بھی
ہاں بارہ اک غل غفا نہیں ہوتا" ہ

شفق پر کوڑھیر آبادی کا رنگ صاف نظر آتا ہے لیکن ان کا انداز پر وہاں ہے۔ غزلوں میں سادگی پائی جاتی ہے۔
جو سیرگشتی کے اثرات کا پتہ دیتا ہے۔ ان کے چند اشعار ذیل میں درج کرتے ہوں:

دکھانے کو جھک جس طور پہ وہ بے نقاب آیا
تلاش دیکھتے مولیٰ کی آنکھوں میں حجاب آیا
بتائیں کیا کہ قاصد کیا گیا اور آیا کیا لے کر
جو نکلتا تھا نکلا ہم نے جو آتا تھا جواب آیا
شجر پیار ہے شہر ہی سہی
نہ تھا سمجھو تو بے جا ہی سہی
تا سزاوار کی نہ توڑو تم آس
نہ طوٹے کا وعدہ ہی سہی
نہ ہو دیوانوں سے لہجہ آپا
شجر آماری صبرا ہی سہی

میر مستحسن خلیق

(۱۷۶۹ء - ۱۸۴۳ء)

میر مستحسن خلیق کی اہمیت اس کی ہے کہ میر حسن کے بیٹے اور میر انیس کے والد ہیں۔ یہ ایک انداز ہے کے مطابق ۱۷۶۹ء کے قریب فیض آباد میں پیدا ہوئے اور انتقال ۱۸۴۳ء میں ہوا۔ انہوں نے ستر سال کی عمر سے شعر گوئی شروع کیا۔ ان کے والدی ان کے اہتمام پر اصلاح دیتے رہے۔ لیکن بعد میں پھر مصحفی ان کے استاد ہو گئے۔ مصحفی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے جو ہر کو پہچانتے ہیں انہیں دیکھیں لگی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مشاعرے میں خلیق نے ایک غزل پڑھی جس کا مطلع ہے:

خُل آئند ہے اس رشکِ قر کا پہلو

صاف ادھر سے نظر آج ہے ادھر کا پہلو

انہوں نے سب یہ مطلع دیکھا تو ہلکا اٹھے۔

جب والد کا انتقال ہو گیا تو خلیق بھی خاندان کے اخراجات کا بار اٹھاتے رہے اور زندگی مشکل سے گزارتی رہی۔ جب ان کی آمدنی دو چار سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر انعام ہے کہ یہ اس زمانے میں اپنی فرائض فروخت کرتے تھے۔ اس پر عمر کے مطابق خلیق کھنوسوں پر لہجہ نیک داس کے بچوں کے اتالیق بھی تھے۔ یہ بھی ایک زریعہ معاش تھا۔ فیض آباد سے سب لوگ کھنوسا گئے تو انہوں نے بھی یہی فیصلہ کیا۔ اب جو یہاں شعرا کے کرام تھے ان کے ان کی اہمیت بھی مسلم ہوئے لگی۔ رہنمائی ایک سرور نے انہیں اہم شعرا میں شمار کیا ہے۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ پورندہ اور رنگہ جیسے شعرا کے استاد ہوئے۔ "بحر و لغز" میں قدرت اللہ قاسم نے ان کے کردار کی تعریف کی ہے۔ خلیق کے چچا بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ یعنی انیس، انس، سولس۔ یہ سب کے سب مرثیہ گوئی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

خلیق ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔ دہلی کی نگارانی زبان پر بھی انہیں قدرت تھی۔ لیکن اس پر کھنوسا رنگہ بھی چڑھنے لگے۔ وہ ناسخ اور انش سے متاثر ہوئے تو قی صورت ابھرنی۔

ایک مرثیہ گوئی کی حیثیت سے ان کا اقبال نمایاں ہے۔ میر انیس نے ان کی زبان خصوصاً فصاحت اور روزمرہ کی باریک بینی کی تعریف کی ہے۔ ایک سلام جو بہت مشہور ہے اس کا مطلع سوا کا شیلی نے بھی نقل کیا ہے:

بھرائی طبع کند ہے لطفِ بیاں گیا

دندانِ مجھے کہ جو ہر قطعِ نہاں گیا

گزشتی بہارِ مرِ خلیق اب کہیں کے سب

بارِ بیاں سے فطری بندہ بیاں گیا

مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء

ہماری اکثر اصناف دوسری زبانوں سے مستعار ہیں، لیکن مرثیہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس کا تعلق سرتاسر اردو سے ہے۔ اس کی ابتدا بھی اور انجام بھی۔ یوں تو شخصی مرثیوں کی مثالیں خاصی ہیں لیکن دراصل مرثیہ (اندر کر بلا پر پیدا ہے۔ اس میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے حواریوں کی شہادت کا ذکر ہوتا ہے۔ مرثیہ کی تاریخ کی بڑی بڑی بک ہے۔ گو یا اس کا مزاج ایک طرف تو دینی ہے دوسری طرف اخلاقی بھی۔ اس صنف میں متعدد اصناف کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً مشکوٰی کی طرح کی، اندکھاری، انکھول کا کیف، قصیدہ کا عنصر وغیرہ۔ کہہ سکتے ہیں کہ کہیں کہیں اس میں راز ہے کی بھی جھلک پائی جاتی ہے اور اس کا بیاں سے تعلق ناگزیر ہے۔ یہ بعد اہم صنف ہے۔ اور میر انیس اہم ترین مرثیہ گو کہے جاتے ہیں۔ میر انیس کے علاوہ مرزا دیر اور کی دوسرے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

شعیدہ عقیدے کے لوگ مجلسِ عزا منع کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں عزم کے بیٹے میں مجلسِ نہا کی جاتی ہیں۔ میر انیس اور مرزا دیر خاص طور پر نگاہ میں رکھے جاتے ہیں۔ سوز غرائی ہوتی ہے، سلام اور نو سے پڑھے جاتے ہیں۔ ایسی مجلسوں میں ڈرامائی فطرتِ شعر کے کی چیز ہوتا ہے اور وہ نے دل کے کھلنے کا عمل بنا لیتا ہوتا ہے۔ یہاں تک مرثیہ کے اندکھاری کیف و تمکیم کا فکروں میں گرو باہوں۔ دینے اس کے نمونے دگی ادب سے علی لطف شریع ہو گئے تھے۔ پھر ایک زمانے میں اس کے عروج اور ارتقاء کی وہ صورتیں سامنے آئیں جو اردو ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

ادبی لحاظ سے بھی مرثیہ کی بڑی اہمیت ہے۔ لسانی مباحث میں مرثیوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اب تو کہہ رہے ہیں اور شاعری میں اہم حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کیفیت استعداد سے کی ہوئی ہے۔ ہر حال قصیدے کے قارم سے

ایسا تو جہاں میں کوئی غلو سے بچ نہ سکا
آدمت جو ظلیق جگر انگار ہے آئی
جس گمزی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم
بی بی میں غوب گھبراتے ہیں ہم
غفلت میں فرق اپنی تجھ بنا کھو نہ آیا
ہم آپ میں نہ آنے جب تک کہ تو نہ آیا

میر مظفر حسین

(1998-1999)

میر حمیر کا نام میر مظفر حسین حمیر تھا۔ ان کی پیدائش کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کن بات سامنے نہیں آئی۔ ڈاکٹر سید اختر علی نے اس کا اظہار کیا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۱۹۱ھ کے پہلے نہیں ہو سکتی۔ اس طرح ان کی پیدائش ۱۷۸۷ء کے آس پاس ہوئی۔ والد کا نام حسین تھے۔ ان کے آباؤ اجداد پٹنہ، علی گڑھ کاؤس کے رہنے والے تھے۔ مگر خانہ دانی ترکہ وطن کر کے کھٹنہ چلا آیا۔ لیکن کب اس کا پتہ لگتا ہے۔ میر کا خاندان سادات کا خاندان تھا۔ انہوں نے خود اس کا ذکر مثنوی ”میر خان نامہ“ میں کیا ہے۔ ان کے والد میر بیگم کے مشہور دادو خاں اس خاں کی ذرا بڑھتی ہے۔ متعلق تھے۔

ضمیر کی ایک مثنوی "مظہر الحق" ہے جس میں انہوں نے اپنے حالات پر کھجور شنی ڈالی ہے۔
ضمیر نے شکر گوئی کا آغاز غزل سے کیا۔ پھر مرثیہ کے علاوہ مثنوی، قصائد، لہجہ بھی کہے۔ ایک شخص قاسم علی
کے اصرار پر انہوں نے مرثیہ کو شروع کیا اور پچاسین پڑھ لکھے۔ ان کے مرثیے جلد ہی اپنے اثر کی وجہ سے مقبول ہونے
لگے۔ پھر وہ مسلسل مرثیہ ہی کہنے رہے۔ بعضوں نے انہیں دیر کے استاد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ خود ضمیر مصحفی کی راہ
پر چلے اور ان کے شاگرد ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا۔

ضمیر کی مشغولیوں میں "نفسو بہت" بھی اہمیت رکھتی ہے جس کا موضوع حضرت علیؑ کی ولادت ہے۔ "معراج نامہ" حضرت ابن حنفیہ کے حکم سے تصانیف کیا تھا۔ ضمیر کی طبیعت کی تسبیح کی اور معجزات و قدرتوں کا بیان کیا ہے۔ ان کی شوقی اور عظمت کا کہنا ذکر کرتا ہے۔ "چوں سیدہ" حضرت ضمیر کے "ہر شہ" بھی تفسیر کیا ہے، جس میں خاندانِ رسالت کا احترام نہیں ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے مرثیے کے حوالے سے ظہیر کو قصیدہ کا موجد قرار دیا ہے اور یہ بڑی بات ہے لیکن بالکل صحیح اثر ان کو اس سے نکلا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

”خمسیرتے چکے ارباباے واپس آئی۔ رشیدؒ نے کہا کہ انہوں نے مرچے کو اسطابق شکل دی ہے اب

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ طلاق کے مرضیوں میں رخصت اور عین کی بڑی اہمیت ہے اور انہیں دو کیفیت نے انہیں جذبات و احساسات کا شاعر بنا دیا ہے۔ حسن کا قلب ان کے مرضیوں کی اہمیت کو بوجھا رہا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ صبر و تحمل کی تصویر اچانک کی طرح نمودار ہو کر پیش کرتے ہیں۔ چونکہ وہ باطن و عیان پر کافی قدرت ہے اس لئے وہ اپنی اور دیکھا بہر جگہ احساس ہوتا ہے۔ اگر مرضیوں میں درون نگ تصویریں دیکھیں ہوں تو ان کے مرضیوں کی طرف توجہ کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رزمیہ ماحصل پر دکر نے کی کوشش نہیں کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مسیح الزماں نے ایک نمونہ لکھا ہے کہ :-

”ان کی خوددہری نے لایا انہیں اپنے معاصرین کے راستے پر چلنے سے باز رکھا اس لئے

مرثیہ کے پرانے اسی احوالے میں محمد ارسلے۔ جنگ کا بیان بعض مرثیوں میں بھی انہوں نے

کھاتے..... لکھنے، پڑھنے اور ان کے تعلیمی اور تربیتی حکم..... تجارت اور پیشہ ورانہ

مرتبہ ۱ میں نہیں لے جاتے ہیں۔ ❖❖

اوپر ملنے ان کی فطرتوں کے بارے میں زبان کے حوالے سے جو سمجھ بوجھ ہے اس کی تصدیق کے لئے مستدرجہ ذیل اشعار و نظموں، جن میں ایک طرح کا پانچواں جمل ہے اور مضمون آخری جملہ اشعار کے اعتبار سے ان کی اہمیت بھی ظاہر کی ہے۔

میراث ہے۔ یہ تمام برحق ہے جسے ہم اور جاو

اب دیکھ کے چل دو، جہاں آگے بھر رہی

کے مطابق ۱۸۰۷ء سے ۱۸۰۵ء کے درمیان فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن اچاز حسین سال پیدائش ۱۸۰۲ء بتاتے ہیں اور اکبر حیدری ۱۸۰۳ء۔ ان کی والدہ ذی علم خاتون تھیں۔ انھیں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ روسیات کے حصول کے سلسلے میں مولوی محمد علی کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن عربی مولوی حیدر علی سے پڑھی۔ ان کے خاندان میں مرثیہ غالب منفی تھی۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں عمیر اور غلامی نے اس فن کو لطافت بخشی۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا اور چلیا بات تو یہ ہے کہ انھیں کے بزرگوں نے مرثیہ گوئی کو فارغ عطا کیا اور یہاں پر شاعری کے مکتبہ کے شاعر کی ایک منفرد اور مختلف جگہ ہو گئی۔ انھیں نے لٹن فخر اپنے والد محمد غلامی سے سیکھا اور مرثیہ گوئی میں کمال بھی انھیں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں انھیں جزئی محکم کرتے تھے۔ لیکن تاریخ کے شعور سے پرانیں کھینے لگے۔

انھیں کے مورث اعلیٰ میرا نامی تھے جو ایران سے ہندوستان منتقل ہو گئے تھے۔ میر غلام حسین صاحب ان کے پوتے اور میر حسن فراز تھے۔ انھیں فیض آباد اپنے والد کے ساتھ آتے تھے۔ خلیق جب تھک گئے اور گوشت گیر ہو گئے تو مرثیہ کا میدان ان کے لئے صاف تھا۔ انھیں نے اب صنف مرثیہ کی طرف خصوصی توجہ شروع کی اور پوری عمر اسی صنف کی آجاری میں گزار دی۔ ۱۸۰۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے قریب قریب دو اٹھاسٹار کیے ہیں۔ لیکن سب کے سب شائع نہیں ہو سکے۔ کچھ قلمب یو گئے اور کچھ چھپدوں میں شائع ہوئے۔

میر انھیں کا زمانہ دہلی ہے جو قیام آباد علی اور احمد علی کا ہے۔ میر حمید میر انھیں کی شخصیت اور طرز و انداز کے سلسلے میں ڈاکٹر ناظم حسن زیدی رقم طراز ہیں۔

”میر انھیں تنقید و سست و خوش اندام، گندی رنگ، مہر و زلفی قسم کے جوان تھے اور ایسے کہ بڑھاپے میں بھی منہ پر بیٹھے تو جوانی کا عالم دکھاتے تھے۔ نو جوانی میں فیض آباد کے امیرزادوں کی صحبت میں سپہ گری کا فتنہ سیکھا تھا۔ اور دشمن کے پابند تھے۔ گھمنڈ کر میر کا قلم نلی سے جا بک۔ اپنے اور گزنی کے ہاتھ کھکے۔۔۔ لیکن ان خون کی جھیل ان کے بیٹے میر علی نے کی۔ اس میں بھی جھنڈاری اور اصول شرافت کا استحصال رکھتے تھے کہ ننگے بدن مشق نہ کرتے تھے بلکہ اس جھنڈے کے لئے پٹا پٹکا جھٹ لیا اس سلاطین تھا۔ مرثیہ خوانی کا فن اس خاندان میں موروثی تھا اس خاندان کے اکثر اکیال طاقت میں قد آدم آئندہ مائے نیکم کر خزانہ کی کی جھلک کرتے اور اپنے عجیب و غریب کوفہ پر کھتے تھے۔ غلامی فن، ریاضت اور ذوق شہم نے ان کے تحت اللہ مرثیہ خوانی میں وہ جو برید کر دئے تھے کہ اور وہ منہ پر پہنچے اور ادھر اعلیٰ مجلس کی پوری توجہ ان کی طرف متعطف ہو گئی۔ شمس العلماء کا لفظ خاس اللہ آباد والی مجلس میں، ان کی شاعری اور مرثیہ خوانی کا بیان یوں کرتے ہیں: انھیں بھی دھوپ میں کھڑا ہو کر دور

میر کے کپڑے پہنے سے تر ہو گئے اور پاؤں خون کرنے سے ٹل ہو گئے۔ لیکن جب تک ہر شخص کی صورت دیکھا اور ان کا مرثیہ شکار باجھے کوئی بات مسمون نہ ہوئی۔ میں نے اس سے پہلے بھی ایسا خوش بیان نہیں سنا اور نہ کسی کے ہاں سے جان سے یہ باخبر العلوت اثر پہنچا ہوتے دیکھا۔“

جب انھیں گھمنڈ گئے تو ان کا کار حریہ بڑھا۔ ان کی مرثیہ گوئی نے انھیں تاجدار مرثیہ بنا دیا اور ان کی خوب خوب پذیرائی ہونے لگی۔ دہلی جو کسی دوسرے کے جھے میں نہیں آئی۔ سب انھیں دور دراز کے علاقوں سے مسلسل مدعو کیا جانے لگا۔ چنانچہ نواب جام علی خاں نے انھیں مقیم آباد آنے کی دعوت دی۔ یہ واقعہ ۱۸۵۹ء کا ہے۔ پھر انھیں نواب تہرہ بلنگ نے ۱۸۵۹ء میں حیدر آباد، بالاپور ۵۵۰ ہاں جو بھاسیں برپا کی گئیں وہ یادگار ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ دوسرے علاقے میں تو مرثیہ گوئی ضمنی طور پر ہوتی رہی لیکن گھمنڈ کا خاص مرکز بن گیا۔ اس صنف کے خوانے سے زبان کی لطافت کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ سب اپنائی گئیں۔ لطافت و بلاغت کا دریا بہا ہوا گیا۔ شوکت الفاظ سے کام لیا۔ مرثیہ خوانوں آخری اس کا خاص وصف ظہور ہے پھر یہ بھی ہوا کہ اس وقت کے مرثیہ گوئیوں کا کمال ایک دوسرے سے حقیقت لے جانے کے لئے اپنے فن کی کمالات دکھانے میں سخت ریاچی کرنے لگے۔ نتیجے میں انھیں اور دیر کے معر کے اس بھی مٹھ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کل اور آج کی تنقید کے نمونے مرثیہ کا جائزہ لیا جائے تو کہتا پڑے گا کہ دیر کے مقابلے میں انھیں کی اہمیت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ لیکن اپنے اشد میں یہ صورت اس طرح شدت اختیار کر گئی کہ مرثیہ گو اور سامعین و دھمنوں میں تقسیم ہو گئے۔ جیسے اور دیر کے۔ انوں ایک دوسرے پر شدت لے جانے کی عظیم کوشش کرتے رہے۔

ڈاکٹر فی مرثیہ خوانوں کے بعض خطوط پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ اقتدار داری، جذبات کی دلچسپی، کردار نگاری، منظر نگاری اور لطافت بیان میں انھیں کی عظمت مسلم ہے۔ انھیں حسین طبع ”ایجادات اور حسن لکھتے ہیں کہ۔“

”روزمرہ عناصر کا جلال و جز خوانی کا مہر و زلفیہ الفاظ کی وسعت و قوت بیان کا جذبہ۔ جذبات و واقعات کی حریق شہی یہ سب ان کے فن کے امتیازی نشان ہیں۔“

میر انھیں جذبات نگاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ ہر جذبہ کو ایک تصویر کی صورت نمایاں کر دیتے ہیں۔ انھیں کے مرثیوں میں واقعات کی کی نہیں۔ اگر سارے واقعات مرثیہ طریقے پر ہوتے اور الگ الگ مرثیہ کا جز بنتے تو ایک (Epic) کی صورت ہو جاتی۔ فی الحال یہ واقعات کچھ سے بڑے ہیں۔ دھمنیں بیان کرنے میں انھیں ایک چابکدست فنکار کی طرح سامنے آتے ہیں۔

میں حال جذبات نگاری کا ہے۔ اگر انھیں تصور جذبات کہہ جائے تو چنانہ ہوگا۔ لیکن گھمن شدت غم کے بیان

میں کوئی حد بائی نہیں رہتی۔ اس لئے جذبات ہوں سامنے آتے ہیں جیسے وہی سب کچھ ہوں۔ اس کو قہقہے بھی کہا جاسکتا ہے لیکن عام قاری یا سامع ایسے جذبات کے اظہار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مرثیہ کے سوار کے کردار کا نمونہ یا مثالی ہوتے ہیں، جو کئی حال میں بھی اپنی خوبیوں سے بھرپور ہوتے۔ میر انیس کے یہاں بھی مثال پسندی ہے۔ لیکن کردار نگاری میں جس طرح وہ آداب کا خیال رکھتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔

میر انیس ایک مہیاری منظر نگار بھی ہیں۔ منظر نگاری میں ان کا کمال یہ ہے کہ ہر منظر آنکھوں کے سامنے تصویر کی صورت اُبھر جاتا ہے۔ ایسی منظر کشی میں ان کی شاعرانہ قوت بھی خوب ساتھ دیتی ہے۔

انیس کے یہاں رزمیہ عناصر کی کمی نہیں، بلکہ ایسے عناصر کی جھلکوں میں وہاں غزل کی منزلوں تک جاتے ہیں اور ضرورت کے مطابق واقعات یا کردار میں تخفیف یا اضافہ کرنے میں قافی ہوتے دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں عناصر کا استعمال خوب خوب ہوا ہے۔ یہ کام ان کی بھی بعض کیفیتیں پائی پائی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے انیس واقعات اردو کے انتہائی ممتاز مرثیہ نگار تصور کئے جاتے ہیں تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:-

"میر انیس نے سچکڑوں ہزاروں مرثیے لکھے ہیں اور ہر مرثیہ بجائے خود ایک قصہ، ایک حکایت ہے۔ لیکن کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا ہوا تھا جسے حال کے خلاف ہو۔ خون و گدھ کی روایت کا سرے سے کتنا پتہ نہ تھا لیکن جب میر انیس نے اسی کو مرثیے میں لکھا تو تمام لوگوں کو اس کی واقعیت کا دھوکا ہوا۔ یہاں تک کہ اب وہ بطور ایک واقعہ مسلمہ کے تمام مرثیہ گوئیوں کے ہاں مختلف جہازوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح میر انیس نے جس قدر واقعات لکھے ہیں، ہر چہ وقت انگیز اور موثر ہونے کے، واقعیت کے قائب میں اس قدر ڈھلے ہوئے ہیں کہ کہیں سے ان پر حرف گیری نہیں ہو سکتی۔

مرثیوں میں جو مضامین قدر مشترک کے طور پر ہیں وہ یہ ہیں: آمادگی سفر، راہ کی تکلیفات اور مصروفیتیں، قیام گاہ کا انتظام، دشمنوں کی بروک، نوک، معرکے کی تیاریاں، رزم آرائی، ہر چیز دہریلوں کا قاتل و جدال، دشمنوں کی فتح، مہل حرم کی بیگنی اور بیادگی، شام کا سفر، قید خانہ و بار کی حاضری۔

ان میں سے ہر عنوان کے اندر کرنے کے لئے بلاغت کے خاص خاص طریقے ہیں۔ مثلاً سفر کی تیاری کے بیان کرنے میں بلاغت کا یہ اظہار ہے کہ سفر کے وقت جو چیز واقعات اور حالات پیش آتے ہیں، ان کی تصویر کشی کی جائے، مگر کیا تاہم کی صورتوں کی تقسیم و اسطر، زو و سطر کا انتظام، حملوں اور کپڑوں کی تیاری، دستورات کے پردے کا انتظام، دوست اور

کلمات، یہ تمام اچھی تفصیل سے بیان کی جائیں اور اس طرح کی جائیں کہ آنکھوں کے سامنے عین سفر کا نقشہ بھر جائے۔ میر انیس نے جہاں جہاں سفر کا بیان کیا، ان نکتوں کو ٹوٹا رکھا ہے۔"

زبان میں میر انیس کے بعض مرثیوں سے کچھ اشعار پیش کئے جا رہے ہیں:

تیار جان رہے پہ چھوٹے بڑے ہوئے
تکواریں نیک نیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

برجیوں اڑتا تھا دپ دپ کے فز دالوں سے
آنکھ لڑ جاتی تھی روپ کے تکیا بٹوں سے

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑی کی راہ سخت
پائی نہ منزلوں، نہ کہیں سایہ درخت

راکب عباسی چاند سے جبرائیل پہ ڈالے ہیں
قوسے ہوئے سہلہ زبائیں نکالے ہیں

گردن جھکا دی نہ اب میں خلل پڑے
قہرے لب کے آنکھوں سے لیکن گل پڑے

لکھا کہا کے اس اور بھی سبز ہوا ہوا
تھا موتیوں سے دامن سمرا بھرا ہوا

تنگیں بٹوں نے باتوں میں پھر اٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرد گراں سراٹھائے ہیں

یہیں زمیں کی اس کے ٹکڑے سے مل گئیں
دونوں کھوپڑیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

پہاڑی جو تھما سپاہ خدا شن رات کی
ساحل سے سر جھکی تھیں سو گھن فزات کی

”جو دھری سید نظیر الحسن صاحب مہاجنی جنہوں نے شبلی کے موازنہ کا جواب المیزان کے نام سے لکھا ہے، مہارت کرتے ہیں کہ دیر کے کلام میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کو مولانا شبلی صرف انہیں کا حصہ بناتے ہیں۔ چونکہ ان مقامات کا تذکرہ انہیں کے سلسلہ میں آچکا ہے اس لئے ان کا اعادہ غیر ضروری سمجھا گیا، البتہ دیر کے کلام کا مطالعہ کر کے ہم جن نتائج پر پہنچے ہیں ان کا خلاصہ درج میں درج ہے۔“

(۱) مرثیہ گوئی کے میدان میں دیر، انہیں سے پہلے اترے۔ چنانچہ مرزا درج علی بیگ نے ’’نمائندہ جامع‘‘ کے دیباچہ میں جن نکستوی یا نکالوں کا ذکر کیا ہے وہاں ضمیر، دلگیر اور فصیح کے علاوہ دیر کا نام بھی لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی اس وقت تک انہیں میدان شاعری میں آئے نہیں تھے یا استاد کی کے درجے پر فائز نہ تھے۔

(۲) مرزا دیر اپنے زمانے میں علاوہ شاعر ہونے کے علوم متداولہ میں بھی مہارت رکھتے تھے، چنانچہ ان کے مضامین میں عالمانہ وزن و وقار پایا جاتا ہے۔ اس زمانے میں بہت نکستوی شاعری کی سطح کچھ زیادہ قاش و خروش تھی، ایسے لوگ کم ملتے ہیں جنہوں نے مرزا غالب کی طرح شعر و شاعری کو عظیم دان کی سطح پر اٹھایا۔

(۳) دیر کی زبان زیادہ پرشکوہ ہے، چنانچہ جن مضامین کے لئے ایسی زبان درکار ہے اس کے بیان میں مرزا دیر کے کرایف کم لکھیں گے۔ مثلاً حمید، غریب، رجز و مکر، آرائی، تلواری کی تحریف، ورمیہ، یہ سب موضوع ایسے ہیں جن میں خیالات پر زور ہوتا ہے اور ایسا ہی بیان ان کے لئے درکار ہوتا ہے۔ ان میں دیر کی استاد کی ہر طرح مسلم ہے۔

(۴) دیر سے پہلے مرثیہ گوئی کی ایک خاص لے تھی یعنی سوز و گداز کے مضامین، مسان اور طعنے زبان میں اٹا کئے جاتے تھے جس کی اثر آخر میں مسلم ہے۔“

مختصر یہ کہ دیر فن مرثیہ پر نگاہ دینا دیر کی جگہ تاریخ مرثیہ نگاری میں انہیں کے ساتھ یا انہیں کے بعد ہی ہے۔ درج میں چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

بیبا شعاع صبر کی مقرر اہل شب ہوئی پندیاں درازی پر طالع شب ہوئی
اور قلع زلف لیلی زہرہ لقب ہوئی بھون ملتے قباے صرچاک سب ہوئی

نکستوی چرخ سحر مند کے لئے

ان چار نگوے ہو گیا بوند کے لئے

جب سرنگوں ہوا طم تکھان شب خورشید کے نکاس نے ملایا نکان شب

خیر شہاب سے ہوئی غالی کان شب ہائی نہ بھر شعاع قر نے خان شب

آئی جو صبح زور پختی سنوار کے

شب نے میر ستاروں کی رکھ دی انار کے

کس شیر کی آمد ہے کہ دی کاپ رہا ہے دن ایک طرف چرخ کچھ کاپ رہا ہے

رخم کا دن زیر گفتن کاپ رہا ہے ہر قصر سلطین دن کاپ رہا ہے

شمشیر بکھ دکھ کے سیر کے پھر کو

جبریل لڑتے ہیں سینے ہوئے پر کو

میر عشق

(۱۸۱۷ء-۱۸۸۶ء)

میر عشق کا پورا نام سید حسین مرزا تھا۔ عشق تھیں کرتے تھے۔ بقول مسعود حسن، ادیب ان کے والد سید محمد مرزا افس خیل شاہ کی ملکہ کے ہمتہ خاص تھے۔

عشق کے بعد اوصی سید ابوالقادر علی ایران سے ہندوستان آ گئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے والد باغ کے شاگرد تھے۔ غرض عشق نے بھی انہیں سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ♦♦ ♦ محظوظ خاص کے مطابق میر عشق کی پیدائش ۱۸۱۷ء میں ہوئی اور وفات ۲۵ مئی ۱۸۸۶ء میں گھنٹوں۔ لیکن پیدائش کی تاریخ قیاسی ہے۔ ان کے والد ہی نے انہیں ابتدائی تعلیم دی۔ پھر انہوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں دسترس حاصل کر لی۔ فن سپہ گری بھی سیکھا اور میر اندازی بھی نیز شمس الدین کی تربیت۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود علمی رجحان غالب و ہارونکلف مذہبی علوم کی طرف رجوع کرتے رہے۔

عشق نے فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ والد سے ہارونکلف کے سب لکھو آئے اور مرزا حیدر بہادر کی بیوہ سے عقد کر لیا۔ اس طرح مالی حالت مستحضر رہی۔ اس لئے کہ کچھ مکانی دی حشر سے خاتون تھیں لیکن ان کی پہلی بیوی میر میر کی صاحبزادی تھیں اور میری نے انہیں مرثیوں کی طلب رجوع کیا، اس لئے کہ بھیڑ میں جو چیز تھی اوسرچے کی شکل میں تھی۔ اسی اعتبار پر بعض حضرات عشق کے مرثیوں کو مرثیہ خجڑے تعبیر کرتے ہیں۔

پیارے صاحب رشید

(۱۸۳۶ء۔ ۱۹۰۷ء)

پیارے صاحب رشید احمد مرزا کے صاحبزادے تھے۔ ان کا پورا نام مفتاح مرزا تھا۔ رشید کھنکھس کرتے تھے اور پیارے عرفیت تھی۔ یہ انھیں کے نواسے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۶ء میں محلہ راجہ بازار گھٹو میں ہوئی۔ تعلیم اتر بیت ان کے چچائی چچا میر عشق کی نگرانی میں ہوئی اور انھیں عربی و فارسی پر دسترس حاصل ہو گئی۔ انھوں نے فنِ شب پر گری بھی کی تھی، شہزادہ ادر شہیر زئی بھی۔ میر انیس کے علاوہ میر عشق اور عشق سے بھی انساب لکھی گئے۔ ان کی شادی ان کے ماموں میر فکری کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ رشید کی اہل حالت اچھی تھی اور زندگی سمرت میں بسر ہوئی تھی۔

رشید ۱۸۹۳ء میں نواب مظفر علی خاں کی تحریک پر راجپور گئے اور مجلس پرچمی۔ پھر وہ وہاں مسلسل جاتے رہے۔ رشید عظیم آباد بھی آئے اور باولی کے امام بازار میں عشرہ نور مجلس میں حصہ لیا۔ پھر مجلس پرچمی۔ یہ ۱۹۰۶ء کی بات ہے۔ انھوں نے سفر حیدر آباد بھی ایسے ہی امور کے لئے کیا۔ رشید کی مجلسیں عام طور سے ہیرام الدہ کی ذمہ داری پر ہوتی تھیں۔ رشید انھیں ”فانز و مرہ“ سے بھی وابستہ ہوئے تھے لیکن پھر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کی شہرت بطور خاص ماہی پور، عظیم آباد اور حیدر آباد میں ہوئی رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان جگہوں پر کائنات میں سرے پر تھے اور ان جہتیں وصول کرتے۔ پیارے صاحب رشید ایک پرگوشت مرچے لیکن مرثیہ نگار کی حیثیت سے انھیں جس طرح کی کامیابی حاصل ہوئی وہ قابلِ لحاظ ہے۔ یوں بھی چونکہ ان کا عشق عشق اور انھیں کے خانوادے سے تھا اس لئے ان کی عزت و ثروت میں مزید چار چاند لگے۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے دیہات عشق کی روایات میں توسیع کی۔ میر انیس کی پوری توانائی زمانے کی خاص بات تھی۔ رشید بھی اس امر میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ یوں تو ان کے سارے مرچے واقع ہیں لیکن خاص طور سے یہاں یہ مضامین اور ساقی و ساقیہ ہیں۔ رشید کی غزل گوئی میں ان کے عہد کی روایات کا پتہ ملتا ہے۔ کوئی گہری گھرائی کے یہاں نہیں ملتی پھر بھی کلام کی وسعت و دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ بامیوں سے بھی ان کا شغف تھا۔ نظام حیدر آباد بھی ان سے متاثر ہوئے۔ وہ مسلسل سفر کرتے رہے اس لئے کہ اب آہلی کا خاص راز یہ بھی تھا۔ بعض امور کے سلسلے میں جعفر بھٹائی تو بدلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

”رشید نے اپنے دیہال اور راجہ مال دونوں کی شعری روایات سے فیض حاصل کیا تھا اور دونوں کی جڑ دہنی پر فخر کرتے تھے۔ جہاں وہ اپنے کو طرزِ سخن میر انیس کا وارث کہہ کر ان کے رنگِ سخن سے اپنے کو وابستہ کرتے تھے وہاں اپنے کو اہلِ سخن ذرا آور مسندِ عشق کا حتمی بھی کہہ کر فخر کرتے ہیں۔ آخری بیت میں انھیں کے چچے، حیدر آباد ذکر کر کے پھر اپنے نام پہنچتے ہیں۔“

میر عشق نے مرثیہ نگاری میں وہی راز اختیار کیا جو ان کے وقت تک مرثیہ کی حدیث راہ تھی۔ انھوں نے کوئی اختیار نہیں کیا لیکن ان کے مرثیوں میں سوز و گداز اور غنائیت کی کیفیت نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں کو ہر گز خیالی اور جذباتیت سے بھی آراستہ کیا۔ ان کے یہاں تشبیہات، استعارات کا نظام ہر دیگر کی کیفیت، ہیئت و صنوع سے ہم آہنگ رہی۔ اس حد تک کہ مرثیہ کی سادگی کیفیت ایک دوسرے سے چوست نظر آتی ہے۔ گھوڑے کی قرطاب و قوصیف میں انھوں نے خاص کمال دکھایا اور اس باب میں ان کے مرثیوں کی ایک انجمن شاعرت بن گئی۔ دراصل عشق غزل کے بھی شاعر تھے لہذا غزل کا جو مزاج ہے اس نے مرثیہ گوئی میں ایک خاص جگہ بنائی۔ مناظرِ غزلت کی عکاسی میں ان کی دسترس نمایاں ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ کہانیاں تصویر کشی میں وہ ہندوستانی عناصر اس طرح چوست کر دیتے ہیں کہ ہندوستانی مزاج صاف جھلک جاتا ہے۔ انھوں کے آگے یہ عجب ہے لیکن میں اسے ایک ہنر سمجھتا ہوں۔ میر عشق کی منظر نگاری سے متعلق چند بند پیش کر رہا ہوں۔ یہ ”گھڑا رزم“ سے ماخوذ ہے۔

تھا ہندو بہت خوش شقی تھیں چار کوس رومہ کے زمان میں جلا قرا صداے کوس
نجم سحر کی طوق تھی یہاں آستانہ یوں روتی ہوئی روانہ تھی شب پر دی خمی اوس
تھا ہندو کی شان تھی سادہ پاس تھا روتی تھی روح قاطر جنگل اوس تھا
کچھ کچھ حیم رخصت شب آمد سحر کم کم گلوں کی پاس عیالان پر فطر
غبنوں کا بار بار چٹکنا ادھر ادھر بچے ہوں جیسے ڈکے اندھیرے میں فوٹ کر
دیکھا جو درخت تھے کہ سیاہ تھے جا جا جا جا مسافروں کے دور آہ تھے
تا کہ زمین شرق ہوئی جلوہ گاہ صبح شب کی سیاہی پر ہوئی غالب سیاہ صبح
چر زدی لگائے پڑھا بادشاہ صبح توہمت بگی بلند ہوئی رن میں آد صبح
خون شفق میں غرق نہ یارادہ چکن تھا غور رشید صبح صبح قتل حسین تھا
تھا جادو یوں میں ذکر کہ فرست کی صبح ہے قرآن کی قسم تھی صودے کی صبح ہے
یہ صبح کر بلا نہیں جنت کی صبح ہے خالق گواہ ہے کہ شہادت کی صبح ہے
میں کو عرض ہونے کے خیم سے باگ ہے

”مردخما“ کا سال تھقیق ۱۹۲۰ء ہے، اس میں ایک نئی جہت ہے۔ اس میں حضرت امام حسینؑ کی ولادت اور حضرت محمد مصطفیٰؐ نے جس طرح نام نہاد کیمیا کی تحقیق درج کی گئی ہے اور دوسرے تاریخی حقائق سامنے لائے گئے ہیں۔ جابر حسین لکھتے ہیں:-

”عشقِ مرثیہ اہلِ تاج اور موضوعاتی پھیلاؤ کے لحاظ سے نغز ہے۔ شاعر نے یہاں تہذیب کو قبول دیا ہے اور متعدد واقعات پر انہیں تہذیبی بندوں میں عشق کی ہیں۔ اس سے شاعر کی دانشوری اور علومِ ہنوں پر اس کی گرفت کا پتہ چلتا ہے۔ مرثیہ شروع سے آخر تک قاری کو انکشاف کی سحر کاری کے سبب اپنی گرفت میں لے چلا ہے۔“

بہارِ حسین آبادی کا ایک مرثیہ ”افزون رہا“ ہے۔ ۱۹۲۰ء میں تخلیق ہوا۔ یہ بہار کے مرثیوں میں سب سے طویل ہے۔ اس میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی صورتیں در آئے ہیں۔ انتہائی اور موضوعاتی اعتبار سے بھی اس میں بعض اجتہادات نمایاں ہیں جن کی نشاندہی جابر حسین نے کی ہے۔

بہارِ حسین آبادی نے ایک مرثیہ ”کیا بے غل“ تخلیق کیا۔ دراصل اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ اس میں روایتی انداز بیان سے انحراف کیا گیا ہے اور مرثیے کو نیا رنگ و آہنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کو نثر طریقے سے پیش کرنے کی صورت ملتی ہے۔ یہاں بھی مرثیہ نگار کے اجتہاد کی خبر ملتی ہے۔

۱۹۲۲ء میں حسین آبادی کا ایک مرثیہ ”خاصانِ خدا“ کے نام سے تخلیق ہوا۔ اس مرثیے میں بھی تاریخی واقعات حقائق کے ساتھ پیش کئے گئے۔ جابر حسین نے اس کا اظہار کیا ہے کہ منسلک منظر پر مرثیہ نگاری کے میدان میں بہارِ حسین آبادی کی خدمات کو ایک نئی انقلاب سے منسوب کیا ہے۔ دراصل اس مرثیے میں اس کا احساس دلایا گیا ہے کہ خاصانِ خدا اللہ بندگانِ حاکمات سے گزرنے کے باوجود دنیا کی آلائش سے کوئی کار نہیں رکھتے۔

ایک سال بعد موصوف کا ایک مرثیہ ”مرثیہ نصیب“ کے نام سے چھپا ہی ہندواں پر مشتمل تخلیق ہوا۔ اس میں انسان کے اضطراب کی تکلیفیں بھی ظاہر کی گئی ہیں اور درحالیٰ ترقی کی صورتوں سے بھی آشنا کیا گیا ہے۔ یہ مرثیہ اپنے تسلسل اور روانی کے باعث بھی قابلِ لحاظ ہے اور اس کی نگری دینی صورت میں چلتی ہے۔

۱۹۲۶ء میں بہارِ حسین آبادی نے مرثیہ ”قصرِ جناس“ تخلیق کیا۔ یہ ۵۵ ہندواں پر مشتمل ہے۔ اس مرثیے کے ذیل میں جابر حسین کی رائے ہے:-

”قصرِ جناس اس لحاظ سے نا دراز اہم مرثیہ ہے کہ اس میں شاعر نے زور محسوس اور زور بیان سے روزِ عاشق و دلالت کا ایک منظرہ رمانی انداز میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ انبیاء کے کرام، رسولِ خدا اور صحابہ کرام سب کے سب کس طرح اس دن جناس میں حیرت و باس کی تصویر تھرا رہے ہیں!

ان کے اس مسرے سے جنوںِ عشق کے سبب ملکِ مضامین کا رخس کی طرف بھی تھکا کا خیال جاتا ہے۔ موند اور حسین انہیں بھر عشق کا شکار کر دیتے ہیں اور شہرِ جوں کے خاص شاعر اور سوانح نگار ہیں، انہیں ہر رخس کا تھکا پتہ پتہ ہیں۔ جن کے بیان پر لہر دہ کر کے رام بابو کہتے، آغا محمد باقر اور ابوالکلی نے بھی ان کو انہیں کا شکار کر دیا ہے۔

جب یہ قطعی طور پر معلوم نہیں کہ وہ اصلاح کے لئے اپنا کلام کن کے سامنے پیش کرتے تھے، ان کے نزدیک یہ کہنا زیادہ صحیح و مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیکھ کر اس طرح وہ چاہے جس سے لیتے ہوں لیکن ان کا قول اور ان کا کلام بتاتا ہے کہ وہ خاندانِ عشق اور انہیں دونوں کی شعری روایتوں کے وارث تھے۔ ان کی خصوصیات کو اپنے کلام میں جگہ دیتے تھے اور ان پر نظر کرتے تھے۔“

گویا بہارِ صاحبِ رشید اور رشید کے ارتقا کے ضمن میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔

بہارِ حسین آبادی

(۱۸۹۳ء - ۱۹۲۹ء)

ان کا اصل نام شاہ محمد باقر تھا اور انھیں بہار کرتے تھے، ان کا وطن حسین آباد (عظیم آباد) تھا جہاں ان کی ولادت ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔

موصوف کا مرثیہ کوئی سے گہرا رشتہ تھا اور اس فن میں ان کے اختیارات کو تفصیل سے قلم بند کیا جاسکتا ہے۔ قدیم مرثیہ گوئیوں کی اختصاص کی حد صرف انہیں فرقی بلکہ وہ اپنے اختصاص میں مزید ترقی پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ ۱۹۲۰ء سے مرثیہ کہنے لگے تھے۔ اسی سال ان کا ”مردخما“ شائع ہوا۔ یہ پہلا مرثیہ تھا۔ اپنے وقت میں اس کی تحریک و حسین بھی ہوئی۔ لیکن مرثیے کو ہندوستان میں شہرت حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد سے وہ قوتاً سے مرثیے کہنے لگے اور ہر مرثیے میں کوئی نہ کوئی امتیاز پیدا کیا۔ لیکن انصاف کا بات یہ ہے کہ مرثیے کی محنت میں ان کے ذکر سے خالی ہیں اور کہیں ذکر آیا بھی ہے تو سچہ روا روئی میں، حالانکہ ان کے مرثیوں کی تعداد بچوں کی تعداد جتنی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سے مرثیے غلطی کی شکل میں آج بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں، ان کے سات مرثیے ۱۹۶۶ء میں بہارِ عظیم آباد سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی اشاعت میں جابر حسین نے دلی دلچسپی لی اور ایک اہم کام سرانجام دیا۔

پہلی ذیل میں موصوف کے مرثیوں پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں۔

جہاں میں نصر علی خود بخود اس ہے آج سردار کا جو محل تھا مقام ہاں ہے آج
قوام قدسیوں کا مآقی لباس ہے آج بھال زرد ہے جو روں پہ وہ ہراس ہے آج
لک ٹوش ہیں چہرے کا رنگ فن فن ہے

نہ حسن ہے در دیوار پر نہ رونق ہے

میں بہار کے کسی بھی مرثیے سے مثالیں نہیں پیش کر سکتا ہوں اس لئے کہ اس کی پوری اپہرت کو سمجھنے کے لئے
کھل مرثیے کا مطالعہ لازمی ہے، یہاں اس کا کوئی موقع نہیں۔ لیکن اس وقت تین نام میرے ذہن میں آ رہے ہیں جن
کے یہاں مرثیوں میں اجتہاد کے پہلو نمایاں ہیں۔ پہلا نام شاہ عظیم آبادی کا ہے دوسرا جوش ملیح آبادی کا اور تیسرا بہار
حسین آبادی کا۔ شاہ عظیم آبادی نے تو ایسا ایلا اس کا اکھبار کیا تھا کہ وہ انیس دہرے سنگ مرثیے کی طرح ذال رہے ہیں
جو تھا کئی سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن یہ دعویٰ تھا جس پر تفصیلی بحثوں کی جوتگی۔ جوش ملیح آبادی نے ”حسین اور خطاب“
سے ڈھنگ سے لکھا اس کے بعض توجہ دے رنگ سے ہلکا ضرور چہرہ۔ بیاد نے خیال اور نگہ دونوں ہی سطحوں پر اجتہاد کی
کوشش کی ہے۔ مرثیے پر جو صفحہ حضرت کام کرتے رہے ہیں انہیں بہار حسین آبادی کے مرثیوں پر نگاہ رکھنی چاہئے اور
یہ واضح کرنا چاہئے کہ جس طرح موصوف نے مرثیوں کو نگارنگ دینے کی کوشش کی ہے وہ کہاں تک مستحسن ہے۔ مجھے اپنی کم
ماہیتی کا احساس ہے اور میں اس ضمن میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتا۔ لیکن بہار کے دینے کی حسین ضرور کر چکوں۔

بہار حسین آبادی کا انتقال ۱۹۲۹ء میں ہوا۔



فورٹ ولیم کالج

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد انگریزوں کے ارتقا کی نظر میں جو موثر آباد صرف اہم ہی نہیں بلکہ اور کے حراج و
میلان کی تبدیلی کا اس طرح باعث ہوا کہ اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

واقعہ جو کہ دیکھنے والے نے جو ۱۸۰۰ء میں ایک کالج کے قیام کی شجہ رکھی تھی جسے گورنر آف ڈاکٹر کس کو منظور
کرنا تھی اور منظور سے پہلے ہی اس کی داروغہ قل ذال دی گئی۔ نیز کالج کا ایک دستور بھی مرتب کیا۔ عجیب بات ہے کہ
فورٹ ولیم کالج کا افتتاح دراصل ہندوستان کی شکرانی سے گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے کہ ۱۲ مئی ۱۸۰۰ء کو نپولین سلطان کی
شہادت ہوئی تھی اور انگریزوں کی فتح کی یاد میں گویا فورٹ ولیم کالج کا افتتاح ہوا۔ اس واقعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ
اس کالج کے قیام کے پیچھے فکر پڑاں کی نیت کیا تھی؟ اور مقرر اس کس طرح ہندوستان کو کیمپ کے لئے زیر ترقی رکھنا چاہتے
تھے۔ اس سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ اور تجارت کے نام پر حقیقتاً غائبانہ کے قتل کی موثر کارروائی جو پہلی تھی۔ لہذا
فورٹ ولیم کالج کا قیام سیاسی مقاصد سے خالی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قیام کے فوراً بعد اس کا دستور العمل بھی مرتب
ہو کر سامنے آیا جس کی پہلی فنق یہ تھی کہ بنگال میں ایک ایسے کالج کی بنیاد رکھی جائے جہاں سے مولانا زمین کوادب کے
ساتھ ساتھ سائنس کی عمومی تعلیم دی جائے اور ہندوستان میں حکومت برطانیہ کو کامیاب طریقے سے کام انجام دینے میں
مدد ملے۔ چنانچہ بنگال، برہار، اڑیسہ اور بھارت کے قیام کے بعد ہندوستان کے قیام کے لئے فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی (اور
بنگال، اڑیسہ میں، مال و چنگی کے شعبوں کے لئے اور ڈھنگ کے تعلیم اداروں اور تجارت کے معاملات کے لئے نیز انڈون کے

تعلیم و ادب کی خاطر ہندوستانی کی واقعیت لازمی قرار دی گئی۔ ہندوستانی شعبہ کے پہلے صدر پروفیسر جان ٹنگر سے تھے۔ ان کے بعد کئی دوسرے غیر ہندوستانی اس شعبے کے سربراہ رہے۔ ڈاکٹر عبداللہ خان گھنٹے ہیں کہ:-

”کالج کا قیام ۱۹۰۰ء میں ۱۲ Classes اور ۱۸۰۰ نو عمر بچوں سے شروع

ہوئے۔ اس سے قبل کالج کی دوسری کاروبارائیاں ہوتی رہیں مثلاً کالج کانسٹبل کا قیام، پرنسپل

تقرر، فیس اور پنشن وغیرہ کی بحالی۔“

ابتداء میں ہندوستانی یعنی اردو شعبے کے تئیںوں کے کام میں میر بہادر علی حسینی، تاریکی، چون، ستر، تعلیمی خاں، غلام اکبر، بھراٹھ، میرا من، غلام اشرف، بلال الدین، محمد صادق، رحمت اللہ خاں، غلام غوث، کنکن لعل، کاشی راج، وحید بخش، حیدری وغیرہ چلے۔ کچھ تئیںوں کے سیکرٹری ہوئے۔ سید جعفر، جھنگی، مبارک، جی الدین اور اسماعیل خاں بحال کئے گئے۔ کچھ اور لوگ بھی اس شعبے سے وابستہ تھے خصوصاً بھائی کھاکے لئے۔ مثلاً سیدل مشر اور لالو لال جی کوئی۔ بعد میں رام نوجن چٹوڑ، دلاشر چٹوڑ، گنگا پرشاد اور شہبازی رام کا تقرر ہوا۔ کچھ اور لوگ بھی اس قافلے میں شریک ہوئے جیسے محمد صادق، میر منصور علی، غلام بخش، غلام سبحان اور مولوی کمال الدین۔

فوری تعلیم کالج میں تئیںوں کی تعداد گیارہ ہزار تھی سو تین (۱۱۳۵۴) تھی۔ ایک عہدہ سولہ لکھ تھی کا بھی تھا جو ظالموں کے گھر جا کر پڑھا کرتے تھے۔ کچھ تئیںوں ایسے تھے جو باضابطہ طور پر نہیں تھے لیکن گل کرست نے ان سے کچھ تئیںوں کی تعریف و تالیف کا کام بھی لیا۔ مثلاً میراٹھ، قاسم (حسن)، اعظمی، کاسا، خاں (قصہ گل و صوبہ)، قاسم (دل و دل)، غلام حیدر (گل پر)، شاکر علی (الف لیلیٰ)، کنکن لال (قصہ کام روپ [کھا کام]، جھنگی (قصہ فیروز شاہ)، جانی مرزا (غل) (ستر جم و ستار)، کمال چند لاہوری (ستر جم گل کاوی)، مرزا علی الف (گلشن ہند) یعنی تاریکی جہاں (دیوان جہاں)۔

ڈاکٹر جان گل کرست

(۱۷۵۹ء-۱۸۶۵ء)

ادب کی خطروں میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ گل کرست کالج کے شعبہ ہندوستان کے پہلے صدر تھے۔ گل کرست کالج کا بنیاد نام جان ہاتھ و گل کرست تھا۔ ان کی پیدائش ۱۷۵۹ء میں الیہ میرا میں ہوئی تھی۔ یہ شہر اسکاٹ لینڈ میں ہے۔ ابتدائی تعلیم کے باب میں اطلاع ملتی ہے لیکن یہ معلوم ہو سکا ہے کہ ابتدا میں سے گل کرست کی دلچسپی ادب میں تھی۔ چنانچہ وہ طبیعت یافتہ اکثر مضامین لکھتے تھے۔ ان کی یاد پوری بھی ہوئی۔ انہوں نے چارٹر میر تھ کالج ہپتھام میں داخلہ لیا اور پھر ڈیپٹ اوپنٹ لٹریچر میں داخلہ لیا۔ شاہد ہاں اپنے بیٹے سے ملنے نہیں گئے۔ انہیں ہندوستان کے بارے میں اطلاع مل چکی تھی کہ یہ ملک ملازمت کے واسطے سے انگلش ہے لہذا وہ اس ملک کی طرف متوجہ ہو گئے۔

انہوں نے اپنے بیٹے کو ترک کر دیا اور نئی کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک اچھے کاروباری ثابت ہوئے لیکن انہیں ان شعبہ میں قیام ۱۸۶۵ء میں ہندوستان آگئے۔ نومبر ۱۸۶۲ء میں انہیں اسکاٹ میرا میں کی جگہ مل گئی۔ یہ ملازمت ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے تھی۔ پھر وہ سورت آئے جہاں نو بیوں کے لئے طبی خدمات انجام دینی تھیں۔ لیکن ہندوستان سے کل جول کے بعد انہیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کا قیام واقعی اس وقت ہو سکتا ہے جب یہاں کی زبانوں سے کئی واقعیت ہواس لئے کتاب تک راجے کی زبان اردو اور ہندی تھی۔ ان کا چاہنا یہ ہے کہ:-

”۱۸۶۲ء میں انہیں وادہ ہوئے ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام خواہ

اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت تک نہ ہو تو میرے لئے خوش گوار ہو سکتا ہے اور میرے

آکاؤں ان کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جب تک کہ ملک کی مزید زبان میں پوری دستگاہ

میں نہ حاصل کر لوں۔ جہاں عارضی طور پر مجھے قیام کرنا ہے۔ چنانچہ اس زبان کو تھے اس

زمانے میں مدرس (Moors) کہتے تھے۔ سیکھنے کے لئے میں جم کر چلے گیا۔“

ظاہر ہے وہ ہندوستانی زبان کو سیکھنے کی طرف راجع ہوئے۔ باضابطہ ایک طالب علم کی حیثیت اختیار کی۔

رفتہ رفتہ وہ صلاحیت ہم بچپانی کے استاد کی صفت میں آگئے اور ایک طرح سے محقق بھی بن گئے۔ انہوں نے بہت

لے کی کرامت کو بطور خاص نظر میں رکھا۔ یہ قیام ۱۷۵۹ء میں تعلیم کی تھی اور اس میں زبان کی مبادیات سے زیادہ کچھ

تھا۔ بہر حال، انہوں نے مزید صلاحیت کے لئے دوسرے ذرائع بھی اختیار کئے۔ یکم نومبر ۱۸۸۳ء میں وہ پوری ہوتے کے

ساتھ فتح کر دئے۔ اس موقع پر انہیں ہندوستان کے کئی علاقوں کو دیکھنے کا موقع فراہم ہوا۔ اس سفر میں انہیں

احساس ہوا کہ برصغیر ہند میں اردو کی حیثیت مسلم ہے اور انہیں اس فیصلے میں دیر نہ لگی کہ اس زبان میں مزید استعداد

حاصل کی جائے۔ ان کا یہ فیصلہ بلا تائید نہیں تھا۔ انہوں نے طب کا پیشہ ترک کر دیا اور کھوسوئی سے زبان و ادب کی طرف

متوجہ ہو گئے۔ ذاتی دلچسپی اور مطالعے سے انکی صلاحیت ہم بچپانی کے بارے کے حلیے میں ایک اہم شخصیت بن کر ابھرے۔

انہوں نے ذاتی مطالعے سے اردو کے باب میں کافی معلومات اخذ کر لیں۔ گل کرست کو اس کا احساس ہوا کہ ہندوستانی

زبانوں میں خصوصاً اردو اور ہندی میں لغت کی ایجاد کی ہے۔ چنانچہ مختلف موضوعات پر توجہ دینی شروع کی لیکن ان تمام

امور کے پیچھے گل کرست کا ذہن اس طرح بھی کام کر رہا ہوا کہ انگریز جب تک کہ مقامی زبان سے بخوبی واقف نہیں

ہوتے، حکومت پر ان کا تسلط مضبوط نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس کی استعداد کھیلنے پر ضروری ہے کہ وہ رابطہ کی زبان اردو سے

واقف ہوں۔ لہذا ابتدا میں اردو یا ہندی کے لئے کام ہوتا تھا۔ ان کی عقل ذہن میں یہ پالیسی بھی کام کر رہی ہوگی۔ ایسی فکر

اور سوچ فطری بھی تھی یہ بات ہے کہ اس سے اردو زبان کے قاعدے کے اسکا کثرت روشن ہو گئے۔ اس زبان سے

واقفیت انگریزوں کے مفاد میں تھی۔ چنانچہ گل کرست نے ۱۷۵۹ء میں باضابطہ پچھلی کے کرکٹو فیض آباد میں پڑھ

خدمت کی ان میں گل کرسٹ کا نام جدا نام ہے۔

اوپر ذکر کردہ گل کرسٹ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس طرح کی طرح کی عمرائیں کو وہ شکار رہے اور تفتیش و تالیف کی وابستگی میں ان کے دن گزرتے رہے۔ سخت محنت اور لگن کی وجہ سے کئی کتابیں سامنے آئیں جن کی تفصیل اختصار کے ساتھ درج کر رہا ہوں:-

- (۱) نورس ویم کاٹی کی زبان: (۲) ہندوستانی اور انگریزی شاعری کا مجموعہ (۳) قواعد ہندی (۴) افعال فارسی اور اردو
- (۵) اول ویم پٹر نے اسے لکھا شروع کیا تھا (۵) اسے شیعہ ہندی چار پریمیکس آف پرتھوی راس (۶) ہندی انیسویں صدی
- (۷) انڈیا گائیڈ نو ہندوستانی اور وی گریڈ پر پارلیمنٹ آف انڈیا (۸) دی ہندوستانی (شعری) (۹) دی ہندوستانی پریسٹس (۱۰) دی ہندی عربک مصر (۱۱) دی ہندی میٹوگ (۱۲) دی ہندی مودل پریسیپٹ (۱۳) دی ہندی روٹن آف
- تھیوینی گریڈ کی افنی ملر (۱۴) گلیٹا کے روسن رسم لکھا گائیڈ (۱۵) پارلیا مٹری و ریٹارم آف انیسویں صدی (۱۶) دی جرنل ایسٹ انڈیا گائیڈ (۱۷) انشس ہندوستانی زبان (۱۸) دی انگریزی ہندوستانی لغت (۱۹) ہندوستانی زبان کی قواعد
- (۲۰) ضمیر لغت قواعد (۲۱) شعری زبان (۲۲) دی اور پریل لیکچر (۲۳) دی ایلی ہندی

ان کے علاوہ بھی چند کتابیں ہیں۔ ان تصانیف و تالیفات سے یہ اندازہ لگان مشکل نہیں ہے کہ گل کرسٹ نے اردو ادب کی کتنی فیادہی خدمت کی۔ ظاہر ہے اس کے سامنے انگریز کی اقتدار کے مفادات تھے لیکن اس میں منظر سے باوجود اس کا رہا نے نمایاں پر خاک نہیں ڈالی جا سکتی اور کیا جا سکتا ہے کہ گل کرسٹ اردو کے ایک خدام رہے ہیں جن کی ادبی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ گل کرسٹ کے بارے میں سیم اختر کی یہ رائے قابل ملاحظہ بھی جا سکتی ہے:-

"چار سال کی ملازمت کے بعد خرابی صحت کی بنا پر وہ انیسویں انگلستان چلا گیا۔ یہاں کچھ ہی ملازمت برقرار رہی لیکن پانچ سال بعد یعنی ۱۸۹۰ء میں کینیڈا کی ملازمت سے ریٹائر ہو گیا۔ جب جیسٹ انڈیا گائیڈ نے سپر ملازمین کو اردو سیکھانے کیلئے لندن میں اور پریل انٹرنیشنل کی تشکیل کی تو کینیڈا نے یہ حیثیت دے دی کہ اس کا حق رکھتا ہو گیا۔ گل کرسٹ نے یہاں بھی بہت کچھ کیا لیکن بعد میں اتفاقاً قیام کی بنا پر ۱۸۹۳ء میں مستعفی ہو گیا۔ اس نے مستعفی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ کے ساتھ ملازمت سے ریٹائر ہو گیا اور نو روپے میں مقبول رہنے کے لئے وہ اپنے طور سے سب کچھ کر رہا۔ گل کرسٹ اردو میں کئی کتابوں کا مولف بھی ہے جن میں سے اس کی انگریزی ہندوستانی لغت اور ہندوستانی گرامر بہت مشہور ہیں۔ یہ اولین کتب ہیں اس لئے بعد کے مستشرقین اور محققین نے ان سے خاصا استفادہ کیا۔"

گل کرسٹ کا انتقال ۱۸۹۵ء میں پیرس میں ہوا۔

بارہ دفعہ مقامات دیکھے تاکہ زبان کی کشتیاں کا۔ ٹوٹی امواز ہو۔ لیکن ان جگہوں کے سفر میں تو اہل لغت کے سلیطے میں گل کرسٹ نے مفید معلومات جمع کیں۔ جس کی تفصیل صدیق الرحمن قدوائی کی کتاب Gilchrist and Language of Hindustan (رچنا پکاشن ۱۹۷۲ء) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۸۵۷ء میں گل کرسٹ فیملی آباد گئے وہیں انہیں "خائق پارسی" ملی۔ اس کتاب نے انہیں قدروں سے متحرک کیا کہ وہ لغات کے سلیطے میں مزید توجہ کریں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہندوستانی لغتوں سے دلچسپی لی بلکہ وہی وضع قطع بھی اپنی مثال۔ لیکن ایک اچھی لغت کے تیار کرنے کا عزم پہنچنے کی طرح تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہوا کہ سمجھ کر کہ دیگر نے ہندوستانی لغت کا ایک حصہ تیار کر کے شائع کر دیا۔ گل کرسٹ اس واقعے سے سخت متاثر ہوئے:-

"ہمارے دل کی چھت کا امواز وہی بہ جنت لگا سکتا ہے جو ترقی کی معراج پر پہنچ کر مصیبتوں کی گھاٹی میں گر جائے۔"

اس واقعہ سے گل کرسٹ بہت پریشان ہوئے۔ ان کی جان پرین آئی اور بخاریں آکر طمان کر دیا۔

۱۸۵۷ء میں جب ان کی ملاقات پیٹرک سے ہوئی تو انہیں یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس کی کتاب مکمل نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ گل کرسٹ نے اپنی کتاب کی پہلی جلد ۱۸۶۱ء میں شائع کر دی اور گورنر جنرل سے یہ منظوری ملے لی کہ اس سے ڈاک ٹکٹ کے پیسے نہ لئے جائیں۔ سمجھ کر کہ پیٹرک علم دوست آدمی تھا اس نے گل کرسٹ کی کتابوں کی اشاعت میں ذاتی دلچسپی لی۔ ۱۸۶۵ء کے ابتدائی مہینوں میں گل کرسٹ نے شکر اور رفیقوں کا کھانا بار بھی کیا۔ اس طرح ایک خوشحال آدمی ہونے کی تمام صورتیں پیدا کر لیں تاکہ ملنے کام آسانی سے انجام پائے۔ ۱۸۶۸ء میں انہوں نے لغت کا ضمیر بھی شائع کیا۔ بتایا جا رہا ہے کہ انہوں نے "تکلیات مودہ" کا مطالعہ کیا اور بھی ہندوستانی زبان کی لغت مرتب کرنے کی طرف ہلکے ہوئے۔ اس لغت کی پہلی جلد ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ سر جان شور لاڈ ویمیزی اور سمجھ کر کہ پیٹرک نے گل کرسٹ کی خاص معاونت کی۔ جس کے سبب اس کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں ان کی قواعد مکمل ہو کر شائع ہو گئی۔

واضح ہو کہ نورس ویم کاٹی کے قیام کے بعد گل کرسٹ کو ہندوستانی شے بوجھ و ضرورتوں پر دیکھنا ضرور کیا گیا۔ ۱۸۶۳ء میں گل کرسٹ مستعفی ہو گئے اور انگلینڈ واپس ہو گئے اور اپنے مہربان دوستوں سے ملنے ایل ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے ملک کی سیاست میں حصہ لیا۔ انگلینڈ میں اورینٹل زو (Oriental Zoo) بھی قائم کیا۔ گو با وہاں بھی چند نعمتیں رہے۔ گل کرسٹ نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ دوسری شادی کی شادی وہ بھی تھی۔ لیکن ۱۸۶۵ء میں گل کرسٹ کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے ایک وصیت کی کہ ان کی آمدنی اپنے مہربان دوستوں میں تقسیم کی جائے جہاں شیں

میرامن دہلوی

(۱۷۴۲ء - ۱۸۰۶ء)

میرامن کا نام میرامن ہی تھا اور تخلص تخلص۔ اس شخص کا نام کا حصہ ہے اور واقعہ ان کا پانچھٹھ صرف تخلص تھا۔ کریم الدین نے اپنے تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" میں میرامن کا نام میرامان لکھا جو بھولی رشید حسن خاں غلط لکھ ہے۔

میرامن نے اپنے کچھ حالات "بارغ و بہار" کے پہچہ میں اور کچھ اپنی دوسری کتاب "سج غریب" میں درج کئے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی اور ذریعہ ان کی زندگی کے باب میں ابھی تک سامنے نہیں آ سکا ہے۔ لہذا میرامن کے حالات کے سلسلے میں خروان کا بیان ملاحظہ ہو:-

"پچلے اپنا احوال یہ عاصی گناہ گار میرامن ولی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ امایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانشانی بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے تھہر رہا ہی جتنی چاہتے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر ملا مال اور نبال کردیا اور خاندان اور موروثی اور منصب دار قدیمی زبان مبارک سے نرملیا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کرمارے) گھر اس گھر سے آباد تھے تو یہ بہت چٹکی اٹھا رہے (عیساں راچہ عیاں) حسب صورت مل جات تھے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ درانی نے گھریا و تاراج کیا۔ ایسی ایسی جانی کھا کر ویسے شیر سے (کہ وہ خن اور ظلم بھری میرا ہے اور آٹول نال و جین گڑا ہے) جلا وطن ہوا اور ایسا بہار کہ جس کا تاجدار بادشاہ تھا غارت ہوا۔ میں نے کسی کے ہتھ میں ٹوٹے کھانے لگا۔ ڈوچے کو شکے کا سہارا بہت ہے۔ کتنے برس جلد و عظیم آباد میں رہا۔ کچھ جی، کچھ گڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اکٹھے سے روزگار نے موافقت کی، عیال و اطفال کو چھوڑ کر تین چار کشتی پر سوار ہوا، اشراف البلاد ٹھٹکے میں آب و دانہ کے زور سے آبیچھ۔ پھر سے بے کاری گزری۔ اٹھا خاں آب و دانہ اور جنگ نے جلا کر اپنے پیو نے بھائی میر کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہا لیکن ناپاؤ پناہ دیکھا۔ تب مٹی میر بہادر علی می کے پیچھے سے حضور جان گل کمرست صاحب بہادر (دام اقبال) کے دربار میں ہوئی۔ ہارے خاں کی مدد سے اسے جواں سال خرد کا دامن دھتھ لگاے۔ صاحب نے کدوں کچھ بھٹے آویں انھیں تو

یہ ہے پرورش پاکر اس قدر وہاں کو کرتے ہیں خدا قبول کرے۔"

میرامن حسین کی مرتبہ کتاب "بارغ و بہار" سے پانچواں ہوتا ہے کہ میرامن کا خاندان مجددیوں سے ہے کہ انھیں خلیفہ خلیفہ داروں میں تھا۔ لیکن یہ صورت چوہے پر قرار نہ رکھی اور صورت مل جات تھے۔ ساری جاگیر ضبط کر لی۔ احمد شاہ ابدالی نے الگ نئی چائی، پھر عالمگیر خانی کی وفات کے بعد ولی کا تخت مظاہر علی سے محروم ہو گیا۔ ایسے میں میرامن عظیم آباد آئے لیکن یہاں بھی کوئی اچھی صورت نہ مل سکی۔

بعض شہادتیں بتاتی ہیں کہ میرامن نے ۱۷۶۷ء میں دہلی چھوڑا تھا اور ان کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہو گیا۔ اس لئے کہ فرسٹ ولیم کالج کی خدمات کے سلسلے میں ان کا ذکر ۱۸۰۲ء کے بعد درج کرنے میں شامل نہیں۔ لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں۔ تمام امور کو سمجھتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:-

"اس بحث سے زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ میرامن ۱۸۰۶ء تک بقید حیات تھے۔ البتہ بلا شواہد یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس میں ان کے قریب قریب ان کا انتقال ہو گیا ہو، کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے تو گھر میں تو کتنی ہی دلیف کا سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ کالج میں تو رہیں گے قاضی نہ تھے تو گھر چھوڑ کر کالج کے لئے ترجمہ کے اہل تھے اور نہیں تو کسی انگریز ہی کو پڑھا سکتے تھے۔ لیکن ان کے بارے میں جو ایک لکھت پر طرح سے خاموشی ملتی ہے تو اس سے یہی ہمارا کیا جاسکتا ہے کہ کالج سے سکھارشی کے بعد وہ زیادہ عرصہ نہ بٹے! بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ زیادہ عرصہ جتنے یا کم، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرامن بارغ و بہار سے زندہ ہے، اس لئے تاریخ ادب کے لحاظ سے بارغ و بہار کی تکمیل کے بعد میرامن نے اپنی بقا کا سامان کر لیا تھا۔ بحیثیت معصف (یا مترجم) میرامن کی موت اس امر میں مضمر ہے کہ میرامن بارغ و بہار کے پایہ تکمیل کوئی اور کارنامہ انجام نہ دے سکا۔ اس لئے بارغ و بہار کے بعد اس کی زندگی کے بقید ایام کی گنتی یہ ہو: ہے۔"

۵۵

رشید حسن خاں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق میر پر میرامن کے تحت انھیں ترقی اردو ہند سے "بارغ و بہار" کو مرصع کر کے شائع کیا۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں چھپا اور اس کی اشاعت دوم ۱۹۹۹ء میں ہوئی۔ انھوں نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ میرامن کا صرف ایک تخلص تخلص تھا، اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ لیکن یہ بڑی شاہ جیساں آباد میں لکھا اس کی تفصیل سے ماہر کی قدیم آبادی یعنی پائے شہر کوئی کہا ہے۔ جس محلے میں وہ قیام پزیر تھے وہ سید داؤد ہے۔ چنانچہ وہاں

کا اظہار کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ وہ (میرامن) کسی محکمہ سید و نو و مہر رہتے ہوں۔ لیکن یہ محض ایک خیال ہے۔

میرامن فارسی پر دستری رکھتے تھے اس لئے کہ انہوں نے "اخلاق حسنی" کا ترجمہ "کنج ثوابی" کے نام سے کیا تھا۔ لیکن دوسری کی تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ یہ کب کا مشکل ہے۔

رشید حسن خاں اس کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کو جو جاگیر کی قلمی آکرہ میں واس کے احترام میں ہوئی، ابھی تو سورج نل نے اسے عطا کر لیا تھا۔

میرامن کے مذہب کے بارے میں واضح طور پر وہ لکھتے ہیں کہ شیعہ تھے۔

یہ خیال عام ہے کہ میرامن کے ایک بیٹے تھے جس کا تخلص احسن تھا۔ مفتی اعظم اللہ نے میرامن کے سال وفات کے سلسلے میں جو عبارت پیش کی تھی اس طرح تھی:

"حسن . میرامن کا نام دادو پسر میرامن"

لیکن رشید حسن خاں یہ لکھتے ہیں کہ مرزا احسن علی کو پہلے میرامن بنایا اور پھر انھیں پسر میرامن بنایا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں اس لئے کہ جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں ایک فقرہ اللہ تعالیٰ غور جوئی کا ترجمہ "گفتن بیست بہار" ہے۔

لیکن جو فارسی عبارت میرامن کی وفات کے سلسلے میں پیش کی گئی ہے وہ اس کتاب میں ہے ہی نہیں۔ دوسری کتاب "مواہجات اللغات" کا ذکر کیا تھا۔ اس کتاب میں بھی کہیں اس کا ذکر نہیں۔ گو یہ ممتاز صاحب نے میرامن کے بارے میں سال وفات ان کے حوالے سے قلمبند کیا تھا وہ غلط محض ہے۔

میرامن کے عظیم آباد کے قیام کے سلسلے میں یہ بھی طے نہیں ہے کہ باں انہوں نے کتنے عرصے تک قیام کیا۔

فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے سلسلے میں اس کا اظہار کیا ہے کہ میرامن دہلی ۱۲ جون ۱۸۰۶ء تک کام کرتے رہے اور انہی مہینے میں سبکدوش کر دئے گئے۔

کبھی کبھی مصنف، مولف یا مترجم کو اپنے شاہکار کی اہمیت کا احساس ہوں اور جانتا ہے جیسے وہ عارف ہو، چنانچہ "بانگ و بہار" کے سلسلے میں میرامن کا احساس تھا کہ جو کوئی اس کا مطالعہ کرے گا گو یا بانگ کی سر کرے گا اور یہ کہ ہمیشہ مرہیز رہے گا۔ اپنے تئیں مرہیز کے بارے میں یہ کوئی خوش فہمی نہیں تھی بلکہ یہ ان کے دل کی آواز تھی، جو حرف بہ حرف نکج جاہلے ہوئی۔ ایک ایسے شخص جہاں اکثر فارسیاں سننے بھی تھیں تھیں وہاں اس کا بھی خیال تھا کہ اس وقت تک لکھی جانے والی کتابیں میں "بانگ و بہار" بہتر ہیں اور عظیم تر ہیں۔ وہ اصل اس کتاب میں محض قصے سننے نہیں ہیں بلکہ قول جہاں بہال۔

"اشیا کے رسم و رواج اور آیات و کلمات اور مہلکی اور معاشی زندگی کا واضح خاکہ بھی ملتا

ہے۔ میرامن نے اس کا ترجمہ آغا غلامحسین نے کیا ہے کہ ان کی اپنی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

"بانگ و بہار" نے اردو کا ایک نیا اسلوب پیش کیا تھا۔ سادہ و سلیس اور ان اور تریلی، چنانچہ عبد یہ عبد اللہ دونوں نے نہ صرف اسے سراہا بلکہ اس کے منقرض اور بنے ساختہ انداز تحریر کو پسند کیا اور شاہنشاہ کی۔ یہ سچ ہے کہ اردو کی دوسری پرانی کتابیں اس کا ساتھ پیش کر سکتیں۔ گل کرست نے بھی اس کتاب کے ضمن میں اپنی رائے اظہار کی تھی وہ یہ ہے۔

"ابھی ہندوستانی فن میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قدر و قیمت یا صحت کے اعتبار سے اس

قابل ہو کہ میں اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لئے دے سکوں، کسی جگہ سے شاید نکالنا میرے

میں کی بات نہیں۔ جہاں کہیں کو کچھ ہے نہ ہوا اور یہ بات مجھے اور انٹل دونوں کو خوب معلوم

ہے کہ ہندوستانی شاعروں سے صرف وہی اہل مستفید ہو سکتے ہیں جن کو زبان پر کلی مہور حاصل ہو۔

ایک دو سال بعد جب وہ استاد پیدا ہو جائے گی جس کی مجھے توقع ہے کہ ہندوستانی شاعروں

کی طرف بھی ہم توجہ کریں گے۔ لی اکل ان کا خیال کرنا انتہائی بے معنی بات ہوگی۔"

میں دہلی میں "سیر و سرور و دلش" سے ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ میرامن نے کس سلاست اور آسانی اور مفہوم کی ترسیل سے کام لیا ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ وہ جو منظر ترتیب دینا چاہتے ہیں وہ بھی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اقتباس دیکھئے۔

"ایک دن ایک بوڑھا اور اس کی بڑھیا اور تین بیٹے چھوٹے چھوٹے ساتھ گئے ہوئے ٹکڑیاں

توڑنے کے واسطے اس غار کے پاس، جہاں ہاتھ پیر شدہ تھا، پہنچے اور ٹکڑیاں اس جنگل سے

پھنٹے گئے۔ بڑھیا بولی، "اگر غار سے دن کچھ بھٹکے آتے تو حاتم کو کہیں دیکھ پاتے اور اس کو

پکڑ کر ٹوٹل کے پاس لے جاتے تو وہ پانچ سو اشرفی دیتا اور ہم آرام سے کھاتے اس تکہ

دھندلے سے چھوٹے جاتے۔ بوڑھے نے کہا، کیا لڑکھتی ہے؟" غار سے طالع میں یہی لکھا ہے

کہ روز ٹکڑیاں توڑیں اور سر پہ دھر کر بازار میں بھجیں تب نوں روٹی میرا آئے میرا ایک روڑ

جنگل سے جاگے لے جاوے۔ نے اپنا کام کر۔ ہزارے تھو حاتم کا ہے کو آوے گا اور بادشاہ

سے آتے روپے دلارے گا؟ صورت نے غصہ کی سانس بھری اور چٹکی مہرانی۔"

لیکن یہاں ایک مکالمہ درج کرتا ہوں جو مرزا درج علی بیگ سرور اور مرزا غالب کے درمیان ہے اور موضوع "بانگ و بہار" ہے۔

مرزا درج علی بیگ سرور:- مرزا صاحب! اردو زبان میں کتاب کی حمد ہے؟

مرزا غالب:- "چاندور و دلش" کی۔

مرزا رجب علی بیگ سرور :- اور قضاہ کا نائب کیسی ہے؟

مرزا غالب :- ”میں اس وقت اس میں اختلاف زبان کیاں؟ ایک تک بندہ اور بھیاہ خانہ جمع ہے۔“

اگر یہ مکالمہ فرضی نہیں ہے تو پھر یہ انداز لگا تا مشکل ہو گا کہ غالب کی اردو سطر کی سلاست و روانی کا رشتہ کہاں سے قائم ہوتا ہے۔

”بارغ و بہار“ کے بارے میں ایک علامہ بھی یہ بھی ہے کہ جو قصہ اس میں درج ہے وہ بھی اصلاً میر خسرو سے منسوب ہے اس لئے موصوفہ اتی نے اپنی محالیت کے دوران اس قصے کو ہراسنے کی ضرورت محسوس کی کہ اس سے طبیعت بربطی ہے اور صحت نصیب ہوتی ہے لیکن یہ صرف میرامن کا بیان ہے اس کی تردید محمد شیرانی نے کی تھی اور رشید حسن حاکم اس تردید کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن میرامن اگر ایک سچے آدمی تھے اور کوئی غلط روایت ان سے منسوب نہیں ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ انہوں نے جو قصہ اس باب میں لکھا ہے اس کی کوئی نہ کوئی غلط ہیر ہوگی۔ ویسے رشید حسن خاں صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ ”بارغ و بہار“ کا مادہ ”نور طرز مرصع“ ہے۔ ”میر خسرو کا لکھا ہوا“ قصہ چارہ و پلش ”ایک زمانے سے مقبول رہا۔ عطا حسین خاں نے ”نور طرز مرصع“ کے نام سے اس کا ترجمہ کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :-

”یعنی یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ ”بارغ و بہار“ ترجمہ نہیں۔ میرامن نے اصلاً ”نور طرز مرصع“ کو سامنے رکھا ہے اور قصے کو اپنی زبان اور اپنے خاص انداز میں لکھا ہے۔ مذہب مفتی قاری سے ترجمہ کیا ہوا داستان قصہ ہے۔ اسے سب نے ترجمہ ہی کیا ہے مگر اسی ترجمے (یعنی مذہب مفتی) کو سامنے رکھ کر پڑھ دیا مگر شمیم نے اس داستان قصہ کو اختصار اور خاص جوابیہ اظہار کے سامنے میں و حال کر پیش کیا ہے اور ان کی کتاب ”گھڑا زخم“ کو کوئی شخص ترجمہ نہیں کیے گا، کسی نے کیا بھی نہیں ہے۔ اسے تصنیف کیا جاتا ہے اور وہ ہے بھی تصنیف۔“

”کنج خونی“ میرامن کی دوسری کتاب ہے۔ عا حسین داماد کا مفتی کی تصنیف ”عقباتی محسن“ کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ پہلے پہل یہ کتاب ۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے ناگری لپی میں شائع ہوئی۔ پھر پوری کتاب اردو رسم خط میں شائع ہوئی اس کتاب میں چالیس ابواب ہیں جن کا مضمون اخلاقیات اور مہارات سے ہے۔

یہ کتاب ۱۸۰۶ء میں ”بارغ و بہار“ کے اختتام کے بعد میرامن نے لکھنی شروع کی۔ کتاب کے آخر میں ایک قطعہ ہے جو تاریخ فتح ثروٹی سے عمل ہوا ہے۔ اسی سے اس کی تاریخ لکھی ہے کہ کب مکمل ہوئی۔ ترجمہ یہ احساس دلاتا ہے کہ میرامن کی فارسی پر کیسی قدرت تھی اور ان کی سطر کا معمول حراز کیا تھا۔ یہ صرف ”بارغ و بہار“ سے ہی نہیں بلکہ ”کنج خونی“ سے بھی ظاہر ہے۔

میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی فوت و لم کا لڑکے کے سرشتی تھے عہد سے ہر نرا تھے۔ ان کی زندگی کے حالات اب بھی پردہ غطا میں ہیں۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ یہ بچے کے رہنے والے تھے اور ان کی وراثتی میرامن سے تھی۔ ان کے آباؤ اجداد کے بارے میں بعض کتابوں میں ہے کہ میں سبزوآر تھا اور ان کے اسلاف نے عہد مظفر میں ترک وطن کیا تھا اور ہندوستان آ گئے تھے۔ انہوں نے دلی کے ارد گرد راجا مسکن بٹا یا تھا۔ لیکن بعض مصادر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی کا کچھ حصہ بہار میں گزرا اور اس کے بعد دہلی میں ٹھہر گئے۔ ”میر حسن“ میں لکھا ہے کہ :-

”جناب میر صاحب قبلہ و کعبہ محمدی و عظمیٰ سید میر بہادر علی حسینی ترغی کی کہ غنی تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس جہاں میں جز سے درست نگاہ رکھے۔ ۱۸۰۱ء میں اشرفیہ البلاد میں وارد ہو کر پینڈویشی ٹوٹی مدرسہ میں کتب بہار کے تفریق ہندوئی میں سر فراز ہوا۔“

”فوت و لم کا لڑکے میں ان کا تقریر ۲۳ مئی ۱۸۰۶ء میں ہوا۔ محمد حسین صدیقی نے اپنی کتاب ”مکی کرسٹ اور اس کا عہد“ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ شیعہوں میں حسینی کا نام سر قریب تھا۔ وجود قریش کا خیال ہے کہ ۱۸۰۳ء میں جب مکی کرسٹ چلے گئے تو حسینی ملازمت سے الگ ہو گئے ان کا انتقال ہو گیا۔“

جادو بہال نے روپک کا حوالہ دیتے ہوئے قلمبند کیا ہے کہ وہ دسمبر ۱۸۰۸ء میں کالج سے سکونش ہو گئے لیکن یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر ہیں۔ پھر بھی ان کی صحیفہ تاریخ وقایع کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

حسینی کی تصانیف میں ”نثر پے نظیر“ ”اخلاق ہندی“ ”تاریخ آسام“ ”رسالہ عقل کرسٹ“ اور ”عقباتی محسن“ (دو جلد) ہیں۔ حواہیوں نے قرآن کے ترجمے میں حسینی کی معاونت کی تھی۔ ”نثر پے نظیر“ سطر کی خلاصہ ہے عمر البیان کا۔ ”اخلاق ہندی“ ہندو پلش کے فارسی ترجمے پر مبنی ہے۔ ”ہندو پلش“ شکرست میں تھی یہ منتقل تاج الدین کی فارسی کتاب ”مطرح القلوب“ کا ترجمہ ہے اور ”مفرح القلوب“ شکرست کی ”ہندو پلش“ کا ترجمہ ہے۔ یہ اخلاقیات کی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کا حوالہ دہم گمیر کے ”قادیان جنت“ سے کیا جاسکتا ہے۔ ”تاریخ آسام“ بھی شباب اللہین تاجش کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ”رسالہ عقل کرسٹ“ اصل مکی کرسٹ کی قواعد کا اردو خلاصہ ہے۔ ”عقباتی محسن“ (دو جلد) میں کہانیاں ہیں۔ غرض یہ کہ حسینی کا لڑکپن و بچہ پن کی اہلی اہلیت ہے۔

شیر علی افسوس

(۱۷۳۶ء۔ ۱۸۰۹ء)

میر بہار علی حسینی کے بعد شیر علی افسوس ۱۸۰۸ء میں دوسرے مصرعہ مقرر ہوئے۔ ان کا پورا نام میر شیر علی جعفری افسوس تھا۔ سید علی جعفر علی خاں کے بیٹے اور سید غلام مصطفیٰ کے پوتے تھے۔ ان کا نسب سید جعفر صادق سے ملتا ہے۔ افسوس کب پیدا ہوئے اس امر میں بڑا اختلاف ہے لیکن اندازاً آٹھ لاکھ سو پندرہ سال کی عمر کے بعد دستاویزی مخطوطات میں سن پیدا آئی ۱۸۳۶ء درج ہے۔ لیکن تلب علی خاں لاکھی نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۷۴۷ء متعین کی ہے۔ وہ دب و نور و علم کا بیٹا سے وابستہ ہوئے اس وقت ان کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ ظاہر ہے ان کی یہ عمر مطلق ہوئی تھی۔ سارخ کے تذکرے میں ہے کہ آخری ایام میں افسوس ٹھٹھک میں نورس و لیم کا بی کی میر تقی گری میں مشغور ہوئے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک نثر نگار تھے بلکہ شاعری میں بھی ان کو ٹھٹھکا تھا۔ انہوں نے میر حیدر علی جبران اور میر سوز سے اصلاح لی تھی۔ افسوس کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں "آرائش محفل" "نور" "بارغ اردو"۔ "آرائش محفل" کو شیخ سبحان دے جھٹھڑی کی فارسی کتاب "خلاصۃ النوار" کا ترجمہ سمجھا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اس خیال کو رد کرتے ہیں۔ اس کی تکمیل ۱۸۰۵ء میں ہوئی۔ اس کتاب میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کا حال تفصیل سے تصدیق کیا گیا ہے۔ ان کا طرز بیان ویسا کیونہیں ہے جو میرامن کی "بارغ و بہار" کا ہے لیکن اس میں وہ بیت پائی جاتی ہے۔ سلاست اس کی خوبی ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔

"بارغ اردو" "سحر کی" "گفتار" کا ترجمہ ہے اور یہ مقصود ترجمہ ہے۔ ایک تحریر "مہوال رسم خط" بھی ہے۔ دراصل یہ گل کرست کے رسالہ "رسم الخط" کا خلاصہ ہے۔ افسوس نے اپنا کلیات ۱۸۰۳ء میں مرتب کیا تھا۔ لیکن وہ ایک نثر نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ تذکروں میں ان کے حالات تصدیق کئے گئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں میر، قائم، سوز اور سودا کا الگ الگ انداز ہے۔ انہوں نے پہلے میر سوز سے اصلاح لی پھر بعد میں جبران کے شاگرد ہوئے۔ "درب ان افسوس" میں خرواہ کا انداز عارفانہ ہے۔ اس باب میں جاوید نہال لکھتے ہیں:-

"درب ان افسوس کا وسیع و فنی نسخہ ۲۶۸، اوراتی پر مشتمل ہے۔ افسوس کا دیوان شائع ہوا تھا لیکن زمانہ برد ہو گیا۔ حتیٰ شعرا میں سارخ نے افسوس کے حال میں لکھا ہے کہ دیوان ان کا نظر سے گزرا ہے جس سے بہت ہوتا ہے کہ افسوس کا دیوان شائع ہو چکا تھا مگر اس کے مطبوعہ کلام کی کوئی کاپی شاید ہی دستیاب ہو سکے۔ افسوس کے دیوان کے چند خطی نسخے رہ گئے ہیں۔" ۵۵

یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ افسوس نے "تغلیات لغزانی" کی ترتیب میں معاونت کی تھی اور مرزا رفیع سودا کا کلیات مرتب کیا تھا۔ ان امور سے اندازہ ہوتا ہے کہ نثر کے ساتھ ساتھ شاعری سے ان کی دلچسپی کم نہ تھی۔ پھر بھی افسوس کو ادب میں مقام ایک نثر نگار کی حیثیت سے ہے۔

حیدر بخش حیدری

(۱۷۶۸ء۔ ۱۸۲۳ء)

حیدر بخش حیدری ۱۷۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۸۲۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے والد کا نام سید ابو الحسن تھا۔ اہل غریب میں حیدری کو سہاشی پریشانیوں بھٹی چیں اس لئے کہ ان کے والد تقریباً تک دست تھے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ بنارس منتقل ہو گئے اور اس طرح حیدری کا دوسرا وطن بنارس ہو گیا۔ جب نواب علی ابراہیم خاں غلیل بنارس کی عدالت کے باجم تھے۔ موصوف نے حیدری کی سرپرستی قبول کی اور ان کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کیا۔ پہلے بیل وہ قاضی عبد الرشید کے بندے میں تعلیم حاصل کرتے رہے پھر ان کے استاد مولوی کلام حسین خاں کی رہائی ہو گئے جن سے انہوں نے نقد و حدیث کا درس لیا اور علوم اسلامی کے سلسلے میں کسب فیض کیا۔ جب سید مہدی بخش حیدری تعلیم سے فارغ ہو گئے تو نواب علی ابراہیم خاں نے انہیں دفتر عدالت میں ایک جگہ سے دی۔

حیدری کو ابتدا میں سے تصنیف و تالیف کا بڑا شوق و لائق تھا۔ انہوں نے "قصہ ہر واد" کے نام سے ایک کہانی تصدیق کی اور اسی کہانی کے ساتھ ٹھٹھک چلے آئے۔ گل کرست کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی کتاب انہیں دی رہ گھر سے ایک باوقی آدمی تھے انہوں نے حیدری کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور انہیں فنی کی حیثیت سے کالج میں جگہ سے دی۔ باب و ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو بنارس واپس آ گئے، جہاں ان کا انتقال ہوا۔

حیدر بخش حیدری شاعر تو تھے لیکن ان کی دنیاوی دلچسپی نثر سے تھی۔ کئی مشہور کتابیں انہیں اندر و بخیر کے لئے کافی ہیں مثلاً "قصہ ہر واد"، "لیلی مجنوں"، "مہلت بیکر"، "تاریخ دہلی"، "دھنچن ہند"، "تو تہ کہانی"، "آرائش محفل" اور "گل مغرے"۔

"لیلی مجنوں" دراصل امیر خسرو کی مشہور کہانی کا ترجمہ ہے۔ "تو تہ کہانی" کی اصل فارسی ہے۔ اس کا ایک فارسی ترجمہ حیدری کے سامنے تھا جسے شکرست سے مولانا ضیاء الدین بخش نے لاری میں ترجمہ کیا تھا اور فارسی کا خلاصہ سید محمد قادری نے احوال تحریر میں لایا۔ حیدری نے اسی خلاصے کو اردو کا قافیہ دے دیا لیکن یہ ترجمہ بہت مقبول ہے اور حیدری کی عظمت پر دال ہے۔ "آرائش محفل" اصنافِ قہم خانی کے فارسی قصے کا خلاصہ ہے۔ واضح ہو کہ اس نام سے افسوس کی "آرائش محفل" بھی ہے لیکن حیدری کی کتاب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دو ترجمے جو حیدری نے کیا۔ مثلاً حسین دامن کا خطی

کا ترجمہ ہے اور مرزا اسد علی کی کتاب "تاریخ نامے" کا ترجمہ "تاریخ نامہ" ہے۔

ان ادبی خدمات سے پہلے چلتا ہے کہ سید حیدر بخش حیدری کس حد تک ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی زبان سلیس اور رواں ہے۔ محاوروں کا بھرپور استعمال ہے۔ ان کے یہاں بلا کی کٹائی بھی پائی جاتی ہے۔ مگر مگر حیدری میر ابن بلوی کے درجے کو نہیں پہنچتے۔

کاظم علی جواں

مرزا کاظم علی جواں بھی فورٹ ولیم کالج سے تعلق رکھنے والوں میں ایک تھے۔ شاعر بھی تھے لیکن شاعری کی وجہ سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ کاظم قریشی کا بیان ہے کہ جواں اور مظہر علی خاں دلاؤنوں ہی کا انتخاب نومبر ۱۸۰۰ء میں ہوا۔ انتخاب نکتہ میں ہوا لیکن مرزا کاظم علی جواں ۱۸۰۱ء میں نکلتے آئے۔ پھر دوسرے ہی دن "نکلتا" کے باب میں انہیں کام سپرد کیا گیا۔ واضح ہو کہ جواں ملازمت کی تلاش میں بھٹو آتے تھے۔ کچھ دنوں تک عظیم آباد میں قیام کیا۔ کرنل اسکات کی سفارش پر کالج کا منتفی مقرر کیا گیا۔ جاوید نہال کا بیان ہے کہ جواں کا حاصل نام حسن علی خاں تھا لیکن اس نام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ جواں کی پیدائش اور وفات کی تاریخوں پر اختلاف ہے۔ لیکن ۱۸۴۲ء تک وہ بڑی حیات تھے۔ ان کا انتقال نکلتے ہی میں ہوا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۸۳۰ء اور ۱۸۳۵ء کے درمیان ہی ان کا انتقال ہوا ہوگا۔ لیکن وارنٹ نے فورٹ ولیم کالج کے بعض کاغذات کی بنیاد پر ان کی تاریخ وفات ۱۸۱۶ء بتھین کی ہے۔

جواں کا قابل لحاظ شاعری کا نام "نکلتا نامہ" ہے۔ جواں نے اس کے دیباچے میں بعض احوال رقم کئے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ مغل کرسٹ کی بدایت پر ہی انہوں نے یہ کام کیا تھا۔ اس نامک کے سلسلے میں جاوید نہال کا یہ بیان قابل ذکر ہے:-

"نکلتا نامہ" منسکرت کے مشہور شاعر کالی داس کی تصنیف ہے۔ منسکرت میں اس کا نام ابھی "کالیان قتلعلک" ہے۔ کالی داس کے اس نام کے کوڑا والی شہرت اور مقبولیت ہوئی ہے۔ جواں نے اس مقبول و معروف نام کا ترجمہ منسکرت سے نہیں کیا۔ فرخ سیر بادشاہ کے ایک نوینی سردار مولیٰ خاں کی فرمائش پر نواز کشمیر نے برج کی زبان میں لکھا، جو بعد مقبول ہوا۔ نواز کشمیر نے ترجمہ کیا اور دو جوں میں کیا تھا، جس کا ترجمہ آسان نہیں تھا۔ اس دشواری کا ذکر جواں نے خود کیا ہے۔"

"نکلتا" کا ترجمہ سلیس اور رواں ہے لیکن کہیں کہیں عبارت کو بھی بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جواں کی دوسری اہم کتاب "نکلتا نامہ" ہے۔ اس کے ترجمے میں اللوال جی نے معاونت کی تھی۔

جواں نے قرآن شریف کا ترجمہ بھی کیا تھا لیکن اس کی عبارت ہے وہ ابھی ہے اور تقریبی پہلو بھی لئے ہوئے ہے۔ جواں نے "تاریخ قریش" کا بھی ترجمہ کرنا چاہا تھا، جو مکمل نہ ہو سکا۔ لیکن یہ بھی تاریخ "نکلتا" کا ہی حصہ تھا جو "تاریخ قریش" میں ہے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ جواں شاعر بھی تھے اور انہیں اس پر فخر بھی تھا لیکن ان کا واحد شعری سرمایہ "جاوید نامہ" یا "جاوید بند" ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے اپنی شاعری کا کوئی دیوان مرتب کیا تھا یا نہیں۔ جواں نے میر درد سواد کے کام کا انتخاب بھی مرتب کیا تھا۔

مظہر علی دلا

(۱۷۶۱ء - ۱۸۱۶ء)

دلا کا پورا نام مرزا علی الحف مظہر علی خاں دلا ہے۔ یہ مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا شمار دلی کے شرفاں میں ہوتا تھا۔ ان کے والد یحیٰ علی خاں دلا مرزا فرخ پور کے استاد بھی رہے تھے۔ وردے بھی ان کی شاگردی اختیار کی تھی۔

دلا کی تاریخ پیدائش یحییٰ خاں - ایک اندازے کے مطابق ۱۷۶۱ء کے قریب دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کی وفات پر سیف الدولہ بخشی الملک بخت گلی خاں بہادر ظفر جنگ کی رفاقت میں آئے اور بہت دنوں تک ان کے ساتھ رہے۔ پھر مرزا جواں بخش جہاں دار شاہ کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ لیکن وہاں کی دشمنوں سے عاجز آکر ۱۸۰۳ء میں بھٹو گئے۔ پھر ان کی وفات آصف الدولہ کے شیر داہا لکھنؤ روانے سے ہوئی اور انہیں کی وساطت سے نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ آخر انہیں کرنل اسکات کی مدد سے فورٹ ولیم کالج میں جگہ ملی اور نومبر ۱۸۰۰ء میں وہاں کے منتفی ہو گئے۔ ان کی وفات ۱۸۱۶ء میں ہوئی۔

دلا کی تصانیف میں "نکلتا نامہ" اور "کمال" "بیچل بکھیتی" "جہانگیر شاهی" "ترجمہ چارہ نامہ معلوم" اور "تاریخ شیر شاهی" ہیں، جو مشہور بھی ہیں۔ "نکلتا نامہ" ناصر علی بگڑائی کی ناری تصنیف کا ترجمہ ہے۔ یہ تصنیفوں کی کتاب ہے۔ سال تصنیف ۱۸۰۱ء ہے۔ "دعویٰ اور کام کمال" ۱۸۰۱ء میں برج بھاشا سے ترجمہ ہوئی۔ اس کا ایک حصہ مغل کرسٹ نے "بیاض ہندی" میں بھی چھاپا تھا۔ "بیچل بکھیتی" کا قصہ راجہ بکر اچیت کے زمانے میں منسکرت میں لکھا گیا تھا، پھر برج بھاشا میں ترجمہ ہوا تھا۔ دلا نے برج ہی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا اور اس ترجمے میں اللوال جی نے معاونت کی تھی۔ فارسی و قبائل نامہ جہانگیری کا ترجمہ ہے۔ "ترجمہ چارہ نامہ معلوم" شرف سواد کے چند نامے کا ترجمہ ہے اور یہ ترجمہ معلوم ہے۔ سال ۱۸۰۲ء میں "بارش اور د" کی جلد دوم کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ "تاریخ شیر شاهی"

اور اصل "تختِ آئینہ شاهی" کے تیسرے نسخے کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں دو بادشاہ شہر شاہ اور عیاضوں کے مجدد کے واقعات کا تسلسلہ کئے گئے ہیں۔

دلا کی ایک شاعرانہ شہیت بھی ہے۔ ان کا کلام کسی ایک صنف میں بند نہیں۔ "دیوانِ دلا" کی تدوین ۱۸۱۰ء میں ہوئی تھی۔ لیکن دلا کی دعو کی میں یہ دیوان شائع نہ ہوا۔ (اکثر عبادت بریلو نے اسے پاکستان سے شائع کیا ہے۔

للؤللال جی

(۱۷۶۲ء - ۱۸۲۴ء)

ان کا پورا نام للؤللال جی کوئی تھا۔ ان کا سن دلا دست ۱۷۶۲ء کے آگے یا اس کا پورا حال ہے۔ یہ بے نام چندر شکل نے اپنی کتاب "ہندی ساریتہ کا تہا سہا" میں ان کی تاریخ پیدائش ۶۳ء اور کبھی ہے۔ اور گنجی ساگر وار شے نے ۱۷۴۷ء متعین کیا ہے۔ یہ شے بھاکھا کے میر شکی تھے اور ان کا تقریر ۱۸۰۲ء میں ہوا تھا۔ (ار شے کے مطابق یہ ۱۸۲۳ء تک کالج سے وابستہ رہے۔

لؤللال جی کی اہمیت جدید ہندی شری وجہ سے ہے۔ لیکن انہوں نے بعض کتابیں اردو میں دوسروں کے اشتراک سے لکھیں یا آزادانہ طور پر لکھی۔

ان کی ایک کتاب "لغاتِ ہندی" ہے۔ یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں خطوں میں شائع ہوئی۔ اس میں ایک سو دہا بتیاں ہیں۔ برج بھاشا کے قواعد کی ایک کتاب اردو میں ہے جو ۱۸۱۱ء میں شائع ہوئی۔ ان کی دوسری کتاب "پیم ساگر" "لال چھوڑیکا" "راج جی" "دھوہ اس" "نچرہ ہیں۔ لیکن یہ سب ہندی میں ہیں۔ چند کتابوں کی تالیف یا ترجمے میں دوسرے ادیبوں کے ساتھ انہوں نے معاونت کی۔ دو کتابیں ہیں "چالی بھجی" "نکلتا" "سہاسن جیتی" "اراجل" اور "تھلیات لڑائی"۔

نہال چند لاہوری

نہال چند لاہوری کی پیدائش دلی میں ہوئی تھی۔ لیکن کل کرست ان کا وطن بارادوست تھاتے ہیں۔ چونکہ ان کا قیام زیادہ تر لاہور میں رہا تھا۔ لیکن وجہ ہے کہ انہیں لاہوری کہتے ہیں۔ وہ ۱۸۰۲ء میں نکلتے آئے۔ ڈاکٹر جی کرست نے انہیں فورٹ ولیم کالج میں ڈاڑست دے دی۔

ہندوستانی لوگ کھڑاں میں "گج بکولی" کی ایک اہمیت ہے۔ اس کی شہرت مقبولیت بھی خاصی ہے۔ اسے

حضرت اللہ بکالی نے فارسی میں تصنیف کیا تھا۔ لاہوری نے اس کا ترجمہ اردو میں کر دیا اور اس کا نیا نام "ذہبِ حقیق" رکھا۔ واضح ہو کہ "گلزارِ نسیم" چندے دیا نظریہ میں بھی "ذہبِ حقیق" مشکوئی میں پیش ہوئی ہے۔ لاہوری کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ انہیں اس کتاب پر ایک سو پچاس (۱۵۰) روپے انعام بھی ملا تھا۔ اس کی ڈھائی سہل اور دواں ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۸۱۳ء ہے۔

نہال چند لاہوری کب پیدا ہوئے اور ان کا انتقال کب ہوا، تفصیل نہیں ملتی۔

شیخ حفیظ الدین

مولوی حفیظ الدین فورٹ ولیم کالج کے ممتاز مصنفین میں ایک ہیں۔ ان کے والد کا نام شیخ جمال الدین تھا اور والدہ محمد اکبر تھے۔ ان کے خاندان کے احوال میں یہ ہے کہ ان کے جد اعلیٰ عرب سے ترک وطن کر کے حیدرآباد آئے۔ لیکن ان کے پردادا شیخ حسن نے حیدرآباد سے قتل ہو کر بنگال کا پانچ سطر بنالیا۔ گو یہ یہ خاندان نہیں چھوڑا بھلا۔

حفیظ الدین کے والد شیخ بدل الدین ایک ذی علم آدمی تھے۔ انہیں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس کی حیثیت حاصل تھی۔ حفیظ الدین نے بھی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی فارسی میں کافی دستگذاشتی ادارے سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔

ذہبِ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ۳۳ مئی ۱۸۰۹ء میں فورٹ ولیم کالج میں فارسی کے مدرس ہوئے اور انہیں چالیس (۴۰) روپے ماہوہ کرکھواؤ ملنے لگی۔ انہوں نے ابو الفضل کی کتاب "عیار افش" کا اردو میں ترجمہ کیا اور اسے گلزارِ نسیم کے نام سے شائع کیا۔ عیار افش کے مکمل کالج کانسل کے سرکاری کو ایک خط لکھ کر انعام کی سفارش کی۔ اس خط کے چند سطروں میں شرح ہیں۔

"میں انجائی مسرت کے ساتھ ایک مفید ترین اور مشہور کتاب "عیار افش" کا جدید حسانی ترجمہ کالج کانسل کے ملاحظہ کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ لاہری شے کے مولوی حفیظ الدین نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ مزہم کی درخواست انہیں احوال کے لئے کافی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے اچھے کام کے لئے کانسل انہیں انعام ضرور دے گی۔"

کل کرست نے اس کا بھی اظہار کیا تھا کہ حفیظ الدین کی بہت انجائی ہوئی تو وہ "الف لیل" کا بھی ترجمہ کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "عیار افش" پر چھ سو روپے کا انعام ملا۔ اس کا پتہ نہیں تھا کہ حفیظ الدین فورٹ ولیم کالج سے کب سکھ دوش ہوئے لیکن وہ ۱۸۱۵ء میں دلی میں موجود تھے اور پانچ سو روپے تنفہٹ منکونہ کے منشی تھے۔ ڈاکٹر سچانند لکھتے ہیں کہ ان بیان سے پتہ چلتا ہے کہ کالج سے ان کا تعلق ۱۸۱۵ء سے کل حقطع ہو چکا تھا۔

"عیار افش" کے علاوہ کوئی دوسری تصنیف (تالیف جو حفیظ الدین کی یادگار ہو سکتے ہیں) ملی۔ لیکن "عیار

والفعلی "گزشتہ" ہے اور اس طرح ان کا نام بھی۔ مولوی حفیظ الدین نے اس کا ترجمہ ۱۹۰۳ء میں مکمل کیا۔ "عباد والفل" "کلیپ دوسرا" کا ترجمہ ہے حبیب غازی میں خلاصہ میں: "املا کا شغل" نے لکھا، جو "انوار اسلمی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ "عز وافرور" اسی کا ترجمہ ہے، جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کتاب کی دو بار بھی ترتیب ماسنے آئی لیکن یہ نئی ترتیب دینے والے غلام اکبر مرزا کی جگہ غلام قادر نور مولوی سید کاظم علی تھے۔ ایک ایسا مقدمہ بھی ماسنے آیا اور اسی مقدمے کے ساتھ ہی یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔

(—1.474)

نبیؐ نارائن کا اصل نام رائے نبیؐ نارائن تھا۔ ان کے والد موزشت نارائن تھے اور دادا بھی نارائن۔ متعدد محققین نے اس کا اظہار کیا ہے کہ نبیؐ نارائن کا اصل غورٹ دہم کا گج سے تھا۔ لیکن جدید ترین تحقیق یہ بتاتی ہے کہ وہ اس گج سے کبھی وابستہ نہیں رہے تھے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں کہ:-

”کالج سے باضابطہ تو نسل کی طرف کوئی مبہم اشارہ بھی کیا جو اس بات کی قوی دلیل ہے کہ وہ کسی وقت بھی کالج کے ملازمین کے ذمے میں شامل نہیں رہے۔“

ایک اور مسئلہ میں ضیف نقوی کی تحقیق اجنبی اہم ہے۔

”ایک اور غلط فہمی جو زیادہ عام اور مقبول ہے وہ یہ کہ نئی نثرانیں شاعر بھی تھے اور جہاں نظمیں کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی نثرانیں نے ’دیوان جہاں‘ کا دیباچہ نظم میں لکھا ہے اور دوسری تصانیف میں بھی موقع بہ موقع طبعی اور ادبی شاعر شامل کئے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ’دیوان جہاں‘ میں خود کو شاعر متعارف کرانے کا شعر گوئی سے اپنے شغف کی نشاندہی کی ہے اور نہ کسی دوسرے مستند ذرائع سے ان کا یا تا حد شعر کہنا ثابت کیا ہے۔ اس طرح یہ بات بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ وہ جہاں نظمیں کرتے تھے۔ ’دیوان جہاں‘ کے دیباچے میں انہوں نے آخری سے پہلے شعر میں اپنے مکمل نام ہی کو بطور نظم پیش کیا ہے۔ یہی مکتبہ ’بیعت‘ ہارٹ معلق“ کے دیباچے میں بھی شامل ہے۔ کسی ناگزیر مجبوری کے بغیر نظمیں کی موجودگی میں ہم کے استعمال کی کوئی مستول بات نہیں کی جاسکتی۔“

یہ بات بھی شاید غلط ہے کہ آخری عمر میں حضرت میرا حوصلہ کی تحریک سے متاثر ہوئے اور اسامہ کو قتل کر لیا۔ لیکن یہ تمام باتیں غروغی ہیں، اصل ان کی تصانیف ہیں جن کی اہمیت ہے۔ ایسی تصانیف میں "چار بخشین"، "مختار حسن"

”دیوان جہاں“، ”تقریر طبعی“، ”نوبہار“، ”بارغ عشق“ اور ”صحابی المظاہرین“ ہیں۔ جن کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔
 ”چار گھنٹن“ ایک فصیح و راقع حنیف سے بہرہ ور ہے جو ہر اثر بھی سے اس حنیف پر انجمن انعام بھی ملا۔ ”بہار عشق“
 بقول حنیف نقوی ۱۸۱ء کی حنیف ہے۔ شاید یہ داستان ہے جس کا کوئی نسخہ ابھی تک دریافت نہ ہو سکا۔ ”گلزار حسن“
 بھی ایک داستان ہے۔ اس میں یوسف و زلیخا کا قصہ بیان ہوا ہے۔ ”دیوان جہاں“ کتب سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس
 لئے کہ یہ تذکرہ ہے لیکن اصلہ پر غور کا جس سے ہر مس جس بڑے انداز سے ۱۹ شعرا کے کام کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ”تقریر
 طبعی“ کا ایک ہی نسخہ ہے جو حنیف نقوی کی ملکیت ہے۔ اس میں کچھ اجنبی شخص اور مبتدل نسل ہیں۔ ”نوبہار“ کا سری گل
 صورت کا ترجمہ ہے۔ ”بارغ عشق“ انیسویں صدی کا تذکرہ ہے۔ اس کا ایک ہی نسخہ ہے جو انجمن ترقی اردو دہلی میں ہے۔

مولانا چارمادریع اللہ کی قارئین تعریف ”صحیفۃ النعمان“ کا ہے اور ترجمہ ہے اسی کتاب نے یہ غلط فہمی دور کی ہے کہ نبی ہمارا اُن مسلمان ہو گئے تھے۔

نئی تاریخ کا انتقال ۱۳۳۵ھ میں ہوا تھا۔ یہ تاریخ سید محمد نے دریغ کی ہے۔ ❖❖

مرزا علی اظہار

 $(\zeta_{\text{eff}} = 1.24)$

مرزا لطف کی داد دے جاوے نہال کے مطابق ۶۰ء اور ۶۲ء کے درمیان دلی میں ہوئی۔ مرزا علی لطف کے والد کاظم جیکے خاں تھے، جو استرا پاؤ کے رہنے والے تھے۔ ہمارے مشاہد کے مطابق ۱۲۱۱ھ میں ہندوستان آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔ ان کی تعلیم دلی میں ہوئی۔ انہیں ادب کا بڑا ذوق تھا۔ اسی سبب سے گل گڑست انہیں فرشتہ و لہجہ کافی کے مصنفین کی صف میں لے آئے۔ لیکن حقیقت صدیقی نے انہیں کافی سے غیر حلقی مصنفین کی صف میں جگہ دیا ہے۔ ۱۲۱۱ھ انہیں شعرا نے اور داد کر دہرحیب دینے کا کام سونپا گیا۔ لطف نے ابوالہجیم خاں کے "تذکرہ گلزار ابرار" میں "کوسا شے و کھاوار" اس میں اپنے طور پر کافی اضافے کیے۔ پھر اس کا نام "گلشن ہند" رکھا۔ واضح ہو کہ تذکرہ "گلشن ہند" ایک عربی سے تہذیبی ادب کی نگہروں سے ارتحال دیا، لیکن ایک حادثے نے کافی کا پیوستہ دلی۔ حیدرآباد کی مولوی لدھی میں طوفان برپا ہوا۔ کافی قصائدات ہوئے، لیکن نامعلوم کچھ "گلشن ہند" کی ایک جلد سیلاب میں بہتی ہوئی ایک جگہ آگئی اور ایک صاحب کی ملکیت ہو گئی۔ بعد میں مولوی میر الحق نے اسے قہارت اہتمام سے مرچہ کیا۔ پھر اسی تذکرے کو انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا۔

الحق کی ایک شہیت شام کی بھی جیسے انہوں نے اپنا ایمان بھی مرتب کیا تھا۔ شیفت نے اسے مذکورہ "مفتخسن" سے قرار

میرا کرام علی کی ولادت عیدہ بیگم کے قول کے مطابق ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ ۵۰ لیکن نام بہت دوری
سائل ولادت ۱۸۷۵ء درج کرتے ہیں۔

اکرام علی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ جب یہ بچہ ہی تھے کہ ان کے والد مطلقہ و آخر ہو گئے۔ اب ان کی
پرورش بچانے کرنی شروع کی۔ تعلیم نے جب فراغت ہوئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہو گئے عورت و دلچسپی کے
تذام کے بعد ان کی ملازمت وچری منتقل ہو گئی۔ چار چھ سال کتب خانے میں ان کی ملازمت کا زمانہ ۱۸۰۶ء قرار دیتے ہیں
تجلیہ رام پور سیکشن ۱۸۱۲ء مقرر کرتے ہیں۔ اکرام علی نے ۱۸۰۱ء میں ایک اردو اخبار بھی جاری کیا تھا لیکن اس بارے میں
مزید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ کالج کی ملازمت میں موصوف ترقی کرتے گئے اور صدر الصدور ہو گئے۔

مولوی اکرام علی کی شہرت ان کی کتاب "افغان الصفا" کی وجہ سے ہے۔ اس میں اکیادہ (۱۱) رسائل
ہیں۔ یہ رسائل چوتھی صدی ہجری کی تصنیف ہے اور مرلی میں ہے جسے موصوف نے اردو میں منتقل کیا۔ پرتیر ۱۸۱۱ء میں
سامنے آیا۔ چھپے ہی اس کی چھاپی ہوئی اور یہ کتاب نصاب میں داخل کر دی گئی۔ اس کتاب میں حیوان اور انسان کی
برتری کے بعض سوالات جنوں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ دراصل چاندوروں کے ساتھ انسان کا جھگڑالہ
رو بہ رہا ہے اس کے خلاف یہ مقدمہ ہے۔ ہر جانور اپنا بیان دیتا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر ڈیمس نے اس کا ترجمہ مکمل کیا۔ لیکن
یہ ترجمہ نکاح چھا شخص تھا چنانچہ کچھوں نے اس کی فرمائش پر اکرام علی نے اس کی تصحیح کی اور زبان کو سوار اور نکھارا۔
مولوی اکرام علی کی دوسری کتابوں میں "مصلحین اسلام" کی بھی اہمیت ہے۔ اس کتاب میں یاد و سوسالی کے
مصلحین اسلام کے حالات درج ہیں۔

مرزا جان پیش

(۱۸۷۹ء۔۔۔ ۱۸۹۱ء)

ان کا پورا نام محمد اسلم علی ہے مگر مرزا جان سے مشہور ہوئے۔ شاعر تھے اور پیش فکس کرتے تھے۔ ایک اندازے
کے مطابق ۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بقول ڈاکٹر فطین مرزا جان پیش ۱۸۷۹ء یا ۱۸۷۷ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۵۵ لیکن
چار چھ سال ان کی پیدائش ۶۲۔۷۰ء کے درمیان جاتے ہیں۔ چھٹیں عبدالودود کے مطابق ان کا انتقال ۱۸۹۱ء میں ہوا
۵۵ اور سہرگرنے ان کی وفات ۱۸۹۶ء ہی تصدیق کی ہے۔ ساری زندگی دہلی میں رہے اور ملازمہ ان کی محبت رہی۔
زبانوں کے جانے اور سمجھنے کا انہیں بڑا شوق تھا۔ عربی اور سنسکرت زبانیں سمجھیں۔ ملاقات پر بھی نظر تھا۔ پیش فواید پھر در
کے شاگرد تھے۔ اس کے علاوہ انہیں سائل اور دیانت اللہ خاں کی شاگردی کا بھی شرف حاصل تھا۔ مرزا جان بخت جہاں

میں انہیں میر کا شاگرد بنایا ہے لیکن تسلی اس کی تردید کرتے ہیں۔ ۵۰
لفظ نے غزلیں بھی کہیں اور دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ لیکن بحیثیت شاعر انہیں کوئی امتیاز حاصل
نہیں ہوا۔ اس باب میں دوسرے امور کے ساتھ ڈاکٹر سید الفی تفصیل ملاحظہ ہو:-

"لفظ نے اپنا جوانی بھی مرتب کیا تھا۔ جس میں غزلوں کے علاوہ دوسری اصناف سخن کے
نمونے بھی شامل تھے۔ لیکن شاعر کی حیثیت سے انہیں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں۔
لیکن بعد ان کی واحد تصنیف ہے بطنی اردو نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے اور جس کی بدولت
تاریخ ادب میں آج بھی ان کا ذکر قائم ہے۔ یہ علی ابراہیم خاں کے مشہور تذکرے نگار ابراہیم
کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ لفظ نے بقول خود اس کام کو دو حصوں
میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلی جلد "ملاضین" نامہ اردو امرائے عالی و قار اور "شعراے صاحب وقار" کے
لئے جو نام اور اور صاحب دیوان تھے جنہوں کی حق تعالیٰ اور دوسری جلد میں شعراے گمنام
و غیر وہ مشق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اس تذکرے کی صرف پہلی جلد دستیاب ہے۔ دوسری جلد
کا حال کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ یہ جلد اولیٰ صرف (۱۲۸) شعروں کے ذکر پر
مشتمل ہے۔ لفظ نے اس میں علی ابراہیم خاں کے قرائم کروہ حالات اور کلام دونوں پر اہم
اخذائے کئے ہیں۔ اس کا چھاپا ۱۲۸۶ھ میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے مولانا شبلی کی
تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ ڈاکٹر علی
الدین قادری زور سے اسے نگہزار ابراہیم کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس
سے چھپا کر شائع کیا۔ ۵۵

محمد اکرام علی

(۱۸۷۵ء۔۔۔)

مولوی محمد اکرام علی کے سورت اہلی کا وطن تھا لیکن ان کے ایک بزرگ شیخ کمال الدین سلیمان ترک
وطن کر کے ہرنول گئے اور یہیں سکونت چاہی ہو گئے۔ ان کے بزرگوں میں شیخ جمال الدین سلیمان کا شیخ مشہور ہوئے جو بقول
نقیس احمد صدیقی بابا فرید الدین کے والد ماجد تھے۔ ۵۵ بعد میں اسی خاندان کے ایک فرد شیخ محمد رحیم مینا پور آ گئے۔
محمد اکرام علی کا سلسلہ نسب اسی خاندان سے ہے۔ دینی نام بہت پوری ان کا شجرہ حضرت عمر فاروق سے وابستہ کرتے ہیں۔

حمید الدین بھاری

پروگرام سید محمد خالد علی بہار کی ہے۔ ان کا تعلق صوبہ بہار سے تھا۔ محل کرسٹ کے واقعہ ہی میں راولپورسٹ وایم کالج سے وابستہ ہوئے۔ راولپنڈی کی تاریخ ۱۹ اگست ۱۹۴۳ء کی جاتی ہے۔ وہ انہوں نے "خوان الوان" کے نام سے ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ اسی کتاب کی وجہ سے یہ معروف ہیں۔ اس میں کونانا پائے کی ترکیبیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب چھ بیس (۶۳) ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کو ایک خزانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ طعام خانہ کے باب میں مہطلات بھی ہیں، چاقو خرنی باب ہے۔ ایک فرجنگ بھی اسی کتاب کا جزو ہے۔ شاید یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن میں اوثاق سے نہیں کہہ سکتا ہوں۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر سید زلمی میں محفوظ ہے۔

مرزا محمد قاسم

مرزا احمد فطرت کا نام مرزا احمد خاں اور فطرت فخرتے تھے۔ اس کا وطن بنگالہ تھا۔ اس زمانے کی ایک کتاب سر جان مر لے ایچ لے کی "توحید اور انجمنی" نامیوں نے اس پر نظر ثانی کی۔ یہ کتاب ۱۸۶۰ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس میں جندو متنان کے دین جن کے بارے میں کچھ معلومات درج ہیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے ولیم ہنٹر کے اشتراک سے "انجیل" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے وہ ایلیٹریں ۱۸۵۵ء اور ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئے۔ فطرت نے اس ترجمہ میں ایک پارسی ماہرین کی بھی مدد لی تھی۔ فطرت نے جیسا بھی ترجمہ کیا خدا اس سے بعد میں مسلسل استفادہ کیا جا رہا۔

تاریخ چین مترا

$$(\vdash \Delta F \subseteq \vdash \Gamma \subseteq F)$$

حضرت افرستہ دہلیہ کا کالج ہے ۲۱ برسوں تک وابستہ رہے۔ ان کی ولادت ۱۷۷۷ء میں ضلع بھٹی کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کے بزرگوار پارسی تھے۔ تعلیم رکھتے تھے۔ انہیں عربی فارسی پر خاص طور پر محنت تھی۔ اردو زبان پر بھی کامل عبور تھا۔ جب میر تقی میر علی انیسویں کا انتقال ہو گیا تو ان کے چاچا بھی ہوئے۔ ایک زمانے تک انہیں فراوانی کیا گیا لیکن آہستہ آہستہ انہیں یاد کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ مزار کی اہم تالیف ”تہذیب القباۃ“ سمجھی جاتی ہے، جسے فارسی اور دیوناگری کے علاوہ دو زبان میں خط میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ گل کرست نے اس پر ایک مقدمہ لکھا تھا۔ ”تہذیب القباۃ“ انہیں ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی تھی لیکن ایک سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں ایک حوا (نہد ۱۰۸) کا جتنا ہے جس میں سناس کا ایک فقرہ

دارشاد کے دو باریوں میں بھی گھے۔ لیکن یہ اداکن مہر کی بات ہے۔ بس جہاں دارشاد کا انتقال ہو گیا تو وہی سے ختم ہو کر جا کا آ گئے۔ تو آپ سید احمد علی خاں کے مصداق ہیں گئے، پھر فکرت آئے۔ جہاں فروٹ و لیم کالچ سے وابستہ ہو گئے۔ مرزا جان بخش کے سپرد یہ کام تھا کہ دستریب دی ہوئی کتابوں پر نظر ثانی کریں لیکن انہوں نے ”بہار دانش“ کے نام سے فارسی قلم کو اردو میں قلم کیا۔ ان کی ایک کتاب ”مفسر البیان فی مصطلحات ہندوستان“ ہے جو ۱۸۴۹ء میں فروٹ و لیم کالچ کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

مولوی امانت اللہ شیدا

$$(-1)^{n+1} \frac{1}{n!} \left(\frac{1}{x} \right)^{(n+1)}$$

مولوی امانت اللہ کا تخلص شیدا تھا۔ ان کے حالات کی خبر نہیں۔ وطن بھی نہیں معلوم۔ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ تھے تو ان کے چارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ ۱۸۵۰ء میں انہوں نے ”اخلاقِ جلالی“ کا اردو ترجمہ کیا اور نام رکھا ”جامع الاخلاق“۔ انہوں نے تو اندر صرف دھوکہ اور تقلید کا پیمانہ چن لیا۔ یہ کتاب بھی ۱۸۵۶ء میں منظوم ہوئی۔ اس کا نام ”دعوت الاسلام“ رکھا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے قرآن شریف کا بھی اردو ترجمہ کیا تھا۔

شیدائے "غلیات اللہی" کے لئے کہانوں کے ترتیب اور ترتیب میں معاونت کی۔ شیدا مرثیہ نقاری کے جید عالم سمجھے جاتے تھے۔ شاہراہ بھی تھے اور ان کا تخلص شیدا تھا۔ ان کا خاندان دلی سے ہجرت کر کے کلکتہ آ گیا۔ شیدائے بہمن کے در عالیہ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر ان کے علم و فضل کی اچھی شہرت ہوئی کہ وہ قوت و علم کالج کی ملازمت میں آئے اور شہید ہندوستانی سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی شہیت ایک مہرجم کی تھی۔ ۱۸۴۶ء میں کلکتے میں انتقال ہوا۔ ان کی حلد درجۃ علی کتابیں معروف ہیں:

”ہدایت الاسلام“ (دو جلد) یہ موصوف، علی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں اسلام کے احکام و قوانین ہیں۔ اس کی ایک ہی جلد شائع ہوئی تھی۔ دوسری جلد شائع نہیں ہو سکی۔

دوسری کتاب ”جامع الاخلاق“ ہے۔ دراصل یہ مولانا جلال الدین محقق دہلوی کی ”اخلاق جلالی“ کا ترجمہ و تالیف ہے۔ یہ کتاب کے شائع ہونے پر

ایک اور کتاب صرف و نحو اعد کے موضوع پر ہے۔ لیکن نظم میں ہے۔ یہ کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں، انہیں کی جیسے شہید ان کی اولیٰ خارج میں ایک جگہ ہے۔

شیعہ ائمہ کا قلم علیٰ جنوں کے شعر اک سے قرآن شریف کا اور دوسرے محمدی کیا تھا۔ اس کے علاوہ ”علیہ السلام“

ہے۔ اسی بناء پر اس کا سواژہ "گلستانِ سعدی"؟ "بہارِستانِ جامی" اور "قائوس نامہ" وغیرہ سے کیا جاتا ہے۔ زبان سبیل اور عام فہم ہے۔ ایک دوسری کتاب "پادشہ پر کچھا" ہے۔ یہ بھی ایک ترجمہ ہے اور مستحکمت سے ہے۔ یہ اخلاقی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ تاجرنی چرنِ سترانے کچھنیں روک کی کتاب کھڑی ہو لی کی کہانیوں کو مکمل کیا تھا اور گمان چند کے مطابق "نکایتِ شہتِ آسوز" (دو جلد) بھی تھکبند کی تھی۔ اس کے علاوہ مسرُوف نے ایک کتاب "خلاصۃ الحساب" لکھی۔ یہ بھی فارسی کی تصنیف کا ترجمہ ہے، جس کے معنی روشن علی انصاری جو پوری تھے ایک اور کتاب "مکملۃ اوجیا سنہ" ہے۔ یہ سعدی کی انصانی کتاب ہے، جو پانچویں درجے کے بچوں کے لئے ترمیم دی گئی۔ ایک اور کتاب کھڑی ہو لی کی کہانیوں سے متعلق انہوں نے مکمل کی۔ دراصل اسے پہلے روک نے ترمیم دینا شروع کیا تھا لیکن ان کا انتقال ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاجرنی چرنِ کالج کے علاوہ دوسرے امور سے بھی دلچسپی لیتے رہے اس ضمن میں ڈاکٹر مسیح احمد لکھتے ہیں:-

"لیکن تاجرنی درجن بچھا چار یہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۳۳ء میں دو کاشی کے کشتہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ۳۱-۱۸۳۰ء میں کاشی آئے وقت انہوں نے اسکول یک سوسائٹی سے متعلق دے دیا ہوگا، کیوں کہ اس زمانے میں کسی انجمن یا سوسائٹی کے سکریٹری کے لئے اس شہر میں مستقل حکومت اشد ضروری تھی، جہاں اس کا دفتر ہوتا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں کاشی میں تاجرنی چرنِ ستر کا انتقال ہو گیا۔"



میرسید اور ان کا عہد

یوں تو میرسید کے چند یہ تھکبند روئے کی تحریک سے اس عہد کے دانشور عام طور سے ان کی حمایت کر رہے تھے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ ان کی دینی اور مغربی فکر کے درمیں مسلسل ان سے برسرِ پیکار تھے۔ جن لوگوں نے ان کی ہمدانی کی ان میں کچھ خاص کے نام ہمیشہ کے لئے یاد رکھے جاتے رہیں گے مثلاً نواب حسن الملک، مولوی چراغ علی چلی نعمانی اور الطاف حسین حالی وغیرہ۔ ان تھکبندوں کی فکر اس سلسلے کے دوسروں کی تھکبندی کے آئی ہے۔

میرسید احمد خاں

(۱۸۱۷ء — ۱۸۹۸ء)

میرسید احمد خاں کی پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں اہلی میں ہوئی۔ ان کا شجرہ نسب امام تقی علیہ السلام سے وابستہ ہے۔ ان کے والد کا نام سید متقی تھا۔ ان کے دادا سید ابدی شاہ عالم بادشاہ کے قاضی لشکر تھے اور نانا میر شاہ خانی کے وزیر۔ لیکن یہ سب کے سب صوفی اور بزرگ تھے۔ میرسید کی تائید الٰہی کا تھکبندوں کی فطرت تھا، جن کے پیر شاہ خاں علی نے ان کا نام احمد تجویز کیا۔ ان کے ایک بڑے بھائی کا نام احمد رکھا جا چکا تھا۔ چار سال کی عمر میں ہم اندک رسم ادا کی گئی۔ ان کا چچا خاندان مذہبی تھا۔ سید احمد کی پرورش و پرورشیت میں اس ماحول کا خاص اثر تھا۔ ابتدا میں سید احمد کی دیکھ

مکی تاسکس پر حکام کی نگاہ پڑے۔ دلچسپ بات ہے کہ اب تک یہ کتاب ہندوستان میں تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ انگلستان میں اس کتاب پر تبصرے ہوئے۔ یہ بات بھی یہاں یاد رکھنی چاہئے کہ غدر کے دوران موصوف نے انگریز افسروں کی جان بچائی تھی اور کئی سرے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا جس کے صلے میں انہیں انگریزوں نے جائیداد عطا کر رکھا تھا لیکن سید احمد نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اصل میں مسلمانوں کی ہجرتی ان کی نگاہ میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ ذاتی دلچسپی آباد اور صاحب ثروت بننے کی کوئی فکر نہ تھی۔

سرسید یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں کی پوسا عجم کی بنیادی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ وہ ہندوستانی خصوصاً مسلمانوں کو بر طرح کی تعلیم سے بہرہ ور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں ایک مدرسہ قائم کیا اور ۱۸۶۳ء میں عازی پور میں "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف علوم کی کتابیں اردو میں منتقل کی جائیں تاکہ جدید تعلیم سے عوام و خواص بہرہ ور ہو سکیں۔ ۱۸۶۳ء میں موصوف نے یہاں ایک اسکول بھی قائم کیا۔ لیکن یہ ادارہ سرسید کے خواہشوں کی تعمیل نہیں تھے۔ ان کے سامنے تو برطانیہ کی تعلیم کا اعلیٰ معیار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی آنکھوں سے یورپ کے اور ہرے دیکھیں اور ان کے نظام تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ وہ ایک سرکاری وظیفے کا سہارا لے کر ۱۸۶۹ء میں اپنے دونوں بیٹے سید احمد اور سید محمود کے ساتھ انگلستان روانہ ہو گئے۔ انگلستان میں ان کی پڑھائی ہوئی۔ سرسید وہاں جب تک رہے یہی کام کیا کہ جہاں کے نظام تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی اور واپس آئے ہی ایک موشر مارالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ دراصل وہ لندن سے شائع ہونے والے "مچرین" "لنکر" اور "ایکٹیکلر" کے ادوار کو اپنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" کا اجراء علی گڑھ انسٹیٹیوٹ پر ہوا۔ اس میں ایسے مضامین بھی شائع ہوئے کہ ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ سرسید کا قیام لندن میں ایک سال چنانچہ بیٹے برآمد قندھار میں بنی تعلیم کے فروغ کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس کا نام تھا "کمیٹی خراسان و تہذیب اسلام"۔ اس کی ایک ذیلی کمیٹی بھی تھی جس کا نام "تہذیب اسلام" تھا۔ اس کمیٹی کا کام چند اکتفا کر تھا۔ ان کا مقصد تھا کہ ان کا مقصد تھا کہ ان کے قیام کے سلسلے میں خود سے چند وصول کرنے میں شہجک محسوس نہیں کی اور ہر کس کا کس کے سامنے ہاتھ پھیلائے گئے۔ یہ سب اس لئے اور ہاتھ کر علی گڑھ میں یا ضابطہ ایک جدید کالج قائم ہو۔ لوگ اس خیال کے معاون تھے۔ ان میں دو قرا لک، علامہ شبلی اور مولوی نذیر احمد تھے۔ اس ذیل میں نو اراکمن نقوی تھے ہیں۔

"قرعانی ہمت، پندرہ فصل دھن کی ایک ٹیم تیار ہو گئی اور سفر کچھ آسان ہو گیا۔ قافلہ کا طوقان پھر بھی نہ تھا مگر یہ کارواں برآمد آگے ہی بڑھ گیا۔ آج ہم اس کارواں کو علی گڑھ قریب ایک اور سرحد قریب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسے علی گڑھ قریب اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا اور سرحد قریب اس لئے کہ اس کے دائرہ میں اس سرحد تھی۔"

بھال کے لئے ایک خاندان نہیں جو اس کی بیگم کو اپنی شخصیت۔ چنانچہ جس تک وہ سید احمد کی دلچسپی بھال کرتی رہی لیکن حسب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی والدہ مزین النساء نے اپنی عمرانی میں ان کی بیگم کو شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ والدہ کا اثر ان کی شخصیت پر سب سے زیادہ رہا۔ ان کے ذہن کو فریاد الدین کا بھی ان پر اثر پڑا کہ انہوں نے ان کی تربیت میں کافی کوشش کی۔ ابتدا ہی میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کی تقریریں سنیں اور مزینا ہوتے رہے۔ شاہ غلام علی کی خانقاہ سے رحمت خاص تھی اور شاہ ولی اللہ کے مکتوبات سے دلچسپی لیتے رہے تھے۔ نتیجے میں اپنی مختلف اور بڑھ رہا۔

خواجہ فرید الدین ایک ذہنی حیثیت شخصیت تھے اور بہت رسوم والے۔ ان کا تعلق انگریز افسروں سے بھی تھا اور نام نہاد بادشاہوں سے بھی۔ چنانچہ سید احمد بھی ابتدا ہی سے بادشاہ کے یہاں اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوتے رہے۔ پھر جب انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہاتھ پاؤں پھیلائے تو سید احمد کو انگریزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا خاص موقع ملتا رہا۔ آفرش انہوں نے انگریزوں کی سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا حمید الدین اور دوسرے اساتذہ سے سید احمد نے فارسی، عربی، حساب اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے پاس نو اب ترین علماء دین دیباختی میں ماہر تھے وہ بھی انہیں پڑھاتے رہے۔ ان کے ادبی ذوق کو فروغ دینے میں غالب و صبہائی اور آزاد و دودغیرہ کے نام اہم ہیں، جن سے ان کا رابطہ تھا۔ لیکن سیاسی اور معاشرتی معاملات کی تعلیم میں راجا رام موہن رائے، دوسرے سماج کی تحریک دلی کالج کی سرگرمیاں اور سید احمد بریلوی کی تحریک خاص اہم ہیں۔ اب تک سید احمد کے یہاں پیشینہ کا سلسلہ تھا لیکن ۱۸۳۱ء میں جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو یہ سلسلہ بند ہو گیا اور پھر انہیں معاش کی فکر لاحق ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی بھی وجہ تھی۔ وہ صدر امین کے دفتر سے وابستہ ہوئے۔ پھر نائب مشی ہو کر آ کر آ گئے۔ انہوں نے ان دوران منصبی کا امتحان بھی پاس کیا اور ۱۸۳۶ء میں بین پوری میں منتقل ہو گئے۔ پھر ان کا چاہا کہ وہ دسری ہو گیا۔ اپنے بھائی کے انتقال کے بعد وہ دلی آ گئے۔ دلی کے قیام کے دوران انہوں نے اپنی مشہور کتاب "آثار احمدیہ" شائع کروائی۔ پھر وہ ملازمت کے سلسلے میں بھگت آباد گئے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے سید احمد کو بے چین کر دیا۔ سہارے ہندوستان میں برادری اور زیادہ مالی کا مظہر تھا۔ مسلمان انگریزوں کی نگاہ میں باقی تھے اور ان کے جان و مال کے گرد مسلسل خطرہ منڈلاتے رہے تھے۔ سید احمد ان دنوں مراد آباد میں تھے۔ انہیں احساس تھا کہ کو اتفاقاً مسلمانوں کی اب خبر نہیں ہے اور وہ انگریزوں کے ہاتھوں اسی طرح بچنے رہیں گے۔ ظاہر ہے انگریز یہ سمجھتے تھے کہ اس بھارت کے پیچھے مسلمانوں ہی کا ہاتھ ہے۔ سرسید اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں "اسباب بھارت ہند" لکھی۔ دراصل سرسید چاہتے تھے کہ اس کتاب سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے۔ وہ اپنے طور پر بھارت کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ سرکار اور رعایا میں رابطہ نہیں ہے۔ ہندوستانی اچھے عہدوں پر ہندو نہیں کئے جاتے اور انگریزوں کے قوانین ہندوستانی رسم و رواج کے خلاف ہیں۔ انگریز اپنی سرگرمیوں سے ہندوستان کو مزید

تیسرا دور۔ سفر انگلستان سے وفات (۱۸۹۸ء) تک

پہلے دور میں جو کتابیں سامنے آئیں وہ یہ ہیں [۱] "جام جم" ۱۸۳۰ء [۲] "انتخاب الاغویہ" ۱۸۳۲ء [۳] "مجلد باطلوب" ۱۸۳۳ء [۴] "تذکرہ حسن" ۱۸۳۳ء [۵] "توسل فی جرائع" ۱۸۳۳ء [۶] "تاریخہ تاریخیہ" ۱۸۳۷ء [۷] "توابع الافکار فی اعمال الخیراء" ۱۸۳۶ء [۸] "قول متین در مطال حرکت زمین" ۱۸۳۸ء [۹] "تذکرہ الحق" ۱۸۳۹ء [۱۰] "رسالہ در علمت در بدعت" ۱۸۵۰ء [۱۱] "تحقیق" ۱۸۵۲ء [۱۲] "مسطبہ الملک" ۱۸۵۲ء [۱۳] "تربصہ کیسے" ۱۸۵۳ء [۱۴] "تاریخ مصلح بخیر" ۱۸۵۵ء [۱۵] "آئین اکبری" (ترجمہ) ۱۸۵۶ء

لیکن دوسرے دور کی جو کتابیں ہیں وہ ان حالات سے جدا ہیں [۱] "تاریخ سرگئی بخیر" ۱۸۵۷ء [۲] "تذکرہ" ۱۸۶۰ء [۳] "تہذیب خط نصاریٰ" [۴] "اسباب بغاوت بعد" ۱۸۶۹ء [۵] "رسالہ آئین مؤنس آف انڈیا" ۱۸۶۰ء [۶] "تہذیب خط نصاریٰ" [۷] "تاریخ فیروز شاہی" "معتمد خیابری" (ترجمہ) ۱۸۶۲ء [۸] "تہذیب الامام" ۱۸۶۲ء [۹] "سائنس کا مطالعہ" ۱۸۶۲ء [۱۰] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۱۱] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۱۲] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۱۳] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۱۴] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۱۵] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۱۶] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۱۷] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۱۸] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۱۹] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء [۲۰] "تاریخ فیروز شاہی" ۱۸۶۸ء

اب تک سر سید کے خلاف آوازیں کئی شہر ہو چکی تھیں۔ لیکن سر سید نے یہ سب سہہ کر کے دیکھا تھا۔ اس لئے تیسرے دور کی تصنیفات و تالیفات میں ایک طرح کی شہرت ہے اور وہ کتابیں یہ ہیں [۱] "سفر ارمغان" [۲] "تذکرہ عیال" کے متعدد مضامین [۳] "آئینہ افکار" کی کتاب پر جو ۱۸۷۴ء

سر سید کی آخری کتاب "تفسیر القرآن" ۱۸۷۹ء ہے۔ لیکن یہ کتاب کئی جہان کا باعث ہوئی حد تو یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر ان کے ہمسایوں نے بھی خاصی مخالفت کی۔ ایسے سید عیال لکھتے ہیں کہ یہ کتاب بحث و نظر کے اعتبار سے سب سے زیادہ مستحکم اور اسلوب بیان کے لحاظ سے دلچسپ اور اطمینان بخش ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ سر سید کا تاریخ سے خاصی دلچسپی تھی۔ مصوف نے ابراہیم خاں کے "آئین اکبری" کی تصحیح کی اور حواشی لکھے۔ "تذکرہ چنگیزی" اور "خیابری" کی "تاریخ فیروز شاہی" کی بھی تصحیح کی۔ اسی طرح "تذکرہ نصاریٰ" میں شہر کے باہر کی عمارتوں کا حال، تھک مٹھی، خاص شاہ جہاں آباد کے عوامی بخیر دلی اور دلی والوں کے حالات رقم کئے ہیں۔

"جہاں تک ہم سے دور کا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں کوشش کی۔ مضمون سے آکر لکھنے کا ایک سید عالم و صاف طریقہ اختیار کیا۔ تحقیق کہارات سے جو تحقیقات اور استعارات خیال سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ چیز کیا۔ تھک مٹھی سے جو اس زمانے میں ملتی عبارت لکھائی ہے، ہاتھ اٹھایا، جہاں تک جو سکا سکا کی عبارت، یہ تو جو کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ

حکایت اور موافقت کے سچ ۳۲ مئی ۱۸۷۵ء میں ایک دور سے کا افتتاح کیا گیا جس کے مقصد میں کالج اور یونیورسٹی ہو یا تھا۔ اسکول کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں پورے ملک ہاؤس بھی تھا۔ دراصل سر سید آکسفورڈ اور کیمبرج کے تعلیمی معیار اور طریق کار سے واقف ہو چکے تھے۔ ان کی انجمن اسی پس منظر میں مرتب ہوئی تھی۔ بعد میں ایک کیمپلٹن۔ سر ولیم میور کے سامنے یہ اعلان کیا گیا کہ کالج کا قیام مؤخرن اچھا اور نہیں کالج کے نام سے ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی ایک ذریعہ بند کے ذریعہ اکٹھا کیا۔

سر سید جولائی ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور علی گڑھ آ گئے۔ ان کے علی گڑھ آنے سے کالج کے قیام کی کام تیز ہو گئی۔ بہر حال ملازمت کی فرائض اس قدر بے کی یادگار ہے۔ لیکن وہ ابتدا سے جو آج علی گڑھ پورے بعد وہستان کے مسلمانوں کا مرکز بن گیا ہے۔ جہاں کی تعلیمی خدمات کا اعتراف ہر کسی و نام کرنا ہے۔ شاید یہ کالج نہ ہوتا تو مسلمانوں کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے پسماندگی اور بھاری ہوتی۔ ایسے محکمہ ان انہیں پسند کر رہے اور اعزازات سے نوازا رہے۔ بقول ڈاکٹر حسین:-

"سید احمد خاں کی طبیعت اور اہمیت کی شہرت ان کی زندگی میں پھیل گئی۔ ۱۸۷۲ء میں بہار شاہ ظفر نے ان کے موروثی خطاب جو اردو ادب میں "عارف جنگ" کا اضافہ کر دیا تھا اور ان کا قیام جب لندن میں تھا تو انہیں "سی ایس آئی" کا خطاب دیا گیا اور اس کا مفہوم یہ کہ آف آرمی نے پہنایا۔

۱۸۷۸ء میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کے لئے "سیراٹے" بنایا اور انہوں نے ان کے لئے "کونسل" کا رکن منتخب کیا اور مزید دو سال کے لئے اس کا اعادہ و ان کے لئے "ارڈر" نے ۱۸۸۰ء میں کیا۔ یہاں وہ چار برس ان کے لئے "کونسل" کے ممبر رہے۔

سید احمد خاں ۱۸۸۸ء میں کے "سی ایس آئی" (سیراٹے) کا مفہوم اعلیٰ ستارہ (بند) کے خطاب سے نوازا گئے۔ ۱۸۸۹ء میں ایسے بڑے بڑے بڑے نے "آئینہ افکار" لایا کی اعزاز کی سند دی گئی تھی۔

سر سید کی تالیف و تصنیف کی زندگی پر ایک نظر ڈالنے تو اندازہ ہو گا کہ وہ ایک ایسے بڑے بڑے وقت عوامی رابطہ کا بھی خیال رکھتے تھے اور اسی دوران تصنیف و تالیف کے کام بھی انجام دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا حالی نے سر سید کی تصنیف و تالیف کو تین ادوار میں اسی طرح تقسیم کیا ہے:-

پہلا دور — شروعات سے لے کر ۱۸۵۷ء تک

دوسرا دور — ۱۸۵۷ء سے سفر انگلستان (۱۸۶۹ء) تک

کہ بچا لے نہ پڑیں۔ بیٹھے ہوئے ہی ڈرتا تھا کہ سانس کی گھڑی سے لب پر بت خالے نہ پڑیں۔ آسمان سے وہ آنکھ باری ہوئے لگی کہ بوائے شعلہ جہاں کی صورت پیدا کی۔ خاک کے ذروں نے چنگاریوں سے نکتہ بدلی۔ برہمن بھائے کے کوٹے میں ہیں خاموش ہو کر بیٹھا کہ معلوم ہوتا تھا نکلے یہ بچا لادہ جاوے۔ غریبوں نے اپنے گھروں میں گھاس کی بیٹیاں لٹکائیں، لٹی کی مصراخیوں پر کپڑا بھگو کے لیٹ دیا۔ امیروں نے تو خانوں میں آرام فرمایا، شمس کی بیٹیاں چمڑی کا پٹے لگیں، لڑکی بچھے کھینچے گئے، شمس کی خوشبو سے ہوا کے جھونکوں پر چھوٹا یقین آنے لگا مصراخیوں پر فربہ میں لگتی نہیں۔ شربت کی تلقینیں بھائی نہیں۔

محمد حسین آزاد

(۱۸۳۰ء - ۱۹۱۰ء)

محمد حسین آزاد مولوی باقر کے بیٹے تھے۔ ان کے اسلاف میں ایک بزرگ شاہ عالم کے زمانے میں اہل ان سے تھرت کر کے دہلی آ گئے۔ ان کے والد نے ایک منطق جعفریہ قائم کیا تھا جو قری کر کے اردو انپار پر نہیں ہو گیا۔ اسی سے ۱۸۳۱ء میں اردو کا اخبار ”اردو اخبار“ شائع ہوا۔ مولوی باقر کی تین شاویاں ہوئی تھیں۔ لیکن صرف آخری بی بی امانی بیگم سے تین اولادیں ہوئیں۔ ایک بی بی اور دو بیٹیاں۔ بیٹے کا نام محمد حسین رکھا گیا پھر انہوں نے آزاد چھکس اختیار کر لیے اور شیخ ابراہیم دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ تاریخ ولادت کے مسئلے میں اختلاف رائے ہے لیکن ان کے مزار پر جو تختی لگی ہے اس میں پیدائش کی تاریخ ۱۰ جون ۱۸۳۰ء مرقوم ہے۔ اس کی حقیقی تاریخ سمجھنا چاہئے۔

ابھی آزاد چاروی برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ اپنے والد محمد اکبر کی زیر نگرانی دیکھنے سے فی تعلیم حاصل کرتے گئے۔ گھر پر تعلیم کے اختتام کے بعد ۱۸۴۵ء میں دہلی کانٹن میں داخل ہو گئے۔ جس زمانے میں وہ کانٹن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اس وقت ان کی عمر ۱۸ برس رہی ہوگی۔ کانٹن کے ساتھیوں میں تذکرہ نویس، فنی و کاٹھ، خواجہ فیہ الدین اور عابد علی آغوب جیسے لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بچہ آزاد دہلی میں لوگ تو ان کو کچھ شکر کرتے رہے۔ آزاد کے والد دہلی کے دوست تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصوف نے شاعری کے باب میں انہیں کی شاگردی قبول کی۔ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ سر پرستی بھی اور ذوق کے لالہ زہان کا بہت خیال رکھا۔ اپنے استاد ہی کے ساتھ ۱۸۴۵ء میں دہلی بارہ شاعر سے شریک کی۔ آزاد اور ذوق کے رہنے اور رابطے کے ضمن میں ملاحظہ فرمائی گئی ہیں۔

”محمد حسین آگاہ کو اپنے استاد سے بے پناہ محبت تھی۔ ذوق دہلوی شروع سے اپنا کلام اپنے دوست مولوی محمد باقر کے پاس پیش کرتے تھے۔ ہوش منیلا لے پڑا۔ زانے یہ کام اپنے اسے لے لیا۔ کلام ذوق پیش کرتے کرتے انہیں ذوق کا دیوان مرتب کرنے کا خیال آیا۔ پتا چلا وہ

میں صوبہ کے صدر آگرہ قتل اسی نسبت سے بے خبر کیا کہ زمانے تک آگرہ میں رہے۔ اور اس میں براگورنر جنرل نے جب گوالیار پر حملہ کیا تھا تب بھی اس جنگ میں شریک تھے۔ جس کے صلے میں انہیں خلعت سے نوازا گیا۔ جب ان کے خالو بخش یافتہ ہو گئے تو ان کی جگہ پر یہ میرٹھی ہو گئے۔ صدر کے زمانے میں خواجہ کاغذ غوث بے خبر کا کافی تعالیم رہے اور یہ دوستوں کی جان بچانے میں اپنی وفاداری کے سبب خاصا نام دلوا کیا۔ عابد حسن چوری لکھتے ہیں کہ:-

”صدر کے زمانے میں صدر ایڈمنسٹریٹو کی جان بچائی اور گورنمنٹ کے بھی اعتبار پر وقار وار رہے۔ اس کے صلے میں صدر اور خلعت عفت پارچہ مع شین رقم جاہر سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئے۔ ملکہ کنور کے بے خطاب شاہجہاں اختیار کرنے کے موقع پر لاہور لیٹن نے جوہر پار کیا اس میں بھی خواجہ صاحب کو تمغہ قیصری عطا ہوا۔ ۳۵ سال کی عازمت کے بعد ۱۸۸۵ء میں پٹنہ لی۔ گورنمنٹ نے جہاں بہادر ذوالقدر کا خطاب دیا اور یہ مزید اعزاز کھٹا کہ بخش لینے کے لئے عدالت کی حاضری معاف کی۔ بخش کے بعد لوہا بھلا آشیان کلب علی خاں بہادر والی رام پور نے خواجہ صاحب کو ریاست کا کادرا اہتمام بنانا چاہا۔ لیکن انہوں نے شکرینے کے ساتھ معافی چاہی اور آخر عمر کو یاد دہلی میں گزیر کر ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔“

بے خبر فیادی طور پر عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ ایک اہم شاعر کی حیثیت سے ان کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ غالب ان کے ماری تھے۔ حالانکہ غالب سے یہ صرف ایک سال چھوٹے تھے۔ غالب نے اپنے خطوط میں ان کے لئے برا الفاظ استعمال کئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان کا احترام کرتے تھے۔ ”مورخ اخبار“ میں بے خبر کی ایک قول ان کی فکر سے گزری تو یوں راوی:-

”کیا کہنا! اہل ان کو کہتے ہیں۔ جد طرز اس کا نام ہے۔ جوڑ حنک تازہ لواہان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، دو قدم بڑے کا لائے۔ خدام کو سلامت رکھے۔“

”محمود بنی“ انہیں یہ خط موجود ہے۔ ساتھ ساتھ بے خبر کی دو غزل بھی۔ ان تو بے خبر نے ”غزل بے خبر“ کے نام سے دو قصائد نظم فارسی کا مجموعہ شائع کیا لیکن اردو میں بھی مجموعہ موجود ہے۔ جو ۱۸۹۱ء میں ”افغان بے خبر“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پھر عابد حسن خاں کی اطلاع کے مطابق ان کے ایک عزیز نے بے خبر کا مجموعہ ”دیکھ لعل و گہر“ کے نام سے شائع کیا۔ یہ شعر اردو میں بھی شہرہ رکھتے تھے، لیکن بہت زیادہ نہیں۔ ان کی فیادی توجہ فارسی میں خطوط نویسی تھی اور شاعری بھی۔ لیکن ان کے اردو خطوط بھی توجہ سے پڑھے جاتے ہیں۔ کچھ تقریریں بھی تصنیف کیں، جن میں قصیدہ خوانی کا رنگ نمایاں ہے۔ بے خبر کی تشریح کا ایک نمونہ دیکھئے:-

”اور پھر کافیت ہوا، آقا ہے سمت الم اس پر آیا زمین سے لگی دیاؤں رکھتے ہوئے خوف آجاتا

آزاد نے یہ طبیعت سرکاری "انجمن پنجاب" کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ وہ ادھر ادھر جلسوں میں بھی شریک ہوتے اور دیگر بچے سامیوں کے عروقی کے مسائل سے بھی دلچسپی لی اور مصمت لڑائی کے خلاف جدوجہد کرتے۔ مسٹر بروس نے انہیں ۱۹۰۶ء جولائی ۱۸ء کو کلکتہ تعلیم میں ایک حیدر دیا جہاں انہوں نے نئی تاریخ ہند اور دوسری کتابیں مرتب کیں۔

محمد حسین آزاد عارضی طور پر علیحدہ مدرسہ کالج میں عربی کے معلم بھی مقرر ہوئے جہاں وہ بعد میں مستقل ہو گئے۔ جب ان کی عمر ۱۵ سال ۵ ماہ ۵ روز پہنچا تو ان کے گھر پر لاہور میں ان کی ادبی و صحافتی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے اخبار "نوائے پنجاب" بھی جاری کیا۔ اسی کالج کی عازمت کے درمیان انہوں نے "نئی تاریخ ہند" بھی اہم کتاب لکھ دی۔

محمد حسین آزاد عظیم گوئی کے اولین متون کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے کہ انہیں کے زمانے میں غزل کی جگہ نظمیں لکھنے کا رجحان ہوا۔ "انجمن پنجاب" نے اس باب میں قریب و قری شروع کی۔ انہی نظمیں پر انعامات دیے جانے لگے۔ مخصوص موضوعات پر نظمیں لکھنے کی دعوتیں دی گئیں۔ انعامات میں حالی کی بعض نظمیں "برکھارست" "حب وطن" "مناظرہ رم و انصاف" وغیرہ انجمن کی تحریک پر وجود میں آئیں۔

۱۸۹۷ء سے ۱۸۹۶ء کے دوران محمد حسین آزاد نے اپنی سب سے اہم کتاب "آب حیات" لکھنے کی دہر ان کی زندگی اور ادبی حیثیت کو جاواں جانے کے لئے کافی ثابت ہوئی۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۸۳ء کے دوران انہوں نے "نیرنگ خیالی" بھی لکھی تھی۔ "آب حیات" میں اضافے کرتے رہے۔ اسی سال ان کی بیٹی امت اسکیمہ شیکم کا انتقال ہوا جس کا ان کے ذہن و دماغ پر کافی اثر پڑا بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اسی حادثے کی وجہ سے ان کا ادبی و ادبی رجحان گہرا ہوا۔

ادب میں نے لکھا ہے کہ انھوں ان کی معاذرت کرتے رہے تھے لیکن ایک مرحلے میں ان سے چھٹک ہو گئی۔ اس حد تک کہ آزاد پریشان ہو گئے۔ جب آزاد نے امر ان کا سفر اٹھایا، کیا۔ اس زمانے میں صاحبان کا عام یہ تھا۔ شہر از میں انہوں نے ہر ایک ایک قسم کی دیکھی جس کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے:-

"شیراز میں چھوٹی چھوٹی نکلیاں تھیں دیکھی کہ ان سے لوگ سراور دار عیاں دھوتے ہیں۔"

ایک قسم کی مٹی ہے جس کی کان شہر کے پاس ہے۔ اس میں خوشبو کے اٹھانے کی قدرتی تاثیر

ہے۔ اسے پھولوں میں بٹا کر صاف کرتے ہیں اور نکلیاں بنا کر بیچتے ہیں۔ شہر میں بچے لے

جاتے ہیں گل گل اس کا نام ہے۔ بچے گلستان کا ساقی پارتا ہے۔

گل خوشبو دے در حمام روئے۔"

پھر طور محمد حسین آزاد ۱۳۲۶ء جولائی کو لاہور واپس آ گئے۔ ۱۸۹۷ء میں کلکتہ کنوینشن کی تاجہوشی کے پچاس سالہ جشن

اس کی تکمیل میں شریک ہو گئے۔ ملاحظہ رہے کہ ۱۸۸۵ء میں جب خود کے چکاموں سے آزاد کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا تو کلام ذوق کو انہوں نے جان سے نر یا د و عزیز رکھا۔ شیخ ابراہیم ذوق نے ۱۸۵۳ء میں انتقال کے بعد آزاد کی تمام آغا جان حقیقی سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ جس کا سلسلہ کم و بیش دو برس جاری رہا۔ لیکن اپنی فکر میں اس میں آزاد نے خود کو کلید ذوق بن لکھا ہے۔ آزاد کی شاعری انھارہ انیس برس کی عمر میں ٹھوڑوں کے ایک سوراگر مرزا محمد علی کی بیٹی زانیہ بیگم سے ہو گئی تھی اور ۱۸۸۵ء تک وہ دو بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ اس وقت بڑی کی عمر سات سال اور چھوٹی بیٹی کی عمر دو برس تھی۔"

محمد حسین آزاد نے ۱۸۵۳ء میں کالج کی تعلیم مکمل کر لی تھی اور اپنے والد کے ساتھ کام کرنے لگے تھے لیکن ۱۸۸۵ء کے چنگا سے نے ایک نئی صورت پیدا کر دی۔ مولوی احمد باقر گرفتار ہو گئے۔ چونکہ آزاد کو اپنے باپ سے بہت محبت تھی لہذا وہ ان سے ملنے کے لئے پنجاب تھے۔ اسی طور پر ان کے سوا ایک فکر کر ان سے ملاقات کرنے کی سہیل نکالی لیکن ان کے والد آخری شہید کر دئے گئے۔ باپ آزاد پر سردار مانی کی حالت میں دلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آ گئے جہاں ان کی ملاقات ہیرا پھریں دہلیہ وغیرہ سے ہوئی۔ پھر اپنی گرفتاری کے خوف سے آزاد دہلی گری چلے گئے جہاں انہوں نے ایک فوجی اسکول میں پڑھانا شروع کیا۔ پھر وہاں سے بھٹی آ گئے۔ اس کے بعد پنجاب میں سکونت پانے پر ہوئے اور وہاں محکمہ جہاد میں ملازمت کی۔ اس کے بعد لہ حیات چلے آئے یہاں سے ایک اخبار "مجمع التحریر" نکلتا تھا اس سے وابستہ ایک پریس بھی تھا جہاں وہ ملازم ہو گئے۔ یہاں کچھ سکون حاصل ہوا تو اپنے اہل و عیال کو سونی پت چکراؤں نکالیا۔ اس کے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے اور وہاں پرنسپل انچیاؤنٹ میں فکریک ہو گئے۔ جب ان کی عمر تیس روپے مقرر ہوئی۔ ۱۸۸۲ء میں ان کا تدارک تمام ہو گیا تھا وہ مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اخبار "تالیق" پنجاب کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ انہیں یہاں تعلیم کے رجعت پسندانہ تصور اور نئے تصور سے غرضی آگاہی ہو گئی یہ بعد میں ان کے ذہن و دماغ کی تشکیل کا باعث بھی ہوئی۔ جب "انجمن پنجاب" قائم ہوئی تو آزاد اس سے وابستہ ہو گئے۔ ان دنوں وہ انگریزوں کو اردو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے اردو شاعری کی حیثیت سے ڈاکٹر لاکھڑے کے ساتھ بھی کام کیا۔ لیکن انہوں نے بہت سے مقالے لکھے۔ گویا ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۸ء تک ان کے تقریباً پانچ سو مقالے سامنے آچکے تھے۔ محمد حسین آزاد کو جنت ہو گئی اور "انجمن پنجاب" کے سنے سے کافی شہرت بھی نصیب ہوئی لیکن ان کے کچھ دشمن بھی پیدا ہو گئے۔ گویا یہ ایک طماع کا جادو تھا اس لئے کہ انہیں بھی لوگوں نے باغی ثابت کرنا شروع کیا لیکن لاکھڑے نے مدد کی اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہوا۔

محمد حسین آزاد نے وسط ایشیا کا سفر کیا۔ انہوں نے تاشقند، جزاک، قشغرہ، چنگک جیسے مقامات کی سیر کی جب وہ اس روٹی حکومت تھی۔ آزاد رو دیاے آری تک پہنچے ان کے بعد چغتال کے راستے واپس ہوئے۔

لغات نے ان کے دوسرے کور کر دیا ہے کہ اردو کا آغاز برج بھاشا سے ہوا ہے نہ انہوں نے قصداً اس کے احوال میں بہت سے ایسے کچھ بیان کیے ہیں جو تحقیق کی سمجھ پر پورے نہیں اترتے۔ مولوی حبیب الرحمن شیرانی نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ:

”آزادی کی قیاس کی بلند پروازی نے غوطے چٹا کر اڑائے ہیں۔“

اگر قاضی عبدالودود کی کتاب ”محمد حسین آزاد بہ حیثیت محقق“ سامنے دے تو اردو ادب کا مشکل نہ ہوگا کہ قاضی صاحب نے ان کی تین سو سے زیادہ قرمز اشتقاقیات کا احاطہ کیا ہے۔ یہ کتاب ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ نے شائع کر دی ہے۔ قاضی عبدالودود نے اپنی باتوں کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

”اکثریت آزاد کی شاعری کی معترف ہے مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ تحقیق کے مریدان تھے۔ اقلیت سمر ہے کہ وہ صرف ایک بڑے لکنا پر داری تھیں، ایک بڑے محقق بھی تھے۔ وہ کتاچے میں بدگمانی کی کوشش کی تھی ہے کہ حق کس کی طرف ہے۔“

ایسا بھی ہے کہ کہیں کہیں آزاد کا ذاتی تہصیب بھی نمایاں ہو گیا ہے مثلاً انہوں نے اپنے استاد ذوق کا حال ساتھ (۶۰) صفحات میں بیان کیا ہے جب کہ مومن خاں مومن پر ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ جب ادھر ادھر سے تنقید ہونے لگی تو نئے نئے مضمون کو چمکے دی گئی۔ کہیں کہیں تناسب کے لحاظ سے طوالت اور اختصار کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر ہیں لیکن کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آزاد یہاں وہاں کی بات کہہ رہے ہیں جب بھی وہی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی مرقع نگاری بھی اہل در سے کی ہے۔ طویل الرحمن اعظمی نے مجھ سے ایک بار یہ کہا تھا کہ کوئی گراں وار مجر پر نہ جھٹے چڑھتے زمین پر جھل ہو جاتا ہے تو ”آب حیات“ اٹھا لیتا ہوں، ہماری کدورت دور ہو جاتی ہے۔ آزاد کی تمام کتابیں اپنے طرز کی ہیں۔ یہ آج بھی چھٹی جاتی ہیں۔ ان کے اسلوب کی دلکشی ان کی ذہانت، لطافت کا ہر جگہ احساس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں استعارہ کا پر عمل استعمال ہے تو کہیں محاسب کا یا انداز اختیار کیا گیا ہے، کہیں نازک خیال اس طرح پیش کی گئی ہے کہ شاید وہاں کہیں محلوں کی وہ کیفیت سامنے لائی گئی ہے جو دوسری جگہ پیش کی گئی تھی، انہیں محاکات سے کام لیا گیا ہے تو کہیں متنازع جملے کا پر عمل استعمال ہے۔

لیکن یہ طرز انداز بھی بکھر تھیں سے پاک نہیں اس لئے کہ تمام کتابوں میں ایک ہی طرح کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ہر طور پر محمد حسین قادری نے انہیں پہلا صاحب طرز کہا ہے نیز محمد ادری میں بھی انہیں بیکار قرار دیا ہے۔

آزاد کی ایک حیثیت شاعر کی بھی ہے اور یہ حیثیت مسلم ہے۔ اس لئے کہ وہ نظم کے اولین شاعروں میں ایک سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے اپنی مسائل سے اس صنف کو متنوع بنایا اور نظم نگاری کے لئے ایک عہد مہم قیام کی۔ ذوق نے ان کے شاعرانہ مزاج کی آبادی کی تھی۔ ان کے شعور کو پھیل کرنے میں ان کا خاص رول رہا تھا۔ لہذا ان کی شاعری کو کسی نہ کسی حیثیت سے اعتبار ملنا ہی تھا۔

کے موقع پر انہیں شمس العلما کا خطاب دیا گیا۔ زندگی کے تقریباً تیس سال محمد حسین آزاد جنوں کی زندگی بسر کرتے رہے۔ تھکے تھکے سے حالت سدھر جاتی۔ علاج معالجہ ہوتا لیکن پھر دیوانگی واپس آ جاتی۔ آخر وقتوں میں وہ عالم دیوانگی ہی میں روحانیت سے وابستہ ہو گئے لیکن زندگی میں عجیب طرح کی بددیہی رہی۔ انہیں ان پر چھوٹی کیفیت طاری ہی ہوئی تھی کہ ۱۹۰۵ء میں ان کی تنظیم کا انتقال ہو گیا جب وہ اور متصل رہے تھے۔ آزاد کی پیاری طویل بیکاری تھی۔ تقریباً تیس برس دو بار رہے۔ آخر ۲۴ جنوری ۱۹۱۰ء میں لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا اور انہیں مزار داخانجی کے قریب دفن کیا گیا۔

محمد حسین آزاد کی کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے۔ ”آب حیات“، ”تیر جگہ خیال“، ”دور بار اکبری“، ”سخن دان فارسی“، ”غلام رحمان فارسی“، ”دیوان ذوق“، ”نظم آزاد“، ”تذکرہ علما“، ”کائنات حرب“، ”نعت آزاد“، ”فرمانے اکبر“، ”سیرایان“، ”تھلے الہیات“، ”جانورستان“، ”مکتوب آزاد“، ”بیاض آزاد“، ”اور انجکد آزاد“۔

اس فہرست کی ابتدائی سات کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہوئیں اور بقیہ ان کی موت کے بعد۔ ”تھلے الہیات“ تو مجددیاد تصنیف کے ذیل میں آتی ہے۔ یوں تو ابتدائی ساری کتابیں ہی اہمیت کی حامل ہیں لیکن ذرا غور کر ”آب حیات“ پر باتیں بولی جائیں۔

اب تک شعرا کے جو تذکرے سامنے آئے تھے ان کا اختصار سب سے بڑا نقص تھا۔ ہر حرف جی کی تحریب اسے اور بھی ناقص بنا دیتی تھی۔ حالات زندگی سرسری طور پر لکھے جاتے۔ کلام کے سبب دوسرے کچھ دھٹے دھٹے میں سمیٹ لیا جاتا۔ فرضی کرنا بھی تک کسی ادبی تاریخ کا تصور نہیں پیدا ہوا تھا۔ تذکرہ کی یہ ساری خامیاں آزاد کے ذہن میں تھیں اور وہ انہیں دور کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ اب تک اردو زبان کے باب میں کوئی ایسی مکتبہ اس طرح نہیں ہوئی تھی جس طرح آزاد چاہتے تھے۔ ”آب حیات“ لکھتے وقت یہ سارے تصورات ان کے ذہن میں رہے ہوں گے۔ چنانچہ ”آب حیات“ وہ پہلی کتاب ہے جس میں ادبی تاریخ کا جو اقرار اہم ہوتا ہے پورے تفصیلی اور مدلل لکھا گیا ادب اردو لکھنے کی راہ ہموار ہوئی ہے۔

”آب حیات“ کا مؤلفہ تفصیلی ہے۔ اس میں بھی فارسی کے اثرات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کامل لحاظ ہے۔ پھر اس میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ اس باب میں علامہ حسن قادری لکھتے ہیں کہ۔

”آب حیات میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں خصوصاً شاعرانہ نمک و نمک و ذاتی دلچسپی اور سیرت و اخلاق کے لطیف کوشش و تلاش سے درج کئے ہیں۔ ان میں ایسی باتیں بھی ہیں جو علامہ آزاد نے کتابوں سے دیکھ کر لکھی ہیں اور انہیں بھی جو ان کو اپنے استاد یا ہمارے گروں سے سیدہ سیدہ پہنچی ہیں۔“

آزاد نے شاعری کے دعوہ و نکات سے خوب بحث کی ہے۔ بعض امور پر نگہ رکھیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ قدیم عاشقانہ شاعری کے دلدادہ نہ تھے۔ وہ نچیرل شاعری کے طبع دار بن گئے۔ انہیں احساس تھا کہ وہ درجے کا مبالغہ شاعری کو پہنچا کرنے کے لئے کافی ہے۔ خواہ مخواہ کی صنعت گری بھی شاعری کا مہیب ہے۔ اس پس منظر میں وہ نظمیں کہتے رہے۔ ان کا اپنا بیان ہے:-

”وہ کیا؟ مضائقہ عاشقانہ ہیں جس میں وصل کا کچھ لطف، بہت سے حسرت و ارباباں، اس سے زیادہ بھر کا روز و شراب، مساتی، بیدار خزاں، لنگ کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے..... انہوں نے یہ ہے کہ ان بھر و روزوں سے ذرا بھی نکلتا چاہا تو قدم نہیں اٹھا سکتے یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا طبعی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہے تو اس کا بیان بد مزہ ہو جاتا ہے..... ان محدود احوالوں میں جو کچھ موجود ہے وہ اچھوڑ کر اس سے آج تک بڑے بڑے بحر و اقیانوس فیضوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کر کے پیدا کیا ہے۔“

بہر طور، جھرمسین آزاد کی شاعری کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ ایک نئے طرز کے بنیاد گزار ہیں اور یہ اردو نظم پر ان کا احسان ہے۔ نمونیک ہے کہ ان کی نظموں میں مہرائی اور گیرائی نہیں ہے، بعضوں نے انہیں رد بھی کر دیا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کی مثنوی ”شب قدر“، ”اولو اعزنی“، ”حب وطن“، ”ادانصاف“، ”ایر کرم“، ”صبح امید“، ”خواب امن“، ”نظر و مریع“ وغیرہ جہاں تعریف کی مستحق ٹھہری ہیں، وہاں ان میں کچھ مہیب بھی لگے ہیں۔ لیکن ان باتوں سے جھرمسین آزاد کی ادبی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور بعض اولیات کی نظر پر انہیں اردو ادب کا درخشندہ ستارہ کہنا چاہئے۔

ڈپٹی نذیر احمد

(۱۸۳۶ء۔ ۱۹۱۰ء)

شمس احمد اپنی نذیر احمد کی پیدائش ۱۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو ریتل میں ہوئی۔ یہ جگہ پرگنہ افضل کوٹہ تحصیل گلگت اور ضلع بجنور میں تھی۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے خلفاء میں ایک بزرگ عبدالغفور عظیم پوری سے ملتا ہے۔ ان کے دادا قاضی غلام علی شاہ بڑے بزرگ تھے، جنہوں نے مولوی سعادت علی خاں صاحب کو قبول و اکثر اختلافات محمد خاں خاٹہ داماد بنا کر رکھا تھا۔

نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم کتب میں ہو رہی تھی کہ ان کے والد مولوی سعادت علی نے انہیں غرضت تعلیم دینی شروع کی، ان خاص طور سے فارسی کی۔ اس طرح ابتدائی میں انہوں نے سچے وعدہ، مینا بازار اور سرتر قہودری ششم کر لی۔ پھر اپنے والد

شی سے عربی بھی پڑھی۔ نذیر احمد نے مولوی نصر اللہ اپنی نگہ سے نوعرلی سے شرعاً لکھ کر اور مطلق میں تہذیب اور عقلی اور فلسفے میں حیدری تک پڑھا۔

نذیر احمد کی علمی و ادبی زندگی بچپان ہی کمزور کی مسجد سے شروع ہوئی ہے۔ اس زمانے میں طلباء اپنے اساتذہ کے گھروں کی خدمات انجام دیتے تھے، ان کے محض انہیں کھانا لانا کرنا تھا۔ نذیر احمد نے بھی مولوی عبدالالحق کے گھر کا کام کارج کرنا شروع کیا اور دوسرے طلباء کی طرح پیٹ بھرنے کے لئے مسجد میں پڑے رہتے۔ یہ اس طرح کے کام سے بھر دلی برداشت بھی تھی۔ ایک موقع پر ان کی ملاقات پرنسپل کا رگل سے ہو گئی۔ ان ہی کے واسطے سے ۱۸۴۵ء میں نذیر احمد دلی کاٹاں میں داخل ہو گئے۔ جب یہ ترجمہ دلی کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے کسی صورت سے دلی کاٹاں کا کلیہ حاصل کیا۔ چونکہ نذیر احمد بچہ ہوتا تھے چنانچہ مولوی عبدالالحق کے صاحبزادے مولوی عبدالقادر نے اپنی صاحبزادی کی نسبت ان کے سر پر نذیر احمد کے والد کے سطلے میں ان ہی خاقان کو جب وہ بچی تھیں اٹھائے پھرتے تھے۔

بہر طور نذیر احمد نے آٹھ سال یعنی ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۳ء تک دلی میں گزارے۔ والد کے انتقال کے بعد انہیں حصول معاش کی فکر خیز ہوئی اور وہ گجرات (بھابھ) پہنچے اور ٹیپل صاحب سے ملاقات کی۔ یہاں چالیس روپیہ پر انہیں مولوی کی ملازمت مل گئی۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۳ء اپنی اس ملازمت سے خوش نہیں تھے۔ پھر وہ کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر عوام بن گئے۔ یہاں بھی انہیں استعفی دینا پڑا۔ اس دوران ۱۸۵۷ء میں بھارت روٹا ہوئی اور وہ کسی طرح دلی واپس آئے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی طرح کی ملازمت کی۔ مئی ۱۸۷۷ء میں روانہ ہوئے۔ اس کی تحصیل نورکھن نقوی لے یوں بیان کیا ہے:-

”مولوی صاحب نے اعظم گڑھ کی اپنی نگہری سے دو سال کی رخصت لی اور پہلی اپریل ۱۸۷۷ء میں دربار کے لئے روانہ ہو گئے۔ ۲۷ مارچ مل کو مولوی صاحب منزل مقصود پر پہنچے اور نواب حسن الملک کی کوٹھی پر قیام کیا۔ دوپہرے عہد اوڑھے داماد احمد حسن اور بیٹوئی رفیع الدین کو بھی لے گئے۔ ان دونوں کو بھی مولوی صاحب کی ماتحتی میں ملازمتیں دی گئیں۔ مولوی صاحب کی تحوہ ہارہ سوچا لیس روپے مقرر ہوئی اور ان کے سپرد یہ کام ہوا کہ مختلف مقامات کا دورہ کر کے وہاں کا مساجد کریم اور ان کی کارکردگی کی مفصل روئید اور کارکردگی کریم۔ مولوی صاحب نے یہ کام بڑی محنت سے انجام دیا اور اس کے سطلے میں نورانی ترقی پائی، یعنی ناظم بندوبست سے ناظم بندوبست و بعد ازاں دار و دو ہو گئے۔ سرسلاہ جنگ مولوی صاحب سے اسے جڑ تھے کہ اپنے دونوں بچوں کی تعلیم ان کے سپرد کی اور مولوی صاحب نے بھی حق ادا کر دیا۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران انہوں نے کم سن سرکار نظام کی تعلیم کے لئے کچھ

دوسرے بھی تصنیف کئے۔

تذکرہ احمد کے لائق و شوق، چھٹائی، وقت کی پابندی، مشرقی وضع قطع، بیباکی و صاف گوئی، حاضر و باقی اور مرقعیت پر کافی توجہ دی گئی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں مدیہ کائنات کی بڑی گنجشہ تھی۔ لیکن انہیں جو چیز متاثر نہاتی ہے، وہ ان کی ناول نگاری ہے۔ ان کے ناول "مراۃ العروس"، "بنات العیش"، "توبۃ النصوح"، "قہر و جفا"، "ابن الوقت"، "ایمانی" اور "روایۃ صداقت" نہ صرف اہم ہیں بلکہ ان پر مسلسل بحث و کھجکا جا رہا ہے۔

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اردو کا پہلا ناول نگار کون ہے؟ جواب سید حسام الدین ہے کہ پہلے ناول نگار میر احمد علی ہیں۔ یوں تو محمود الحسنی نے ایک ناول "عقہ عقیر" کا ذکر کیا ہے کہ وہ اردو کا پہلا ناول ہے۔ لیکن بات آگے نہیں بڑھتی اور اب تک سید میر احمد کو ہی اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔

ناول "مراۃ العروس" ۱۸۶۸ء میں تیار ہوا۔ اس کے بعد ہی کئی کتابیں تصنیف کے سلسلے کی شائع ہوئیں جو دوسروں کی تھیں۔ "مراۃ العروس" امور خاک واری اور لڑکیوں کی تربیت کے موضوع پر ایک اصلاحی ناول ہے۔ اس اصلاحی ناول کے اثرات دور رس بنے۔ تذکرہ احمد جس طرح عورتوں کی اصلاح چاہتے تھے وہ اصلاح ہوئی یا نہیں یہ دوسری بات ہے۔ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ واضح ہو کہ ناول یوں تو ۱۸۶۸ء میں تیار ہوا تھا لیکن اشاعت ۱۸۶۹ء میں ہوئی تھی۔ اس ناول کے دو کردار اکبر کی اور امیری اب بھی زندہ و کردار ہیں۔ حکومت نے اس کتاب پر ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس ناول کی کیا اہمیت رہی ہوگی۔

"مراۃ العروس" کو اگر آج کے فنی چانے پر دیکھنا چاہیں تو باہمی ہوگی۔ اس میں آئینہ دل کردار ہیں اور وہ بھی ایسے جو ہر حال میں ایک جیسے رہتے ہیں۔ اگر ہم انگریزی ناول نگاری کی ابتدا کو ذہن میں رکھیں تو چارہ من کا ناول "پامیا" یا "در چہرہ یازد" از خوردہ من آ جاتا ہے۔ یہ بھی اخلاقی ناول ہے اور اس کا تعلق بھی عورتوں کے کردار و اطوار سے ہے جس میں ایک ملازمہ اپنی محنت و عزت کے لئے اپنے مالک کے بڑے سے بڑے قدم کو شہوت سے دو کئے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور آخر میں اس کے اوصاف سے متاثر ہو کر مالک اس کو کرائی سے شادی کر لیتا ہے۔ لڑائی تذکرہ احمد کے ناول کو اس پس منظر میں دیکھ اور پرکھا جاسکتا ہے۔

"مراۃ العروس" کے بعد ۱۸۷۶ء میں "بنات العیش" شائع ہوا۔ اس ناول میں تعلیم پر خاصہ زور دیا گیا ہے اور تعلیم بھی اخلاقی۔ اس کے علاوہ خانہ داری کی تربیت بھی دی گئی ہے۔ امیری خاتم تعلیم نسوان کو عام کرتی ہے، مدرسہ قائم کرتی ہے لیکن حسن آرا جو خواہر، بزرگان اور بدسلوک ہے اس کی کاپالط ہو جاتی ہے۔ اس ناول پر بھی سرکاری طور پر تذکرہ احمد کو پانچ سو روپے بطور انعام ملے تھے۔

"توبۃ النصوح" ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ اب تک ان کا کلام اس فن میں کچھ متزلزل ہو چکا تھا اس لئے فنی حیثیت

سے "توبۃ النصوح" کچھ بھر ہے۔ لیکن کچھ کا تو نام بدراہن ہے۔ قصور عالم خراب میں شکر کا نقشہ دکھاتا ہے۔ یہی مطالب اس کی زندگی میں اصلاحی انقلاب لائے جا رہے۔ اس ناول کے تئیں کردار تصویح، تعلیم اور خواہر واریک دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اور فنی اعتبار سے اہم ہیں۔

"قہر و جفا" ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔ یہاں ایک سے زیادہ شمار ہیں کے سلسلے میں گویا انہیں پیش کی گئی ہیں۔ ایک سے زیادہ شمار ہیں کردار کیا گیا ہے۔ ممکن طور پر اولاد کی تربیت کے مسائل کا بھی اٹھائے گئے ہیں۔ "قہر و جفا" میں ایک نام "عصمت" بھی ہے، اس وقت کافی مقبول ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عائلی بیوی اور دوسری بیوی کے باب میں جیسے تھپتھپے اٹھائے گئے ہیں وہ دلچسپ ہیں۔

میر سے قبل "ابن الوقت" تذکرہ احمد کا سب سے اہم ناول ہے۔ اس ناول کا ہیرو "ابن الوقت" ہے جس نے حالات کو سمجھتے ہوئے انگریزی و شیخ اختیار کی۔ انگریزوں کی طرف بات کرنے لگا۔ کھانے کے وقت، انگریزوں کی طرح لباس تبدیل کرتا۔ یہ بھی اسی طرح سماجی جاتی۔ لیکن اس نظریے کا حریف جتو اسلام جو اس کا بھائی بھی ہے وہ ایسے تمام امور کو نظر فرما رہا ہے۔ بعضوں نے ابن الوقت کے کردار میں دوسری کی شبیہ کو ذکر کیا ہے یعنی اس میں عروج کے نظریے کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ سمجھوں کہ مظلوم ہے کہ لڑائی تذکرہ احمد سرسید کا بڑا اثر "م" کرتے تھے۔ انگریزی تہذیب کے خلاف یہ کتاب اہم سمجھی جاتی ہے۔ ایک طرف سرسید جی تو دوسری طرف اکبر الہ آبادی (جیت اسلام) دونوں کے نظریات آئے سامنے ہیں۔ یہ ناول فنی اعتبار سے غیر اہم نہیں۔

تذکرہ احمد کا آخری ناول "روایۃ صداقت" ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ کتاب دراصل صداقت کے والد کے ایک خط کی صورت میں ہے اور خط کے اختراعت تصدیق گئے ہیں۔ اس کا اختتام یوں ہے:-

"ایک دن صداقت کے والد کو ایک خط موصول ہوا ہے۔ یہ خط کیا ہے پوری کتاب ہے۔ علی گڑھ کے ایک طالب علم سید صادق نے صداقت سے خط شے کے لئے پیام دیا ہے اور ساتھ ہی اپنے مذہبی عقائد تفصیل سے بیان کر رہے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جدید تعلیم نے اس کے جذباتی عقائد کو محو کر دیا ہے۔ گائے کی تعلیم سے مذہب کو مضر ہے ہو سکتے تھے۔ اس خط کے پڑھنے میں اس کا یوں ہو گیا ہے۔ میر حال لڑکی کے والدین کو یہ رشتہ قبول کرنے میں متامل تھا۔ لیکن صداقت اپنی کھلی کے ذریعہ اس باب سے کھلتی ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ یہ رشتہ ہو کر دے گا۔ انجام کار شادی ہو جاتی ہے۔"

تذکرہ احمد کے ہاتھوں کے اثرات دور رس رہے، اس حد تک کہ برعکاس میں اصلاحی تحریروں کو اثر سے نکال دیا گیا۔ صرف "عظیم آباد میں شاہ عظیم آبادی نے" "صورت النیر" نام کا ایک ناول مرتب کیا۔ جس کا دوسرا اثر میرا

حصہ شکم چند چڑجی کے ناولوں سے سبب نہیں کھا، لیکن جس پر ڈپٹی نذر احمد کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ "اصلاح النسا" (رشیدہ النساء) "لسانہ خورشیدی" (اللسان حسین عظیم آبادی) اور "مصلحہ" (سجاد عظیم آبادی) پر نذر احمد کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

آج ناول کا فن کافی ارتقا پذیر ہو گیا ہے۔ داخلی اور خارجی احوال کے بیان کے لئے کئی طرح کی تکنیک سامنے آچکی ہے۔ مغرب کے ناولوں میں برقی جانے والی فنی رموز سے آگاہی عام ہے۔ ایسے میں اردو ناول نے کئی کمزوریاں لی ہیں لیکن نذر احمد کے ناولوں کی جگہ اس لئے محفوظ ہے کہ یہ وہ ناول ہے جس سے آج کا اردو ناول نکلا ہو چکا ہے۔

ڈپٹی نذر احمد ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو ہمیشہ فعال رہی ہے۔ جس نے زندگی کے ہر لمحہ حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کیا اور اپنی علمی زندگی کو پروان چڑھانے میں ہر طرح کی کاوش کی۔ ان کی جگہ اردو ادب میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔

نذر احمد پر آخر عمر میں غازی کا ناول "اردو ادب" ۱۹۱۰ء میں انہوں نے وفات پائی۔

خواجه الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء — ۱۹۱۳ء)

اردو کے پہلے نثر پر مبنی سوانح نگار اور اہم شاعر الطاف حسین حالی سے کون واقف نہیں؟ موصوف کا نام نامی کئی محبتوں سے اردو تاریخ کا ایک ستیری باب ہے۔ ان کا پورا نام خواجه الطاف حسین قندلور تھیں حالی کرتے تھے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق ان کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں ضلع کرناں کی مشہور جگہ پانی پت میں ہوئی۔ خاندانی اعتبار سے بھی انہیں عظمت حاصل رہی ہے۔ ان کا سلسلہ نسب ۳۳ واسطوں سے حضرت عیوب انصاری سے ملتا ہے۔ لیکن ان کی والدہ سیدہ تھیں جن کا شمار ۳۶ واسطوں سے حضرت رسول ﷺ تک پہنچتا ہے۔ والد خواجه ابن دانش تھے اور والدہ سیدہ امت الرسول عرب بانی پت پھول تھیں۔

حالی نے نواب عبدالملک سید حسین بگڑی کی اماں اپنے حالات قصیدہ کہے تھے۔ اس خودنوشت میں ہے کہ:-

"غیاث الدین عین نے انہیں محمد اور سیر حاصل دیات پر گنت پانی پت میں اور معتد بہ اراضی سوار تھیں پانی پت میں بطور مدد معاش کے اور بہت سی زمین ان کے دربار میں آبادی تھیں پانی پت واسطے حکومت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تفتیش نزع بازار اور تولیت مزارات احمد جو سوار پانی پت میں واقع ہیں اور خطابات عیدین ان سے متعلق کردیں۔"

لیکن یہ جائز احوالی تک نہیں پہنچ سکی اور عام طور سے حالی نے شک و شبہ کی گزری۔ یوں بھی حالی نو (۹) برس کی عمر میں یتیم ہو گئے جبکہ ان کے والد کی عمر صرف چالیس برس کی تھی۔ اب ان کے سر پرست میں بھائی بہنوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ والدہ کے انتقال کے بعد معاشی حالت اور بھی ڈگر گوں ہو گئی۔ لیکن ایسی ناممکنہ صورتوں کے باوجود حالی کی علمی پیاس نہ بجھ سکی۔ یوں تو حالی انسانی تعلیم ضابطے کے ساتھ حاصل نہ کر سکے اس لئے کہ معاش کا مسئلہ ہمیشہ سامنے آ جاتا کہ بڑی دہائی تک کسی صورت اپنی علمی پیاس نہ بجھاتے رہے۔ لیکن خواب معطیٰ خاں شیخو سے ان کی ملاقات نے ان کی زندگی کا رخ قدرے موزوں بنا دیا۔ حالی کو معطیٰ خاں شیخو کی مصاحبت کے فوائد کا ہمیشہ پاس رہا۔ انہوں نے ہی انہیں بھلاب گورنمنٹ کالج ڈیلاہور میں ملازمت دلوائی۔ چونکہ شیخو بھی حالی کی طرح غالب سے متاثر و متاثرین کیا کرتے تھے اس لئے دونوں میں ارتباط کا ایک ذریعہ بن گیا۔ اسی دوران میں شعر و شاعری کی طرف حالی کا میلان بڑھ گیا لیکن شیخو کی صحبت نے ان کے اس ذوق کو مزید بڑھانے میں معاون بنایا۔ وہ اس معاملے میں غالب سے زیادہ شیخو سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:-

"... وہ حقیقت مرزا (غالب) کے مشورہ و صلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہ ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ خواب (شیخو) مرحوم کی صحبت سے ہوا۔"

ان کا احساس یہ بھی تھا کہ جمجمہ سے اور باہری الفاظ و عبارات اور عامیانات خیالات سے شیخو اور غالب دونوں بھر پور تھے۔ لہذا ان کی شاعری میں یہ صورتیں نہیں تھیں۔ گویا شیخو کی صحبت نے ان کی داخلی نشوونما میں قابل لحاظ اثرات قائم کئے۔

حالی کی شادی ان کی اپنی ماسوں زاد بہن اسلام النساء ۱۸۵۳ء میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ستر و سال تھی۔ ان سترہ کے سلسلے میں حالی کا اپنا بیان ہے کہ وہ تیز مزاج خاتون تھیں، بھر پور تھیں، حالی کے چھوٹے صاحبزادے سجاد حسین کی شادی بھی اپنے ماسوں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ گویا حالی کی بیوی اور سہولہ بھی بیچنی تھیں۔ لیکن دونوں اکثر و بیشتر بڑی بھگوتی رہیں مگر حالی اپنے کمرے میں بیٹھے پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتے۔

گویا حالی پر حال میں اپنی علمی صلاحیت اور زبان و ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ جس کا ایک نتیجہ یوں سامنے آیا کہ ۱۹۰۳ء میں انہیں مجلس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس موقع پر مولانا شبلی نے بھی انہیں مبارک باد دی۔ پھر حالی کو نظام حیدر آباد نے بھلی سالہ مارگرہ کی تقریب میں مدعو کیا، جہاں موصوف کا قیام چھ مہینے تک رہا۔ وہاں ان کی شان میں سپاندام بھی پیش کیا گیا اور مظلوم ستائش سے بھی نوازا گیا۔ اس سلسلے کی ایک نظم جو شکی عبدالاحی ایاز نے تلمیذ کی تھی، وہ محفوظ ہے۔

حالی نے پانی پت میں ایک لائبریری بھی قائم کی۔ اس سے ان کے علمی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ سر سید کی قربت نے ان کے مصلحتی ذوق کو اور بھی گھرا دیا۔ ان کے اصلاحی مضمون میں سرشت اور تجزیہ آئی۔ انہوں نے بھی سر سید کے اخبار

”تہذیب الاخلاق“ جس اصطلاحی مضامین لکھے، جن کا قتل زیادہ تر سماجیات اور سیاسیات کے علاوہ عہدِ تعلیم سے تھا۔ انہوں نے اخلاقیات اور اقتصادیات پر بھی مضامین لکھ کر دئے۔ بطور مثال ان کی عربی حالی کا انہیں احساس رہا تھا چنانچہ اسے بھی نظم و نثر میں مضمون بنایا۔ لیکن میں ان امور پر توجہ کرنے سے پہلے حالی کی ادبی خدمات کے باب میں ان کی کتابوں کی ایک تفصیلی پیش کر دوں:-

- [۱] ”مولود شریف“ (۱۹۳۳ء) [۲] ”تریاقتی مسموم“ (۱۸۶۵ء) [۳] ”چرخ محمدی“ چہ مصفاۃ رباعی“ (۱۸۷۲ء)
- [۴] ”شوقِ اہل بیت“ (۱۸۷۴ء) [۵] ”مذکرہ رحمتیہ“ (۱۸۷۴ء) [۶] ”طبقات الارض“ (۱۸۷۴ء) [۷] ”اصول فارسی“ (۱۸۶۸ء) [۸] ”کمالیہ“ (۱۸۷۴ء) [۹] ”سوانح عمری حکیم ناصر خسرو“ (۱۸۸۲ء) [۱۰] ”حیات سعدی“ (۱۸۸۲ء) [۱۱] ”مقدمہ شعر و شاعری“ (۱۸۸۳ء) [۱۲] ”یارگارِ عالم“ (۱۸۹۶ء) [۱۳] ”حیات جاوید“ (۱۹۰۱ء)
- [۱۴] ”مضامین حالی“ (۱۹۰۳ء) [۱۵] ”مقالات حالی“ (دو جلدوں میں) ۱۹۳۳ء میں انجمن شرقی اردو نے شائع کیا
- [۱۶] ”کتکرات حالی“ (دو جلدیں) (سبھن پانی پتی ۱۹۳۵ء میں شائع کیا) [۱۷] ”تکلیب حالی“ (۱۹۵۰ء میں اسماعیل پانی پتی نے نئی تالیف بطور تصحیح کر کے شائع کی) [۱۸] ”سرشتِ عالم“ (۱۹۶۹ء) [۱۹] ”مذہبِ اسلام“ (۱۸۷۹ء) [۲۰] ”مناجاتِ رب“ (۱۸۸۳ء) [۲۱] ”مجموعہ نظم حالی“ (۱۸۹۰ء) [۲۲] ”ایوان حالی“ (۱۸۹۳ء) [۲۳] ”چپ کی راز“ (۱۹۰۶ء)
- [۲۴] ”تجاربہ حالی“ (۱۹۲۲ء) [۲۵] ”کتکرات نظم حالی“ (جلد اول اور دوم) (اس میں ۹۳ قطعات ۲۲۸ غزلیں اور ۱۵۰ رباعیات ہیں۔ بارہ ترکیب شدہ اور ”چپ کی راز“ بھی شامل ہیں۔ ۱۹۳۳ء)

بحیثیت شاعر حالی کی کئی حیثیت ہے۔ وہ ایک فرنگی بھی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جدید نظم کے بانی ہیں اور مرثیہ بھی خاص انداز کا لکھا ہے۔ جدید اور تہذیب کی پیشروانی بھی انہیں کے نام ہے اور سوانح نگاری کے اولین مہمار بھی سمجھے جاتے ہیں۔ گو یہ مختلف قسم کی اولیات لانا کے حصے میں ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ جو فنی خورج انہیں حاصل قدوہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔ مگر ایک سرسید سے دانشگری کے باعث اسلامی اور اخلاقی تہذیبِ غفر اور بھی مقہوم ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے غزلگوئی میں نئی کیفیت پات کو پر دیا یا با اس سے ایک حد پر ذرایت اور نثری۔ وہ قدیم سرمایہ شاعری پر اسلامی نظر بھی ڈالتے رہے۔ اس سلسلے میں مجھوں گور کچھ دیکھیں اور سید حسن مسکری بھی انہیں وارو دیتے رہے ہیں۔ حالی کے یہاں ایک طرح کی کٹک پائی جاتی ہے۔ ہر چند کہ یہ کٹک ہماری فکر ہے، مگر بھی ایک نئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے خود کہا کہ:

حالی غنوں میں شیفہ سے مستفید ہوں

شاگرد ہر دہ کا مقلد ہوں میر کا

پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں میریت کی تلاش بے غتی ہوئی اس لئے کہ ان کی کٹک نہیں نہیں تھی۔

لیکن ان کی غزلوں کا انتخاب کیجئے تو اچھے شعرا کی کمی نہیں۔ یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ ہر معاملے میں حالی تو ان اور امجدال کا سچا دوست اور شاگرد ہے۔ ان کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے ہے۔

حالی کی غزلوں میں بڑی اور کٹک کا ایسا احساس ملتا ہے جس کی شان و شوکت انظرِ قنادوں نے کی ہے۔ حالی ایک ایسے شخص تھے جو اپنے جذبات پر بہرہ بخا سکتے تھے۔ sustain کر سکتے تھے۔ لہذا ان کے یہاں جوانی کا وہاں غلاں کرنا غل غلٹ ہوگا۔ جوشِ جذبات میں وہ کوئی ایسا شعر نہیں کہتے جس کی مراد میں اخلاقیات کو پار کر جائیں۔ بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو رکھنے میں کمال کی فنکاری دکھائی ہے۔ مجھوں گور کچھ دیکھیں کا خیال ہے کہ حالی کے یہاں شعری اور ملامت میر کا ہے طرف اور تحفہ کے طور پر لب کے ہیں، مگر مضمونیت اور مہذب سادگی شیفہ کی ہے۔ ظاہر ہے اس کو ماننے میں دشواری ہوتی ہے اور ایک طرح کے سبب ان کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں غزلوں میں ایک خاص قسم کی تہذیب ملتی ہے جس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

یہ بھی حالی کے عین مطابق بات ہوگی کہ وہ عشق و عاشقی کے جذبات کو شعر کے حکم میں اُجالے میں نہایت احتیاط سے کام لیتے، مبادا اخلاقیات پر کوئی ضرب نہ پڑ جائے۔ اپنے آپ پر یہ قدغن شعر کی لگتی میں رکاوٹ ہو سکتی ہے لیکن ایسا ہوا انہیں۔ ذیل میں چند شعرا نقل کرنا ہوں جن سے ان کی غزلوں کی عمومی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

تم کو ہزار شرم سی مجھ کو لاکھ ضیہ

الغت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

ہم جس پر مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور

عالم میں تجھ سے لاکھ سی تو مگر کہاں

کچھ بڑھاتے ہو اختلاط بہت

ہم کو طاقت نہیں عدالت کی

نظم حالی کی طرف توجہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ انہوں نے اکثر مضمونوں میں طبع آزمائی کی۔ مثلاً: باقی، تعلق، مرثیہ، قصیدہ، ترکیب بند وغیرہ۔ ان تمام مضمونوں میں ان کا تصور وہی ہے جو ان کی شخصیت کے عین مطابق ہے۔ رباعیات میں انہیں انداز سے دو قطعات میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ یعنی اخلاقیات و نظم حالی کا ہر حال میں خیالی تصور ہے۔

حالی نے مرثیہ کے سلسلے میں یہ بات واضح کی کہ ہماری نیا ہیں تو حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا کے مصائب پر ہونی چاہئیں لیکن انہیں بہت کڑھل کر ب دینا کا بیجا ناپید اگر مقصد نہیں ہوتا چاہئے۔ لہذا انہوں نے انہیں مرثیہ کہے۔ ان مرثیوں کی کیفیت قہاریت اہم ہے۔ مرزا عالم اور حکیم محمد خاں کے سلسلے میں ان کے فنی مرثیے شاہکار کا وہ بد کہتے ہیں۔

”سعدی حالی“ (مذہبِ اسلام) حالی کا وہ شاہکار ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے تو ایسے لوگ ملے

جنہیں یہ پوری نظم شروع سے آخر تک ازہر ہے۔ اس میں مسلمانوں کی معاشی، تمدنی، تہذیبی اور اخلاقی پستی پر اظہار خیال بھی ہے، پھر انہیں ایسی مختصر صورتوں سے نکلنے کی ترغیب بھی۔ ان کا ماضی کیا تھا اور حال کیا ہے؟ یہ سب اس مسدس میں موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ ترویج اقوال خیر اور

بہت دھوم سے تم نے کی آج حالی

کہ ہوں کفر کی تم نے بنیاد ڈالی

کہ مسومن سے ہیں موسیت نکالی

بڑھاپے میں کرتے ہو یہ خیر و برکت

خدا کی بھی اب چاہئے کچھ تو ہشت

رخصت اے بندہ سنا اے بوستان بے غراس

رو بچکے تیرے بہت دن ہم بدلیں سیماس

حالی کی بعض نظمیں بہت مشہور ہیں۔ مثلاً ”مناجات پیو“ اور ”چپ کی داؤ“۔ یہ دونوں نظمیں حالی کے شعور اور فکر پر دال ہیں۔

اسمیں معلوم ہے کہ اسلام میں یہ دکایا روج ہے۔ لیکن ہندو تہذیب کے زیر اثر اسے گھما دکھاتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ظاہر ہے کہ پیو کے سلسلے میں حالی کا موقف ان کے تین احرام اور جدوری ہے، جس کو انہوں نے نہایت دل Pathos طریقے پر جان کیا ہے۔ ”چپ کی داؤ“ بھی غور تو اسے غور تو اس کے موضوع پر خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان کی مقصودیت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ موضوعات اور تہذیب کے لحاظ سے حالی جدید نظم کے بانی ہیں۔ جن کے یہاں موضوعات دست سے سوال لے کر ابھرتے ہیں اور سب کے پیچھے جواب یہ ہے کہ جب تک معاشرہ درست نہ ہو زندگی مشکل نہیں ہو سکتی۔

حالی کی نظر پر توجہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ ان کا کیوں خاصہ بڑا ہے۔ ایک طرف تو انہوں نے مولود شریف تصنیف کی تو دوسری طرف بعض مناظر سے پرہیز کیا ہے اور مقالے قلمبند کئے۔ پھر سوانح میں ”حیات سعدی“، ”یارگار غالب“، ”حیات جاوید“ بھی کتابیں لکھیں۔ تنقید میں ”مقدمہ شعر و شاعری“ سامنے آئی، جو ہر زمانے کے لئے تنقیدی مشعل بن جائے۔ جب ان کی بعض کتابوں میں ”قرآن مسموم“، ”تاریخ غمخیز پر مصفاۃ رائے“، ”خواہد الہام“، ”عالم اسفا“ اور ”تذکرہ رحلت“ کی خاص اہمیت ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سبھوں میں ایک اسلامی تصور موجود ہے لیکن ہنر کے جو مطالبات

نے دلی کی شریف صورتوں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اس میں ایک بڑی جوش و خروش اور اس کی بچی کا قصہ ہے اور پھر شاہ جی کی گفتگو مکالمے کے طور پر سامنے آئی ہے۔ فی الحال کی قدامت پرستی پر سخر طعنے ہے۔ یعنی اس کتاب میں ایسے قصودات ہیں جنہیں ہم فرسودہ کہہ سکتے ہیں۔ تو بات دھنگ نظری، چالانہ عناصر و طبع و فکر کی اصلاح کا جذبہ کار قرار ہے۔ اسے ایک ناول کے طور پر بھی پڑھا جاتا ہے۔

حالی کی سوانح نگاری کی طرف رخ کیجئے تو گہرا ان کی فخریات کا حال مزید روشن ہوگا۔ ”حیات سعدی“ اور دلی کی پہلی یا ضابطہ سوانح عمری ہے۔ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ انہوں کا خیال ہے کہ اس میں جلد بچا ہے۔ یہ سوانح نگاری کے فن پر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالی نے سعدی کا انتخاب کر کے دراصل مسلم معاشرے کے کیف و کم کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ سعدی کی حیثیت جو کچھ رہی ہے اس سے ہم آشا ہیں مثلاً جہاں دو شاعر تھے وہاں روحانی عیش و بھی۔ لہذا حالی کی نگاہ ان پر بڑی قربان کے مزاج کے عین مظاہر ہے۔ یہ سوانح دو حصوں میں منقسم ہے اور اپنے آپ میں دو طرح نکلتی ہے۔ اس میں بعض ایسے قصے بھی درج کر دئے گئے ہیں جن کی حیثیت افسانے سے زیادہ دیکھ کر نکلتی ہے لیکن پھر بھی جہاں تا جہاں رکیا گیا ہے وہ بہت ہی حکیمانہ ہے۔

”یارگار غالب“ حالی کے سوانحی سلسلے کی دوسری اہم کتاب ہے۔ یہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی۔ حالی دراصل غالب کے ایسے سوانح نگار ہوئے جیسے ڈاکٹر جانسن کے لئے بائوبل۔ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ”یارگار غالب“ انگریز تہذیب کی جاتی تو غالب کی تفہیم کے بہت سے گوشے غور و جائزے۔ حالی نے غالب کو ایک فرقے کے طریقے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ خلق اور ہمدردی صورت میں۔ دیکھئے ”یارگار غالب“ کو غالب کے خاص کا دفتر کہہ دیا بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ غالب کی شخصیت کے ہر گوشے کا آسان کام نہیں تھا۔ پھر یہ بھی کہ غالب ایک مشکل پسند شاعر تھے جن کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن کی تشریح و توضیح آج بھی آسان نہیں ہے۔ حالی نے ایسے اشعار کی تشریح کر کے ایک طرح سے غالب کو اپنی راہ ہموار کی۔ غالب کی دستاویز شری، دروغ و علم اور بے داشت کرنے کی کیفیت، ان کا طرز فہانہ انداز سب ہم ”یارگار غالب“ کا جزو ہے۔ حوالہ یہ ہے کہ غالب کی نفسیاتی اہمیتیں بھی اہم گئی ہیں۔ کیا جاسکتا ہے کہ آج بھی غالب کی تفہیم میں یہ کتاب ہمہ معاون ہے اور یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس بڑا بڑا تصنیف کے اثرات غالب کی مثال میں کیا کچھ ہے ہیں۔ دوسری سوانحی کتاب ”حیات جاوید“ بھی اہم ہے۔ ایک دیکھ لے ملاحظہ ہو:-

”حیات جاوید“ حالی کے سوانحی سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی، کانپور سے شائع ہوئی۔ اردو کی نظمیں پڑھیں سوانح عمریوں میں سے ہے۔ یہ کتاب صرف سرسید احمد خاں کی

لائف ہی نہیں بلکہ انیسویں صدی کی تمدنی، مذہبی، ادبی، تعلیمی اور سیاسی زندگی کی تاریخ ہے۔ حالی کی اردو سوانح عمریوں کی طرح ”حیات جاوید“ میں بھی سرسید کے کورناموں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ لیکن ”حیات جاوید“ کی ترتیب میں انہیں اپنی مسائل اور مشکلات کا سامنا تھا وہ ”حیات سعدی“

اور باوجود غالب سے ملٹک تھے۔ کیونکہ مذکورہ بالا دونوں شخصیتیں متضاد قیام نہیں اور سر سید کی زندگی مواصلت اور مخالفت کے جہم میں گھری ہوئی تھی۔ ایسی نازک حالت میں کسی ایسی سوانح عمری کا مرتب کرنا جس سے واقعات و حقائق منبج بھی نہ ہونے پائیں اور لفظاوی پہلو بھروسہ ہو مشکل امر تھا۔ اسی اس تکلف کا اظہار حالی نے دریا چہ میں خود کیا ہے۔

حالی کی ایک حیثیت تنقیدی نظر پر سار کی ہے۔ ان کی کتاب ”مقدمہ شعر و شاعری“ دراصل ایک مقدمہ ہے۔ جو ان کے دیوان کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں کانپور سے شائع ہوا۔ یعنی یہ شاعری کا مقدمہ ہے۔ ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں ایک طرف وہ مباحث ہیں کہ ادب کا مقصد سے کس حد تک تعلق ہے اور زندگی سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ حالی نے اخلاقی اور مقصدی امور پر زور دیا ہے وہ مسلسل تنقید کا موضوع ہے۔ لیکن اس کے دوسرے رخ بھی کچھ ایسے ہیں جو کم فکر سمجھ نہیں۔ انہوں نے سادگی، اصلیت اور جوش کی تحریف کی اور انہیں شاعری کے اہم عناصر سے تعبیر کیا۔ شہید و بیانی اور ہام کو غیر ضروری قرار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ دوسرے لوگوں کے حوالے ان کے یہاں جس طرح ہیں وہ ان کے محدود علم کا نتیجہ ہیں۔ پھر تنقید پر انہوں نے جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ بھی قابل اعتناء نہیں۔ اس باب میں نہیں نے ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیا ہے جو میری کتاب ”سختی سے مصافحہ“ میں شریک اشاعت ہے۔ یہاں چند نکات پر اکتفا کرتا ہوں۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ حالی کے یہاں ہر معاملے میں شائستگی کا پہلو مقدم رہا ہے۔ ان کے یہاں افراط و تفریط نہیں ہے۔ لہذا ان کی بوطیقہ میں اگر ان کی بوطیقہ ہو سکتی ہے (تو ان کی جڑی اسی ہے اور یہ تو ان ہیوں جیہ ہوتا ہے کہ وہ تمام انسانی عوامل کو اخلاقی رویے کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اور فلسفے سے ان کی گہری واقفیت ان کے اپنے اخلاقی رویے پر حاوی نہیں ہوتی اور وہ ایک ایسے شعر و شاعر کے طبع و ادب سے جانتے ہیں جس کی ضرورت انسانی زندگی میں ہمیشہ رہتی ہے۔

اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حالی جس طرح تجسس کی بحث کرتے ہیں وہ اپنی تمام تر کردہوں کا گویا جھکھولنے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی واقعیت کلچر سے نہیں تھی اور ان کا علم لاؤریکا کے تک محدود تھا۔ لیکن حالی نے تجسس کی جس طرح بحث کی ہے وہ اپنے دائرے میں اہم ہے۔ ٹھیک ہے کہ Imaginations کے خانے میں نہیں رکھنے اور ان کی باریکیوں پر نگاہیں ڈالنے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج جن اصطلاحوں پر جس طرح بحث ہو رہی ہے یا ہو سکتی ہے وہ عظیم الدین احمد کے زمانے کی تحدید سے بھی بہت آگے ہے۔ اس لئے کہ تجسس جن امور سے مراد ہے ان کی تفصیل تو کلچر کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ نئے علوم نے اس تصور کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے اور جیسے جیسے بحث آگے بڑھتی جاتی ہے حالی کے ابتدائی تصورات کا استحکام باقی رہتا ہے۔

حالی نے جہاں اخلاقی پہلوؤں پر زور دیا ہے وہاں زندگی سے ان کی وابستگی کا اتنی ہی شدت سے اظہار کیا

ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ حالی تو ادب و شعر کا زندگی سے اس طرح جڑے ہیں جیسے ادب نہ ہو محافظت ہو لیکن مسافات کے اکبر سے پن سے حالی کے نقطہ نظر کا کوئی تعلق نہیں اس لئے کہ حال انہیں اور بے شعری نہ صرف تیز کر سکتے تھے بلکہ یہ جانتے تھے کہ زندگی کا دھن عمل شعر و ادب میں کس حد تک نافع ہے اور کہاں نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

نواب محسن الملک

(۱۸۳۷ء — ۱۹۰۷ء)

نواب محسن الملک کا اصلی نام سید مہدی علی قادر میرزا حسن علی کے صاحبزادے تھے۔ ان کا خاندان سادات دارہ سے تھا۔ گویا ایک شیعہ خاندان کے فرد تھے۔ ۱۸۳۷ء میں اکاؤ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ان کی ابتدائی تعلیم بھی ہوئی۔ شیعہ فکری میں ملازمت ہو گئی پھر مسزیم کلکتہ کے وسیلے سے ترقی کی۔ خود کے بعد پختہ بھی ہوئے اور سرشت دار بھی۔ ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار بن گئے۔ مکی و زمانہ ہے جس میں انہوں نے اردو کی درامت کرنا میں قلمبند کیا۔ ایک کا نام ”قانون مال“ اور دوسری ”قانون نوچداری“۔ یہ علوم کیوں انہوں نے شیعہ مذہب ترک کر دیا اور ایک مرتلے میں میں ہونے کا اعلان کیا۔ ۱۸۶۷ء کے حعلق ایک کتاب ”آیات حیات“ بھی قلمبند کی۔ ۱۸۶۷ء میں مرزا پور میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ حیدرآباد کے سر سالار جنگ نے ان کی خدمات حاصل کیں اور تب ان کی تنخواہ ماہوار (۱۲۰۰) روپیہ مقرر کی پھر بڑے کر پندرہ سو روپے (۱۵۰۰) آگئی۔ انہیں نواب شیر نواز جنگ کا بھی خطاب ملا۔ ۱۸۷۶ء میں راجہ نو سکریٹری ہوئے۔ پھر ترقی کرتے کرتے پرنسپل سکریٹری ہو گئے۔ تب سر پرامی صاحب پر غار ہوئے اور نوکرا تین چار روپے قرار پائی۔ انہوں نے معذریات کے تعلق سے کچھ معلومات اخذ کیں۔ اسی زمانے میں برطانیہ کے درج مسٹر گیل اسٹون سے ان کے تعلقات قائم ہو گئے۔ اب تک سر سید کی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ ابتدا میں سر سید سے الگ تھلک رہے لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کے قریب آتے گئے۔ سر سید بھی ان کی صلاحیت اور عظمت کو خوب سمجھتے تھے۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ سید وف نے اپنی بیٹہ زندگی سر سید کے ساتھ ہی گزاری۔ ۱۸۹۸ء میں سر سید وفی کے انتقال کے بعد وہ علی گڑھ کالج کے سکریٹری منتخب ہو گئے ان کا انتقال ۶ مارچ ۱۹۰۷ء کو ہوا اور انہیں سر سید کے قریب ہی دفن کیا گیا۔

نواب محسن الملک نے کالج کی اس اشد خدمت کی جب اس کی مالی مشکلات بہت بڑھ چکی ہوئی تھی۔ ایک لاکھ روپے کا ٹھن ہو چکا تھا اور کالج قرضوں سے ادب گیا تھا۔ نواب محسن الملک متحرک رہے اور چندے اکٹھے کئے۔ نتیجہ میں اس کی حالت کچھ مدھری بلکہ بہتر بنا دیا۔ درست ہوگا کہ ساری مشکلاتیں حل ہو گئیں اور قرض بھی ادا ہو گیا۔

محسن الملک کی خدمت کا اعزاز مولانا حالی نے اس طرح کیا:

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار

مر کر کے ہم قوم کے کام آ گیا آخر

مہدی کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا
اس کو بھی وہی قوم کا غم کھانا تھا
یوں چیتے ہیں یوں سرستے ہیں قوموں کے فدائی
دنیا کو تلاش یہ وہ دکھلا گیا آخر
مہدی کے لئے قوم حجاز دار ہے ساری
سکھرام ہے کشمیر سے تا داس کھاری

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ محسن الملک نے حیدرآباد کے زمانہ قیام میں ریاست میں غازی کی جگہ اردو
گورنر کادی راجا بن جانے کی تجویز دی اور کامیاب بھی ہوئے۔ پھر ان کے وہ مضامین جو "تہذیب الاخلاق" میں شائع
ہوئے وہ اپنی سادگی اور فصاحت کی بنا پر عام مسلمانوں کے لئے بھی بہت صبر ثابت ہوئے۔ مولانا حالی تو
کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے تھے کہ ان کی تحریروں سے مسلمانوں میں جوش پیدا ہوا اور وہ جذبہ عمل سے بھی سرشار
ہوئے۔ مولانا شبلی بھی ان کی تحریروں کی خوبیوں کا اعتراف کرتے تھے۔ محسن الملک کے خطوط کا ایک مجموعہ "مجموعہ رسائل" کے
نام سے شائع ہو چکا ہے۔

عبد المجید سالک

(۱۸۳۵ء - ۱۹۵۹ء)

عبد المجید سالک کی پیدائش ۱۸۳۵ء میں جلالہ میں ہوئی۔ بچپن ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد انہوں
نے اسلامیہ کالج، لاہور میں داخلہ لیا اور پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کے علاوہ ڈسٹریکٹ فاضل ہوئے۔

سالک کی کئی ادبی چھٹیئیں ہیں مثلاً وہ صحافی بھی تھے شاعر بن کر اور مقرر بھی۔ ان کا تعلق ریڈیو سے بھی رہا تھا۔
سالک نے ۱۳ رسائل کی عمر سے شاعری شروع کر دی تھی۔ زیادہ تر وقت صحافت میں گزرا۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں
نے ایک ادبی ماہانہ "قائوس خیال" کا اجرا چھان کورٹ سے کیا۔ کبھی جانتے ہیں کہ وہ بچوں کے درساں "پھول" کے ایڈیٹر
رہے اور "تہذیب نسواں" کے بھی۔ یہ عرصہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۵ء تک ہے۔ اس دوران انہوں نے ادبی ماہنامہ "کھکھاس" بھی
مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ اسے سید امتیاز علی خان نے لاہور سے نکالا تھا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۷ء تک سالک مشہور روزنامہ
"زمیندار" لاہور کے ایڈیٹر رہے تھے۔

جنگ آزادی کے مرتلے میں ایک سال کے لئے انہیں قید کی سزا بھی پہنچتی پڑی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے
روزانہ "انقلاب" کا اجرا کیا تھا اور ۱۹۳۹ء تک اس سلسلے سے وابستہ رہے۔

والے اس کا نام کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

موصوف کشمیری مسائل سے بھی الجھتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء تک رہا تھا۔ ان کے اخبار "انقلاب"
کو کشمیر میں پابندی لگادی گئی تھی۔ جب انہوں نے "کشمیری مسلمان" نکالا تو اس پر بھی کشمیر کا بھی اجرا کیا اس پر بھی کشمیر میں
پابندی لگادی گئی۔ وہ اخبار کشمیر میں نہیں آسکتا تھا۔ انہوں نے "مظلوم کشمیر" کا بھی اجرا کیا۔ اس پر بھی کشمیر میں پابندی لگی۔
سالک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر نئی میں تو دھڑلے دیکھتے تھے غازی اور عربی کے بھی ماہر تھے۔
انہوں نے پنجابی میں بھی شاعری کی۔ ان کے بارے میں ہے کہ وہ گنگو کے نہ صرف آداب سے واقف تھے بلکہ جہاں
نہیں بھی ہوتے اپنی قوت گوئی اور اثرات سے لوگوں کا دل وہ لیتے۔ انہوں نے انھار کے مسائل پر آزادی کے بہت
سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور عربی جو کچھ بھی لکھا اس میں گہرائی اور گیرائی کی نظر کا پتہ چلتا ہے۔ دراصل ادبی
اعتبار سے وہ حالی اور اقبال اور غیر سے متاثر تھے اور اردو کے کلاسیک مزاج پر ان کی نظر تھی جس کے اثرات ان کی غزل میں
دیکھے جاسکتے ہیں۔

انہوں نے ایسے ہی عروض و بحر کا استعمال کیا جنہیں تک رسک سے دور رکھا جاسکتا ہے۔ فیذا ان کی غزلوں
میں کاٹیکر چاروں کی رویت پائی جاتی ہے۔

سالک ادب میں زندگی کے تمام تر پہلوؤں کی عکاسی کرتے رہے تھے اور ان کا موقوف تھا کہ ادب زندگی ہی کے
لئے ہے لہذا وہ ترقی پسندی سے قریب رہے لیکن اس کی احتجاج پسندی کو بھی قبول نہیں کیا۔

اپنی صحافتی اور ادبی زندگی کی غایت مصروفیت کے بعد وہ انجمن حمایت اسلام کے جرنل ٹنٹل میں رہے اور
پاکستان قلم سٹرک بورڈ کے ممبر بھی۔ موصوف نے الہیہی اپنے پیس کے لکھنے کی خدمت بھی انجام دی۔

سالک کی اکثر کتابیں یا تو ۱۹۲۷ء سے پہلے شائع ہوئیں یا ۱۹۳۹ء کے بعد۔ ۱۹۵۷ء سے پہلے کی کتابیں "چترا"
اور "نیا چاند" ہیں۔ دراصل یہ نگار کی تخلیقات ہیں جن کا ترجمہ سالک نے کیا۔ "چچا اور دیگر افسانے" بھی اسی زمانے کی
کتاب ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "راؤد و محترزل" ہے، جس کا دوسرا ایڈیشن ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔ ۱۹۳۷ء کے بعد
اشاعت پر نہ ہونے والی کتابوں میں ایک سرگزشت بھی ہے جہاں کی مبالغہ خیانت ہے۔ "اکبر اقبال" ان کی مشہور کتاب
ہے، جس میں اقبال کی زندگی کے احوال سامنے لائے گئے ہیں۔ خاکوں پر مشتمل ایک کتاب "یاران کہن" بھی ان کی
بانگ ہے۔ انہوں نے خلافت پر بھی ایک کتاب لکھی۔ نام ہے "مسلم خلافت ہندوستان میں"۔ یہ کتاب ایک تحقیقی سند
کے طور پر یونیورسٹی کے منظور شدہ ہے۔

نکس نے یہ تمام امور ساجد اکاڈمی کے "انسائیکلو پیڈیا آف انڈین لٹریچر" (جلد چہارم) صفحہ ۶۳ اور ۶۴ پر
سے اخذ کئے ہیں۔ ویسے "راؤد و محترزل" نے لاہور فروری ۱۹۳۱ء میں ایک خاص نمبر کا لاہور اخبار "نیا چاند" سے "آکھیں
ترسجیاں ہیں" میں ان کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ جہاں سے یہ حقائق گھر رہا ہوں۔

”مالک صاحب نے تعلیم ہندو کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود زبان اور ادب کی تقسیم کی کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ شہنشاہ ہندو اور مسلم تہذیب کی دو قسموں میں کے ذہن میں تھی۔ جس کی تشکیل میں ہندوستان کی ایک سیاسی جماعت نے اپنے تمام ازار تہذیب صرف کر دیے تھے لیکن دونوں تہذیبوں کو اس طرح سے ایک تہذیب بنی نہیں سمجھتے تھے جس طرح سے ہندوستان کی ایک اور سیاسی جماعت نے ان دونوں کو پیش کرنے کو پیش کیا۔ اس بڑک سکتے پر ان کے خیالات نے ضرورت اور مصیقت کی بجائے حقیقت پر مبنی تھے۔ وہ ہندو مسلم تہذیب کو الگ الگ صداقتیں تصور کرنے کے باوجود انہیں ایک دوسرے کے محبت مند اثرات سے آرا نہیں سمجھتے تھے۔“

مالک کا انتقال ۱۹۵۹ء میں ہوا۔

وقار الملک

(۱۸۴۷ء — ۱۹۱۷ء)

وقار الملک کا حقیقی نام مشتاق حسین تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۸۴۷ء میں مراد میں پیدا ہوئے جو علی گڑھ میں ہے۔ ان کا خاندانی سلسلہ عبدالرحمن سنہلی سے ملتا ہے۔ عبدالرحمن شاہجہاں کے دربار کے استاد تھے جن کا نام سید محمد فضلہ تھا۔ انہیں کی اسراحت سے دربار میں رسائی ہوئی تھی۔ کئی چھ مہینے کے بعد کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے باپا نور علی نے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ ۱۸۸۵ء میں جب مراد آباد میں تحصیل کا مدرسہ قائم ہوا تو مشتاق حسین وہیں داخل کر دیے گئے۔ وہاں چار سال تک ان کی تعلیم ہوتی رہی۔

یوں تو ان کے باپا انہیں انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن نگر محاش کی وجہ سے وہ عربی تعلیم جاری نہیں رکھ سکے اور ایک مجموعہ کی نوکری کے بعد ۱۸۶۰ء میں انکم ٹیکس کے دفتر سے وابستہ ہو گئے۔ پھر ۱۸۶۵ء میں برادریوں کے نائب مرشد و سر ہوئے۔ سید جعفر گھنٹی ہیں کہ صدر الدولہ کی جگہ خالی ہوئی تو مشتاق حسین علی گڑھ چلے آئے۔ یہاں سرسید کے ساتھ کام کرنے لگے۔ ان کے خیالات سے مستفید ہوئے گا انہیں اچھا موقع ملا۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ”مالک سوسائٹی“ کے ممبر بن گئے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک مدرسہ ”مفید الخلائق“ قائم کیا۔ ۱۸۶۹ء میں ایک یونانی خطا خانہ کھولا۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک حیدر آباد میں ایک کام کرتے رہے۔ حیدر آباد میں ان کی خواہش خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے محبوب علی خاں عاشق ششم نے انہیں ۱۸۸۵ء میں خاں بہادر کا خطاب عطا کیا اور ۱۸۹۰ء میں حکومت حیدر آباد نے وقار الدولہ کا وقار الملک کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جب وقار الملک حیدر آباد سے علی گڑھ واپس ہوئے تو کالج اور سوسائٹی کی خدمات میں برتنی مصروف ہوئے۔ یہ سارے حقائق سید جعفر نے ”مقالات شیرانی“ کے مقدمہ ”ادکار حیات“ سے حاصل کئے ہیں۔ ان

کا انتقال ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو مراد میں ہوا۔ ان کی کتابوں میں ”الخطاب فرانس“ اور ”نوجوانین“ ہیں۔ جو ترجمہ ہیں۔ ”تہذیب الاخلاق“ کے مضامین ادب ہیں۔ انہوں نے سیاسی مضامین بھی لکھے اور سماجی بھی۔ ان سب میں مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون ”تکفیل علوم جدیدہ“ میں اپنے تعلیمی تصورات واضح کئے ہیں۔ جسے جدیدہ اور نوجوانی قرار دینی ضرورت کی حرکت کے سلسلے کا ایک مضمون ہے۔

عام طور سے وقار الملک کی تحریر میں تعلیم کی پالی جاتی ہے۔ ان کے مضامین دلچسپ اور قابل لحاظ ہیں۔ کہیں کہیں انگریزی مطالعے کا بھی پتہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں غزرواں ہے اور ایک طرح کی تحقیق کا احساس ہوتا ہے۔ بقول سید جعفر:

”سرسید کا مشن اپنے دور کے تمام باشعور افراد کو موت غمزدہ رہا تھا۔ سرسید کے مقصد اور ان کے نصب العین میں راسخی ہر گز نہ تھی اور حال ہی میں جو تھی کہ تہذیبی حیثیت سے مرثا بر باشعور فرد اس کی طرف توجہ دیتا تھا۔ جو ان کی محبت سے مستفید ہوتا وہ ان کی گمراہی دور ہوتا تھا۔ وقار الملک ان لوگوں میں سے ہیں جن پر سرسید کی محبت کا چادر چلی گیا تھا۔ سرسید سے ان کی پہلی ملاقات مراد آباد کے قلعہ کے زمانے میں ۱۸۶۶ء میں ہوئی تھی۔ جب ”مالک سوسائٹی“ قائم ہوئی تھی تو انہیں اس کا ممبر بنایا گیا اور سرسید سے پریس کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ جب ”تہذیب الاخلاق“ جاری ہوا تو وقار الملک سرسید کے خیالات کا اپنے مضامین کے ذریعے سے پرجا کرنے لگے۔

سرسید کی تحریروں میں غلطی و صداقت کا ہر دور تھا وہ اور ان کے بلند مقاصد میں جو حقیقت تھی اس کے اثر سے شاید ہی کوئی ذی حس مصطفیٰ محفوظ رہ سکا ہوگا۔ ضمن الملک، حالی، چراغ علی اور وقار الملک کے مضامین سرسید کی آواز ہارکت معلوم ہوتے ہیں۔ ”موج کوڑ میں گمراہی“ میں سرسید اور وقار الملک میں بعض وقت جہاں اختلاف رائے ہو جاتا تھا، ان کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا یہ اختلاف رائے کا سوال تھا اختلاف طبع کا نہ تھا۔ سرسید اور وقار الملک دونوں آزادی اختلافات کے باوجود ایک ہی ذہب کے انسان تھے۔“

مولوی چراغ علی

(۱۸۳۶ء — ۱۸۹۵ء)

سرسید کے مداح اور نقی مولوی چراغ علی تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۶ء میں ہوئی۔ یہ کشمیری تھے۔ ان کے اجداد

انگریزی کتابوں کے بعد ان کی قابیلیت کی سب سے بڑی قاشاک و سبکی مضامین ہیں۔

بہر طور یہ بات صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ مولوی چراغ علی نے انہیں مقاصد کے لئے کام کیا جو سرسید کے لئے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ بعض ہزاروں اختلافات کو سمجھنا کیجئے تو ان کے ذہن ان کے اپنے بہرہ ور تھے جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

امداد امام اثر

(۱۸۳۹ء — ۱۹۳۲ء)

سید امداد امام نام شخص اثر خطاب شمس العلماء اور نواب۔ ۱۸۳۹ء کو مطبع مسالہ رچو رچ پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شمس العلماء سید و سید الدین بہادر تھا۔ سید علی حسن بکراہی شاگرد علی بکراہی "کاشف المظہر" کے معروف "بہارستان خرم" کی تقریباً قلمبند کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"حضرت مسطف یعنی جناب شمس العلماء حکیم سید امداد صاحب جو عطف اکبر جناب شمس العلماء سید و سید الدین خاں بہادر ابن شمس امام علی ابن سید یحییٰ اللہ ابن سید احمد اللہ حصینی الحسنی کے ہیں۔ نسبت نسل حضرت زید شہید فرزند ارجمند حضرت امام ابن العابدین علی ابن ابی الحسن ابن علی ابی طالب علیہم السلام کے ساتھ رکھتے ہیں۔"

امداد امام اثر کی باطنی تعلیم مدرسہ اسکول روکھی میں نہیں ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے والد نے یہ نفس نہیں ان کی تعلیم میں دلچسپی لی اور دس دسے رہے۔ پھر انہیں چیدہ دلوگوں کی صحبت بھی نصیب تھی۔

امداد امام اثر کا انگریزی حکومت نے دو بار خطاب سے سرفراز کیا۔ پہلی بار ۱۸۹۹ء میں انہیں شمس العلماء خطاب دیا پھر ۱۹۰۹ء میں نواب کا۔

موصوف کی بڑی تفسیرات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) "کاشف المظہر" (۲) "معراج النکاح" (۳) "نسانہ صفت" (۴) "کتاب الاشارة" (۵) "کیا ہے ذراعت" (۶) "نوائد دارین" (۷) "مصابیح الظلم" (۸) "معروف بہ مناظر العصاب"

(۱) "معراج النکاح" میں ۶۰ تفسیروں کے افکار و نظریات درج ہیں اور افسوس اُنھوں میں ان کے احوال زندگی۔ (۲) "نسانہ صفت" میں تو بیرونی طور پر ایک ہول ہے لیکن اس میں قلبیات و نجوم و فلسفہ و فیرہ ہیں۔ مغرانیہ اور تاریخ کے باعث بھی درج کئے گئے ہیں۔

(۳) "کتاب الاشارة" مجربوں اور ان کی قصوں پر ایک نکل کتاب ہے۔ اس میں اشعار و اشارے کے فوائد سے

وہاں سے شخص ہو کر جناب ہو گئے تھے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ چونکہ یہ میرٹھ میں ملازمت کرتے تھے اس لئے وہیں مقیم بھی ہو گئے تھے۔ والد کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ہوا جب چراغ علی کی عمر محض دس سال کی تھی۔ ابتدائی تعلیم کا کوئی واضح نظم نہ ہوسکا۔ حالات کے جبر کے تحت انہیں ملازمت حاصل کرنی پڑی لیکن بدولتی کرتے رہے اور صوبہ دار تک کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۹۵ء میں ہوا۔

مولوی چراغ علی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے خلاف لکھنے والوں کے خطرات کو دور کرنے میں موثر رسائل قلمبند کرتے رہے۔ انہوں نے ایک پارٹی کی کتاب محمدی کے دو میں "تعلیقات" کے نام سے ایک کتاب قلمبند کی اور پارٹی کے باخبر کو گمراہی قرار دیا۔ لیکن ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مرزا نظام محمد قادیانی کی کتاب "نیراجن احمدیہ" کے سلسلے میں موصوف نے ان سے تعاون کیا۔ وہ کچھ کچھ نہیں آتی۔

مولوی چراغ علی زیادہ تر انگریزی میں لکھتے تھے اور ان کے انگریزی اسلوب کی اکثر و بیشتر تعریف کی جاتی تھی۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:-

"مولوی صاحب کی اکثر کتابیں انگریزی میں ہیں اور باوجودیکہ ان کی انگریزی تعلیم کا قاعدہ نہ ہوئی تھی مگر یہ سے بڑے اہل قلم ان کی انتقاد و بازی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کے مضامین انگلستان کے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوتے تھے اور ان کی تصانیف پر انگریزی رسالوں میں نہایت عمدہ رویہ لکھے گئے۔ انہیں جبرانی اور سوائی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ اسی زبان وانی قہد تھا کہ ان کے مضامین لسانیاتی حقیق کے اشارے سے بڑے محققانہ ہوتے تھے، جن میں حقیقیت، صحت نظر اور تحریر کی چوٹی پوری خوبیاں موجود تھیں۔ انہوں نے انگریزی میں جو کچھ لکھی ہیں ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) Critical Exposition of the popular jahari

(2) Reforms under Muslim Rule

(3) Mohammad-The true prophet

ان کی اردو کتابوں کے نام یہ ہیں:-

"تعلیقات" اسلام کی دنیوی رکتیں، "قدیم قوموں کی تاریخ" "ٹی بی باجود" "دار یہ تعلیم" "تعلیق بابا زما"۔

ایک اور کتاب لکھنے کا ارادہ تھا جس کا نام "العلوم البجہ یہ وہ الاسلام" تجویز ہوا تھا مگر موت نے فرصت نہ دی۔ "رسائل چراغ علی" کے نام سے ان کے کچھ رسالے بھی طبع ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے۔ مولوی صاحب "تہذیب الاخلاق" کے اہم مضمون نگار تھے اور دراصل ان کی

بھی بحث کی گئی ہے اور بعض چوبیس کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

(۴) ”کیمیائے زراعت“ کے بارے میں مسٹر محمد حسین صاحب رقم طراز ہیں:-

”یہ کتاب ضرور اس قابل ہے کہ ہر شخص جس کو زراعت سے تعلق ہے اور خصوصاً وہ لوگ جو اس قلمی میں دلچسپی رکھتے ہیں، اس کو اپنے پاس رکھیں اور اس کے مسائل پر جو ہندوستان کے کسان سے ضروری تعلق رکھتے ہیں حل کرتے ہیں۔“

(۵) ”فرماندہاری“ ایک مذہبی کتاب ہے جو ویسائیت میں لکھی گئی ہے۔

(۶) ”مصباح العظم“ میں شیعی عقیدہ کے پس منظر میں مذہب امامیہ اور آل محمد سے متعلق مختلف امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۷) ”کتاب الجواب“ المعروف بـ ”مناظر الصواب“ مذہب امامیہ کے پس منظر میں بعض سوالات کے جواب نیز خاندانِ انبیا پر کچھ مصائب کا سامنا کرنا اور ان کا بیان ہے۔

ادوارد ایم اثر کی ”کاشف الحقائق“ لطائف حسین حالی کی ”مقدمہ شعر و شاعری“ کے آس پاس لکھی گئی۔ یہ دو حصوں میں ہے۔ پہلی جلد ۱۹۹ء میں ”طبع انڈیا آف اشیا سے شائع ہوئی اور اس کا نام ”بہارِ اشیا“ رکھا گیا۔ اس میں مختلف اقوام جہاں کی شاعری کا ذکر ہے نیز اخلاقی، مذہبی و معاشرتی سے بھی بحث کی گئی ہے۔ مصروف بنان و ادبی اور عرب کی شاعری بھی زیر بحث آئی ہے نیز مختلف نکات مثلاً شاعری کی تخریج، موسیقی سے اس کا تعلق، مصوری وغیرہ بھی زیر بحث آئے ہیں اور اس پر تفصیل و مباحثہ گفتگو کی گئی ہے۔ موصوف کو اس کا احساس تھا کہ مصوری ایک قسم کی شاعری ہے۔ ان امور پر ادوارد ایم اثر نے تفصیل گفتگو کی ہے پھر Objective اور Subjective شاعری کے نکات واضح کئے گئے ہیں، یہ بحث اثر کے ادبیات میں سے ہے۔ لفظ وضعی کی گفتگو کرتے ہوئے اثر نے اس کا احساس دلایا ہے کہ الفاظ کا استعمال جو بظاہر بہت اعلیٰ معلوم ہوتا ہے اچھا شعر نہیں بنا سکتا۔ وہ شاعری کو ایک امر طبعی کہتے ہیں اور اس کا احساس رکھتے ہیں کہ زمانے کے لحاظ سے ادوار شاعری میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور اس کے اغراض بھی بدلتے رہتے ہیں۔ شعریت کے لگائی و جیدہ نکات زیر بحث آئے ہیں جن کی تفصیل دلائی ہے۔ اس کے بعد اثر نے رام، مہر، راجہ، ان و غیرہ کے ادبیات کو زیر بحث لایا ہے اور ان کے اہم شعر پر خصوصاً توجہ کی ہے۔ ادوارد ایم اثر نے ایرانی ادبیات سے بحث کرتے ہوئے ڈرامہ نگاری پر بھی ایک نظر ڈالی ہے۔ کامیڈی اور تریجڈی پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو منظوم کے حراج کو خاطر میں لایا ہے۔ یورپ کے عہدِ ریناسنس کے علاوہ عربوں کی قدیم شاعری پر شرح وسط سے روشنی ڈالی ہے۔

”کاشف الحقائق“ جلد دوم میں ملک فارسی اور فارسی شاعری کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر فارسی اور اردو کی اشعار شاعری کا بذریعہ تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ غزل گوئی کے باب میں جاکی، بھائی، شیرازی، خسرو،

اردو نثر نگاروں میں جان گلبرسٹ پر بھی توجہ کی گئی۔ اس کے بعد سید محمد بخش حیدری، نثار بہار علی حسینی، میراج، حافظ اللہ بن احمد، شیر علی، خسرو، خیال، چند لالہ، جواں کاظم علی، جواں مالو، لی کوئی، ظہیر علی والا اور اکرام علی ہیں۔ ولی کوثری، الہ مارغ شاعر کہا گیا ہے اور ان کے کلام میں درد، موجودہ، میر، معنوی، ذوق، آتش، نارخ کے رنگ کی وضاحت کی گئی ہے۔ سودا اور میر پر بطور خاص توجہ کی گئی ہے۔ میر کو سلطانِ احقر کہتے ہیں۔ ذوق اور غالب پر بھی اچھی گفتگو ملتی ہے۔ آتش پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ قصیدے سے بحث کرتے ہوئے فارسی قصیدہ نگاروں مثلاً رودی، فردوسی، سنائی، انوری، نظامی، سعدی اور گاندی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سورا پر تفصیلی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ فارسی کے قصیدہ نگاروں کا بھی ذکر ہے اور اس باب میں اردو کے بھی شعرا زیر بحث آتے ہیں۔ مشعوذوں کے ذیل میں اردو اور فارسی مشعوذوں کی نظر رکھی گئی۔ میر حسن پر خصوصاً توجہ کی گئی ہے۔ سرے کی بحث میں ادوارد ایم اثر میراجس کے مرثیوں کو لیاہی کہتے ہیں۔

”کاشف الحقائق“ میں ایک طرف قصیدات سے بحث ہے تو دوسری طرف اس میں ادبیات کا مالی منظر نامہ بھی ہے۔ نقاد جی تنید کی صورت جواں کبلی پر وضاحت سے ملتی ہے۔ لہذا اپنے کیف و کم کے اظہار سے اس کی آواز بھی اجیت ہے۔ حیرت ہے کہ حالی پر تو ان کے مقدمے کے ذیل میں مسلسل اور سراسر گفتگو ہوتی رہی ہے لیکن حالی کے یہاں ”کاشف الحقائق“ اور ادوارد ایم اثر ضمنی طور پر بھی زیر بحث نہیں آتے۔ یہ اردو تنقید کا کوڑا بھی ہے اور ایہ بھی کہ کچھ نکتے میرا کلام ادوارد ایم اثر تعصب کا مظہر ہے ہیں اور ان کا دائرہ عمل حالی سے وسیع تر ہے۔ اس کا احساس ہونا چاہئے۔

میں نے ترقی اردو بورڈ دہلی کے لئے ”کاشف الحقائق“ کی دونوں جلدیں ایڈیٹ کی تھیں۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے اس کے مقدمے کو ایک الگ کتابی صورت میں شائع کرنے کی کوشش کی اور کچھ اضافہ کے ساتھ ایچ کیشل پبلیکیشنز دہلی نے ”کاشف الحقائق“ ایک مطالعہ ”شائع کر دیا۔ اس کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تفصیل کے لئے ان کتابوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

ادوارد ایم اثر کا وہم نامی قاصد تھا۔ ان کی دوسری تصنیفات جن کی فہرست دی جا رہی ہے متنوع اور اہم ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کیوں بڑا وسیع تھا۔ اس کی تفصیم کی ضرورت ہے۔

ادوارد ایم اثر شاعر بھی تھے۔ ان کا سرمایہ شاعری بھی وسیع اور محترم ہے۔ اسے موصوف کی پینٹکس کے حوالے سے دیکھنا اور سمجھنا چاہئے۔ ڈاکٹر اختر قادری نے ادوارد ایم اثر پر تحقیق کی تھی۔ مقالہ چھپ چکا ہے، اسے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ادوارد ایم اثر کی وفات ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں آہلک (گیا) میں ہوئی۔ ”میرا لخصی“ (۲) صفحہ ۳۹ پر ان کی تاریخ وفات کا شعر اس طرح ہے:

”خاتم طرقت“ لکھو مستور

ذوالحجہ لہذا اپنی غارِ امت سے کبھی بطنِ جنس ہوئے۔

مہدی افادی کی تین شاخیاں ہوئیں۔ تیسری بیوی عظیم الشان تھیں جو بیگم مہدی کے نام سے معروف تھیں۔ انہیں کی مسماہی سے ۱۹۳۸ء میں ان کے مظاہرین اور مکاتب شاخ ہوئے۔ مکاتب میں بیگم مہدی نے وہ خطوط شائع نہیں کئے جو ان کے نام تھے لیکن ۱۹۶۵ء میں "سچیدھرت" کے نام سے ڈاکٹر محمود الہی نے وہ خطوط بھی شائع کر دیے ہیں۔ مہدی افادی بقول فیروز احمد:-

"علی گڑھ تحریک کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال اس وقت ہوا جب اس تحریک کے ادبی مقاصد کے خلاف ایک نرا ادبی میلان ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ اس طرح ان کی فکر و نظر کا سہارا دست میں رہتا ہے ایک کا تعلق اپنے عہد کی اس جدید تحریک سے ہے جس میں وقت اور زمانے کی اور زندگی اور ادب کو روح عصر کا ترجمان بنانے کی کوشش کی گئی۔"

لہذا مہدی افادی کے تصورات اپنے تصادات کے دھار معلوم ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو اس تحریک کا اثر ان کے ذہن پر پڑا تھا ہے تو دوسری طرف جو جو اس سے اختلاف کی قومیت بھی ابھرتی رہی۔ لیکن یہ سمجھ ہے کہ انہوں نے خود محسوس کیا تھا کہ آج کی فنی کا ذوق "تہذیب الاخلاق" کا پیدا کردہ ہے۔ تحریک کا اثر خود ان کی شخصیت کی تعمیر کا ایک حصہ ہے۔ چونکہ جذباتی احساسات ان کے دل کو مسلسل متاثر کرتے رہے تھے اس لئے عقل پسندی کہیں کہیں رہ جوتی نظر آتی ہے۔ یہ تھیں اول اور دماغ کی کوشش کا آئینہ ہے۔

بہر طور، مہدی افادی کے مضامین جہاں روشن خیالی کا تصور قراہم کرتے ہیں وہیں جذباتی احساسات سے سلبو نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان میں ایک طرح کی کشمکش پیدا ہو گئی ہے۔ موصوف کا مضمون "اور دل لڑیج کے عناصر غم" ہیئت پڑھا جا تا رہا ہے جس میں سرسید، آزاد، حالی اور شبلی کے افکار کو شبلی کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح ملک میں تاج کو معلم اول میں شبلی کے تصورات کو کم سے کم الفاظ میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شبلی کو اس زمانے کے مصنفین میں کس حد تک اعتبار حاصل تھا۔ مہدی نے حالی کے عقلی ذہن کی بڑی داد دی ہے لیکن کہیں بھی اپنے خیال کو جھجکے بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک مضمون شبلی سوسائٹی پر بھی ہے وہ بھی قائل مطالعہ ہے۔ ایک "گگ" مضمون میں حالی کی معاصرانہ جھجک پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔

مہدی کی نظر حسن و عقل کے معاملات پر رہی تھی۔ چنانچہ ایک مضمون "فلسفہ حسن و عشق" یونانیوں کے نقطہ نظر سے "معرب کیا گیا ہے جس میں محبت کو Define کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ محبت کے لوازمات کو عورت کی وابستگی سے تعبیر کرنے کی کاوش ملتی ہے۔ ایک اقتباس ملا ہے:-

"عورت کتنی ہی پاکیزہ و شہیدانہ خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی کافرانی کا شہیدائی

ہو اس کی افواج اس کا سر بائے نطاط ہیں۔ جن سے اس کے دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ چپے چپے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتی۔ وہ ادا کر کے رہے گی۔ کیونکہ یہ امر اس کی فطرت میں داخل ہے۔ شائد سے آج کل خود گرائے لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ یہ اس کی فطرت کا راز ہے جسے وہی خوب سمجھتی ہے۔ دہرائے ہوئے آج کل میں دماغ اسے اپنے کا بھار غائب کرنا منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ نظر بھرا کر دیکھے! عزم کا جائزہ نظر ہی ایک طرح کی راد حسن ہے جو ہزار پارہائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لے کر رہے گی۔"

اور اصل یہ Erolie تصورات ہیں جنہیں عقل کی کسوٹی پر نہیں دیکھا جاسکتا، انہاں کا رشتہ سرسید کی تحریک سے جوڑا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ ادب کی بساط کا ایک بڑا حصہ محبت عورت اور اس کے لوازمات سے عبارت ہے۔ مہدی افادی اپنی صیرگیوں کی وجہ سے آج بھی پڑھے جاتے ہیں اور یہ ان کی خوش نصیبی ہے۔ مہدی افادی کا انتقال ۱۹۶۱ء میں رہا۔



ذریعہ کی۔ سب سے پہلے ٹیلر نے ۱۸۴۳ء میں کانچ کے قیام کی سفارش کی اور ۱۸۴۵ء میں کانچ قائم ہو گیا۔ ٹیلر اس کے متحمس ہوئے۔ جلد ہی کانچ نے ترقی کی اور ۱۶ جولائی ۱۸۳۶ء میں یورو ٹمپ کے طب کی تعداد ۱۴ تھی اور ایک سال مزید گزرنے کے بعد ۲۰۳ ہو گئی۔ ۱۸۴۸ء میں دوسرے مضموعات کے ساتھ ساتھ برٹش راج فائنٹ کنٹریمر جاسٹس منکاف نے ایک انگریزی شیعہ کا اضافہ کر دیا۔ پاورسپے کہ ۱۸۳۵ء تک سرکاری و غیر سرکاری مدرسوں میں مشرقی علوم اور زبانوں کی تعلیم دی گئی زبانوں میں ہی ہوتی تھی اور انگریزی زبان کی حیثیت ثانوی تھی۔ لیکن ۱۸۳۵ء میں گورنر جنرل لارڈ ہیلنگ نے یہ سلسلہ ختم کر دیا اور اب ہل دس اہل انگریزی تعلیم کے لئے مخصوص ہو گئے۔ لیکن لارڈ آکلینڈ جب گورنر جنرل ہوئے تو انہوں نے دیہی زبانوں میں بھی تعلیم کی اجازت دے دی۔

۱۸۴۱ء میں بخروں اس کانچ کے پرنٹل ہوئے اور پھر دیہی زبانوں اور انگریزی کے امتحانات بھی الگ الگ سطح پر ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اردو کو خاصا فائدہ ہوا۔ مغربی علوم سے دلچسپی کی وجہ سے دیہی زبانیں اکتساب کرنے لگیں۔ پھر یہ ہوا کہ انگریزی، سنسکرت اور عربی کی معیاری کتابیں اردو، بنگالی اور ہندی میں ترجمہ ہونے لگیں۔ ایک انجمن بھی قائم ہوئی جس کی مجلس انتظامیہ میں مسز ٹی منکاف ہی گرانٹ دانی سی ریوٹا، ڈی بیلو سن کونسلٹن اور کاناٹھ ٹیلور اور ایف جے تھے۔ جیس انجمن کے سرکاری بھی تھے اور ملی کانچ کے پرنٹل بھی۔ اس انجمن کا کوئی نام ”دہلی کانچ ورکنگز اسوسی ایشن“ بھی چاروں افراد اس ادارے سے ۱۸۸۸ء میں شائع ہو گئی۔ تفصیل یوں ہے:-

”ورکنگز سوسائٹی نے تقریباً ۱۸۸۸ء میں کھسوا کر شائع کیں۔ ان کتابوں میں تاریخ پر تقریباً ۱۵، طب، ریاضیات، طبیعیات اور کیمیا پر ۲۰، ریاضیات پر ۱۰، قانون پر ۱۰، جغرافیہ پر ۵، علم فہرست پر ۱۲، رہائی کتابیں سیاسیات، معاشیات، ادبیات، صرفہ و نحو، مذہب اور مشاہیر کے تذکرے سے متعلق ہیں۔ ان کتابوں نے کوئی پارادو میں مغربی علوم کے فروغ کی راہ ہموار کی اور یہ صحیح طور پر مذہب کا باعث بنیں۔“

جس نے دیہی زبانوں کے ذریعہ مغربی علوم کی ترویج اور اجتماع کا یہ عہد اہم کام سر انجام دیا اور جب وہ انگلستان چلے گئے تو ان کے اس پیرنگرمان کے جانشین ہوئے۔ انہوں نے بھی علمی امور میں خصوصی دلچسپی لی اور نصاب تعلیم کی اصلاح کی، ”پرنٹنگ پریس“ ایڈٹ کیا۔ جس سے کو شامل نصاب کیا۔ ایک پریس بھی قائم کیا اور ایک ہفت روزہ ”قرآن السعدین“ جاری کیا۔ ان کے بعد ٹیلر ہیڈ ماسٹر ہوئے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہلاک کر دیے گئے۔ مسز ٹیلر نے ۳۴ سال اس کانچ کی خدمت کی۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:-

”مسٹر جے، ڈاکٹر سپرنٹنڈنٹ اور مسز ٹیلر یہ کانچ کے ٹیم پرنٹل ایسے گزرے ہیں کہ انہوں نے کانچ کی جی خدمت کی اور اس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی۔ طلبہ اور اساتذہ ہر زبان

دہلی کانچ

سر سید نے سائنس کا مفہوم سوسائٹی ضرور قائم کی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ شہر اور اب کے ساتھ سائنسی تعلیم کا جدید نظام قائم کیا جائے۔ انہوں نے اپنے طور پر بہت کچھ کیا لیکن جی بات یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں دہلی کانچ کی خدمات نہایت وسیع اور اہم ہیں۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ فورٹ ولیم کانچ کا قیام اس لئے عمل میں آیا تھا کہ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے محض انجمن بنے جو ہیں بلکہ ہندوستانی زبان، تاریخ و کلچر سے آشنا ہو کر ہندوستان میں برطانوی سامراج کے استحکام کی کوششیں کریں۔ لیکن انگریزوں کی ایسی غایت نے بھی ہندوستانیوں خصوصاً اردو ستر کی ترویج اور اس کے مزاج کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا۔ لیکن دہلی کانچ کے قیام کا بنیادی موقف علمی اور سائنسی تھا۔ اس ادارے کے قیام سے اردو کے وسیلے سے اکثر مغربی علوم سامنے آ گئے۔ ریاضی، سائنس، فلسفہ اور ہیئت وغیرہ کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس کانچ کے اثرات کے تحت طبیعت، کیمیا اور ریاضیات، جہاں سیاسیات، تاریخ، سوانح، جغرافیہ، صحافت، تیز ادبیات، خاصاً اردو صرف کیا جانے لگا۔ اس لئے دہلی کانچ کو اگر شمالی ہندوستان میں اشاعت کا پہلا ذریعہ سمجھا جائے تو یہ سمجھ غلط نہیں۔ دہلی کانچ کے قیام کے بعد ہندوستان کی مختلف زبانوں کے علوم کی کتابوں کا معاملہ سامنے تھا۔ ظاہر ہے کہ اب تک دیہی زبانوں میں مختلف علوم کی کتابیں متناقص ملنے لگیں تھیں۔

دہلی کانچ کی ابتدا دسمبر ۱۸۴۱ء میں ہوئی۔ یہ ۱۸۶۲ء میں دہلی میں قائم ہوا اور علامہ ذکی الدین خاں کے

کا ہوا اور تھا اور شہر والے بھی ان کا ادب کرتے تھے۔ خاص کر مشرقی شیعہ کی اصلاح اور اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر ترویس اور ڈاکٹر پیرگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت قابل قدر ہے۔"

دہلی کالج کے نامور ایوانوں میں مولوی ذکا اللہ اور نذیر احمد اہم ہیں۔ اس کالج کے دوسرے مساتذہ میں مفتی صدر الدین خاں، مولوی ملکوک علی، امام بخش صہبائی، مسٹر رام چندر، ڈاکٹر فیض الدین، پیارے لال آشوب، پنڈت من پھول اور مولوی کریم اللہ وغیرہ اہم ہیں۔ ذیلی میں ان کے بارے میں انتہاد سے چند امور درج کر رہا ہوں۔

ماسٹر رام چندر

(۱۸۳۱ء — ۱۸۸۰ء)

دہلی کالج کے ممتاز طالب علموں اور اس کے بعد استادوں کی فہرست میں رام چند دیا ماسٹر رام چند کا نام شہر کی طرفوں میں لکھنے کا مستحق ہے۔ موصوف اہل علم، ہادی نیز سائنسی جہات میں مگر تقدیر خداست کے لئے مشہور ہے۔ ان کی پیدائش ایک متوسط وندہ گھرانے میں ۱۸۳۱ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سندھ لال، مقرر تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمہ مالیات میں ملازم تھے اور نائب تحصیلدار نیز تحصیلدار کے عہدوں پر فائز ہو کر پانی پت میں رہے۔ جب رام چند کی عمر نو برس کی تھی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کی والدہ نے نہایت تدبیر سے ان کی پرورش کی اور ان کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا۔ ۱۸۴۳ء میں رام چند انگلش اسکول میں داخل ہوئے جہاں انھیں کچھ تعلیم بھی ملتا تھا۔ پھر بریٹش کے یہ سلسلہ جاری رہا۔ انھوں نے اپنی دیانت اور محنت سے مساتذہ کی نگاہ میں ایک مخصوص جگہ بنائی اور ریاضی میں ابتداء ہی میں دسترس حاصل کی، حالانکہ اسکول میں انھیں چھ ماہ کے کاغذی انتظام نہ تھا۔ رام چند کے ذاتی مطالعے سے ان کی صلاحیت فہرست میں ہوئی اور وہ ریاضی کے ایک اچھے طالب علم سمجھے جانے لگے۔ لیکن ان کی عمر ابھی گیارہ برس کی تھی تو خوشحال راستے دیکھ کر ان کی شادی ہو گئی لیکن جو چیز میں انھیں :-

"شادی کے پہلے دن ان کے سسرال سے سونے کی سات صہریاں، چاندی سونے کی دو تلوں

میں پان اور بہت سا روپیہ نقد آیا۔"

باپ کے انتقال اور ماں کی مجبوریوں نیز حالات کی ناسازگاری پھر کوئی بہری بیوی نے انھیں رنجیدہ نہ کیا ہوگا لیکن کردار کی قوت نے انھیں سنبھال رکھا اور وہ کسی صورت سے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔

جس زمانے میں رام چند دہلی کالج میں داخل ہوئے تو انھیں ۳۰ روپے کا کالرشپ بھی ملا۔ اس وقت ترویس (Booths) کالج کے پرنسپل تھے۔ رام چند انگریزی کتابوں کے ترجمے سے وابستہ ہوئے۔ ۱۸۴۳ء میں وہ فک

فرانسس سوسائٹی قائم ہوئی۔ اس سوسائٹی کو حکام کا تعاون حاصل تھا اور کالج کے مساتذہ اور طلباء تھے کے کام میں پیش قدمی تھی۔ اس سوسائٹی سے تقریباً ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئیں کابریجے رام چند ایسے کام میں دلچسپی لیتے رہے تھے۔ صدیقی اور ضامنہ والی لکھتے ہیں کہ:-

"دہلی کالج، اور انگریز سوسائٹی اور مجمع فوائد انعام جیسے اداروں کے سرگرم اراکین میں وہ سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں تھے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی انھوں نے صحت، دیانت اور خلوص کے ذریعے مساتذہ اور کالج کے منتظمین کو اپنا کردار دیکر لیا تھا۔ چنانچہ کالج سے فارغ التحصیل ہوتے ہی ۲۸ فروری ۱۸۴۴ء کو انھیں شعبہ علوم مشرقی میں پروفیسر انتہاد ریاضی کے رکھ لیا گیا۔ ان کے وقت تک وہ پچاس روپیہ ماہوار مقررہ ہوئی مگر مارچ ۱۸۴۵ء میں بڑا حاکم سوروپے، ہواد کردی گئی۔ ان کے بعد ان کی مصروفیتوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ مارچ ۱۸۵۴ء میں انھوں نے فوائد الطالبین کے نام سے ایک چندہ روزہ اخبار نکالا۔ پھر دسمبر ۱۸۵۷ء میں ایک ماہوار رسالہ جاری کیا، ابتدا میں اس کا نام "فوائد ہندو گھرانہ" تھا مگر بعد میں اس کا نام "صحت ہندو گھرانہ" دیا گیا۔ یہ دونوں برسے دہلی کالج سے شروع ہوئے دہلی اسلامی تحریک کا ایک اہم جز تھے۔ ان کے ذریعہ رام چند نے علم و ادب کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔"

غرض یہ کہ اردو تحریک کا مزاج مرتب ہوا۔ مسلمان لکھ جانے لگے۔ روشن خیالی عام ہوئی اور اس طرح علم و ادب نے ایک نئی کردار لی۔ رام چند نے انھیں حق سے لکھنے لکھانے کی طرف راہ دکھائی لیکن راستی مشوہات کی طرف ان کی توجہ سے اردو کا دامن وسیع ہوا اور وسیع تر علاقے میں کام کرنے کا جواز پیدا ہوا۔ یوں تو ساری زندگی رام چند مسلمانوں سے جوڑے رہے لیکن مذہب کی تبدیلی ایک اور چیلن کا باعث بنی۔ موصوف نے ہندو مت ترک کر کے یہاں تک اختیار کر لیا۔ ان کے ذہن و دماغ میں یہ بات آتی رہی تھی کہ یہ ساری مذہب زاد ویشٹل ہے۔ پھر پوری دنیا کا وہ ہندو مت پرستوں میں ایک سلسلہ ہے اس سے بھی ان کی شہرت قدرے بڑھ گئی تھی۔ انگریزوں کی صحبت چھوڑنا اس نے انھیں سوسائٹی مذہب قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس لئے کہ نئی روشنی ان سے بھونکی تھی لیکن اس کا اثر ان کے سامنے اور چاہتے والوں پر بڑا ہوا اور رام چند کو موقع پیش آیا کہ ایک جگہ بھی سمجھا لیا۔ خود رام چند دسمبر ۱۸۵۵ء کے بعد انگریزوں سے کھٹکھٹا کر بدولت سوار ہو گئے تھے اور مغلوں کے ساتھ جو ان کا روپیہ تھا اسے انھیں ان کی نظر سے لکھتے تھے لیکن بہر حال وہ سوسائٹی ہی رہے۔

رام چند کی ایک کتاب A treatise on the problems of maxima and minima ہے۔ اس کتاب نے رام چند کے وفات کو بہت بلند کیا اور ان کی گونج چورپ تک پہنچی۔ جس وقت یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس

نواب انصاریؒ نے "روزِ محبت" ہفت روزہ کے مضامین میں لکھا تھا کہ "نواب انصاریؒ کا اجر" ۱۸۳۵ء میں ہوا تھا اور ۱۸۵۵ء میں وہ صحت بہتر کے ساتھ ہی ساتھ بد ہو گیا۔ اس طرح ان کی زندگی کا اسی دور ۲۳ سال کی عمر سے صرف ۳۳ سال کی عمر تک رہا اور بچوں کی کاشت و پختگی کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی دوسری راہ پر لوٹ گیا۔"

کاش کہ وہ مذہبیات کی طرف اس طرح مائل نہ ہوتے تو پھر ان کے ذہن و دماغ کو مزید ترغیب حاصل ہوتا۔ وہ اپنے ان کی نگارشات آج بھی اور وہ کامرانیوں میں۔ ہاں نہ ہی تحریروں کو بہر حال میں متناہ کرنا پڑے گا اس لئے کہ ان میں کوئی اور ہی ذہن کا کام کر رہا ہے۔

رام چندر ایک مختلف اسلوب کے مالک قرار دے جاسکتے ہیں۔ سائنسی ذہن رکھنے کے باوجود وہ اپنی تحریر کو اصطلاحات سے پرہیز نہیں کرتے۔ سادگی اور روانی ان کی نثر کا جوہر ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ اسی حد تک استعمال کرتے ہیں جس حد تک ان کی ضرورت ہے۔ ان کی تحریر میں الفاظ سے پہلے کا مل نہیں مگر انہیں وہ نگارندہ اور نگار جاتے ہیں۔ سید جعفر نے اپنی کتاب "ماہر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ" میں ان کے چار سو سے زیادہ مضامین پر تبصرہ کیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہر رام چندر اپنی علمی اور ادبی زندگی میں کتنے مصروف رہے ہوں گے۔ علمی اسلوب اختیار کرنا آسان نہیں۔ چاہی وہ کتنے محنت سے سب لکھنے والے کا ذہن مداف ہو اور کوتاہیت پر چوری کرتے ہو۔ یہ صورت رام چندر کی نثر نگاری میں دیکھی جاسکتی ہے۔

رام چندر اکثر و بیشتر بیمار رہتے تھے۔ ان کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی تھی۔ معروریت ملائی تھی، اس سے بھی صحت پر اثر پڑتا تھا۔ بعض ناخوشگوار حالات کی بنا پر بھی ان کی صحت پر اثر پڑتا رہا تھا۔ جب وہ چالیس برس کے ہوتے تو ان کی صحت اتنی خراب ہو گئی کہ ڈاکٹر کی درخواست دے دی۔ یا آخر ۵۹ برس کی عمر میں ۱۸۸۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مولوی ذکا اللہ

(۱۸۳۲ء - ۱۹۰۰ء)

مولوی ذکا اللہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام ذکا اللہ تھا انہی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بارہ برس کی عمر کے ہوتے تو دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں محمد حسین آزاد اور ذیاب نے پڑھائی اور انہی موجود تھے۔ مولوی ذکا اللہ نے ہندوئی ان سے تعلقات پیدا کر لئے۔ دہلی کالج کے ماہر رام چندر، یاسنی کے ماہر قصور کے جاتے تھے ظاہر انہیں کی صحبت میں ذکا اللہ کو بھی ریاضی سے دلچسپی ہوئی۔ اب تک ان کی حیثیت ریاضی کے ایک مشہور استاد کی رہ چکی تھی

وقت ان کی عمر ۲۹ برس کی تھی۔ واضح ہو کہ دہلی میں مسٹر ویم پیور نے قدیم فارسی خطوطات کے انگریزی ترجمے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی تھی۔ وہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی کالج سے الگ ہو گئے اور دہلی آ گئے۔ یہاں ٹائمس سول انجینئرنگ کالج میں ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ ۳۵ برس کی عمر میں فرارانی صحت کی وجہ سے دہلی سے دہلی آ گئے اور وہ ۲۵ برس کے ہوا اور فرارانی صحت ہوئی۔ دہلی آ گئے کے بعد ۸۶۶۹ میں راجہ ہندو سنگھ کے اہل بیت مقرر ہوئے اور ان میں سے ایک چلے گئے۔ پھر وہ ۱۸۷۰ء میں سر شے تعلیم کے ڈائریکٹر ہو گئے۔ جب ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے ۱۸۷۱ء میں بنگال کی ایک برہمن خاتون سے شادی کی۔

۱۸۷۳ء میں رام چندر کی کتاب "عقائد و روایات" شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پہلا باب "عقائد و عقائد و عقائد" ہے۔ دوسرا "مضامین جدا گانہ" اور تیسرا "مختلف حالات کا طے ہونا" ہیں۔ ان ابواب سے اس کتاب کی اہمیت اور خود سامنے آ جاتی ہے۔ رام چندر کی تحریراتی فکر اس کتاب سے مراد ہے۔ ایک کتاب ان کی "تذکرۃ الکاملین" بھی ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ۹۷ مضامین ہیں۔ جس میں ۸۸ سوالات ہیں، باقی مضامین بیانِ مردم و فرنگستان اور ہندوستان کے حالات اور علوم و فنون سے متعلق ہیں۔ اسی دورانِ رام چندر سائنسی مضامین بھی لکھتے رہے تھے۔ گارمیاں دہلی نے ان کی ایک "بھوت سنگ" کا ذکر کیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "اصول گورنمنٹ" کے بھی ہے۔ دراصل یہ کتاب مودری کے انگریز کی نگہوں کا ترجمہ ہے۔ ان کی ایک مینیہ کتاب "اصول جبر و متبادل" بھی ہے۔ ان کے علاوہ متعدد کتابیں ہیں مثلاً "اصول علم حساب جزئیات و کلیات"، "سرچشہ اقصیٰ علم طبعی"، "رسالہ اصول نگوں کے باب میں"، "اعجاز القرآن" وغیرہ۔ لیکن میں خاص طریقے سے ان کی دو متعارف فیہ کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ہے "اعجاز القرآن" جس میں پانچ تفصیلات ہیں اور ایک مختصر ہے۔ پہلی تفصیل میں دہلی کی تفسیر کی گئی ہے دوسری تفصیل میں حضرت محمد کی تعلیم اور اجازت قرآن کے مباحث ہیں۔ تیسری جبریت سے متعلق ہے۔ چوتھی دین اور ایم کے بارے میں ہے۔ پانچویں میں قرآن ایک منظرے کی بحث ہے اور آخر میں یہ ہے کہ معانی قرآن اور حدیث کے یہ عقیدہ محمدیوں کا تصدیق قرآن ہے ایک منظرہ ہے باطل ہے۔ اس کتاب کے جواب میں بھی کتابیں لکھی گئیں۔ انہی ہی کتابوں میں ایک "اعجاز قرآن" ہے جس میں رام چندر کے خیالات کی اصلاح کی گئی ہے۔ "رسالہ جبر و متبادل" قرآن" بھی ماہر رام چندر کی ایک متعارف فیہ کتاب ہے۔ اس کتاب کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے تقریباً ۲۰۰ جوابات سامنے آئے۔ دیکھئے ماہر رام چندر نے جماعت مسلمانہ کو سب بھی رقم کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہر رام چندر مسلمان مذہب اختیار کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے ذہن و دماغ پر فنی اثرات ڈالنے کے لئے کافی تھا اور وہ مخلوک ہوتے چلے گئے۔ قول جو مسیحیت کا خود ان پر کیا اثر ہے اس پہلے کا ایک اقتباس دیکھئے۔

"قول جو مسیحیت کے بعد رام چندر کی مذہبی مشغولیات اس قدر بڑھ گئیں کہ پھر انہیں ملک

ہذا کا اللہ نے ان کی شاکر دہائی میں ان سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔ یوں بھی ان کی ذہانت کی وجہ سے ماضی پر مبنی
انکس چند مزید رکھتے تھے۔ ذکاوت ایک ایسے طالب علم ثابت ہوئے اور ہمیشہ اچھے ٹیپر لاسکتے رہے۔ ان کی شیر مستعدی
ملاہمت کی وجہ سے انکس وہی قیادت حاصل ہوئی اور قابلیت ہی کی بنا پر تھے۔

ایسے استاد و ماسٹر پر پندرہ کی ڈگری پر چلنے ہوئے کی کالج میں معلوم ہو گئے اور پانچویں پر جانے لگے۔ یہاں
سے الگ ہو کر آکر کالج سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں انکس اور غازی کی تعلیم دینی تھی۔ گویا حساب کے استاد و ماسٹر کی
دسترس غازی اور اردو پر بھی تھی۔

۱۸۵۵ء میں مولوی ذکا اللہ مدارس کے اپنی اسٹیکل ہو گئے اور اس خدمت پر تقریباً اسی بارہ سال مامور رہے۔
۱۸۶۶ء میں دو ڈپٹی اسکول دہلی میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے فائز ہو گئے۔ ان کی شہرت اور ذرا تک بنگلہ تھی اور ایک
معلم کی حیثیت سے ان کی قدر و قیمت کا احساس بادشاہ کو ہوا تو کیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ انکس ایک وقت اور غزل کالج ماس
کے بعد میونسپل کالج میں پروفیسری کی پیشکش کی گئی۔ موصوف میں ریشٹرل کالج میں آ گئے اور چند سال تک یہاں غازی
پر جانے رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور غزل پائے لگے۔

اب بطور خاص وہ تعلیم و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے اور بڑی کوشش سے قریب قریب چار بیس سال تک
اپنے اس شغف میں وقت گزارتے رہے۔ ان کا انتقال دہلی میں ۱۸ نومبر ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ ان کی وفات کے بعد اپنی نذر احمد
نے رسالہ ”تذکرہ“ دہلی پبلشرس ۱۹۱۰ء میں ان پر ایک تفصیلی مضمون شائع کیا جس میں ذکا اللہ کے حالات پر تفصیل ملتی ہیں۔
اس مضمون سے چاندانہ ہوتا ہے کہ مولوی ذکا اللہ بیس سو چھ تھے وہ علم کو بڑی دولت اور شہرت تصور کرتے تھے۔ انکس
حصول انگریز کی شائق تھا۔ انگریزوں پر اپنی ذہنی دسترس تھی اور بے مشغلی کی وجہ سے بولے میں غفلت بہت محسوس کرتے تھے۔
لیکن اس زبان پر انکی دسترس ہو گئی تھی کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ کو بھی حاصل نہیں تھی۔ اپنی نذر احمد نے یہ بھی لکھا ہے کہ۔

”انہوں نے انگریزوں کے ساتھ بھرپور بال و بال پائی مشق کو پیش کیا۔ اور وہ ہر روز کچھ عید احمد خان

کے گویا بچہ تھے۔ انہوں نے ساری عمر کی فوجی تک نہیں اور بھی مگر بڑی بڑی تک نہیں رہی۔

میں ہارنے کے دنوں میں ان کو بڑے سے بڑے کی طرح کھار دیا اور پانچواں پہننے کو اور جہاں کرنا۔

غرض مولوی ذکا اللہ کی وضع ظاہر یا طرز و انداز دیا جھٹکے سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ

انگریزوں کی ان کو بھیجی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو نہ یہاں بھی یقیناً مسلمان تھے مگر ان کا دامن

مقلیدہ لوٹ تعصب سے بالکل پاک تھا۔ وہ اپنی میل جول میں نہ آپ کو دخل نہیں دیتے

تھے۔ سب سے غلوں کے ساتھ ساتھ اور حاضر و محاب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے۔

پان کے اس خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ مر تو رہے تھے مولوی ذکا اللہ انکس کی دستوری پوری

دنیائی اور دوسرے سے تحقیق نہ تھی، مگر انہوں نے مذہب کی اصلیت کو سمجھا تھا اور ان کی باہمی
صحت و صحت کی شہرت تھی۔

مولوی ذکا اللہ کی تعریف و تالیف کی قدر و قیمت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ماضی پانچویں سے ان کی دلچسپی کے
کئی فائدے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ انکس اردو میں لکھی گئی اس لئے ایک طرح سے اردو کے حوالے سے تسلی و تعلیم کا
از خود جواز پیدا ہوا۔ ان کی کتابیں داخل نصاب ہوئیں۔ انکس ان کی خدمت کے سلسلے میں امداد بھی حاصل ہوئے۔
شمس العلماء اور خان بہادر کے خطابات ملے۔ ”سیر المصطفیٰ“ میں ان کی تعریف و تالیف کی جو تعداد بتائی گئی ہے وہ ۲۹
ہے۔ ۱۴ غیر مطبوعہ کتابیں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ دیباچات میں انہوں نے ان کتابوں کی تعریف و تالیف میں ۱۴
نصاب کے حوالے سے ۱۶۶ خطابات و بیانات دیئے۔ ”نور ساریات و منار“ کے تعلق سے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ان کی کتاب ”تاریخ ہندوستان“ بہت مشہور ہے۔ اس کا شمار دہلی میں ہندوستانی
تعداد رسالت بڑا ایک سو پندرہ (۱۶۵) خطابات میں۔ انہوں نے ملک انور کی سوانح عمری ”انور گار“ کے نام سے شائع کی
تھی۔ مولوی سید اللہ کی سوانح عمری تصنیف کی۔ عبد الغنی کی تاریخ لکھی۔ ایک کتاب ”آئینہ قصیری“ بھی تحریر کی۔

ذکا اللہ مختلف رسالوں میں مسلسل لکھتے رہے تھے۔ خصوصاً ”تذکرہ ساریات و منار“ (علی گڑھ) ”تذکرہ“ (لاہور)
”نور ساریات و منار“ (لاہور) ”سیر المصطفیٰ“ (علی گڑھ) ”نور ساریات و منار“ (لاہور) ”تذکرہ“ (لاہور)
اور ”جمع بہار“ (سیر) میں بھی کئی مضامین لکھے۔ انکس ان کے اردو کی یہ کتابیں جب نصاب سے الگ ہو گئیں تو ان بھی
لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

مولوی ذکا اللہ ایک ترقی اور ذہنی علم نفس کا نام ہے، جس کے عرائض میں اختراع کا مادہ و ذہن اہم موجد تھا۔
طرز بیان سادہ اور سلیس و سادہ تھا جہاں نہیں بخاور کے کلام متوال ہے۔ دہلی سے۔ ان کی حیثیت ایک تحقیق کی بھی رہی ہے۔

کہہ سکتے ہیں کہ ذکا اللہ ایک باہر و زکا تھا جس کی تعریف و تالیف سے انور ساریات کے سرمائے میں فوج اسلاف
ہوئی اور جس کی کارشات اپنے وقت میں اور آج بھی قابل احترام ہیں۔

مولوی مملوک علی

مولوی مملوک علی عربی کے مدرس اعلیٰ تھے۔ ان کا وطن خانوہ تھا لیکن دہلی میں مستقل طور پر رہ رہے تھے۔ اس
زمانے میں ان کی بہت شہرت تھی۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی کے ماہر بھی جانتے تھے۔ کہ یہاں دہلی نے اپنے تذکرے
میں ان کا تفصیل ذکر کیا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں وہ ساڑھے سال کے تھے۔ انہوں نے نورنگہ موسائی کی طرف سے علم ہند
اور تحریر تعلیم کے چار ابواب ترجمہ کئے تھے۔ موسائی کی طرف سے انہوں نے ”سیر المصطفیٰ“ کا ترجمہ بھی کیا تھا۔

امام بخش صہبائی

(۱۸۵۷ء)

امام بخش صہبائی قادری کے عالم تھے۔ ان کی حیثیت مجدد دین کی تھی۔ بلند پایہ ادیب اور اچھے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے نظمیں اللہ بن کی "حاکم الملایک" کا ترجمہ کیا اور شعرائے اردو کا ایک انتخاب بھی شائع کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شہید ہوئے۔ انہوں نے سرخس گھوڑی کی شریعت لکھی اور اس باب میں تحقیق کا کام سرانجام دیا۔ انہیں کے شاگرد محمد حسین آزاد اور پیارے لال تھے۔ سرمد نے "آثار اللغات" کے سلسلے میں ان سے مدد لی تھی۔ یہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں کانچ سے تعلق کی بنا پر شہید کر دئے گئے۔

پیارے لال آشوب

(۱۸۳۸ء - ۱۹۱۳ء)

پیارے لال ۱۸۳۸ء میں قندھار کا آخری بڑا آشوب۔ ان کا تعلق بھی دلی کانچ سے تھا۔ پیدائش ۱۸۳۸ء بتائی جاتی ہے۔ دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے اسباب میں روپ نوادار تھے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب کا چند سالہ سورا ساتھ میں رہا ہے جن کی قربت، ماسٹر رام چندر اور صہبائی سے تھی، غالب کے بھی چہیتے تھے۔ کانچ ہی سے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ لیکن خود کے زمانے میں ڈگری آگئے۔ ایک سال بعد بریلی چلے گئے جہاں انہیں سرکاری ملازمت ملی۔ پھر وہ پنجاب گئے اور لاہور میں تعلیم کے شعبے میں کیوبنر ہو گئے۔ پھر دلی آئے اور گڑ گاؤں میں آکر بیٹے ماسٹر ہو گئے۔ ۱۸۹۲ء میں انہیں رائے بہار کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۵ء میں انہیں پانڈو ہو گئے اور دلی لاہور آئے جاتے رہے۔

پیارے لال آشوب مسلم دوست تھے۔ ان کی محنتیں زیادہ تر مسلمانوں ہی کے ساتھ تھیں۔ خاکسار اور مختار تھے۔ مرآت کے آدمی تھے، لیکن بلا کے ڈچر۔ ان کی تصنیفات میں "روم بند" "نصف عصر" اور "نقص بند" اور "جلدیں" معروف ہیں۔ ان کے علاوہ چند کتابوں کے ترجمے بھی کئے گئے "سارخ انگشتان" "آر پار قصیری" "آوارگی تالیف کا ترجمہ"۔ آشوب رسالہ "تالیف و خطاب" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کا انتقال ۱۹۱۳ء میں ہوا۔

ایک نثر نگار کے لحاظ سے ان کی اہمیت ہے جنہوں نے ہندوستان کے مختلف شعبے فتح اور تہذیبی و حادوں پر نگر رکھی۔ وہ اساتذہ و دہلی کانچ کی شان و حریت ہیں اور وہاں کی نثر نگاری کے سلسلے میں معروف ہیں ان میں پیارے لال کی بھی ایک اہم جگہ ہے۔

مولوی کریم اللہ

دلی کانچ میں تعلیم پانے والوں میں مولوی کریم اللہ بھی تھے۔ ان کا وطن پانی پت تھا لیکن دلی میں ہی آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہاں ایک مطبع قائم کیا تھا۔ ان کی کتابوں میں "مکتبائے ہند" "تعلیم ہند" "تذکرہ طبقات شعرائے ہند" "محدث ناولیس" "تاریخ شعرائے عرب" وغیرہ معروف ہیں۔ انہوں نے اہل نقد کی تاریخ کی متعدد جلدوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔

مولوی عبدالحق دلی کانچ کی اہمیت کا اساس اس طرح دلاتے ہیں:-

"ہمارے ملک میں دلی کانچ اس کی سب سے پہلی اور کامیاب نظیر ہے جس کے بعد کسی دلیل و حجت اور تجربے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہی وہ پہلی درجہ کی تھی جہاں مغرب و مشرق کا تنظیم قائم ہوا۔ ایک ہی جہت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ بڑھا جاتا تھا۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے و مصلحات کے اضافے کرنے اور دینی کی اصلاح میں جدوجہد کا کام کیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد پڑی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی جس میں سے ایسے بڑے روشن خیال اور باخلاق انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور ہماری موسیقی پر بیحد رہے گا۔ اگر دلی کانچ نہ ہوتا تو کیا ماسٹر رام چندر مولانا آزاد، مولانا مایہ احمد، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال جیسے لوگ پیدا ہو سکتے تھے؟..... یہ کانچ اس جدید عہد میں ہماری تہذیب و علم کی ترقی کے سلسلے میں ایک ایسی گڑی ہے جو کبھی جدا نہیں ہو سکتی۔ گو ہم اپنی غفلت اور غمگینی سے اس کا نام بھلا دیں مگر اس کا کام نہیں بھلا سکتے۔ کیوں کہ اتنی مدت کے بعد بھی ہم اسی راستے کی طرف عود کر رہے ہیں جس پر وہ گارن تھا۔"

یہ بات نہایت اہم ہے کہ جنگ آزادی سے اس کانچ پر خاص اثر پڑا۔ کانچ کے کئی اساتذہ اور اس سے وابستہ افراد قتل کر دئے گئے۔ خود کانچ میں شہرہ سانس تباہ و بارگزر کیا۔ لاہور پر بھی زلزلہ آئی اور ایک طرح سے کانچ کا بخود خاصہ ہو گیا۔ دہلی سے ۱۸۶۳ء میں دو پارہ ڈھکچا گیا۔ لیکن بعض مصلحتوں کی بنا پر اسے ۱۸۷۷ء میں مستحکم بنا کر رہا گیا۔



انیسویں صدی کے اواخر
اور
بیسویں صدی کے اوائل میں تحقیق و تنقید

جائے۔ انہوں نے کثیر تعداد میں کتابیں جمع کیں۔ لغات اردو اور اصطلاحات کا ایک ذخیرہ قائم کیا اور سمجھوں کو لے کر ۱۹۳۸ء میں اپنی میں انجمن کے مرکزی دفتر میں منتقل کر دیے۔ انہوں نے اپنی ملکیت، جس کی مالیت تقریباً ۵۰ ہزار روپے کی ہوتی ہے، انجمن کی خدمت کر دی۔

اب دریافت آگیا تھا جب اردو ہندی کے اختلاف کی نوعیت شدت پر چک چکی تھی۔ انہوں نے اردو کے تحفظ کے لئے جو کچھ بن چکا تھا کیا ملک کے حالات غراب سے غراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ تقسیم ملک اور برطانوی سلطنت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ویسے سرے میں انجمن کا دفتر بھی متاثر ہوا۔ بہت سی ترقی میں ضائع ہو گئیں۔ عبدالحق پاکستان چلے گئے اور وہاں انہوں نے انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی۔ اور وہاں اس کے فروغ کے لئے "تحریک" ہو گئے۔ ایک رسالہ "اردو" بھی نکالا۔ ایک پندرہ روزہ رسالہ "قومی زبان" بھی نکالی اجرا کیا، نئے بعد میں مابعد بنایا گیا۔ پرانی کتابوں کو از سر نو چھاپنے کی کوشش کی۔ اپنی کوششوں سے "جامعہ عثمانیہ" کے طرز کا اردو کا کتب گھر بھی قائم کیا لیکن بعد وستان چھوڑنے کا حکم انہیں ہر حال تھا اور شاہ آفریدی دکن میں انہیں پناہ دیا جس پر وہ چلے گئے۔ ان کا انتقال ۱۹۶۱ء کو کراچی میں ہوا۔

عبدالحق ایک محقق، دانشور، خاکہ نویس، انکسار پرور اور اردو کی ترویج کی اہم ترین نعل شخصیت کا نام ہے جس کی کارکردگی کو زبان فرہوش نہیں کر سکتا۔ ایک تحریر کی آہنی کے یہاں جو غلوں سے بھر جائے وہ آفریدی ہم تک قائم رہا۔ ساری زندگی اردو کی ترویج، اشاعت میں گزار دی اور اس کے حقوق کے وہ ایسے ظہور دار بن کر سامنے آئے جو انہیں کا حصہ رہی۔

تحریک آزادی سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ اس معاملے میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔

کئی کتابیں ان کی مزید شہرت کا ضامن ہوئیں۔ مثلاً انہوں نے مرثیہ زبان کی طرف توجہ کی اور اس پر فارسی کے اثرات تلاش کئے۔ یہ کتاب "مرثیہ زبان پر فارسی کا اثر" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ان کی ایک مختصر کتاب "اردو کی ابتدا اور زمانہ صوفیہ کے نام کا کام" آج بھی اہم سمجھی جاتی ہے اور مختلف پوزیشنوں میں داخل نصاب ہے۔

عبدالحق نے دینی ادب سے بھی دلچسپی لی۔ اس ضمن میں ان کی ایک اہم کتاب "تقریرات" ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے علامہ محمد علی "اردو" "سب دن" کے عنوان کی تدوین کی اور ان کتابوں پر علامہ مقدمہ پر رقم کیا۔ یہ مقدمہ سے مختلف کتابوں کی تصنیف میں ترقی ملی معاون ہیں اور ان کی اہمیت سے کئی کئی بار انہیں اس کے علاوہ انہوں نے "مکتبہ عثمانیہ" اور "معراج العاشقین" کی بھی تدوین کی۔ یہ ادب بات ہے کہ "معراج العاشقین" کے بارے میں کئی معلومات آگئی ہیں۔ اسی طرح "سب دن" اور "مکتبہ عثمانیہ" کے حصے میں بھی لیکن ان کا کام بنیادی ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے مضامین اور مقدمہ بات و خطبات کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ اس باب میں مقدمہ بات عبدالحق "مکتبہ عثمانیہ" "مکتبہ عثمانیہ" اور "چند تقریرات عبدالحق" وغیرہ معروف ہیں۔ ان کے خاکوں کا بھی مجموعہ ہے "چند ادھر" ہے جس کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔ اس میں جو شخصیات زیر بحث آئی ہیں وہ سب کی سب قابل لحاظ نہیں ہیں۔

کے اردو میں کی اصلاح کا جو حکم اٹھایا۔ بہت سی کتابوں پر مگر نقد و تنقید لکھے۔ ان کی تحفیات پر کئی روشنی ڈالی جاتی رہی ہے اور کئی طرح کے مقالہ کو کتابوں کو لکھا جا رہا ہے۔ لیکن ایسے امور سے ان کے خیالوں کی کاموں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

بابائے اردو کی ایک شہیت شہرہ نگار کی بھی ہے۔ انہوں نے بہت سی اردو شہرے لکھے جن میں بعض کی شہیت ضخامت کی ہے۔

آج کے نقطہ نظر سے عبدالحق ایک ایسے قائد تھے جنہوں نے کوئی نظریہ ساری کی ہو لیکن انہوں نے اردو کے سرائی و سیلان کی تفہیم میں بہت کارآمد خدمات انجام دیں۔ وہ سرسید سے بھی متاثر تھے اور جالی سے بھی۔ ان دونوں کی کتابوں کا ان غامض کی تخلیق میں ملتا ہے۔

عبدالحق محنت نویس اور قواعد سرائی یا اصطلاحات سرائی کے نکل سے بھی گزارے۔ ان کا اس طرح کا کام بھی دلچسپ سمجھا جاتا ہے۔

عبدالحق نے اردو کی ترقی اور ترقی اس کے ادب کے استحکام کی بھی اور ترقی کو شہیں کی ہیں وہ انہیں اردو ادب کی تاریخ میں زعمہ اور پاکدور بنے کیلئے کافی ہیں۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ ان کے تصدیق یا تحقیق کا یہ سب کچھ کوئی کسلی پر پرکھا جا رہا ہے۔ ان کے اصطلاحات کا تدوین کی جارہی ہے تاکہ یہاں بخار و کفر فروغ کے بارے میں شدت ہے اسے اعتدال کی راہ پر لکھ کر دے اور سمجھنے کی نئی نگرانی سے آگئی ہے۔ لیکن یہ سب امور ان کی کارکردگی کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے۔

نصیر حسین خیال

(۱۸۷۸ء — ۱۹۳۳ء)

نصیر حسین خیال عظیم آباد میں نواب کی حیثیت سے مشہور رہے تھے۔ ان کا خاندان جاوید و ثروت اور علم و فضل میں بے حد ممتاز رہا تھا۔ ان کی راوی خاطر تعلیم جس کے والد نواب میر غلام علی خاں تھے۔ ان کی بانی عارفیہ تعلیم کے والد نواب سید میر علی خاں تھے اور عمائی سید نواب حسین خاں تھے۔ نصیر حسین خیال کے والد نواب سید محمد حسن خاں تھے اور نانا سید محمد عباس خاں تھے۔ نواب سید غلام علی خاں تھے۔ ان کے صاحبزادے تھے۔ ان کے صاحبزادے تھے۔ نواب سید محمد نور و حسین خاں اور نواب سید غلام علی خاں تھے۔ نور و حسین خاں کے صاحبزادے تھے۔ نواب سید نصیر حسین خیال کے حقیقی ناموس تھے۔

آپ کی ولادت کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ یہ نصیر محمد ظفر الحق ۱۸۷۸ء کی تاریخ تصنیف کرتے ہیں۔ لیکن روضہ قاسم ۲۱ مارچ ۱۸۸۰ء کی تاریخ یہ پیش کرتے ہیں۔ اس مسئلے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ نصیر حسین خاں پختہ کے محلہ حاجی گنج میں پیدا ہوئے۔ لیکن انہیں کچھ ہی سال کے تھے کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کی تربیت کی آمد داری خاطر تعلیم کے لئے ہو گئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے چچا حضرت نصیر حسین خاں اور ماموں شاہ عظیم آبادی نے

ان کی پرورش و پرورش میں معاونت کی۔ شادی صحبت سے انہیں بہت فائدہ ہوا۔ انہوں نے عربی و فارسی میں دسترس تو حاصل کی ہی مگر دینی میں بھی خاصی استعداد و کیم بہت تھی۔ یورپ کے سفر پر جیسے تو وہاں فرانسیسی تھیں۔

خیال تھا عربی بھی کر سکتے تھے۔ ان کے استاد و شاگرد تھے۔ لیکن یہ سلسلہ کار پر قائم نہ رہا اور یہ نظر نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ انہوں نے ایک رسالہ "ادب" بھی نکالا تھا۔ ان کی شادی نواب داچل شاہ کے وزیر نواب انتظام الدین مرزا احمد بیگ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ شادی کے بعد وہ چاند میں شہرہ کے اور مستحق تھک رہے تھے۔

آپ کے بہت سے کارناموں میں ایک کا نام وہ خطبہ صدارت ہے جو انہوں نے ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا اردو کانفرنس ہفتویہ چھ ماہ قریب کا طویل خطبہ ہے اور اس کے صفحات پندرہ سو تھک رہے جاتے ہیں اس کا کچھ حصہ "داستان اردو" کے نام سے رسالہ "انصر" کے قلم نویسوں میں شائع ہوا۔ جس کا آخری باب "عقل اور ارادہ" ہے۔ ایک اور کتاب "داستان مجم" بھی ہے جس کی اہمیت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ شاہ ولی الرحمن دلی کا کوئی نے اس باب کی تفصیل اس طرح رقم کی ہے:-

"۱۹۲۷ء میں آل انڈیا تعلیمی کانفرنس ٹھٹک میں منعقد ہوئی تو اس کی صدارت بھی آپ ہی نے

فرمائی اور اپنے خطبے میں اردو زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ پھر ۱۹۱۸ء میں ٹھٹک سے دہلی کیلین میں آپ سے بھی شہادت ملی تھی تو اس موقع پر بھی اردو زبان کی اہمیت پر زور دیا۔

نواب صاحب سر و سیاست کے تھے۔ دہلی و لاہور تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں نظام صہارہ آباد کی طرف سے آپ کو یورپ بھیجا گیا۔ آپ نے وہاں کیمبرج یونیورسٹی کی مشہور راجن پوٹن میں اردو کے متعلق تقریر کی اور ایک مضمون بھی لکھا جو اردو رسالہ "نوائے کیمبرج" میں شائع ہوا۔ پروفیسر برکٹن سے بھی آپ نے ملاقات کی اور دونوں میں قادی میں گفتگو ہوئی۔ دوران گفتگو ایمان کا ذکر آگیا تو آپ نے پروفیسر برکٹن کو دہلی و لاہور و سرائی کی ترغیب دی۔ پروفیسر برکٹن نے جواب دیا کہ "یہ شرم خالقہ ہمارا" انگلستان کی سر سے فارغ ہو کر آپ نے فرانسیسی، انجمن، جرمن، اٹلی وغیرہ کی بھی سیر کی اور وہاں کے مشہور مقامات اور تعلیم گاہوں کو ملا دیکھا فرمایا۔ اس کے بعد آپ مصر شریف لے گئے جہاں راجن پاشا سے ملاقات میں رہے۔ پھر گنجد (ترکی) پہنچے جہاں اتاترک مہمائی نکال پاشا سے ملاقات حاصل ہوا۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے آپ نے نہ صرف مضامین لکھے اور انیسویں صدی تک عملی حصہ بھی لیا۔ اسی طرح سے ۱۹۳۳ء کے دہلی میں دہلی شریف لے گئے۔ دہلی میں دور دراز گیا میں انہم اپنے طریقہ کم کے یہاں قیام کیا۔ دسمبر ۱۹۳۳ء میں آپ علی گڑھ

کو چلے آئے آپ کے قلب میں درد تھا اور یہ درد ایسا ہلکا ثابت ہوا کہ علاج کی بھی نہایت تھی۔ یہاں تک کہ چھاتی صحت کے بعد درج پر واز کر گئی۔ آپ کی لاش کو کو اب صاحب نے چنبرہ انڈیا گریڈ ۱۲ اور کیمبرج شہر شاد کے پیلو میں سپرد خاک کی گئی۔"

راجن پاشا کو "داستان اردو" کی اب وہ ادبی اہمیت نہیں رہی ہے لیکن اپنے وقت میں اس کی اہمیت بھی جانی تھی۔ دراصل نواب صاحب نے تعلیمی کی "دہلی" کو اردو کے علمی کی پہلی مثال قرار دی تھی۔ یہ بات بھی اب بھی سمجھنی ہے۔ اس طرح سے انجام کے بارے میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ درست نہیں ہے۔ انجام کو بیدل کا شمار دہلی تانا گیا ہے لیکن اردو شعر کے حوالے سے وہ استاد نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کی ایسے نکات ہیں جن پر شاہ ولی الرحمن دلی کا کوئی نے غور نہیں کیا ہے، جو متعلقہ مضمون سے واضح ہے۔ پھر بھی ایک صاحب اسلوب مصنف کی حیثیت سے ان کا ایک امتیاز ہے۔ انہیں انشا پر قادر سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلوب پر غور نہیں کرنا کہ چوبیس نظر آتی ہے۔

حافظ محمود شیرانی

(۱۸۸۰ء۔ ۱۹۶۶ء)

پچھانوں کی تاریخ کی رو سے شیرانی کسی جگہ سے منسوب نہیں بلکہ انہوں کے ہر ذیلی ملک نہیں ممبر ان شہر کے ایک پڑپڑے کا نام تھا۔ غرضی سٹوٹن میں ان ہی کے کچھ لوگ راجن پاشا سے آباہ ہو گئے۔ سائین ریاست جو وہ چار ملے نامید میں کھانا دہلی کی ایک جگہ سے شیرانی کے اسلاف میں شیخ احمد کھٹو ہیں پیدا ہوئے۔ شیرانی سب سے پہلے اس لقب کا نو میں سکونت پانے ہوئے لیکن بعد میں ایک گاؤں شیرانیہ کے نام سے بہاؤ محمود شیرانی ۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمود کھانا گیا لیکن عرفیت محمد بن کمال تھی۔ ان کا ایک اسم تھی علی ہے نظام الدین اسماعیل محمود ہیں۔ حمید الدین خاں (مستوی) محمود شیرانی کی شادی ۱۶ مارچ ۱۸۹۹ء کو دہلی شیرانیہ میں عالم خاں والد عراب خاں شیرانی سے ہوئی۔ اسی سال انہوں نے انگریزی کی پڑھنا شروع اور انہیں جو وہ پورے پانچ دیا گیا۔ سیکھتے سے انہوں نے ۱۸۹۹ء میں ہل کے امتحان پاس کیا، پھر شمس العالیہ مفتی عبد اللہ لکھی سے علوم اسلامیہ کے حصول کے لئے لاہور آئے۔ اور علی گڑھ لاہور سے انہوں نے شمس علم اور قسٹ فاضل کے امتحانات امتیازات کے ساتھ پاس کئے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک اسم علم فیض سلطان لکھی۔ ایسے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور لندن جانا چاہتے تھے۔ ان کے والد نے انہیں حاکم انگلستان کی اور وہ ۱۹۰۳ء کو لندن پہنچ گئے۔ ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ قانون کی تعلیم حاصل کریں لیکن ان کی خواہش قانون کی بجائے زراعت کی تعلیم حاصل کرنے کی تھی۔ لیکن والد کھانوں کے بعد لندن میں بھاڑ ہو گئے۔ سخت پیسہ جو کچھ مصروف کار ہوئے ۱۶ مارچ ۱۹۰۵ء میں مصروف نے راکل ایڈیٹنگ سوسائٹی کی

رکیت حاصل کی۔ اس دوران فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۰۵ء میں ٹوکیو میں ان کے فرزند دادو خان پیدا ہوئے جو آخر شیرانی کے نام سے معروف ہیں۔

قیام لندن کے زمانے میں شیرانی زیادہ تر مہمان گراہی اور کی حیثیت سے رہے تھے۔ لیکن اپنے تعلیمی معاملے میں کسی بھی پریشانی کو خاطر میں نہ لاتے یہاں تک کہ اپنی حالات کو بھی نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ قانون کا امتحان جلد سے جلد پاس کریں۔ ابتدائی امتحان میں ادا کا صواب بھی ہوتے رہے۔ اس دوران انہوں نے کچھ نظمیں اور مضامین بھی قلم بند کئے۔ ۱۹۰۵ء میں ان کی ایک نظم ”ظلمتِ پاکستان“ شائع ہوئی۔ اسی سال انہوں نے شاہ اودھ پرنسٹن کی امریکہ میں ایک باکس قلعیدہ بھی لکھا۔ ۲۹ جولائی کو ان کے والد کی اختلاج قلب سے اپنا تک رحلت ہو گئی۔ شیرانی فوراً ہندوستان لوٹ آئے۔ اب تک قانون کی آٹھ ترمیمیں انہوں نے مکمل کر لی تھیں۔ صرف چار باقی تھیں۔ اب سوال والد کے بعد ان کے اخراجات کا قرا جو لندن میں پورے ہونے تھے۔ بہر حال ۱۹۰۵ء میں وہ لندن آ گئے اور ان کے بھائی مسعود خاں نے مالی معاونت کا وعدہ تو کیا لیکن اسے وہ چوری طرح انجام نہ دے سکے۔ کسی طرح تعلیم جاری رہی۔ اسی دوران انہوں نے کاسٹلی ٹیوشن لاہور لیگس سٹری کے امتحان پاس کئے۔ مسعود خاں اب ان کے اخراجات پورے نہیں کر سکتے تھے لہذا ایسے حالات سے شیرانی کو کافی پریشانی ہوئی۔ اس دوران ایک واقعہ پیش آیا کہ لندن کی ایک دکان سے انہوں نے ایک کتاب خریدا اور وہاں کے پرانے اشیا کا کاروبار کرنے والی فرم ٹوڈک اینڈ کمپنی کے یہاں پہنچے۔ یہ کتاب اس فرم کے پیڑھے میں خرید لی اور انہیں کافی فائدہ ہوا۔ اب شیرانی پر اپنی کتابوں کی تلاش میں رہتے گئے اس سے انہیں مالی مضرت حاصل ہونے لگی۔ اسی دوران انہوں نے برٹش میوزیم اور ایف اے آف انس لاہور کی میں اسلامی تاریخ پر تحقیق کی ابتدا کی۔ انہوں نے بیچن اسلامک سوسائٹی کے لئے ایک لائبریری کی بنیاد بھی رکھی۔

شیرانی ۱۹۰۹ء میں غازی کا ایک امتحان دیا اور اول آئے۔ جس سے انہیں آٹو لے کارلر شپ مل گئی۔ پھر ٹوڈک اینڈ کمپنی سے ان کے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے۔ ایک مرحلے میں اس فرم میں انہیں باضابطہ ملازم رکھا گیا۔ اسی دوران انہوں نے ڈاکٹر سہری صاحب ”ظفر عروجِ اسلام“ کو مرہب کر کے ٹوڈک اینڈ کمپنی سے شائع کروا دیا۔ اس ملازمت سے فائدہ اٹھاتے بھی رہے اور دوسرے کتب خانوں سے استفادے کی صورت میں بھی نکالتے رہے۔ ان کے پاس بہت پیسے تھے۔ ٹوڈک کمپنی نے اب ہندوستان کی پرانی اشیا کو فروغ دینا چاہا تو اس کے لئے مناسب شخص محمود شیرانی ہی تھے۔ اس شخص میں محمود شیرانی لکھتے ہیں:-

”۱۹۱۳ء میں ٹوڈک اینڈ کمپنی نے یہ پروگرام بنایا کہ حافظہ صاحب ان کے خرچ پر ہندوستان

جائیں اور وہاں سے پرانی چیزیں یعنی کتابیں، نکلے، تصویرات، تصویریں، سورتیاں، وغیرہ واپس

لے آئیں۔ اس وقت ان کی تنخواہ سی (۱۰۰) روپے تھی۔ میرے پاس ایک تنخواہ جاری رہے گی

کبھی یہ شخص ہندوستان چا کر ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ انہیں ایک ہائے نام رقم کے عوض کمپنی میں حصہ دار بنالیا جائے۔ اس فرض سے حافظہ صاحب نے سات پونڈ جریدہ چک ان کو ادا کئے جس کی رسید ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کی نوٹ میں موجود ہے۔ بقایہ ایک ہزار پونڈ انہوں نے مسعود خاں کے نام کے کوری سال موسم بہار میں ٹوڈک چلے آئے۔ ٹوڈک پہنچ کر وہ اپنی اشیاء کی فراہمی میں مصروف ہو گئے اور وہ ان بھی کرنے لگے۔ مثلاً ۷ جولائی کو لندن سے کمپنی کے مکتوم حصہ دار مسٹر سیف ایچ ڈیگز نے جو خط لکھا ہے اس میں ان کی روانگی کی ہوئی چیزوں کی رسید اور بعض فراغت کی اطلاع ہے۔ مثلاً دریاؤں کا ٹیڈل کے قلمی نسخے کا ایک ورق سات پونڈ میں فروخت ہوا اور شاہناے کا ایک پرانا نسخہ میں پونڈ میں لیا۔ لیکن ان چیزوں میں زیادہ تعداد اور چیزیں کی تھی۔“

بہر حال کمپنی جنگ عظیم کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا لیکن ایسے کام انہوں نے اپنے طور پر بدھ نہیں کئے اور ان کی مقامات جیسے انجیر، جودھ پورہ، جتپور، ملتان، لاہور، منسور، وغیرہ جانتے رہے۔

آخر میں انہوں نے بھوپال میں آباد ہونے کا ارادہ کیا تھا۔ بہر طور ۱۹۲۸ء میں وہ اسلام آباد کالج لاہور میں لکچرر ہو گئے۔ تب ان کا شوق جو یہ وقت کاروبار اور محنت پر دبا ہوا تھا۔

مظہر محمود شیرانی کے مطابق ان کے تحقیقی اور تصدیقی مضامین رسالہ ”تھون“ میں شائع ہونے لگے۔ اس کے بعد رسالہ ”اردو“ میں انہوں نے تحقیقی مقالات اور شاہنامہ پر اس زمانے میں گرا فخر مضامین لکھے۔ تب ہی ”شعر العجم“ کی تصدیق بھی شروع کی۔ اور بھل کالج سیکرین میں مضامین لکھنے کا سلسلہ ۱۹۲۵ء میں شروع ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں ایچ مشہور اسلامی کتاب ”دعایا میں اردو“ اسلام آباد کالج کی انجمن اردو کی جانب سے شائع کروایا۔ ۱۹۲۹ء میں بنگال کسٹ بک کمپنی نے انہیں اس کتاب پر ایک ہزار روپے انعام دیا۔ ۱۹۳۳ء میں میر تقی میر کا نام کی ”مجموعہ فخر“ کو مرہب کر کے شائع کیا۔ ۱۹۳۶ء میں مشہور ”فردوسِ ارقی“ پر مضمون لکھا۔ ان کی کتاب ”فردوسِ ارقی پر چار مقالے“ بیحد اہم ثابت ہوئی۔ ان کے موضوعات میں اردو زبان، ادب، فارسی ادب، اسلامی تاریخ، جراحی، رسم الخط اور مسکوکات نیز آثار قدیمہ بطور خاص تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں مگربیہ تحقیقی شروع کی تھی۔ اس زمانے میں ان کا ایک مضمون ”ادب کے مجددوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ“ شائع ہوا۔

شیرانی حقیقت کے باوجود پہلے تھے اور پرانی چیزیں جمع کرنے کا ایک خاص شعور پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے خزانے میں چند سال کے اندر ہی غازی پورہ کی کھدائی سے ملے ہوئے کچھ بھی اکٹھا کرتے تھے، نیز جھپٹا، برتن، سورتیاں، کتبے اور فرامین جمع کرنے میں بھی انہیں خاصا دل رکھا۔

شرانی کے بعض تنکوں میں "پرتوئی راجہ اسما" اور "خالق باری" بھی اہم ہیں۔ محمد حسین آزاد اور رحمان ذوق بہان کے مضافیں رسالہ "ہندوستان" میں قسط وار چھپتے رہے۔

اب شرانی تھک چکے تھے اور صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں دو تین بار میرپور میں مبتلا ہوئے۔ آخر میں ان پر حسرت و یاس کی کیفیت طاری واقعہ تھی۔ گو یہ اب بیماری نے جڑ بکڑی تھی۔ آخر شربتِ الہیہ ۱۱ دسمبر ۱۹۶۶ء کی بارہ تاریخ بروز جمعہ صاف وفات پائی۔ کوئی کچھ کر سکے۔

شرانی کی تنقیدی اور تحقیقی کارکردگی کے اعتراف میں سید عبداللہ نے ایسے پتے رقم کئے ہیں:-

"پروفیسر شرانی ہمارے دور کے بہت بڑے مفکر و مورخ تھے۔ وہ ادبیات کی صحت و صداقت پر جان دیتے تھے۔ اور اس معاملے میں کسی غلطی اور غلط بیانی کو معاف نہ کر سکتے تھے۔ بیانی کی تلاش ان کا ایمان تھا جس کی خاطر انہوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کی بھی پروا نہ کی۔ انہوں نے تاریخ و ادب کی بڑی بڑی غلطیوں کی اصلاح کی اور ایسے ایسے پتے نظر یوں کے طلسم کو توڑا جن کی بڑی بڑی غلطی دنیا میں ابھری ایک حقیقت ثابت کے راسخ اور پکی ہو چکی تھی۔ محض رد و اہت پر وہ اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ روایت کو بھی کام میں لاتے تھے۔ اگرچہ شرانی صاحب کے تعمیری کاموں کی کچھ کی نہیں پھر بھی ادب اور تاریخ کے بہت سے غلط نظریوں اور عقیدوں کو انہوں نے جس شدت اور قوت کے ساتھ توڑا اس کی بنا پر اگر انہیں..... بہت شک کیے دیا جائے تو بچتا ہوگا۔"

حافظ محمود شرانی اردو کے ایک ممتاز منتقد اور منتقد تحقیقی کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انہوں نے اردو کی ابتدا کے سلسلے میں جو نظریہ قائم کیا ہے وہ مسلسل زیر بحث رہا ہے لیکن ان کی کسی بھی تحریر کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ عملی اور تحقیقی اعتبار سے ان کا دورہ قاضی عبدالودود سے کم نہیں ہے بلکہ تحریر کی تحقیقی اور اسلوب کی روانی کی بنیاد پر ان کی تحریریں زیادہ چمک جاتی ہیں۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور نے "مقالہ سے حافظ شرانی" کے عنوان سے ان کے مضامین شائع کروئے ہیں۔ ان کی تہذیبِ نظر محمود شرانی نے کی ہے۔

میں نے سو اچھی اور دوسرے امور مظہر محمود شرانی کی اسی مرتبہ کتاب سے استفادہ کئے ہیں، جو جلد اول میں مصنف کی حوالہ سے اردو کی کتاب کی زندگی ہے۔ تفصیل کے لئے یہ کتاب دیکھی جاسکتی ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت ۱۱ جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں شرانی کے چند مضامین اور دوسرے میں آٹھ۔ اگر ان مضامین کو دو جہن میں رکھا جائے تو محمود شرانی کی متوجہ حیثیت، تاریخی نگاہیں اور ایسے ان کی جگہ ادبی طور پر تاریخ ادب اردو میں محفوظ ہے۔

فصح الدین بلخی

(۱۸۸۵ء - ۱۹۸۸ء)

مشہور محقق، مورخ اور شاعر و ادیب فصح الدین بلخی خاندان کی ایک ذی مرتبت شخصیت کا نام ہے۔ موصوف کی پیدائش ۱۸۸۵ء میں عظیم آباد کے پٹنہ پٹی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم ان کے والد کے زیر سایہ انجام پائی۔ لیکن اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم کے حصول کے لئے مدرسہ میں داخل ہوئے پھر پٹنہ اور ایفگو مرکب ہائی اسکول کے طالب علم ہو گئے لیکن ذاتی اکتساب جاری رہا۔ عربی، اردو اور فارسی نے مہارت ہم پختی اور انگریزی پر بھی کئی دروس حاصل کی۔ جب ان کی عمر سترہ سال کی تھی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور خاندان کا شیر ذمہ اٹھ گیا۔

فصح الدین بلخی کی دو شاہیاں ہوئیں۔ پہلی اہلیہ لیلیٰ تو رفاطہ جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ بھران کی شادی سید محمد ادریس بلخی کی صاحبزادی لیلیٰ رسولی سے ہوئی۔ ان ہی سے ان کی اولاد پیدا ہوئی۔

ابتداء میں فصح نے نارتھ بہار مسلمٹ کے شعبے میں قانون گوئی حیثیت سے ملازمت اختیار کی لیکن جلد ہی اس سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد فٹری اسکول میں معلم ہو گئے۔ یہ ملازمت ایک عرصے تک رہی۔ موصوف اس اسکول میں انگریز فوجیوں کو انگریزی کی تعلیم دیتے رہے تھے۔ اس کے بعد وہ پٹنہ فٹری اسکول بھیج دئے گئے جہاں سے سبکدوش ہو کر وطن واپس آئے۔ پھر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج میں معلم ہو گئے۔ لیکن فورٹ ولیم کالج سے انہیں بہت دنوں تک ذریعہ اور بڑی روفی جی کے پریم کورٹ میں ترجمان کی حیثیت سے بحال ہو گئے۔ ۱۹۶۳ء - ۱۹۶۴ء کے درمیان لیلیٰ جید و ایمان فی ثانی سے ملے اور بہار اہلی میں کو پٹنہ سوانی نواد میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں سے الگ ہوئے تو سندھان میں پھر قانون گو ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ان کے حالات بہت بدل گئے اور شعرا و ادب کی طرف بڑی دل دہی سے متوجہ ہو گئے۔ مظفر بلخی کی کتاب میں ہے کہ موصوف نے تعلیمی مقالے ۸۹، شخصیت مقالے ۳۹، مثنوی مقالے ۱۶۶، ادبیاتی مقالے ۸۹، انسانیاتی مقالے ۳۱ اور نظریاتی مقالے ۹۷ تصنیف کئے ہیں۔ دراصل یہ تفصیل مخطوطہ کتاب کے پیش نظر ہے جسے سید محمد حسین نے تصنیف کیا ہے۔ موصوف نے اس کی وضاحت کی ہے کہ فصح الدین بلخی تحقیق میں قاضی عبدالودود، عقیدہ میں پروفیسر حکیم الدین احمد اور تاریخ میں پروفیسر سید حسن عسکری کے مد مقابل ہیں۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان تین حضرات کی کچھ نہ کچھ کیفیت ان کے یہاں موجود نہیں۔ انہوں نے جو بھی تحقیق کا کام کیا ہے وہ مگر افتاد ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں۔ ان کی کتاب "تاریخ مکہ" ایک بے مثال دستاویز ہے جس کی تاریخی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ بہت اچھے پڑھنے کی قدر ہے ان کی تلاش کا نتیجہ ہے۔ دراصل بہار میں جس

طرح لوگ تحقیق کے جذبے سے سرشار ہوئے اس کے محرک دوسروں کے علاوہ اپنی صاحب کی بھی ذات گرامی رہی تھی۔ ان کی کتاب ”تذکرہ نسوان ہند“ کل بھی اہم تھی اور آج بھی اہم ہے۔ مائیکر کی دختر زیب اہل حق کے سلسلے میں موصوف نے بہت سے ایسے امور کو رد کیا جو اس کی شاعری سے عبارت تھے۔ غنی کے لطیفے اور بڑیاات کو رد کرتے ہوئے انھیں غلط قرار دیا ہے۔ اس طرح اچھا گر چند اہل حق کی شاعری پر چٹکات مارتے لائے وہ تحقیقی اعتبار سے بڑے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ دراصل ان کی کتاب ”ہندو شعراء ہند“ ایک الگ اہمیت کی حامل ہے جس میں بڑی جانفشانی سے ہندو شعراء کے احوال و ملامت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نصیح الدین ٹٹنی کی دلچسپی تاریخ اور کہانیاں سے غیر معمولی تھی۔ وہ آثار قدیمہ کے بہت سے پیلوڈس پر نہ صرف نگاہ رکھتے تھے بلکہ ان کہانوں کو محفوظ کرنے کا کمر بھی جاتے تھے۔ ان کی مساجی سے بعض کہانیاں محفوظ ہو گئے جس سے بعد میں استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ خواجہ فضل امام نے موصوف پر مضمون لکھتے ہوئے موصوف کی جمع کردہ فارسی اور اردو کی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ یہ سب کتابیں تحقیقی لحاظ سے جدا اہم ہیں خیال کی کوششوں سے محفوظ ہو گئی ہیں۔ ٹٹنی چند یاد دہانیوں پر بھی لکھے ہوئے ہیں جو انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران لگ بھگ ساڑھے ۱۳ سو عمرانی فارسی اور اردو کی خطوط و مخطوطہ کتابیں جمع کیں۔ وہ ۱۹۷۸ء میں یہاں سے سکودیش ہوئے۔

گوپا موصوف کی مساجی سے کتنے ہی گرائیڈر خطوط محفوظ ہو گئے جس سے مسلسل فیض اٹھایا جا رہا ہے۔

ٹٹنی کی ایک حقیقت اقدار کی بھی ہے انہوں نے جامعہ مذاق اور حوقیانہ انداز بیان کی نہ صرف مذمت کی بلکہ بعضوں کے اشعار کی تصحیح بھی کی۔ بان بھارات کی غلطیوں، ناقص ہشتر رنگی، مشور و زائد کی کیفیت، رد و لب کی غلطیاں توں سے نا آشنا اور سرحد وغیرہ پر گہری فکر ڈالی۔ عمر وحی مسائل کو حل کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ انجانی اہم شعرا بھی ان سے اصلاح لیتے رہے۔ اس ضمن میں حسن نعیم کا بھی نام اہم ہے جنہوں نے عمر وحی بروز موصوف ہی سے لکھے۔

نصیح الدین کی اکثر مشکل موضوعات کو بھی سلاست اور روانی سے پیش کرنے کی ایک انجانی مثال پیش کرتی ہے۔ ان کی تشریح و دلی ہر جگہ قائم رہتی ہے اس لئے کوئی پیلوڈ جو نہیں جاتا۔

موصوف کا انتقال ۱۹۸۸ء میں ہوا۔ شائق بہال ناگپوری نے تاریخ و قیات کہی:

| | | | | |
|------|-------|------|-------|------------|
| تہاد | ہاشی | مرے | مطر | ٹٹنی |
| پامی | آج | اپنا | حق | تحقیق |
| پوری | حقیقی | میں | نصاحت | ہے |
| کہا | کس | نے | آگ | ہے اوق |
| آپ | کی | ہے | ہے | نصیح الدین |

نصیح الدین ٹٹنی پر ۲۸۸ صلی کی ایک تحقیقی کتاب ”نصیح الدین ٹٹنی: حیات اور کارنامے“ (از: مظفر ٹٹنی شانی) ہو چکی ہے۔ تفصیلات کے لئے اس کتاب سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

حامد حسن قادری

(۱۸۸۷ء — ۱۹۶۳ء)

حامد حسن قادری دراصل مولانا حامد حسن قادری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی ولادت گجراتیوں ضلع مراد آباد میں یکم مارچ ۱۸۸۷ء میں ہوئی اور وفات ۹ جون ۱۹۶۳ء کو کراچی میں۔

ان کے والد مولوی احمد حسن رامپور میں وکیل تھے۔ ۱۸۵۹ء میں انھیں رامپور ہی میں عدالت عالیہ کا منصب عطا ہوا۔ قادری صاحب نے ایسے ہی ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو بقول خواجہ احمد فاروقی ”مکمل شاعر، عالم اور محدث تھے۔ ان کا گھر محلہ گھنڈہ سال بہت میں تھا جو امیر بنانی کے گھر سے بہت قریب تھا۔ ۱۸۹۹ء میں امیر کے گھر میں آگ لگی تو بعض کاغذات جل جل کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ خود حامد حسن قادری نے آگ لگنے کی تصویریں چھپوایا ہے۔“

”بعض تذکروں میں آگ لگنے کا سال ۱۸۹۵ء درج ہے۔ مگر ایسا ہے تو ممکن ہے وہ آگ

پہلے لگی ہو۔ ۱۸۹۹ء میں آگ لگنا خود مجھے یاد ہے۔ میں رامپور میں حضرت امیر بنانی کے

محلے میں ان کے مکان سے قریب ہی رہتا تھا۔ میرا بھائی کا زمانہ تھا۔ آگ ایسے غضب کی تھی

کہ اگر چہ مکان آتش زدہ سے میرا قریب ہی تھا۔ — بھر بھی وہاں سے بچے ہوئے کاغذات

میرے بچکر آئے تھے۔ اس حادثے سے ہم سب پر عجیب ہوت طاری ہوئی تھی۔ امیر صاحب

اور علیل صاحب کا دیکھا بھی طرح یاد ہے۔ بعض فقر ہیں جن میں شریک ہوا یاد ہیں۔“

کہا جاتا ہے کہ اس وقت قادری کی عمر ۱۱ برس کی تھی جن دنوں دارغ اور امیر کے اشعار ازہر کے بیٹھے تھے۔ انہوں

نے ابتدا میں ٹٹنی اختیار احمد خاں راز سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ یہ امیر کے شاگرد تھے۔ حامد حسن قادری کے والد مولوی

احمد حسن نے ”قصہ قاضی جوئیہ“ فارسی میں بطور شعوی تخلیق کی تھی اور اسے قادری صاحب کے نام سے چھپوا دیا تھا۔ اس

شعوی کا تاریخی نام ”نظم نگین“ بھی ہے۔ خانہ آبی اثرات کے تحت انھیں تاریخی کوئی سے بڑی دھمت ہو گئی اور نتیجے میں وہ

بڑی آسانی سے ادراجیں نکال لیتے۔ امیر بنانی کی تاریخ و قیات یوں کہی تھی:

”آں قدح کشت آں ساقی لہذا“

قادر نے ۱۹۰۹ء میں انیسویں ہائی اسکول لاہور سے میٹرک پاس کیا اور ستمبر ۱۹۱۰ء میں ایس ای ہائی اسکول لاہور چھوڑ دی میں اردو کے استاد ہو گئے۔ لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے لاہور سے بی اے فاضل پاس کیا اور ادیب فاضل بھی ہوئے۔ اس کے بعد مولوی جی جعفر جی زردشتی ہائی اسکول مہاراجہ چھاؤنی میں پرنسپل بن گئے۔ اس کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول لاہور میں اردو اور فارسی کے مدرس رہے۔ پھر ۱۹۱۴ء میں برادہ کالج میں فارسی کے پروفیسر ہوئے۔ قادری ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۵ء تک مسیح جانی کالج آگرہ میں اردو اور فارسی کے پروفیسر رہے پھر صدر شیعہ بھی ہو گئے اور ۱۹۵۲ء میں سکونت ہوئے۔ گویا مساری عمر تعلیم و تعلم میں گزاری۔ خوب احمد قادی کے بیان کے مطابق قادری نے ۱۸۹۹ء سے مضامین لکھنے شروع کئے۔ ان کے مضامین ”پھول و خار“ ”لاہور“ ”سکین“ ”امرتسر“ ”وطن“ ”لاہور“ ”انتخاب“ ”اجواب“ ”لاہور“ ”خزان“ ”لاہور“ ”علی گڑھ منتظمی“ ”تھانہ“ ”آگرہ“ ”عالمگیر“ ”لاہور“ اور ”نگار“ لکھتے ہیں شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے قزو کا پیور سے بچان کا اخبار لکھا تھا جس کا نام تھا ”اخبار سعید“۔

قادری کی کتابوں کی تعداد قابل لحاظ ہے۔ ”باغبان“ (۱۹۲۱ء) ”انکس“ (۱۹۳۲ء) ”فطرت اطفال“ (۱۹۲۵ء) ”کمال داغ“ (۱۹۳۳ء) ”تاریخ مرثیہ گوئی“ (۱۹۳۳ء) ”تاریخ و تہذیب“ (۱۹۳۸ء) ”داستان تاریخ اردو“ (۱۹۴۱ء) ”تقدیر و فکر“ (۱۹۳۲ء) ”ایرانی افسانے“ (۱۹۳۳ء) ”سعید و صیار“ (افسانے ۱۹۳۴ء) بے حد مشہور ہیں۔ ان کی تصنیفیں بصیرت کے بارے میں خوب احمد قادی لکھتے ہیں۔

”ان کے خیال میں شاعری کام بھی ہے اور تکمیل بھی۔ شاعری برائے زندگی بھی ہے اور برائے شعر و ادب بھی اور برائے لاشے بھی۔ مشرقی ہندوستان کا نظریہ شاعری مغرب سے بالکل مختلف رہا ہے اور ہے اور رہے گا۔ وہ لکھتے ہیں: ”میرے نزدیک ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں تضاد نہیں ہے۔ ان کا احتجاج ممکن ہے۔۔۔ خیالات، تجزیے، موضوعات سب سب جتنے جتنے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں لیکن ان کے اظہار کا بہترین طریقہ نہیں بدلتا۔ وہ شعر و ادب کے ظاہری پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح کیا شاعر کو شاعر بناتا ہے۔“

قادری کا نقطہ نظر یہ تھا کہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اردو شاعری کا مزاج بھی بدلتا چاہئے۔ قدیم اصناف میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ سبے قرب بات کی قدر کرنی چاہئے۔ ان کی اپنی افادہ حیثیت ہے لیکن ساتھ ساتھ ہندوستانیہ کو قوت ہونے سے بچایا جائے اور مشرقیت تادم ہو۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہر بات کے کہنے کا ایک انداز اور ایک سلیقہ ہونا چاہئے جس میں روزمرہ کی چاشنی ہو۔ انہوں نے اپنے تصورات اپنے خطوط میں لایا۔ وہ وضاحت سے بیان کئے ہیں۔

قادری کی سب سے اہم کتاب ”داستان تاریخ اردو“ تصور کی جاتی ہے اور واقعی اس کتاب کی نگاہیں اور ادبی

اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں نثر نگاری کے کچھ تاریخی حقائق بھی بیان کئے ہیں۔ ظاہر ہے ان میں کچھ غلطیاں بھی ہیں لیکن ان کے یہاں جو اسلوب نثر ہے وہ بڑا دلکش اور پرمستی ہے۔ ایک ایک لفظ پر نگاہ رکھتے ہیں، انصاف میں نہیں جاتے، اختصار اور جامعیت ان کا فن ہے۔

میں نے اوپر یہ ذکر کیا ہے کہ قادری شاعر بھی تھے لیکن ان کی شاعری جس پشت چلی گئی اور مثنوی کتابوں نے ان کی شاعری پر ایک پردہ ڈال دیا۔ ویسے ان کے یہاں شاعری میں بھی ایک خاص انداز تھا ہے جس میں گہری سنجیدگی ہوتی ہے لیکن ان کی شاعری کا ایک جز خاص مجھ پر چھڑا کا انداز بھی ہے۔ انہوں نے تھوڑے باعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کا شاعرانہ انداز ذیل کے چند اشعار سے پتا ہے۔ جس میں ایک صاحب کی داڑھی منڈوانے کا رد عمل بھی کیا گیا ہے۔ دراصل انہوں نے پاکستان جا کر داڑھی ترشائی تھی۔ اشعار دیکھئے:

ہاں جا کر جو تم نے سوطی داڑھی
دیا مگر یہ پاکستان کو جانے

دراے ہاں تھے رہنے بھی دیتے
نہ تھی آخر وہ عرض و طول میں چھانچ

یہ وہ تھا توفی جاتی ہے سفیدی
مگر تھا یہ تو نور سب و تاب

اگر روئی کا کالا ہو بھی جاتی
نہ آتا اس کو دھتے کوئی طالع

نہ رہا آ کے بچہ اس میں فرکوش
جو کی پہلے سے تم نے فکر افراغ

بھی تھاب سمجھا تھا کسی نے؟
کہ ذبح ریل کو سمجھا حلال آج

ہلایا تھا ”براہمنش“ کسی نے؟
کہ چڑھ آیا غضب کا بحر مباح

د کرتے تھے یہ منڈوانے کی غلطی
تو کہیں بچے مرے طفلوں کا آماج؟
سلائی کی سوز یہ صاف تاریخ
خس و خاک راہی کا نہیں آج

ابوالکلام آزاد

(۱۸۸۸ء - ۱۹۷۸ء)

ان کا حقیقی نام نجی الدین احمد تھا۔ ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے اسلاف جس قوتی کے تھے لیکن اکبر بادشاہ کے زمانے میں مغلوں کا دارالسلطنت آگرہ رہا تھا۔ یہ علم ادب کی ایک مرکزی جگہ ہوتی تھی۔ بہت سے علما کیجا ہو گئے تھے۔ ان میں سب میں ایک بزرگ شیخ جمال الدین تھے جنہیں علم حدیث پر بڑی قدرت تھی۔ اس زمانے میں اکبر نے اپنے دین الہی کے مسئلے میں اس سے فتویٰ حاصل کرنا چاہا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کبھی شیخ جمال عرف بہلولی دہلوی مولانا آزاد کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس سلسلے کی مزید تفصیل کے لئے ایک طویل اقتباس درج کرتا ہوں جس کے لئے معذرت خواہ بھی ہوں:-

"تیم دہلی کے زمانے میں مولانا سنور الدین نے اپنی بڑی بڑی کی شادی شیخ محمد ہادی سے کر دی۔ شیخ محمد ہادی شیخ محمد احسن کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا تعلق مولانا شیخ جمال الدین کے خاندان سے تھا۔ شیخ محمد ہادی مولانا ابوالکلام کے دادا تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں ۴۵۰ سال کی عمر میں ہوا۔ مولانا آزاد کے والد کی عمر اس وقت تین یا چار برس کی تھی۔ یہ زمانہ مغلیہ دور کے خاتمہ کا تھا۔ مگر بڑی حکومت کا تسلط تقریباً ہندوستان کے چاروں طرف سوچا تھا۔ ان کی پرورش و تعلیم و تربیت ان کے دادا مولانا سنور الدین کے یہاں ہوئی۔ تاہم یہ وقت تعلقہ میں زیادہ تھی اور بھول مولانا آزاد خود کی زندگی کے جو حالات وہ بیان کرتے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود وہ بہت تنہا و غفلت کے بے شمار خوبیاں تھیں اور عمدہ موسیقی کی تکتے میں سوچو جو تھیں۔ انیسویں صدی کے خلا میں مولانا آزاد کے والد خیر الدین کی نمایاں حیثیت تھی۔ وہ دینی میں کمر بستہ رہے۔ لیکن وہ یہاں کے ماحول سے مطمئن نہ تھے اس لئے دینی سے ہجرت کر کے قازان چلے گئے اور مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہیں انہوں نے ایک عرب خانہ دار سے شادی کر لی۔ عرب خانہ دار نے شیخ محمد بن خاوری کی بھانجی تھیں، جو اس

ہوئے جن میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ مولانا آزاد پانچویں میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ مکہ معظمہ میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت والد الہی کی نگرانی میں ہوئی۔ مولانا آزاد کی والدہ کی باوری زبان عربی تھی اور وہ اپنے بچوں سے عربی زبان میں بات چیت کرتی تھیں۔ اردو زبان نہیں جانتی تھیں۔ البتہ انکی اردو سیکھ لی تھی کہ بات چیت کر سکیں۔

مولانا کے والد ۱۸۹۸ء میں مکہ معظمہ میں سخت بیمار پڑے۔ وہاں کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ عربیوں اور عربوں کے مشورے سے انہیں علاج کے لئے ممبئی لایا گیا۔ یہاں کچھ دن قیام کے بعد انہیں شکست لے گئے۔ مولانا خیر الدین کے مریدوں کی تعداد بہت بڑی تھی اور وہ سب مولانا سے سیدالسیف اور عبت کرتے تھے اس لئے علاج کے بعد ان کے مریدوں نے ان کو واپس نہیں جانے دیا اور مولانا مع اپنے خاندان کے شکست میں رہنے لگے اور اب یہی ان کا وطن ہو گیا۔ مولانا آزاد کو بھی اپنے والد کے ساتھ شکست ہی میں لے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابو نصر غلام سلیمان کا انتقال ہو گیا اور ۱۹۰۸ء میں مولانا خیر الدین مولانا آزاد کو قضا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا خیر الدین کی وفات کے بعد ان کے مرید مولانا آزاد کو ان کا جانشین بنانا چاہتے تھے مگر مولانا نے انکار کر دیا۔

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز دیکھارہ ماہ سال کی عمر سے ہوا۔ پہلے شاعری اور بعد میں نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ شاعری کا شوق مولوی عبد اللہ اور احمد خاں بھٹائی نے پیدا کیا۔ یہ مولوی محمد فاروقی چر یا کوئی کے شاگرد تھے۔ ان کی بہن مولانا کے یہاں گھر کے کام کاج کے لئے ملازم تھیں۔ اس تعلق سے مولوی عبد اللہ و خاں کی آمد و رفت ہوئی۔

عبد اللہ و احمد خاں ان کی ایما پر انہوں نے اپنا تخلص آزاد رکھا۔ والد الہی نے درخواستوں پر نئی امیر احمد سے اصطلاح لی لیکن ان کے باطنی استاد شوق توری تھے جن کے بارے میں تفصیل کسی دوسرے صفحے پر ملے گی۔ لیکن مولانا کی سماجی زندگی کافی فعال رہی ہے۔ ۱۸۹۹ء میں "نیچر عالم" جاری کیا، ۱۹۰۷ء میں "الاصباح" اور ۱۹۰۳ء میں "لسان الصدوق"۔ اسی رسالے کی وساطت سے مولانا کی ملاقات مولانا شبلی نعمانی سے ہوئی۔

صحافت اور سیاست کا چرخی نام کا ساتھ ہے۔ ۱۹۰۲ء ابوالکلام آزاد بھی عملی سیاست میں داخل ہو گئے۔ واضح ہو کہ ۱۸۸۵ء میں انہیں پیش کش کا گھر میں قائم ہوئی تو سرسید نے اس کی مخالفت کی لیکن مولانا آزاد کا تکرر میں کے حق میں تھے۔ انہوں نے "الہلال" ۱۳ جنوری ۱۹۱۲ء میں نکالا۔ چورس یا کبھی قضا و غلابی تھی۔ اس رسالے کے اثرات دور رہے تھے۔ اور اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ اس کے بعد مولانا نے ۱۹۱۵ء میں "الہلال" نکالا۔ گویا یہ دونوں ہی رسالے علمی ادبی اور

سیاسی آئینگی کے لئے مجدد مفید ثابت ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانوں کے مجدد تھے دہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے ملکی سے تقسیم کی مخالفت کی۔ مسلمانوں نے عام طور سے ان کا ساتھ نہیں دیا لیکن جب ملک تقسیم ہو گیا تو انہوں نے ملک، قوم اور ملت کے لئے گرفتار خدمت انجام دیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور انتشارات لاہور جی، اسے مضبوط اور مستحکم کیا۔ انہیں ترقی اردو کا بھی تحفہ کیا۔ مولانا کی سیاسی زندگی بڑی بھر خاں رہی۔ انہیں متعدد پارٹیاں لڑ کر لیا گیا اور سرائی دی گئیں۔ اس کی تفصیل عبداللطیف اعظمی نے اس طرح قلمبند کی ہے:-

”راہچی کی نظر بندی (۱۹۱۶ء) مدت تقریباً ۳ سال نو ماہ۔ دوسری گرفتاری ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء مدت ایک سال ایک ماہ۔ تیسری گرفتاری ۲۱ اگست ۱۹۳۰ء مدت تقریباً چھ ماہ۔ چوتھی گرفتاری ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء مدت دو ماہ۔ پانچویں گرفتاری ۳ جنوری ۱۹۳۸ء تقریباً گیارہ ماہ۔ چھٹی گرفتاری ۹ اگست ۱۹۴۲ء مدت تین سال چوبیس دن۔ یعنی مولانا ابوالکلام آزاد نو سال سات مہینے چوبیس دن جیل میں رہے۔ یہ گرفتاریاں ہمیشہ پانچویں تھیں اس لئے کہ مولانا آزاد بھارت میں آزاد کینا چاہتے تھے بلکہ اسے نئی ڈگر پر لا کر نئے امکانات سے بہرہ ور کرنا چاہتے تھے۔

مولانا کی ادبی زندگی بھی مجدد محترم رہی ہے۔ ان کی متعدد کتابیں ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہیں۔ مثلاً ”تذکرہ ترجمان القرآن“، ”غبار خاطر“ و ”فیض“۔ ”ترجمان القرآن“ کی جلد اول بقول علامہ ادریس قاسمی کے اشکاف میں قرآن مجید اور دوسری قرآنی کا حاصل ہے۔ سورہ فاتحہ کی ترجمانی کے ایک سوسترے خواہ ابوالکلام کی مقامی نظر، اظہار، جرات اور ذہنی ارتقا کے اس درجے کی خبر دیتے ہیں جو گرفتاری کے حالات کے ساتھ ساتھ دوست و دشمن کی جانب بڑھتا گیا۔“

”تذکرہ“ ”غبار خاطر“ اور ”فیض“ کی صورتیں ملتی ہیں۔ جن پر تفصیلی بحث طوفاً ہے۔ ”ترجمان القرآن“ کی دو جلدوں کا پہلا مسودہ راہچی میں مرتب ہوا تھا اور تیسرا میرٹھ جیل میں۔ ان دونوں کے طرز بیان میں فرق ہے۔ ”تذکرہ“ میں عربی الفاظ زیادہ ہیں جبکہ ”سورہ فاتحہ“ میں گہری وضاحت کے سبب زبان نسبتاً زیادہ سہل ہے۔ مولانا آزاد کی گریحوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب مختلف موضوعات کے لئے مختلف ہوتا ہے۔

”غبار خاطر“ کے خطوط میں ادب و فلسفہ، تاریخ، رسوم و عادات، آداب سبھی ایک خاص انداز سے سامنے آئے

چلے۔ ان کے اسلوب نگارش کے بارے میں عبدالعاجز، بیانی کی جواز سے ملاحظہ ہو:-

”خدا جانے کتنے نئے اور بھاری تحریریں لکھتے اور نئی کتابیں اور نئے اسلوب پر پختہ اپنی ادبی اور علمی کمال سے حاصل و حاصل کر رہے تھے۔ گئے اور جانتے تھے کہ یہ عالم تھا کہ کتنے ہی سکندراعزمت، تین گئے۔ حالیہ علمی کی سلاست، سادگی، سرفرازی اور ان کے لڑائی باہمی اور مباحث سب لڑنے لڑنے کرتے رہ گئے۔“

مولانا کی تمام نگارشات اگرچہ نظر ہوں تو انہیں تاثیر و زکاوت کا رکنا یا ایک لچک و تصور کرنا چاہئے ہوگا۔ ان کے خطبے، ان کے ٹکڑے اور فلسفیانہ جانات، ان کی عربی و انگریزی کی شہرہ، اردو و عربی فارسی الفاظ و لسانی قدرت، حافظے کا کمال، بیان کی جرات اور زندگی سے تعلق رکھنے کی صلاحیت، بے مثال لیڈر شپ، پھر ان کے اپنے مزاج کی تنہائی پسندی اور خود نگار کے لئے بھیڑیں بھی وقت نکال لینا، یہ سب کچھ ایسے لواصف ہیں جو کہیں اور نہیں ملیں گے۔ انہوں نے اپنی نیک چوٹی کی موت پر چھ دل حاصل کر کے آخری رسوم میں شامل ہوا بھی گوارا نہ کیا۔ یہ وہ ہیں انکی ہیں جو بظاہر مجدد اہم معلوم نہیں ہوتے لیکن جس شخص پر ایسے مراحل گزرے ہیں وہی شدت کرپ کو کچھ سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ملک و قوم اور ملت کے لافانی اور لافانی رہنے ہونے کے علاوہ اپنے علم و کمال کی وجہ سے ہمیشہ یاد کے جائیں گے۔ کانگریس کے زمانے میں مختلف مباحث پر سرفراز ہونا، پارلیمنٹ یا سیاسی وفد میں باہر جانا یا آزادی کے بعد وزیر تعلیم ہونا ان کی عظمت نہیں بڑھاتا۔ بلکہ جن عہدوں پر موصوف رہے وہ عہد نے ان کی وجہ سے سرفراز ہو گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ۲۲ فروری ۱۹۷۱ء کو دہلی میں ہوا اور وہ چورنگی چلے۔



انیسویں اور بیسویں صدی کے ممتاز ڈرامہ نگار

امانت لکھنوی

(۱۸۱۵ء تا ۱۸۵۸ء)

امانت لکھنوی کا پورا نام آغا حسن اورنگعلی امانت ہے۔ ۱۸۱۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر آغا علی تھا۔ ڈرامے میں انہوں نے اختلا و تخلص اپنا پاتا تو شاعری میں امانت۔ لیکن تخلص استاد معروف نہ ہو سکا۔ امانت واقعی شہرت کا باعث ہوا۔ ایک روایت کے مطابق امانت کی زبان میں لکھتے تھے اس حد تک کہ گنگا ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں ایران میں حضرت امام حسینؑ کے روضے کی زیارت کی تو زبان کھل گئی۔

ڈرامہ ”اندلسجا“ امانت کا شاہکار ہے۔ ان کی ساری شہرت اس ڈرامے کے حوالے سے سامنے آئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے قاضی لٹاؤ شاعری بھی کی۔ ایک حیثیت ان کی واسطت گونگی بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس فن کے وہ امام ہیں۔

آغا حسن امانت اس وقت پھلے پھولے رہے انہیں وزیر کا نظارہ تھا۔ لکھنؤ میں بے دلوں حضرات اپنی اپنی اہمیت منوانے لگے تھے۔ ایسے میں امانت نے اپنی ایک الگ راہ اپنی۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے۔ درخت ٹکڑے ہے کہ وہ ان دونوں کے مقابلے میں بچھ جاتے اور گیس بھی نام نہ ہوتا۔

امانت کے صاحبزادے سید حسن کے حوالے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ انہوں نے ”اندلسجا“ صاحب کی فرمائش پر تخلیق کی۔ شاہی مشورہ یہ بھی دیا گیا تھا کہ اس ڈرامے میں مختلف مضامین بار بار پائیں مثلاً غزل و مثنوی و غمری و بولی و غیرہ اور موسم کی بھی سالی ممکن ہو۔ یہ سب باتیں ”اندلسجا“ میں موجود ہیں۔ اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ مختلف ایڈیشن بار بار چھپتے رہے ہیں اس لئے کبھی کبھی غلط ایڈیشن بھی سامنے ہوتا ہے۔

امانت کی شعری صلاحیتیں ان کی ڈرامہ نگاری کے سامنے خوب سی گئی ہیں اور ان کی غزلوں میں جو امکانات تھے انہیں بس پشت والی دیا گیا ہے حالانکہ امانت ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ یہ تھیں راجات تھیں اور لفظی بازیگری کے شاعر نہیں بلکہ ایک حساس دل و دماغ کے شاعر ہیں۔ ان کا راج ان ۱۸۲۰ء میں مرتب ہوا۔ اس دیوان سے ان کی زندگی کے بعض حالات بھی سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ ان کا نسبی سلسلہ سید علی ابن سید محمد آغا ابن سید علی شہیدی سے ملتا ہے۔ ان کے اسلاف میں لوگ لکھنؤ آئے اور اس طرح یہ ان کا وطن قرار پایا۔ اس زمانے میں مرشد گونگی لکھنؤ میں ایک مراد صنف تھی۔ اس سلسلے کے ایک اہم شاگرد تھے۔

بہر طور ”اندلسجا“ نے اپنے ثبات کا درجہ حاصل کیا اور امانت لکھنوی ایک قاضی لٹاؤ شاعر بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے فکر یا نہ سمجھنے کی اس وقت تخلیق کی، جس کی اپنی اہمیت ہے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۸ء میں ہوا۔ موت کے بعد بھی ان کے کام کی اشاعت ہوتی رہی۔

کہا جاسکتا ہے کہ امانت کے یہاں محروقی کے سلسلے کے احساسات، معاملہ بندی وغیرہ اس اعتدال کا نشانہ نہیں ہیں جو عام طور سے لکھنؤی شعرا کا طرز اختیار تھا۔ امانت کے دیوان "تراکن الغصاحۃ" کو سامنے رکھا جائے تو ان کی غزلوں کے ٹیپ وکم کا اندازہ ہو۔

لیکن امانت کا "اندرسہا" ایک ایسا ڈرامہ ہے کہ اس پر مسلسل کچھ نہ کچھ لکھا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی غلط باتیں بھی روایت کے انداز میں سامنے آجاتی ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اس کے ریس کردار کی رنگینی، اس کے گانے گھریاں، ہولی، رقص و غنچ کی کیفیت کبھی دل کو بھاتی ہیں اور اس کی اہمیت پر دال ہیں۔ دراصل امانت ایک طرف تو اس ڈرامے کو ادبی اہمیت دینا چاہتے تھے تو دوسری طرف اسے عوامی بنانا چاہتے تھے۔ ان دونوں مقاصد میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس باب میں کچھ ضروری امور کی مختصر سی ذکر و احوال سے مطلع کرنے کی ہے، جو ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

"اس سے ضمنی طور پر یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ "اندرسہا" میں عوامی خدایں نمایاں ہونے کے باوجود لٹریچرنگ بھی ایسی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

"اندرسہا" سے موجودہ اردو ڈرامے تک صرف ایک درمیانی نثری پادی جھینر میل کمپنوں کی ہے۔ ان میں کاؤس کی کھاد کی انگریز جھینر میل کمپنی ۱۸۷۸ء کے دربار دلی کے موقع پر موجود تھی اور اس طرح امانت سے جھینر میل کمپنیوں کے درمیان تقریباً صدی کا فصل ہے۔ اسی دور میں خرام فی اور پیکل جھینر میل کمپنی اور خورشید جی کی انکوہو یہ تاک کمپنیاں نکلیں۔ اس دور کے ڈرامہ نگاروں میں روفی، بھارتی اور میاں جلیلی ظریف تھے، ان کے بعد طالب چادری، مہدی حسن، حسن انصاری اور چاہ بابریلی کا دور ہے۔ ان میں سے دو کا سلسلہ لکھنؤ تک پہنچتا ہے۔ طالب چادری نیز بھارتی اور قاضی کے واسطے سے صحافی کے سلسلے کے شاگرد ہیں اور حسن انصاری خواب مرزا شوق مصطفیٰ "زہر عشق" کے نو اسے ہیں۔ غرض "اندرسہا" لکھ کر امانت نے لکھنؤی روایت ان شاعری کے نمائندوں کی طرف سے اردو میں ایک ایسی صنف ادب کی داغ بیل ڈالی جو ابھی تک ترقی کی محسوس طے کر رہی ہے اور جس کا نقشہ عروج ابھی تک حاصل نہیں ہوا ہے۔"

"اندرسہا" کا قصہ بڑا دلچسپ ہے اور وہ دلی ہے۔ راجا اندرا پناہ وارتا جاتا ہے جہاں بہت سی پریاں اسے مانج گانے سے راجا کا دل بھاتی ہیں۔ جڑ پر ہی گنگا منتر ادا ہے پر عاشق ہو جاتی ہے۔ راجا اندرا خطا ہو کر گنگا من کوٹھنوں میں قید کر دیتا ہے اور پری کے پر کو اس کے بار سے لگا دیتا ہے۔ وہ جو گن گن کر طرف در در گھرے گیت گاتی پھرتی ہے۔ راجا شہرت سن کر اسے بلو دیتا ہے، گانے سن کر خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ "تک کیا انعام مانگی ہے۔ وہ انعام میں گنگا من کوٹھن لیتی ہے۔

ہے۔ آپ معلوم ہوتا ہے کہ جو گن در اصل جڑ پر ہی تھی۔ آخر اس کا قصہ یہ ہوتا ہے۔ گنگا من راجا کو بلاتا ہے۔ آخر کار عاشق و معشوق کے ملاپ پر قصہ ختم ہوتا ہے۔ "اندرسہا" میں طرح در طرح میں آئی، اس ضمن میں خواہ امانت لکھنؤی نے شرح اندرسہا بھی لکھا ہے۔

"دل میں در پردہ عشق کی آگ تھی اظہوت کو حسن سے لاگ تھی۔ وضع کے خیال سے نہ کہیں جانا تھا نہ کہیں آنا تھا۔ زبان کی بستی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا۔ ایک دروازہ کمر ہے کہ حلق مرزا عاجز ملی کائنات زلی، رفتی عشق مونس و منحور۔ تھری جاں نثار، شکر اور دل، موزوں عینیت، تھیں عبادت۔ عاشق کلام امانت، انہوں نے ازراہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبراتا محبت ہے۔ ایسا کوئی جلد دس کے طور پر طبع ازراہ نظم کرنا چاہتے کہ وہ چار گھڑی دل گئی کی صورت ہو۔ آخر کار مرصوفی ان کی قربانی کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا۔ دم شوق زیادہ ہوا۔ غرض کہ چودھوی تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ ہجری میں اندرسہا اس جیلے کا نام رکھ کر بجائے چار باب چار پر یاں قرار دے کر شروع کیا۔"

اس کے بعد اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ "اندرسہا" واحد ملی شاہ کی قربانی کا نتیجہ ہے۔ بلکہ یہ بات بھی غلط ہے اس کا کسی طرح سے کوئی تعلق باشاہ سے تھا۔ نہ واحد ملی شاہ کی قربانی پر "اندرسہا" تصنیف ہوئی اور نہ ہی اس کا تعلق کبھی بھی درباری اسٹیج سے ہوا۔ دراصل یہ انکل گنج ہے کہ ان کے شاگرد عبادت نے ان کی تجاویز اور ذہن کی بستی کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی ڈرامہ اس کے طرز کا لکھنے کی قربانی کی اور یہ بات امانت کو پتہ نہ تھی۔ اس سے اتنی بات واضح ہے کہ باشاہ نے جس طرح ریس کو قبول کیا، اسی طرح جڑ پریت کا راہی تکیقات میں اپنا تھا ان کی کیفیت کا علم امانت کو ضرور تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی وقت تحلیل سے جس کے طراز کو بدل ڈالا اور ایک ایسا محکوم بنا تک لکھا جس کی مسامتہ و تضادیت کی کوئی مثال سامنے نہیں آتی۔ اس کے بعض ڈرامے بدلتی میں ہیں، ساتھ ساتھ گھری اور دار سے کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ دربار شہنشاہی سے دور "اندرسہا" عوامی تاک تھا۔ جس نے واقعہ عوام کا دل موہ بھی لیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تصنیف ۱۲۶۵ھ تکابت کی غلطی ہے اور اصل ۱۲۶۹ھ ہونا چاہئے۔ عطرہ رحمانی لکھتے ہیں:-

"قصاحت کا یہ بیان کہ اندرسہا ۱۲۶۵ھ میں تصنیف ہوا، خود سہ امانت کے بیان کے خلاف ہے اور فصاحت کے معراج تاریخ کی بھی تردید کرتا ہے۔ اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ ۱۲۶۵ھ تکابت کی غلطی ہے جو غالباً ۱۲۶۹ھ کی جگہ سمجھا دیا۔ لیکن یہ اس قصہ کا اختتام ۱۲۶۹ھ میں ہو چکا ہو۔ لیکن اس کی نظر دینی اور دیگر جزوی تخمین ۱۲۷۵ھ کے اوائل میں ہوئی ہو۔ اس لئے کہ امانت کے قول کے مطابق قصہ کا سن آغاز ۱۲۶۸ھ ہے اور اختتام ذی الحجہ سال کے عرصہ

میں ہوا۔ اس لحاظ سے بھی قلم کار سن ۱۲۶۹ھ ہو سکتا ہے۔ بہر صورت ہر ماہ تاریخ کے اعتبار سے ۱۲۷۰ھ میں قرار پایا ہے۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ ۱۲۷۰ھ جنمیل و اشاعت کی تیاری و اجتماع کا سال ہو مگر کتاب ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی ہو۔

صورت و انداز جو بھی ہوا آتی بات ثابت ہے کہ ”اندلسجا“ امانت کی اپنی آماجگاہ کا نتیجہ ہے۔ لہذا اس کا بارشاد و یا قیصر رافع کی چہرہ رویہ اری سے شہ کاظم کے لحاظ شخص ہے۔ اسے فراخ بینی اور پاکیزہ بھی انتہائی قلم ہے۔ تاہم ساگر میں لگاؤ کر ہے کہ واجد علی شاہ کے بار میں ایک فراخ بینی نیکار موجود تھا۔ اسی کے شعور سے یہ سہ ماہی شخص نے بارشاد کی اپنی فراخ بینی اور پاکیزہ طرز پر ”اندلسجا“ لکھی۔ لیکن یہ بیان بھی غلط نہیں ہے اس لئے کہ اس کا فراخ بینی اور پاکیزہ طرز پر ”اندلسجا“ کی شہرت شہر میں پھیل گئی اور جگہ جگہ کے چرچے ہوئے تھے۔ اس کی نقاد بھی شروع ہو گئی۔ ہمدانی الال نے بھی اسی انداز کا ناگہ گھٹنے کی کوشش کی۔ دوسری اندلسجا میں بھی لکھی جانے لگیں لیکن امانت کی ”اندلسجا“ ہر لحاظ سے محترم رہی۔

اس کی کہانی پر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ہمز پر ی پر سے ناگہ پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے اندر حوصلہ بھی ہے، جوش اور تڑپ بھی۔ گلفام سے اس کی محبت مثالی ہے۔ دراصل پر ی اور آدمی زاد کے محبت کا تصور بھی حیرت میں ڈالنے والی چیز ہے۔ لیکن شہزادہ جب رو بارش جانے کی خواہش کرتا ہے تو ہمز پر ی ہی اس کو خطرات سے آگاہ کرتی ہے لیکن گلفام قید ہو جاتا ہے اور پر ی بھی مصیبت کا شکار ہوتی ہے۔ لیکن اس کی فکری دنیا بھی رنگ لاتی ہے۔ وہ جو کس بھی ہے اور شہزادہ گلفام سے ملنے کا طریقہ بھی یہ صورت نکالتی ہے۔ محبوب کو حوصلہ دلانے کا عمل اس کو فعال بناتا ہے۔ لیکن ناگہ کا جانا یا نادی کے کیف و کم کا نتیجہ ہے۔ اس ناگہ کے باب میں افسانہ حسنین کی رائے بھی نقل کرنے کے قابل ہے جس میں انہوں نے اندلسجا کے اساطیر کی پیروی پر ایک نگاہ ڈالی ہے:-

”اندلسجا کی کہانی میں نہ کوئی جدت تھا نہ کوئی ندرت۔ ہندو دوج والا کے مشہور گرد و رنج اندر کے گرد ایک معمولی سی کہانی کے تانے بانے سے محکوم ذرا چار کیا گیا تھا جس پر ہمز حسنین کی مثالی سحر الجہان کا غیر معمولی اثر نظر آتا ہے۔ لیکن امانت نے اس خلا کو اس طرح پر کر دیا کہ گویا اسی وقت ذرا نہ کی دہائی جاگ اٹھی اور بہت سے دوسرے شاعروں نے امانت کی تقلید میں اندلسجا میں لکھی، جو تقریباً اسی قسم کے آئینہ ہوا اور اسی قسم کے سادہ و سادہ مسلمان سے ہلکے کے سائے پھیل گئیں۔ اندلسجا اس کے موضوع کوئی سہلی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ مگر ان سے کوئی نتیجہ نکلتا ہے تو یہی کہ مسلمان ہندو دوج والا سے نہ صرف واقفیت رکھتے تھے بلکہ اپنے ادبی اور تمدنی مظاہر میں ان سے کام بھی لیتے تھے۔ ان سے اپنی ذہنی تفریح کا سامان فراہم کرتے تھے۔“

ہمدانی لال

ہمدانی لال پر وہ فضا میں تھے لیکن مسعود حسن ادیب نے اپنی کتاب ”تھنوں کا عوامی آئین“ میں ان کے بارے میں کچھ امور درج کر کے انہیں ماریخ ادب اردو کا ایک حصہ بنا دیا۔ ورنہ آج بھی ان کی تفصیلات نہیں اور جزو کھانا کے متعلق معلوم ہوا ہے وہ ادیب ہی کی دین ہے۔

دراصل امانت کی ”اندلسجا“ کی ”مقبولیت“ سے بعض مصنفین اپنے طور پر اپنے قصے لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی اندلسجا میں سائے آئیں۔

ہمدانی لال ایک غیر معزوف شخص تھے۔ ان کے حالات زندگی مسعود حسن ادیب نے اپنی کتاب ”تھنوں کا عوامی آئین“ میں مختصراً درج کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۰۷ء میں بڑی جگہ دوو کے ہمدانی لال کے مختصر سے حالات انہیں سننے کو اب کے ذریعے سے مشتاپ ہوئے جو واجد علی شاہ کے خسر اور ادب علی نقی جعفر خان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمدانی لال قصبہ سوانا کے رہنے والے تھے جو کھنوسے کوئی دس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ مسعود حسن ادیب نے حضرت دھانی کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ ہمدانی لال کا نام ہمدانی لال تھا اور یہ کہ انہوں نے در کچھ صرف کر کے آئین تیار کیا تھا۔ ہمدانی لال نے لکھنؤ میں رہائش اختیار کی تھی۔ وہ دھاتی کھڑی اور چتر کا کاروبار کرتے تھے اور ان کی دکان حسنین آباد کے چارنگ کے قریب واقع تھی۔ ہمدانی لال ان پر جانسان تھے۔ مسعود حسن ادیب کا خیال ہے کہ کئی آدمیوں نے مل کر ہمدانی لال کی ”اندلسجا“ تیار کی تھی مگر اس کا جلد ہمدانی لال نے تیار کیا تھا۔ مسعود حسن ادیب ان کے ایک شاگرد یار شاہ خاں (عالمی عبادت خان) سے ۱۹۳۳ء میں ملے تھے اس زمانے میں ان کا مشغلہ ادبی ور ہے کی پیش و طوائفوں کو باجگہ گانے کی تعلیم دینا تھا۔ لیکن اپنی جوانی کے زمانے میں وہ ہمدانی لال کی ”اندلسجا“ میں حصہ لیا کرتے تھے اور ان کی پوری فکریں ”اندلسجا“ میں پر ی کا رول ادا کرتی تھی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہمدانی لال کی ”اندلسجا“ کے بارے میں یہ بحث بھی ہے کہ یہ امانت کی ”اندلسجا“ سے پہلے سائے آئی۔ مسعود آد کا خیال ہے کہ امانت ایک مختصر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتداً قصہ موسیقی سے اس طرح واقف نہیں رہ سکتے تھے جس طرح ہمدانی لال اور یہ کہ ہمدانی لال کی اندلسجا کے نمونے پر انہوں نے اندلسجا میں یہ مسودہ شمایا آئیں۔

لیکن اسلم قریشی کا خیال ہے کہ ہمدانی لال کے یہاں قصہ و غنا کا عنصر برائے نام نہ تھا تو خام ضرور ہے۔ ان امور کے علاوہ یار شاہ اور فقیران کے بیان کو بھی شہادت کے طور پر قبول کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمدانی لال کی ”اندلسجا“ کو قبولیت حاصل ہے۔ لیکن ان تمام امور کو مسعود حسن رضوی نے رد کر دیا ہے اور امانت کی اندلسجا کی کو قبولیت دلی ہے ان کا خیال ہے کہ:-

”سے نواب کے بیان کے دونوں ہر معنی ہداری الال کی اندر سمجھا امانت کی اندر سمجھا سے پہلے لکھی گئی اور یہ کہ وہ واجد علی شاہ کی شاہی میں سمجھی گئی، کسی غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سنے نواب ایک جاہل شخص اور جاہلوں کے ہم صحبت تھے لہذا ان کے بیان کو اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ پھر یہ کہ وہ بدعقلی شاہ بہت نفس مزاج، ذی علم اور خون لیلیٰ کے ماہر تھے۔ ان کے دہس میں کام کرنے والے افراد مہذب، تعلیم یافتہ اور درویشانہ و سرور کے ماہر ہوتے تھے۔ جب کہ ہداری الال خوالاں پر عتھے اور اس کو پیش کرنے والے بھی ادنیٰ درجے کے جہلانہ تھے۔ شاہی تقریب میں اسے کیوں کر بار پائی ہو سکتی ہے۔“

اس کے علاوہ مسعود حسن رضوی نے اس کا اظہار کیا ہے کہ ہداری الال کی ”اندو سمجھا“ راجہ اندر کی تمایاں حیثیت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ قدیم شخصوں میں اس کا نام ”ماہ میر معروف ہد اندر سمجھا“ ہے۔ اصل نام ماہ میر ہی تھا لیکن امانت کی ”اندو سمجھا“ کی شہرت کی وجہ سے اسے بھی ”اندو سمجھا“ کہا جانے لگا۔ گو امانت کی اندر سمجھا پہلے سے موجود ہے۔

بہر حال یہ بات تو واضح ہے کہ ہداری الال کی ”اندو سمجھا“ تو آج تک درودجہ حاصل نہ ہو سکا جو امانت کی ”اندو سمجھا“ کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے سبیلے سے کم از کم ہداری الال کی اردو کے اردو ادبی ادارے میں ایک جگہ ضرورہ چل رہی ہو جاتی ہے۔

آغا حشر کاشمیری

(۱۸۷۹ء - ۱۹۴۵ء)

ان کا نام آغا محمد شاہ حشر تھا۔ کاشمیری تھے۔ والد کا نام فنی شاہ تھا۔ یہ ۱۸۷۹ء میں ہداری الال کا اب سے اپنے ماموں احسن شاہ عرف ہجر کی کی زوجت پر چار سال آئے۔ انھیں کی چھوٹی صاحبزادی سے ان کا نکاح ہوا۔ فنی شاہ کی دوسری ادا لہ تھا محمد شاہ حشر تھے۔ حشر چار سال بزرگ ہوا۔ ۱۸۷۹ء پیدا ہوئے۔

۱۸۷۹ء میں مولوی محمد مرزا بھٹار نے قاری میں ان کا ذہنی لادیت مرتب کیا۔ یہ اطلاع آغا حشر کی کاشمیری کی ہیں جن کی کتاب ”اتحاف کا حشر کاشمیری“ مترپویش اردو کا دلی نے شائع کی ہے۔

حشر کی ابتدائی تعلیم حافظ عبدالصمد کے مدرسے میں ہوئی۔ جہاں انہوں نے قاری اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ حافظ قرآن ہونا چاہتے تھے لیکن نصف مبالغہ پارہ حفظ کیا۔ ایک زمانے میں وہ شاہی بھی تھکس کرتے تھے۔ جب مدرسے سے فارغ ہوئے تو چھ ماہ ان کے اسکول میں ان کا اعلیٰ ہو گیا اور وہ باضابطہ اردو میں شعر کہنے لگے۔ جب انہوں نے شہر چھکس اختیار کیا۔ ابتدا میں مرزا محمد حسن خان سے اصلاح لی۔ اسی زمانے میں ”آفتاب صحت“ نامی ایک ڈراما لکھا جو ”جو اہر

انکسپر نہیں“ نامی میں شائع ہوا۔ آغا حشر کو ڈرامے سے خصوصی دلچسپی تھی اور وہ اس کی طرف مائل ہو گئے اور وہی لئے نقطہ نظر سلسلہ آگے نہیں بڑھا۔ ارادہ دیکھنے اور لکھنے کے شوق میں وہ کہیں آگئے اور ایک دوست عبد اللہ کے یہاں قیام کیا۔ وہاں ایک جگہ شاعر سے شہرکت کی جہاں ان کا کام بعد پند کیا گیا۔ پھر ان کی ملاقات کاؤس جی پان کی کھڑے سے ہو گئی جو پارسی تھیریلکس کھلی کے مالک تھے۔ آغا حشر کا شہری لکھتے ہیں کہ کاؤس جی پان کی کھڑے سے ان سے چھ اشعار کہنے کی قربان کی تھی چنانچہ حشر نے ”چائے کا کوپ“ کے عنوان سے فی البدیہہ ایک مختصر نظم کہہ دی۔ کھڑے کو سخت حیرت ہوئی اور وہ آغا حشر کی صلاحیتوں کا تعجب ہو گیا۔ نتیجے میں باضابطہ ارادہ لکھاری ان کے حصے میں آگئی۔ بعد میں آغا حشر نے ”پان کی افریہ تھیریلکس کھلی“ اور بہت سی دوسری کتابوں کے لئے ڈرامے لکھے جن میں اکثر بعد کا مبالغہ ہوئے۔ آغا حشر کے ڈراموں کی تفصیل یہ ہے:

(الف) اردو ڈرامے:

- (۱) ”مرید ٹیک“ ۱۸۹۹ء (۲) ”مرا تہیں“ ۱۸۹۹ء (۳) ”سیر حرم“ ۱۹۰۱ء (۴) ”شعبہ“ ۱۹۰۲ء (۵) ”سلید خون“ ۱۹۰۳ء
- (۶) ”صید یوں“ ۱۹۰۴ء (۷) ”غواب سستی“ ۱۹۰۸ء (۸) ”غریب صورت لہا“ ۱۹۰۹ء (۹) ”سلورنگ عرف ٹیک پر یوں“ ۱۹۱۰ء
- (۱۰) ”یہودی کی لڑکی“ ۱۹۱۱ء (۱۱) ”شیر کی گرج“ ۱۹۱۸ء (۱۲) ”تڑکی حور“ ۱۹۲۳ء (۱۳) ”رستم دہر اب“ ۱۹۲۹ء

(ب) ہندی ڈرامے

- (۱) ”بلو سنگھ عرف سور اس“ ۱۹۱۳ء (۲) ”دھرم رتی“ ۱۹۱۹ء (۳) ”ہندو ناری عرف بھارت رتی“ ۱۹۱۹ء
 - (۴) ”تھکرت گرج“ ۱۹۲۰ء (۵) ”پانگن غریب بھارت عرف ہندوستان“ (شروان تدار کپڑا) ۱۹۲۴ء (۶) ”سنسار پکر عرف پینا پکار“ ۱۹۲۴ء (۷) ”تھکرت پینا“ ۱۹۲۳ء (۸) ”آگھ کا ٹیک“ ۱۹۲۳ء (۹) ”پینا پکار“ ۱۹۲۸ء (۱۰) ”غریب کی دیا عرف دھرمی پانک“ ۱۹۲۹ء (۱۱) ”پانک کا ٹیک عرف بھارتی پانک“ ۱۹۳۰ء (۱۲) ”دلی کی پان“ ۱۹۳۱ء
- آغا حشر نے اردو ادب کے بنگالی میں بھی لکھے۔ ان کے کئی ڈراموں کی فلم بھی بنائی گئی۔ مثلاً ”شیرین فریاد“، ”غوریت کا پیار“ اور ”یہودی کی لڑکی“۔

آغا حشر کی بدیہہ گوئی مشہور ہے۔ وہ بہت آسانی سے اور سبزی سے اظہار گلش کر سکتے تھے کہ مقابلہ کرنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ایسے ہی دو واقعات آغا حشر نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں جن کا ذکر طرائف ہے۔ سگی غیر متعلقہ اور بچوں کی طرح آغا حشر بھی اپنی تخلیقات کا کوئی دیکار نہیں رکھتے تھے۔ جدو کہ بے کیان کی انتہائی صلاحیت بھی حدود محدود تھو کہ کبھی اور یہ تمام چیزوں سے بے نیاز رہتا تھا۔ حساب کتاب سے بھی۔ اپنے سرووں کے سلسلے میں بھی اسے غیر متعلقہ تھے کہ کبھی کبھی ان کی باز یافتہ خردان کے لئے مشکل ہو جاتی۔ جمیل لکھتے ہیں کہ:-

”آغا صاحب اپنے ڈراموں اور دیگر تخلیقات کو کبھی احتیاط سے نہیں رکھتے تھے۔ داپے پنے

اور زخموں کے سلسلے میں کوئی باز نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس چشم پوشی اور بے خبری کا نتیجہ یہ تھا کہ جب بھی کوئی مثنوی نوکری پھوڑ کر جاتا تو ذرا سے کا کوئی نہ کوئی مسودہ بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور یہ باز اس وقت فاش ہوتا جب اس مسودے کی تلاش ہوتی تھی۔ چنانچہ مثنوی فرخ امرت سہری جب آغا صاحب کی کتبخی کی ملازمت چھوڑ کر گئے تو ان کی بیاض اپنے ساتھ لے گئے۔ اس بیاض میں فارسی اور اردو کلام کے علاوہ عربی کلام کی دبا میات کا منظوم ترجمہ بھی شامل تھا۔ اس بیاض کی نگہبانی سے آغا صاحب کو انتہائی صدمہ ہوا۔ اس کے بعد انہیں جب بھی ان کی کسی پرانی غزل یا نظم کے اشعار یاد آتے تھے وہ کسی مثنوی کو لکھ دیا کرتے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان کے کلام کا اچھا خاصہ ذخیرہ محفوظ ہو گیا تھا۔ لیکن اس بیاض کے ساتھ بھی بالآخر وہی معاملہ پیش آیا جو اس سے قبل بعض ذرا موں اور پہلی بیاض کے ساتھ پیش آچکا تھا۔

۱۹۳۰ء سے آغا حشر پناہ رہنے لگے۔ اسی دوران کی فلمی ڈرامے بھی تلمبند کئے۔ لاہور میں ”حشر کچن“ کی بنیاد رکھی۔ لیکن جس وقت ”سکھیشم پناہ“ کی شریک بن گئی تھی ان کی صحت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی اور ۲۸ مارچ ۱۹۳۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

آغا حشر ایک ذہن و دل شخص کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت سے انکار نہیں۔ انہوں نے بعض بے حد پراثر ڈرامے لکھے۔ ان کی پڑرائی بھی ہوئی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہیں اردو کا چمکیں نہ کرنا درست نہیں۔ وہ چمکیں اور دوسرے ڈرامہ نگاروں سے متاثر ضرور تھے بلکہ بعض چمکیں کے متاثران کے ڈراموں کے تار و پود بھی بنے ہیں۔ انہیں کسی لحاظ سے بھی وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکا جو انگریزی اور عالمی ادب میں چمکیں کو حاصل ہے۔

آغا حشر اپنے تخلیقی اوصاف کے اعتبار سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً ان کے اردو کالم نگاری کی قوت بیش از بیش تھی۔ ایسے کالموں میں مبالغہ کا انداز ہوتا تھا لیکن ان کے اثر سے انکار نہیں کیا سکتا۔ بعض جیتے جاگتے کردار بھی انہوں نے پیدا کئے لیکن کوئی بھی اچھلا، چمکیں، رنگ، لیر، صفت یا دوسرے ٹچ کے کرداروں کے ہم پل نہ ہو سکا۔ پھر بھی اردو ڈرامہ کو جس طرح انہوں نے ایک معیار تخلیق کی کوشش کی وہ انہیں کا حصہ ہے۔

آغا حشر کو بجا طور پر ایک شاعر بھی سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ڈراموں میں ان کی شاعرانہ بلند آہنگی ملتی ہے۔ بعض نظمیں بھی یادگار ہیں۔ میر ذیل میں صرف ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں تاکہ ان کے یہاں جو شاعرانہ کیف ہے اس کا اندازہ ہو سکے:

کشتائش زندگی کی ارجا طہ جسم و جان تک ہے

یہ سب بھگتہ مفلک ہماری داستان تک ہے

فریستہ رنگ ہو جائیں نہ آنسو سوزشِ تم سے
تراخم گل ہداماں دیوہ بے خرچہ کھان تک ہے
مناوت دل کو دل کی لذت ایذا نہ مٹے دے
کلام کاروانِ شوق اس جنسِ گراں تک ہے
لبو ہو جائے دل گھٹ گھٹ کے پر آنسو نہ لگیں گے
کمرے کا شیلہ و مجبورِ حتم طاقت جہاں تک ہے
رکا ہے دم ، فریب آرزو مرے نہیں دیتا
ہلا دے لب ، قرا چار خیری ایک ہاں تک ہے
بہی آکر لبِ شام پر شعر گرم بنتا ہے
دوسو زندگی جو شعلہ زن دل سے زباں تک ہے
تبی دست اثر ہے شعر تو ہڈیاں نکلیں ہے
کہ لطف آے حشر خلیل و بیان داستان تک ہے

عابد حسین

(۱۸۹۶ء - ۱۹۷۰ء)

عابد حسین کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ ان کی بنیادی حیثیت ڈرامہ نگاری ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر رہے تھے۔ انہوں نے ہمارا گاندھی کی دو کتابیں اردو میں ترجمہ کیں۔ ایک کا نام ”علاش حق“ اور دوسرے کا نام ”ساریخ و غلطہ اسلام“ متعین کیا۔ یہ دونوں ہی کتابیں اہم سمجھی جاتی ہیں۔

ان کے ڈرامے ”پردہ غفلت“ نے کافی شہرت حاصل کی۔ یہ ڈرامہ مصوف نے اس وقت لکھا جب خلافت کی تحریک زور پکڑ چکی تھی اور وہ خود برطانیہ میں تھے۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ دراصل اس ڈرامہ میں ایک خاندان کے احوال رقم کئے گئے ہیں، جس میں معاملہ افراد کے درمیان جانچاؤ کی تقسیم کا ہے لیکن ایسے تمام زم صورت واقعہ کی بحث میں مسلمان معاشرے کے دوسروں و روایات ہیں جو خاندان کی جانچ کا باعث ہیں۔ کچھ کردار تو وہ ہیں جو روایات کے پابند ہیں اور جانچاؤ کی تقسیم کے باب میں جو صورتیں اسلام سے جلی آ رہی ہیں انہیں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن دوسرے

جب بدلیں گی بھی مسلم معاشرے کی اصلاح ممکن ہے۔ دراصل یہ مرکزی تصور ہے جو ذرا سے میں درج کی ہو گی کی طرح ہے۔ ایک اور صورت نوا بھرتی ہے وہ آواز کی نواں ہے جس کے عابد حسین بہت بڑے حمایتی نظر آتے ہیں لیکن ان کے جو بھی نصیب الہین رہے ہوں وہ آج بھی بحث کا موضوع ہیں اور مسلم تاج اپنے موقف سے ہٹائیں گے۔

ان کا ایک اور ڈرامہ "کیا خوب رو کی تھا" ہے۔ اس کی اہمیت پڑرائی ہوئی ہے۔ عابد حسین ایک دانشور تھے۔ انہوں نے جرمن شاعر ٹیٹے کے "لاؤسٹ" کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ بعد قبول بھی ہوا۔

عابد حسین نے یوں تو اردو ڈرامہ نگاری کے باب میں خاصے کام کئے۔ موضوعاتی اعتبار سے تو ان کی پڑرائی کی جاتی ہے لیکن ذرا سے سفین نے جس طرح ترقی کی ہے اس پر ان کی نگاہ کم جاتی ہے۔

عابد حسین کا اسلوب رواں اور نگار ہے۔

ان کا انتقال ۱۹۷۰ء میں ہوا۔

استیاز علی تاج

(۱۹۰۰ء — ۱۹۶۳ء)

سید استیاز علی تاج کے والد کا نام مولوی ممتاز علی تھا۔ سید استیاز علی تاج ۱۹۰۰ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اورنگ زیب کے زمانے میں بخارا سے ہندوستان آیا تھا۔ اسی خاندان کے سید ممتاز علی اور سید ذوالفقار علی تھے۔ ممتاز علی مولوی محمد کاسم خان ترقی کے شاگردوں میں تھے۔ ممتاز علی باضابطہ مصنف تھے۔ ان کی مشہور کتاب "البدیعانی فی القاصد القرآنی" سات جلدوں میں ہے۔ ان کی بیوی محمدی بیگم بھی تھیں۔ انہیں سکھوں سے مولوی ممتاز علی پیدا ہوئے۔ یہ بکروبادی تھے۔ کچھ چاندی اور چھوٹا ان کی تھی۔

تاج کی ابتدائی تعلیم کا حریہ اسکول لاہور میں ہوئی۔ وہیں ہاڈل اسکول، لاہور سے امتحان پاس کیا۔ بی اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس ہوئے۔ ابتدائی عمر ہی میں ادبی رجحان نمایاں ہونے لگا تھا۔ صرف چند سال کی عمر میں اس زمانے کے مشہور رسالے "نگار" ہوا۔ ان کے شاغ ہوتا تھا۔ میں ایک "ضمون شائع کروایا۔ وہ طالب علمی میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "موت کا رنگ" ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لئے ہے۔ انہوں نے ماہنامہ "کھٹکھٹاں" بھی لکھا۔ لیکن ان کا بنیادی رجحان ڈرامے کی طرف تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ڈراما کلب کے کچھ تھے۔ بعض ڈراموں میں اداکاری کی۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں "نارنگی" لکھا اور آغا مشر کو سنایا تو وہ اپنی ان کے باوجود اس کی پڑرائی سے باز آئے۔

یہ ڈرامہ ان کی شہرت کا سبب بھی ہے۔ لیکن وہ ایک زمانے تک آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہے تھے۔

نے ایسے سارے ڈرامے میں جلدوں میں مرتب کئے۔ لیکن اس کی تمام جلدیں شائع نہیں ہوئیں۔ تاج کی موت اچانک ہوئی تھی۔ اس لئے اس کی اشاعت بڑی ہو گئی۔ انہیں عورتوں اور بچوں کے ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ انسا نے بھی لکھتے تھے۔ مزاح بھی تھے۔ انہوں نے *Three men in a boat* سے اکتساب کر کے ایک مزاحیہ کردار بنایا۔ جو چچا چھٹن کے نام سے مشہور ہے۔ اس نام سے کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ چچا چھٹن اردو کے نڈہ کرداروں میں سے ایک ہیں۔

تاج نے کئی مغربی ڈرامے ترجمہ کئے۔ جیسے پیر کے بعض ڈراموں کا سلیس ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ پڑڈشا کا بھی ایک ڈرامہ اردو میں منتقل کیا۔ انہوں نے ڈکٹر ایلیو، ڈاکٹر مالڈ، مائی گرائیٹن پر اور کئی مغربی مصنفوں کی بعض تخلیقات ترجمہ کئے۔

استیاز علی تاج اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کی بیوی بھی ادیبہ تھیں۔ میری مراد چاہ ہے ہے۔ پہلے وہ چاہ اسلیس کے نام سے لکھتی تھیں لیکن بعد میں ان کے انسا نے چاہ استیاز علی کے نام سے شائع ہونے لگے۔

تاج انجمن ترقی ادب، لاہور کے ڈائریکٹر بھی رہے تھے۔ انہی دو مصروف کاری تھیں کہ ۱۸ مارچ کی شب میں وہ نقاب پوش اشخاص نے میاں بیوی دونوں کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ یہ سوانحی اشعار میں نے مالک رام کی کتاب "دیکرہ معاصرین" سے اخذ کئے ہیں۔

عظمت رحمانی لکھتے ہیں کہ مختصر ڈرامہ نگاری کے سلسلے میں میں کو اہم مرتبہ حاصل ہے۔ موصوف نے ان کے چند مغربی ڈراموں کے نام دیے ہیں جو دوسری زبانوں سے اخذ کرتے ہوئے حاصل ہیں۔ مثلاً "قرطبہ کا خلیفہ"، "ہنگوی جورا"، "روہینا"، "خوشی"، "خریم گلب"، "عصر کا قوس کے لئے"، "شیر اور ان"، "اصفیائے شاعر"، "لوکی زبان"، "اصیہ صبا"، "امین سکون"، "ان کے ابا"، "اور" "کرہ نمبر"۔

لیکن ان تمام اسور کے باوجود ان کی شہرت کی بنیاد نیم تاریخی ڈرامہ "نارنگی" ہے۔ کالجوں کے نصاب میں پڑھنے کے باعث اس سے بھی واقف ہیں۔ ایک کثیر کی محبت میں گرفتار ڈرامہ نگار، سلیم اپنے باپ اکبر سے تصادم رہتا ہے۔ لیکن انجام الیہ ہے۔ یہی سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ یہ الیہ کس کا ہے، اکبر کا کہ سلیم کا، اس میں ایک توجہ یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ کثیر انارنگی خود اکبر کے دل میں بھی ہوئی تھی۔ لہذا باپ بیٹے کی تازہ میں یہ عنصر تقبیاتی ہے۔ لیکن میں اسے درست نہیں تصور کرتا۔ سارا معاملہ مغلیہ سلطنت کی آہن بان اور شان کا ہے اور اسے ہی استیاز علی تاج نے فوس کرنا چاہا ہے۔ اس میں اکبر بکثرت بادشاہ جو کرتا رہا تھا وہی اسے کرنا چاہتے تھا۔ محبت اور الفت کے اپنے تعلق ہیں۔ سلیم کی مجبور دی اپنی جگہ پر اور کثیر کے خواب اپنی جگہ پر۔ بہر طور، یہ الیہ پر اثر ہے یا ہے اس پر ہم جلدی ہی سطح کا لیں چسپاں کر گیا۔

استیاز علی تاج کے کرتا۔ یہ پس پشت، چھٹے گھے ہیں جن کی توجہ یہ کی کوشش کرتی جاتے۔

محمد مجیب

(۱۹۰۳ء - ۱۹۸۵ء)

محمد مجیب عباسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے موروثی اعلیٰ ملک ضلعین الدین تھے۔ چودھری ریاض علی کوسوہلی اور کیمیا سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے محمد یوسف اور محمد نسیم۔ محمد نسیم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور ۱۸۹۰ء میں وکالت کی سند لی تھی۔ لایڈ وکیت جرنل بھی ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں پاکستان چلے گئے۔ ان ہی کے قبیلے سے صاحبزادے محمد مجیب ہیں جو ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں گھنٹوں میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی ۱۹۲۹ء میں قصبہ سندیلہ کے ایک ممتاز گھرانے میں ہوئی۔ ان کی تنظیم کا نام آصف الاسلام تھا۔ ان کا اصل وطن بھول گڑھی، ضلع بارہ بکس ہے۔ محمد مجیب نئی تعلیم: جہد ہے۔ سے آراستہ تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم روایتی انداز سے ہوئی۔ اسکے بعد وہ گھنٹوں کے ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں محمد مجیب آکسفورڈ چلے گئے اور تاریخ میں بی اے آؤس کیا اور فرانسیسی اور لاطینی بھی سیکھی۔ پھر ان کا سفر جرمن ہوا۔ یہاں انہوں نے جرمنی سیکھی۔ اس زمانے میں روس انقلاب سے دوچار ہوا تھا۔ انہوں نے روسی ادیبوں کا بطور خاص مطالعہ کیا اور روسی زبان بھی سیکھی۔ ان کے مطالعے میں ناولسٹائی، مینوفوف، دستوویگزرے تھے۔ مجیب صاحب کا جرمن میں قیام تین برس رہا تھا۔ وہاں انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ دیگر تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے جامہ ملیہ اسلامیہ کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس ضمن میں پروفیسر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:-

”ان کے اس ادارہ سے دانشگری کی بھرتی عتہ کم و بیش بیس سال رہی ہے اور پچھلے چوبیس سال سے تو وہ شیخ الاسلام کی حیثیت سے اس کی رہبری اور قیادت کرتے رہے ہیں۔ جامہ سے اپنی ذاتی علیحدگی کے باوجود جس کا ذکر موصوف نے بار بار اپنی تحریروں میں کیا ہے انہوں نے جس لگن اور لگاؤ کے ساتھ خود کو وقف و شمار کیا تھا اس کی نظیر تعلیمی اداروں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ وہ اس ادارہ کی ان بزرگ اور برگزیدہ شخصیتوں میں رہے ہیں جن کے ذکر کے بغیر جامہ کی ہر تاریخ نامکمل اور ہر افسانہ اعتباراً اچھا سے چگانہ رہے گا۔“

یعنی مجیب صاحب کی قیادت میں جامہ کا جو فروغ ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

محمد مجیب کی اردو ادب میں کی جیستیں ہیں۔ انہیں دانشور کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ان کی علمی تصانیف ناقص الفاظ میں ہیں۔ ”لفظ سیاحت“ (۱۹۳۶ء) ایک اہم کتاب ہے، جس کی اہمیت آج بھی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں موصوف نے ”دنیا کی کہانی“ قلمبند کی، جس میں محدثہ نسیم سے دو درجہ تک کی ارتقائی صورتیں ہر وہم کیں۔ کئی کتابیں انگریزی میں لکھیں جن کا تعلق عالمی تاریخ، ہندوستانی مسلمان نیز ہندوستانی موسیقی، اسلامک اثرات سے ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں ترجمہ کیں جن

کی اپنی اہمیت ہے۔ دراصل ان کو دنیا کی کہانی اور عالمی تہذیب و تمدن سے بڑا سروکار نہ تھا بلکہ ”ان کی کتابوں کو سامنے لانے کی محنت کو ششیں کیں۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ”تاریخ تمدن“ ہے جس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

محمد مجیب کو لاسوئوں سے خاص دلچسپی تھی۔ انہوں نے متعدد ڈرامے لکھے۔ مثلاً ”کھیتی“، ”اہجام“، ”خاندان بنگلی“، ”عجب خاتون“، ”بہر و کن کی عشا“، ”آرامش“ اور ”آؤ ڈرامہ کریں“۔ یہ سارے ڈرامے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۷ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔

آرامہ ”کھیتی“ میں راجاؤں کی ضمیر فرشتی کا حال پیش کیا گیا ہے۔ لڑکی جونہی کیا رنگ لاسکتا ہے اس پر توجہ کی گئی ہے۔ اس میں کوئی زمانہ کر دیا نہیں ہے۔ دراصل یہ ایک اصلاحی ڈراما ہے جس میں قوم و ملت کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ ”خاندان بنگلی“ ایک ایسا معاشرتی ڈرامہ ہے جس کا اختتام شیخ سرمد کی سزا کے قتل پر ہوتا ہے۔ اس میں کئی سچے سچے ہیں مثلاً یہ کہ مذہب مستقل اور آزاد قرار دے۔ مذہبی تعصب اور جنوں انسان اور انسانی احترام کی جڑ کا قتل ہے۔ یہ پانچ ایکٹ کا ڈرامہ ہے اور خاصا مقبول ہے۔ ”عجب خاتون“ میں نسیم کے کس سحر میں ان کے صوفیانہ افکار کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مجیب صاحب انسانیت کو آزاد بنانے اور غلامی سے بچانے میں بہت خاتون یعنی مرکزی کردار سے یہ صورت سامنے آتی تھی ہے۔ ”بہر و کن کی عشا“ دراصل مجیب صاحب کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ خاتونیں بھی آرت میں دلچسپی لیں۔ ”دوسری شام“ دو ایکٹ کا ڈرامہ ہے، جس میں خانگی زندگی کی بعض تصویریں ہیں۔ انسانی کیف بھی ہے اور انسانی ذہن کی بہترین کوکھ لے کی کوشش کی گئی ہے۔ ”آرامش“ میں دراصل عوام کے حوصلے سے بحث کی گئی ہے اور بعض صورتوں میں شکست خوردگی کی وجوہات تلاش کی گئی ہیں۔ یہ پانچ ایکٹ کا ڈرامہ ہے۔

محمد مجیب نے بہت سے معیاری مضامین لکھے جن کا مختصر ذہب و معاشرت سے ہے۔ اسلام بطور خاص ذہیر بحث رہا ہے۔ تعلیمی مسائل پر توجہ دی گئی ہے۔

مجیب صاحب نے فن ادب کے بعض مسائل پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔ مجیب صاحب نے شخصیات پر بھی بڑی گیرائی سے لکھا ہے جن میں تہذیبی، معاشرتی نیز سیاسی معاملات در آتے ہیں۔ مجیب صاحب نے روسی ادب پر خصوصی توجہ دی اور روسی ادب کی درجہ میں شائع کیں۔

محمد مجیب کی ایک حقیقت افسانہ نگاری بھی ہے۔ دراصل ان کے افسانے ان ہی موضوعات کو پیش کرتے ہیں جن کے لاسوئوں کا موضوع رہا ہے۔ ان کی بعض کہانیاں جیسے ”کیمیا گر“، ”خاندان“، ”دانی“، ”ناگیا مکان“، ”پاشان“ وغیرہ اہم ہیں۔ ”چراغ رات“ بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔ ان کا افسانہ ”چتر“ تھنک کے اعتبار سے جانا معلوم ہوتا ہے۔

فرض کی پروفیسر محمد مجیب ایک ناظر روزگار شخصیت کا نام ہے جن کی علمی اور ادبی کوششیں یادگار کاروبار کھتی ہیں۔ گوہی چند رنگ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ:-

”مجیب صاحب نے اپنے ادبی کاموں کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے، کہانیاں بھی لکھیں۔“

طرح عجیب صاحب کی شخصیت میں بھی مشرق و مغرب کی اعلیٰ اقدار سمجھ ہو گئیں اور حکمت پسندی اور لبرل ازم کے جوہر نے اس کی ایک نہایت مستحکم شکل اختیار کر لی۔ عجیب صاحب کی شخصیت میں تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ آرتھ اور جمالیات کی ایک تحقیقی رویہ بھی برسرِ عمل ہے اور کارفرما نظر آتی ہے۔ انہوں نے اعلیٰ انسانی اقدار و خوش مذاقی کو ہمیشہ اہمیت دی۔ اپنی سادگی، کوششیں اور اچھا سادہ وقت انہیں کی اصلاح کار و قرار جو مستقل کے خواہوں کو بچ کر دکھانے میں صرف کیا۔

عمر عجیب کی وفات نجی دہلی جامعہ نگر میں ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ء کو ہوئی اور جامعہ طبع اسلام آباد کی دہلی کی قبرستان (قطرہ خاص) میں انہیں رکھے گئے۔

ابراہیم یوسف

(۱۹۳۵ء۔)

ان کا اصل نام محمد ابراہیم خاں ہے۔ اور والد کا نام یوسف خاں۔ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی سائنس اور اردو میں ایم اے کیا اور بی ایچ ای بھی ہوئے۔ ہار سکول کی اسکول میں مدرس رہے پھر پرنسپل ہو گئے اور سکین سے سبکدوش بھی ہوئے۔

ابراہیم یوسف اردو ڈرامے کا ایک قاضی قدر نام ہے۔ انہوں نے متعدد کامیاب ڈرامے لکھے جن کی کوئی پورے ملک میں ہوئی۔ ان کا پہلا ڈراموں کا مجموعہ ”سو کئے درخت“ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا جب سے ان پر نگاہ پڑنے لگی۔ پھر انہوں نے ان کے مجموعے شائع کئے جیسے ”خطرہ دارے“ (۱۹۵۳ء) ”دو نہیں کے آئین“ (۱۹۵۶ء) ”چانچ چھ ڈرامے“ (۱۹۵۸ء) ”ارام سوئی“ (۱۹۸۳ء) خاص ہیں۔ ان کے علاوہ وہ ڈرامے کے جہات پر مستقل کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے خیال میں ”صورتِ عالم گیری“ اردو کا قدیم ترین طبعی زاویہ دار ہے۔ اسے موصوف نے مرحب کے شائع بھی کیا۔ دو ماہی کے ایک ڈراما نگار کرکٹل کے ڈرامے کا ترجمہ ”گمشدہ خط“ کے نام سے کیا اور شائع کیا۔ ایک اہم کوشش مختلف زمانے کے اردو ڈراما نگاروں کی ترتیب بھی ہے اس باب میں انہوں نے حق میں اور موصوفین ڈرامہ نگاروں کو مرحب کر کے دو کتابوں میں شائع کیا۔ آغا حشر پر ایک ایک کتاب مرحب کی۔ ایک اور تاریخی کام دیہ کی دور سے ۱۹۴۷ء تک کے ہندی ڈراموں کا انٹیکا ہے، جس پر موصوف نے نگاہ ڈالی اور شائع کیا۔

ابراہیم یوسف کی ایک اور تحقیقی اور تنقیدی کاوش ”اندراج اور اندر سمجھنا“ ہے۔ یہ کتاب مجدد اہم ہے اور تحقیق و تنقید کی ایک اچھی مثال پیش کرتی ہے۔ انہوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے جس کا عنوان ہے ”آبلہ اور مرنے لیس“۔

ابراہیم یوسف نے اردو ڈرامے کے سلسلے میں جو کام کئے ہیں وہ سب کے سب اہم ہیں۔ اس لحاظ سے

اخلاق اثر

(۱۹۳۷ء۔)

ان کا اصل نام سیدہ اخلاق حسین ہے۔ ان کے والد حاجی سید صفیق حسین تھے۔ اثر ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے اردو انگریزی میں کیا۔ پھر بی ایچ ڈی کی ڈگری بھی لی اور دوسرا اثر دہلی سے دیا ہے ہو گئے۔

اخلاق اثر جمادی طوری ڈرامے سے شغف رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مثلاً ریڈیو ڈرامے کی تاریخ (۱۹۵۵ء) اردو ڈرامے کا مطالعہ (۱۹۵۷ء) ریڈیو ڈرامے کی اخلاف (۱۹۸۰ء) اور نظریات اور آلہ اشعار ریڈیو (۱۹۸۳ء) ان کے علاوہ اردو کی پہلی کتاب (۱۹۵۶ء) ”کامیاب اختتام“ (۱۹۵۶ء) ملاقات (۱۹۸۹ء) اقبال ڈرامے (۱۹۸۱ء) اور اقبال اور ممنون (۱۹۸۶ء) لیکن جیسا میں نے کہا کہ ان کی اصلی جہان نگاہ ڈراما ہی ہے اور اس میں بھی ریڈیو ڈرامے سے۔ انہوں نے اس شغف پر بڑی عرق سوزی سے کام کیا اور ان کے خدوخال متعین کئے۔ ان کے مطالعات میں ان کتابوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ریڈیو ڈرامے کی تاریخ کے ضمن میں ان کی مجموعی بیانی ہوئی روشنی رہنما ثابت ہوئی رہی ہے اور اس کی وقعت کا اعتراف ان کو ہے جو ریڈیو ڈراموں سے شغف رکھتے ہیں۔

محسوس ہوتا ہے کہ اخلاق اثر اقبال سے خاصے متاثر ہیں۔ اقبال پر ان کی دو کتابیں ہیں تو مطالعہ اقبال میں بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھیں پھر بھی ان کی دینی و انسانی کا حال روشن کرتی ہیں۔

اثر کا اہم تعلیم سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ اس باب میں بھی ان کی کارکردگی نمایاں رہی ہے۔



انیسویں اور بیسویں صدی میں طنز و مزاح

درج علی بیگ سرور

(۱۷۸۶ء تا ۱۸۷۱ء)

مرزا درج علی بیگ سرور اردو کے ایک ممتاز شاعر، نثر نگار، اسکالر، پروفیسر اور استادانِ کمال اور شاہِ عمر کی شخصیت سے معروف ہیں۔ ان کے والد کا نام مرزا امیر علی بیگ تھا چاہتا ہے۔ کیا چاہتا ہے کہ سرور خوش فہمی میں، حاقی تھے اور انھیں سوسائٹی میں بھی کمال حاصل تھا۔ شاعری میں محمد آغا نواز علی حسینی کے شاگرد تھے۔

درج علی بیگ کے سال پیدائش کے سلسلے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے کوئی معتبر شہادت ایسی نہیں ہے، تاہم بعد کر کے قبول کر لیا جائے لیکن تیر مسعود نے بعض حوالوں سے ان کا سال ولادت ۱۷۸۶ء مقرر کیا ہے۔ اسی تاریخ کو رشید حسن خاں بھی تسلیم کرتے ہیں ایک اندازے کے مطابق ان کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ ۸۵ برس کے تھے۔ حکیم مظہر حسن کوڑوی نے ان کا سال ولادت ۱۲۸۵ھ یعنی ۱۸۷۱ء مقرر کیا ہے۔ درج علی بیگ سرور کے متعلق وطن کے بارے میں بھی اختلاف رائے ہے۔ تیر مسعود اور رشید حسن خاں کے علاوہ کئی دوسرے محققین انھیں کھٹو کا پورا کرتے ہیں۔ نور درج علی بیگ سرور بھی اپنا وطن کھٹو ہی بتاتے ہیں لیکن حنیف نقوی نے استدلال کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کھٹو کے نہیں بلکہ کانپور کے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے جنس تہ کرہ نگاروں کی تحریر سے استفادہ کیا ہے جو اسی زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی غلام محمد الدین عسکری، جلال میر علی اور خیراتی لال پٹیل۔ خوب چند ذکاوتی اور گارساں دہاکی نے بھی ان کا وطن کانپور پر بتایا ہے۔ انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ ڈاکٹر تیر مسعود جلال اور پٹیل بھارتیہ کا کے بیانات سے باخبر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے گارساں دہاکی کے بیان کو رد کر دیا ہے کہ وہ کانپور کے تھے۔ حنیف نقوی نے تینوں تہ کرہ نگاروں کے بیانات اور سرور کے اہل خاندان کے کانپور کے مستقل قیام کے پیش نظر از سر نو فکر کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ میر احیال ہے کہ نقوی کا استدلال کافی دہلی ہے اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر اکتفا تو یہ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کی دلیل کو تسلیم کرتے ہوئے سمجھتا ہوں کہ درج علی بیگ سرور کا وطن کھٹو نہیں بلکہ کانپور ہی تھا۔ میں یہاں نقوی ہی کے حوالے سے آجھ دوسرے امور بھی پیش کر رہا ہوں جن میں اختلاف نہ ہوا ہے سامنے آئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کانپور میں اپنے والد علی حکیم سید اسد علی کی ترغیب پر انہوں نے "قائدِ کاب" تصنیف کی جو از زبان کی عزت و شہرت و تارکا کا باعث ہے۔

سرور نصیر الدین حیدر کی شخصیت کے بعد دوبارہ کھٹو آئے اور ۱۸۵۶ء تک مقیم رہے۔ جب کہ "قائدِ کاب" ۱۸۲۳ء میں میر حسن رضوی کے مطبع کھٹو سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی ادبیاتِ قورانی تسلیم کی گئی اور ان کے چھپنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی اس حد تک کہ کم وقت میں اس کے پانچ ایڈیشن سامنے آئے اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں جس کا اندازہ پانچویں ایڈیشن لگا بھی مشکل ہے۔

جب وادھلی شاہ تختہ نشین ہوئے تو سرور کی مالی حالت بہتر ہو گئی۔ انہیں کی ایمان انہوں نے مکمل ایک جگہ جینی کے "شاہنامہ فردوسی" کے نقل سے "اششیر خرابی" کا اردو میں ترجمہ کیا اور نام "سرور سلاطانی" رکھا۔

سرور کے ایک کم فرما دیکھی اچھلی خاں بلوچ تھے، ان کی نگاہ و کم موصوفہ پر رہتی تھی۔ انہیں کی فرمائش پر سرور نے "نہر چند مہر" کی ایک داستان "نور آئین ہند" کو اپنے امداد میں خریدا اور "شکوہ محبت" نام رکھا۔ یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ان پر نظر کرم کرنے والوں میں مفتی شیخ نارائن بھیروی بھی تھے۔ ان کی ایمان پر جب علی بیگ سرور نے "الف لیلیٰ" کی کہانیوں کو مختصر کیا اور مفتی زبان میں اسے لکھنا شروع کیا لیکن کئی طرح کا قتل پیدا ہو جہاں اور اس کی تکمیل میں ۲۳ سال کا وقت سامنے آیا۔ اس کے بعد ہی اس کی اشاعت ہو گئی۔ لیکن انہوں نے اس کے حق و اشاعت کو مولوی محمد یعقوب انصاری کے نام منتقل کر دیا۔ پھر یہ کتاب چار جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کا نام "شینان سرور" رکھا گیا۔ یہ نام پتا رہ گیا ہے۔

اب وہ زبان تھا جب انگریز بہادر نے اوہ کے قلم کو اپنے قلم قدرت میں کر لیا تھا۔ تب سرور عارضی طور پر بنارس میں تھے اور انہیں کھنکھ کی بد حالی کی خبر سننے پر بے انتہائی غم ہوئے اور اپنی آنکھوں سے وہ تماشا دیکھا کہ کس طرح انگریزوں نے اپنی دسترس میں ہر شے کو لے رکھا تھا۔ وادھلی شاہ کلکتے میں نظر بند کئے جا چکے تھے۔ سرور کی تہمت تھی کہ وہ کسی طرح وادھلی شاہ سے ملاقات کرتے۔ لیکن فی الحال اس کی کوئی صورت سامنے نہ تھی۔ مگر اب یہ شہر کھنکھ و شہر نہیں تھا جہاں ولدھی کے سارے سامان موجود تھے۔ اب وادھلی اور گھبراہٹ والی جگہ ہو گئی تھی ایسے ہی موقع پر مہاراجہ انشوری پر سادہ نارائن سنگھ نے انہیں بنارس بلا لیا۔ یہ واقعہ ۱۸۵۹ء جولائی کا ہے۔

بنارس میں سرور وادھلی فعال رہے لیکن انہوں نے بڑی عرق ریزی سے محمد یعقوب انصاری کی فرمائش پر "نشان عجائب" پر نظر ڈالی کی۔ اس شخص میں فتویٰ لکھتے ہیں:-

"مولوی محمد یعقوب انصاری کے حسب فرمائش اس زمانے میں انہوں نے کم از کم دو بار از حد عرق ریزی کے ساتھ نشان عجائب پر نظر ڈالی کی اور جہاں جہاں ممکن ہو انہوں نے بیان تازہ کی چنگ سے اس کی روایت میں اضافہ کیا۔ اس سلسلے کا ایک ایڈیشن ۱۲ ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء) تک جولائی ۱۸۶۰ء کو مطبع افضل المطابع مموی کا پیر سے ۱۸ روپے ۲۷۰ درمیان ۲۸۰ (۱۹ مارچ ۱۸۶۳ء) کو مطبع افضل المطابع مموی کے پیر سے چھپ کر شائع ہوا۔ یہ دوسرا ایڈیشن اس اعتبار سے مجدد اہم ہے کہ یہ مصنف کا تصحیح و ترجمہ کیا ہوا آخری نسخہ ہے اور مفتی نوالی شہر نے سرور سے نشان عجائب کا حق اشاعت خرید لینے کے بعد ۱۲۸۳ھ-۱۸۶۷ء میں اس کا نو پہلا دیوہ دہب اور مصور ایڈیشن شائع کیا تھا وہ اسی نسخے پر مبنی تھا۔"

قیام بنارس کے دوران ہی "شینان سرور" اور "نشان عجائب" تین گھنٹہ در "سائنس آف" "گلزار سرور" "نور آئین ہند" "نشان عجائب" "شینان سرور" اور "نشان عجائب" کا ترجمہ کیا ہے اور علامہ رضی شریف کی کی ہے۔ فتویٰ نے پیر مسعود کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ "سرور سلاطانی" میں "ششیر خرابی" کی سادہ اور سہل زبان کو مشکل اور تکلیف دہ بنانے کا عمل مانتا ہے تو "گلزار سرور" میں "عدائت العثمانی" کی ترجمانی کو مثلاً سادہ اور صاف اردو میں لکھا ہے۔ لکھنؤ کی یادگار "شہر و عشق" بھی ہے ہر ایک مختصر سے قصہ پر مبنی ہے۔ لیکن چند جگہ اسے غنائی حلقے کا بھی کہتے ہیں اور اسے سنے کا بھی۔

سرور کو ایک شاعر کی حیثیت بھی حاصل ہے لیکن ان کا زبان ان اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ کاپے اور جو بھی اشعار سامنے آئے ہیں وہ "نشان عجائب" ہی میں ہیں۔ محمد یحییٰ چٹائی نے اس کا احساس دلایا ہے کہ سرور نے کوئی دیوان مرثیہ کیا ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ غلابہ مہر الملوک عشرت کے پاس ان کا ایک غیر مرثیہ دیوان موجود تھا۔ ویسے بتائے "طبقات سخن" میں ان کے ۱۲۳ اشعار اور ایک دہائی نقل کی ہے۔ بہر حال، ان کی شاعری کا حال اب بھی رہا ہوا ان کی ساری عظمت کا دار و مدار شعر نگاری ہے اور ان کی شعر نگاری میں "نشان عجائب" کی منظر کو بر لحاظ سے اعتبار حاصل ہے۔ ۱۸۶۳ء کا زمانہ جب علی بیگ سرور کے لئے خاصہ ہنگامہ انگیز ثابت ہوا، اس لئے کہ اس سال انہیں ہفتہ چھوڑنا پڑا۔ ایک ہفتہ پہلے ہائی جاتی ہے کہ انہیں قادیان میں حیدر نے جلاوطن کیا تھا اور دوسری یہ کہ وہ ایک قس کے قلعے میں لٹے تھے۔ لہذا انہوں نے گرفتاری کے خوف سے کانپور میں پناہ لی۔ لیکن وہاں ان کا وقت اچھا نہ گزرا اور کھنکھ کی عظمت ان کے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ وہ جون و دہشت کے بھی شکار ہوئے لیکن عجیب بات ہے کہ انہوں نے ایسے ہی زمانے میں "نشان عجائب" لکھی۔

۱۸۶۳ء میں "نشان عجائب" کا پہلا مثنوی مرثیہ ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "نشان عجائب" کا قصہ سرور کے یہاں کس طرح پیدا ہوا اس باب میں سرور نے خود لکھا ہے:-

"حسب اتفاق ایک روز چند دوست صادق صحبت موافق باہم بیٹھے تھے مگر تیرگی زمانہ تباہ اور کج روی ملک۔ ظلم پر در و دراز تو لا رہا تھا۔ شاعر سے سب بادل تری و زاری اور غم اندر وایاں سے اور کھڑے حرمان و افکار سے کہ ہر دم بہ پاس تھے۔ دل گرنتہ، ہوش و ادراک اس تھے، یہ ذکر بہ زبان آیا کہ شعبہ بازی جو رخ چہری بلی قام از زہن آدم علیہ السلام تائیں ہم یوں ہی چلی آئی ہے۔ اور تفریق پر واری و رنج و غم سے حواء زاد رہتی ہے۔ چاہتی اس حکام کی کہ کوئی ادائی ہے۔ اب یہی غیبت چاہئے، اس کا احسان مانے کہ ہم اس دم کا ہم تو بیٹھے ہیں۔ استار:

جو ہم تم پاس بیٹھے ہیں، استار، یہ دم غیبت ہے
یہ سنتہ بلا رہ جائے تو کیا کم غیبت ہے

کام آئے، چاہے نظر نہیں آکر ملدی نہ کرنا، بہت فرصت نکھول گا۔ وہ تو یا رشتہ طرہ ہر خاطر
خوش قبول کیا۔"

لیکن صورت حال جو بھی ہو "نسانہ عجائب" کی تھلیف کے وقت سرور کے غشی نظر دوسری کتابوں کے علاوہ
"ہفتش نو بیاد"، "بہار افشا"، "پہلویت"، اور "دستان امیر حمزہ" طرہ تھی۔ "ادبکرم" بیان چند کے قول کے مطابق "نسانہ
عجائب" کے واقعات میں تبدیلی کا قب کے سوا کوئی ایسا خیال نہیں جو فرمودہ لکھوں سے ممتاز ہو۔ اور اگر کتب کی تعداد تو اسے
"بہار افشا" کا چرچہ پہنچے ہیں۔ عزیز احمد بھی اس کا مانعہ "پہلویت" "پہلویت" "پہلویت" ہیں۔ لیکن "نسانہ عجائب" اپنے طور اور
طرہ تھی میں ایک ایسی داستان ہے جو تھلے سرور کے اسالیب کو الگ الگ پچھانے میں مدد دیتی ہے، کسی کی کیا اہمیت ہے
ابھی اس پر بحث مطلوب نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ مادہ اسلوب عجائب رباب، خود "نسانہ عجائب" میں دو اسالیب کی کار فرمائی
نظر آتی ہے ایک تو وہ جوانی و چہرہ کی گراں باری اور اوقی الفاظ کی کھنٹی کی وجہ سے قارئین کے سر پر جو حسن جاتی ہے تو
دوسری طرف کچھ سلیس اور ماحولہ زبان کا بھی استعمال پانچ پر نظر آتا ہے جہاں سلیس زبان استعمال کی گئی ہے وہاں قلمی ملاحظہ
ہوگئی ہے اور ڈالیدہ اسلوب کی کار فرمائی جو در صریح کرتی ہے اس کا استدلال ہو جاتا ہے۔

ایسا کہیں ہے کہ اس میں دو طرح کے اسالیب پائے جاتے ہیں۔ ایک جیوہ حال نظر آتی ہے کہ ہر امن نے
"باغ و بہار" میں جو جوت چگائی تھی اور سرور کے ذہن و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سے وہ تھلے کی بہت کوشش کرتے
لیکن اس کے اثرات کہیں کہیں پان کے اندر چلنے سے نکل کر ایک نظری صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میرامن اور "قصہ چہار
درہ تین" "تین" "پانچ و بہار" کے بارے میں ان کا یہ بیان خردان کے اثرات کی پہلی نگاہ ہے۔

"صیبا میرامن صاحب نے "قصہ چہار درہ تین" کا "باغ و بہار" نام کر کے خاندان کیا ہے کھیل
چاہا ہے کہ ہم لوگوں کے دامن حصے میں یہ زبان آتی ہے۔ مگر بہ نسبت سوانح اول ملا مصیبن
خال کے سوجھ بوجھ کی کوئی ہے۔ لکھا تو یہ ہے کہ ہم دلی کے روڑے ہیں، ہر گھاروں کے ہاتھ
پاؤں تو نہ ہیں۔ مگر پانچ میں ایسی کچھ پہلی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ صفت میں ایک
نام بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو کوئی کب سزاوار ہے، کائنات کو یہ وہ کوئی سے انکار بلکہ نگہ دہار
ہے۔ لکھتے آشت کہ خود یو بد کہ عطار گویا یہ وہی مثل شے میں آئی کہ اپنے مدد معافائی۔
لیکن تحریر اس کی اطلاع تقریر ہے۔ قصہ چہار پب ہے بے نظیر ہے۔"

اب اس سے اندازہ لگایا مشکل نہیں ہے کہ سرور میرامن کی "باغ و بہار" کے دو میں "نسانہ عجائب" لکھ رہے
ہیں اور اس طرح مذاق اڑانے کی کوئی وجہ کچھ میں نہیں آتی۔ یہ کام تو وہ خاموشی سے بھی کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایک قصہ
سلیس زبان میں لکھنے کا دعویٰ اپنے دوستوں سے کیا تھا۔ لیکن ملاحظہ اور دانی پس پشت چلی گئی کیونکہ میرامن کی سزا سنا سے

دلی کھل جاتا ہے اور صحبت غیر جنس میں سخت سلطنت، جگت تاوت سے ہر جو کے کانے کھاتا
ہے۔ سہی:

پانی در زنجیر پیش درختاں

بہ کہ باہگ نگاں در بوختاں

لیکن زمانے کی عادت یہی ہے کہ باوجود کثرت غم و شدت اندوہ و الم وہ شخص یا ہم نہیں دیکھے
سکتا۔ مرزا:

پھٹکے ہے چھینچ چرخ، چاک کے سنگ فقرتہ

بیتہ کر ایک دم گھٹیں، دوریں جو ہم کلام در

جب سلسلہ سخن یہاں تک پہنچا، اس سرے میں ایک آفتابے ہمزہ بندے کے تھے، انہوں
نے فرمایا اس وقت تو کوئی قصہ یا کہانی یا شیریں زبانی ایسی بیان کر کے دفع کو دوت اور
جمعیت پریشانی طبعیت ہو اور غنچہ سرست دلی جو موسم حوادث سے متصل ہے، بہ استہوار ازیم نظم
کھل جائے ہر ماں بر دارے، جز اقرا و انکار، مناسب نہ چاہا، چند کلمے گوش گزار کئے، مگر چہ
گر بہ کردن، راہم دلی خوشی یا بدی، مگر اس نظر سے مصرع:

ہر چہ از دوست میر سود، نیکوست

وہ باتیں انہیں بہت پسند آئیں، کہا: اگر یہ دل بھی تمام تو اس پر گنہ و فقر کو، اور آواز تا انہام،
قصے کے طور پر زبان اردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت منظور نظر اہل عصر ہو، لیکن مختصر
معاف ہو، الوقت سے صاف ہو۔ بندے نے کہا، طبعیت انا کے روزگار پیش تر متوجہ صوبہ
جونی اور پیش ہے۔ قبول لکھیا:

جج کے دیکھنے واسلے تو بہت ہیں، لکھیا:

اور یہاں حسن شامان ظن، تھوڑے ہیں

وہ بولے: پشاور آشت صلہ طلب اجرت کسی سے متصور نہیں، فقط جاری خوشی مد نظر رکھ، جیسا
رطب دیا پس کہے گا، ہمیں پسند ہے، اگر طریقہ جو روزمرہ اور خوشگوار کی تہداری ہے، یہی ہو۔

”جس احوال و گواہی کو سامنے رکھ کر انجم پانچوری نے جھوٹے گواہی دے کر کے اور مزاح و طعنت سے نکلنے کے لئے لکھا ہے وہ خاص کر دو متضاد مقامات سے مرکب ہے۔ ایک طرف مغربی تہذیب و تمدن کے شرقی اقتدار پر حملہ آور ہو کر سماج کے قوانین کو برہم کر رہی تھی جس سے چند معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے تھے دوسری طرف مغربی سیاست کے خلاف قومی تحریک آزادی کے قدم بڑھ رہے تھے مگر اس تحریک کے جلو میں کچھ ناگوار باتیں بھی ابھر رہی تھیں۔ خاص کر لیڈروں کی بیعت اور ان کے ذاتی کردار کی بدنامی گہری لگا کر رکھنے والے وطن دوستوں کو چھوڑ کر تھک رہی تھی۔ اس عجیب و غریب تضاد نے جہاں عام لوگوں کو الجھن میں ڈال دیا وہیں لوکاروں، قاضی کر جھوٹکاروں کو موقع دیا کہ شیعری کو ٹھٹھکے والی ہر چیز پر حیر و حیر چلا دیں اور سامراجیوں اور قوم پرستوں دونوں کی بدحواسیوں سے لطف بھی لیں اور ان کی داخلی حیات کو بھیجیں بھی۔ ان کی دشمنی کچھ لوگوں نے کسی کا کچھ مرقہ نہیں اٹھا کر کس مل بھیرے بہرہ چنے انہوں نے اسلئے کر کے اور انہیں ہمام کی لگاہ میں مٹھا کر خیر بخار دیا۔“

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ جلیل مقہری جیسے بلند روز نگار نے انجم پانچوری کو بہادر چھوڑ دیا کہ معمار کہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ طغیان کی دوسری جلد پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس کا اظہار کیا ہے کہ بہت کم ایسے صفحات ہیں جو ایسے پیچھے ہوئے فکروں سے خالی ہوں جنہوں نے میری نظروں کو اسٹارے مطالعہ میں یکجہر کے لئے اظہار کیا ہو۔

”کرشمہ دامن دل کی کھل کر جا ایما پاس“

میں سید احمد قادری کا پاس گزارا ہوں کہ انہوں نے معمار اور ادب کے طور پر ”انجم پانچوری“ کا ذکر کیا۔ تک ”بھٹی کتاب مرتب کردی ہے۔ ویسے ساہتہ کا دلی ادبی نے بھی ان پر ایک موثر گراف شائع کیا ہے اور گئی پناہ انڈیا کے مقالات، سہرہ رقم کئے گئے ہیں لیکن اب بھی اس کی ضرورت باقی ہے کہ انجم پانچوری کی حقیقی شناخت کے لئے ان پر ایک بھرپور تحقیقی کتاب شائع ہو۔ یہ کام ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انجم پانچوری کی جگہ اور بظہر و مزاح کی ادبیات میں محفوظ ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۳ء — ۱۹۳۷ء)

اصل نام مرزا فرحت اللہ بیگ اور پہلی تعلیمی نام بھی ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸۸۳ء میں دلی کے ایک محلہ چوڑو والاں میں ہوئی۔ ویسے ”بادشاہ فرحت“ میں غلام یزدانی نے ان کا سال ولادت ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۴ء دونوں ہی لکھ دیا ہے۔

ہے۔ ان کے اسلاف شاہ عالم بانی کے عہد میں ترکستان سے ہندوستان آئے۔ مرزا نے اپنا تجربہ اپنے مضامین کی جلد چہارم میں درج کر دیا ہے۔

فرحت اللہ بیگ کے والد کا نام مرزا شمس اللہ بیگ تھا اور دامرزا عبداللہ بیگ، والدہ شرف بیگم اور بانی انجمن آراجمک یہ خوب نامان الدین کی بیٹی تھیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ بھی کس نے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی پرورش ان کی پھوپھی حسن جہاں بیگم نے کی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ابتدائی تعلیم گھری پر ہوئی۔ پھر چھپے کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد وہ کشمیری دروازے والے مدرسے کے طالب علم ہو گئے۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے ہندو کالج میں داخلہ لیا۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے پیدا ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں سندھ ایلغزو میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۵ء میں بی اے پاس کیا۔ اسی کالج سے موصوف اکبر اے بھی کر رہے تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے والد بعد لا الہی قسم کے انسان تھے۔ اپنے آپ میں کمن سیر و تفریح کرتے والے۔ ”بادشاہ فرحت“ میں ہے کہ انہوں نے نذر احمد سے ایک بار کچھ دوپے خرچ کر لیا تھا جو ایک نذر احمد نے کالی سود طلب کیا تھا۔ میں یہ کام نہ ہو سکا۔ نتیجے میں مرزا فرحت اللہ کو ملازمت کرنی پڑی اور وہ اس فرض سے حیر و آوارہ گئے اور ساری زندگی میں اس سے۔ ویسے ان کا آقا جانا دلی میں ہوتا رہا۔ دلی چھری سے دل رہی تھی جس کا انہیں شدید احساس تھا۔ اسی حسیلی میں انہوں نے ایک ”مضمون“ لکھی دلی ”رقم کیا جس سے ان کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ حیدر آباد اسکول میں وہ بیٹے ماسٹر ہو گئے لیکن بعد میں پیشہ بدل گیا اور بخشن جج کے عہدے تک پہنچے۔ اس حیثیت سے وہ گھر گھر میں رہے۔ یہاں ان کی طبیعت اور مزاج میں تبدیلی ہوئی اور ان پر مذہبی رنگ چڑھ گیا۔

اپنی عمر کے ۶۳ سال انہوں نے دلی اور حیدر آباد میں گزارے۔ ۱۹۳۷ء دلی اور ۳۹ سال حیدر آباد میں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصانیف میں سات مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور نگارشات بھی ہیں۔ ان کے سارے مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ لیکن ان کے انتقال کے تین سال بعد ان کی ایک اور کتاب ”میری داستان“ شائع ہوئی۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر آباد میں وہ خوشی نہیں رہے بلکہ ایک طرح سے قید و بند کی زندگی گزار رہے۔

بیگ کی مضمون نگاری در سالہ ”نمائش“ کے ساتھ ہوئی جس کا اجرا ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ لیکن اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ”نمائش“ سے پہلے ”ہم اور ہمارا استقام“ در سالہ ”اقاری“ میں ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے یوں تو اکثر مضامین ہم سمجھے جاسکتے ہیں لیکن ان کے تین مضامین ان کی شہرت کا سبب ہیں۔ ”نذر احمد کی کہانی“، ”کچھ میری کچھ ان کی زبانی“، ”دلی کا ایک مشاعرہ“ اور ”بھولے والوں کی میز“۔ یہ تینوں

مضامین اکثر پندرہ ریڈیوں کے خباب میں شامل ہیں۔ لیکن ان کا مرکز کارا مضمون خدو امجد ہی ہے۔ جس کی اشاعت کے بعد ان کی اہمیت بخیریت مضمون نگار کافی بڑھ گئی اور ہر طرف سے چہ رانی ہونے لگی۔ اس کی اشاعت چھٹی مارچ ۱۹۴۷ء کے جوائے ۱۹۴۷ء کے شمارے میں ہوئی تھی۔

ایک عراج نگار کی حیثیت سے مرزا غفر حجت اللہ مجیک کی ایک خاص اہمیت ہے۔ غفرانیت کے باب میں ان کا خیال تھا کہ خوشنظمی اور بدانت کا احساس ایسی تحریر میں ہو چاہئے جسے غفرانیت نگاری سے منسوب کیا جائے۔ اس ضمن میں اسلم بیرونہ لکھتے ہیں:-

۱۱ مرزا فرحت اللہ بیگ کی بہت سی تحریروں کی انکی ہیں، جس میں انہوں نے خوش طبعی اور دبانے کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً: ”اگلے مضامین“ ”نذر برادر کی کہانی“ ”کل کل“ ”گھوڑا اور ایک خواب“ ”حاجب کی ڈائری“ ”پھر دوسری بات“ انہوں نے یہ لکھی ہے کہ ہماری جماعتیں، دلچسپ اور محبوب و دلکش طریقے سے بنائے جائیں اور پھر سے یہ کہ سیاسی، سماجی اور تکنیکی اصلاح دلچسپ طریقے سے کی جائے۔ جہاں تک سیاسی، سماجی اور تکنیکی اصلاح کا تعلق ہے اس معاملے میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے غور و فکر سے مزید کام نہیں لیا۔ انہوں نے یقیناً اصلاحی مضامین بھی لکھے ہیں جیسے ”کشمکش کی شادی“ ”انجمن اصلاح حال بد مضامین“ ”لکھنؤ بیان“ کے تنبیہ مضامین ہیں۔“

مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکے بھی دلچسپی سے پڑھتے جاتے ہیں۔ انہوں نے نذر راہرہ حضرت اللہ خاص، وحید اللہ بن سلیم پر خاکے لکھے ہیں۔ ان خاکوں میں متعلقہ افراد کے ادبی کارناموں کو کثرت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کو نکال کر ذکر کرنے کی سعی ملتی ہے۔ اس عمل میں یہ خاکے بیحد اہم مظلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بعض خاکے کہ تمام غصہ خیزوں پر لکھی گئی ہیں جیسے ثانی چندریار، دہرہ بوجھان خرو۔ انہوں نے بعض ایسے مضامین بھی قلمبند کئے جو اسلامی قسم کے ہیں۔

بعضوں نے انھیں محض بھی کہا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں تحقیق کے اصول و ضوابط کا کوئی پاس نہیں ہے۔ دراصل وہ ماضی کی رو بہ غلطیوں کے کچھ حقائق تلاش کرنا چاہتے تھے۔ اس سے قیادہ رو بہ کچھ نہیں۔ اس ضمن میں ان کے مضامین "تخلیج المان"، "تسکیم آغا جان پیش"، "انقلاب اور انقلابی اکبر آبادی" و کچھ جیسے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا اسلوب گفتگو محکمہ نہیں۔ وہ اپنی تحریر کو بوجھل نہیں بناتے، نہ خواہ مخواہ ایسی ادبی روش اختیار کرتے ہیں جسے عاقل علم کا جواز نہ ہو۔ معمولی اعتبار سے ان کی تحریروں میں دلکاشی پائی جاتی ہے اور وہ ان کی نگارشی زبان پر فطری طور پر ان کی فکر و دقت کا اعتبار رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے ان کے وقت کے ادیبوں کے خد کا کمال نمایاں ہو جاتا ہے۔

۱) خود اپنے اسلوب کے مطابق ہر مسئلے میں نقصان نہ آجائے۔

”خدا معلوم ہمارے یہاں کے مولویوں کی یہ کیا ڈیڑھت ہے کہ جب باقی کر دیں گے تو ضرورت اور بے ضرورت عربی کے مولے مولے الفاظ ٹھونس دیں گے۔ کھینے پھینسے گے تو پجاری اردو کو عربی کا دوجامہ پہنا دیں گے کہ اس کے کھینے کے لئے ہر ایک مطر میں ایک دو دفعہ قاسم دیکھنے کی غیبت آئے۔ بچوں کا نام رکھیں گے تو ایسا کہ جو کر چا کر تو کیا خاصے پڑھے لکھوں کی زبان سے اس کا انا ہونا مشکل ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے نہیں جگیا کہ کام کائنات کے لئے نگر والے اس نام کو بگاڑ دیتے ہیں، چنانچہ جو کھینے مولوی ملکوں اعلیٰ صاحب کا نام پیکر کر ملکویاں ہو اور ان کے صاحبزادے صنعت اعلیٰ صاحب کے نام نے گویاں کی شکل اختیار کی اور اس نام نے دو در و پیکر اکچھوٹے بڑے در و ست احباب انوکھا کرنا اپنے برائے سب ان کو گویاں کی جگہ تھی اور یہ عجیب و غریب نام سننے اور دیکھنا ہوتا ہے۔“ ۱۱

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ عجمک نے جو اسلوب اختیار کیا تھا اس کی وجہ کیا تھی۔ مرزا فرحت اللہ عجمک کا انتقال دہلی کی حرکت ہند ہو جانے کے چھ ماہ پہلے ۱۹۴۷ء کو ہوا۔

رشید احمد رشیدی

(1944—1947)

رشید احمد صدیقی نقیب مرایا ہونے لگا جو بنجر میں پیدا ہوئے۔ حضرت سید ذکریا رشید صاحب کے جد اعلیٰ تھے اور سترہویں صدی عیسوی میں تعلقہ دین کی غرض سے ترک سے آئے تھے۔ پہلے پنجاب میں قیام کیا۔ پھر جو پورہ آ گئے اور مرایا میں مستقل سکونت اختیار کی ان کی اولاد میں بیشتر فوجی تھے۔ یہی رشید صاحب کے اسلاف میں تھے۔ ان کے والد کا نام عبدالقدیر تھا۔ یہ بھی پولس کے محکمہ سے وابستہ تھے اور ایک عرصے تک ملایا اور غازی پور میں رہے۔ عبدالقدیر کی جنگی اور با اختیاری مشہور تھی۔ صوبہ صلاوا کے پابند رہے تھے اور مولانا فضل الرحمن شیخ مراد آبادی کے مرید تھے۔ عبدالقدیر کی شادی سیدہ باسملی کی صاحبزادی چھکالہ بلی سے ہوئی تھی۔ ان سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ رشید احمد صدیقی چوتھی اولاد تھے۔ عبدالقدیر جب بچہ یا ضلع بلگرام میں تھے تو وہیں رشید احمد صدیقی پیدا ہوئے۔ بچپن میں سیدہ خدیجہ اور کنوڑہ تھے۔ مختلف امراض کے شکار رہے۔ اسی وجہ سے وقت پر تعلیم نہ ہو سکی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انہوں نے قادری کے علاوہ عربی کے بھی چند سالے پڑھے۔ پھر اردو حساب کی طرف مائل ہوئے۔ اس کے بعد مقامی پرائمری اسکول میں داخلہ کر دئے گئے۔ یہاں سے لمرافت کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول جو پورہ میں داخلہ لیا۔ یہاں سے انہوں نے ۱۹۱۴ء میں میٹرک پاس کیا۔ اقتصاد کی طور پر ان کے گھر کے حالات اتنے نہیں رہے۔ اس لئے مزید تعلیم کا امکان کم ہو گیا اور

ہیں۔۔۔۔۔ ان کی پہلی کتاب 'مضامین رشید' میں ان کی طراوت کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مگر یہ طراوت سب کے لئے نہیں۔ خدا کی خاص و عام سب کے لئے ہے۔ اکبر کے بعد اردو میں طراوتی روح سب سے زیادہ رشید احمد صدیقی کے یہاں ہے۔"

ڈاکٹر عبد اللہ نے ان کی کتاب "منجے بائے گراشاہ" اور "چتر ہم عصر" ("مولوی عبدالحق) کا سوازی اس طرح کیا ہے۔

"منجے بائے گراشاہ میں اصل طرح نظر شخصیت کو سرا کرنا اور اس کی پوری شخصیت کو بھارنا ہے۔ اس کا مقابلہ 'چتر ہم عصر' سے کیا گیا ہے۔ مگر دونوں میں فرق ہے جو دونوں معنیوں کے حراج کا فرق ہے۔ 'چتر ہم عصر' میں شخصیت کی ایک جھلک دکھا کر اس کے مقابلہ کو ابھارا ہے۔ منجے بائے گراشاہ 'کا مقصد جتنی جاگتی شکل میں اس شخص کو پیش کرنا ہے اور 'چتر ہم عصر' میں ان کے مقابلہ کو پیش کرنا مقصود تھا۔ اس سے مولوی عبدالحق کو لگا دکھا۔"

پروفیسر بھٹوں کو کہہ دی ہے "آشفقت بیانی میری" پر یوں تنقید کی ہے۔

"آشفقت بیانی میری ۱۹۷۱ء سے ایک دہائی سے۔۔۔ اس سے کسی کو بھی انگلیا نہیں ہو سکتی کہ چتر ہم عصر میں ایک ادبی تخلیق ہے۔ اس کو ایک بار ایم یا اختر الہات سمجھتے تو ٹھیک ہے اور جو نپوریا اس سے زیادہ غلی گڑھ کو جب کاموں کیلئے تو منجے بائے گراشاہ سے۔۔۔۔۔ آشفقت بیانی میری ایک سلیجید و روا ہے جس سے جاہا مزاج اور طراوت کی بڑی لطیف اور چمکی ہوئی تصویریں ہمارے احساس اور تامل کو چھوڑتی ہوئی لگتی ہے۔ سلیجید کی اور مزاج کو باہم گھلا کر ایک مزاج بنانا رشید احمد صدیقی کا خاص لہجہ ہے۔"

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ رشید احمد صدیقی کے موضوعات طرہ و درجہ نہیں۔ وہ ایک دائرے میں رہتا پسند کرتے ہیں چنانچہ اپنی موضوعات ان کے لئے پرکشش نہیں۔ نہ ہی انہوں نے کسی بڑے کئیوں پر کچھ کرنا ضروری سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں زندگی و کردار جیسے حادی بظول، پچھا چکن، دغوی، میاں آزاد یا ایسے دوسرے کردار نہیں ملتے۔ دراصل کرداروں کی ایسی تخلیق کے لئے ناولوں کا سا کیوں چاہئے۔ رشید احمد صدیقی کا لازماً دو سبب ان ٹھن۔ لیکن انہوں نے جو خاکے لکھے ہیں ان کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

میراثی خیال ہے کہ رشید احمد صدیقی نے جان بوجھ کر اپنی ایک انگ دوش دکائی۔ انہوں نے مرثا کے رنگ کے مزاج نگار ہونے کی بھی کوشش نہیں کی تو وہ فرحت اللہ چک کی صف میں آ جا چکے تھے۔ دراصل ان کا مرکزی نکتہ ایسا مزاج اور طنز ہے کہ انہا جو تہی کی کالک کو سامنے لا سکتا اور ساتھ ساتھ شخصیتوں کو بھی۔ اسی لئے ان کے یہاں ایسا

شرح لکھ چکی جو حسن نگاری کی پہچان بنا ہے۔

ایک بات اور جو انہیں دوسرے طنز نگار سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے دانش گاہ ملی ٹرکھ کی انجمنی زندگی۔ دراصل وہ اس حامل اور دائرے کو ہمیشہ مرکز نگاہ رکھتے رہے۔ نتیجے میں ان کی تحریروں کے لئے وہ ایک پلیٹ فارم کی حیثیت بن گیا اور ان تمام مضامین کا حوالہ بھی جو ان کا سرمایہ طنز و مزاح ہے۔ ایک اور بات جس پر توجہ کی جانی چاہی ہے وہ ان کا اسلوب ہے۔ رشید احمد صدیقی کا اسلوب کسی اور کا نہیں ہے اور اس پر ان کے مطالعے کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ سیرا محسوس ہوتا ہے کہ چتر اور اس نثر لکھنا مقصود نہیں بلکہ اس میں زندگی بھی پیدا کرنا ہے اور نثر زنی بھی۔ قول حال کے جہا استعمال سے ایسی تحریروں کا ایک اور بھی بڑھ گیا ہے۔ جذبات کی طرف توجہ دینے کی ہی تھی یہاں کا قائل پیدا کیا لیکن ایسی تمام مساعی میں ایک حد اعتدال ہے جو ان کی خاص پہچان ہے۔

رشید احمد صدیقی اپنی منتخب اور گر اندر تصنیفات مثلاً "مشران"، "مضامین رشید"، "منجے بائے گراشاہ"، "نیم نقصان رونا"، "آشفقت بیانی"، "طریقات و مضمونات" کے علاوہ "غالب کی شخصیت اور شاعری"، "ہمارے ذاکر صاحب"، "جدید فنون"، "سہیل کی سرگزشت"، "علی گڑھ کی مسجد قرعہ" وغیرہ کے لئے بحث و ادراکے جائیں گے۔

رشید احمد صدیقی کی ایک حیثیت نگار کی ہے۔ لیکن انہیں اثراتی نگار کہا جاتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ غزل پر لکھا ہے اس کا ایک جملہ کہ "غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔" لا جد یہ قول اس کا بھجہ عام رنارک ہے جو عظیم الدین احمد کی رائے کہ "غزل نیم وحشی صنف سخن ہے" کے شانہ بہ شانہ چلتی ہے۔ موصوف نے غالب پر بھی یہی پائی تھی رائے دی ہے کہ اردو شاعری کو ایک نیا شعور، ایک نیا مصب، ایک نیا افق دیا۔ غالب کے تصرف سے غزل اردو کی تاج نگارہ نظر برہن ہوئی۔

حالی کے بارے میں ان کا یہ جملہ مشہور ہے۔ حالی جدید تھے اور شعلی ماضی ہوئے۔ اکبر کے بادے میں ان کا خیال ہے کہ انہوں نے کئی تحریکوں اور سماجی ترقیوں سے آنکھ بند کر رکھی تھی اور اللہ بہ قول کل جیتنے مرنے کی تعلیم دیتے تھے۔

رشید احمد صدیقی کا یہ بیان بھی جو اقبال سے متعلق ہے بیکارم ہے کہ شاعری نے اقبال کو اقبال بنانے میں اپنی ماری آزمائشیں ختم کر دیں۔

فراق کے بارے میں ان کا فقرہ ہے "غزل کی آنکھ ساخت و پرداخت اور سست و رفتاد میں فراق کا بڑا احمد ہے۔"

کہہ سکتے ہیں کہ یہ پختے پھرتے جملے گہری معنویت بھی رکھتے ہیں، اس لئے زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان کی چھوٹی سی کتاب جدید غزل کے سرمایہ کا ایک اچھا حساب و تجربہ ہے۔ ان کی رائیوں سے احتیاط کیا جاسکتا ہے بلکہ کیا جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی اپنی اپنی نگار کی کتاب انہماک ہے، انہوں نے سر دشت کی گہری نگار لکھی۔

عظیم بیگ چغتائی

(۱۸۹۵ء - ۱۹۳۱ء)

ان کی پیدائش ۱۸۹۵ء میں جودھ پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مکہ میں پائی۔ لیکن ان سے مصوف کی سبقت خراب رہی تھی لہذا وہ کبھی بھی متاثرہ دست نہیں رہے، بھائی بہنوں میں کمزور۔ والدین کی طرف سے ان کی دیکھ ریکھ زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر کئی طرح کی نفسیاتی گڑبڑیں پیدا ہو گئیں۔ واضح ہو کہ عظیم بیگ چغتائی عصمت چغتائی کے حقیقی بیٹا تھے۔ مگر وہ نے مصوف کی پر ایک خاکہ "دورانی" کے عنوان سے قلم بند کیا تھا۔ یہ ان کی نفسیاتی کیفیتوں کو سامنے لانے کی ایک ایسی کوشش ہے جس پر مسلسل توجہ کی جاتی رہی ہے۔ ویسے "دورانی" عنوان بذات خود تحریر و انتخاب پیدا کرتا ہے۔

عظیم بیگ چغتائی جسمانی کمزوری کی وجہ سے نادر کا کام نہیں کر سکتے تھے۔ کھیل کود سے باز رہا ان کا مقدر تھا لیکن قدرت کچھ دوسری طرح سے جسمانی کمزوری کا داوا پیدا کرتی رہی۔ ان کے اندر ہنسنے بھانسنے کی ایک ایسی کیفیت اور بیت کردہ جو مثال ہے۔ ویسے کمزور شخص کے یہاں جی زندگی کے حوالے سے دور رہے اس کے لئے جسامت بڑھانی ضرورت تھی۔ لیکن عظیم بیگ چغتائی اپنی جسمانی کمی کو اپنی تحریروں سے Compensate کرتے رہے۔

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ مزاج نگاروں یا طرافت نگاروں میں عظیم بیگ چغتائی کی اہمیت کیا ہے؟ جواب یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عظیم شہ قلمی تھے۔ مگر وہ ہی ان کی تحریر میں کسی قسم کی گہرائی ہے۔ ابھی اور معیاری طرافت ہنسنے بھانسنے ایک ایسی انصاف انگیزی کرتی ہے جو نگاری اعتبار سے اہم ہو جاتی ہے۔ یہ صورت عظیم بیگ چغتائی کی تحریروں میں محدود ہے لہذا انہیں بلند پایہ طرافت نگار کہنا غلط ہوگا۔ ان کی تحریروں میں شوخی اور شراکت ہے۔ بچوں جیسی معصومیت ہے لیکن ساتھ ساتھ مضحکہ خیزی بھی ہے۔ ان کے سارے کردار ہنسنے بھانسنے کے عمل سے دوچار رہتے ہیں۔ اس سے آگے کی غایت بھی نہیں ہے۔ وہ اپنی کسی تحریر کو ایک شکل دینے کے بعد اس سے قطعی الگ تھلک ہو جاتے ہیں۔ اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو خاطر میں نہیں لاتے، اصلاح نہیں کرتے۔ ایسے میں تحریر میں بڑبختی ابتدا میں ہوتا ہے وہ دور نہیں ہوتا۔ ان کے طعنے مضامین بھی، جگہ جگہ ہی ہیں۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ ایسے جگہ مضامین بھی چند کردار پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے کرداروں میں خاتم کو نادر جو شر میں یوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ ان کرداروں کی حیثیت مسلم ہوگی ہے اور ان ہی سے چغتائی بچائے جاتے ہیں۔ (انگریزوں کی نگاہ سے)۔

عظیم بیگ چغتائی قلم کے نادر ہاوی میں شوخ واقعات سے طرافت سمودیتے ہیں۔ کوئلہ، شرابی، دہلی، دہلی، دہلی اور خاتم میں وہ کسی شیطانی دنیا میں نہیں، اسی معاشرہ میں رہ کر اس کی

نے واقعات اور اپنی معاشرت سے لئے ہیں اور اس میں شے نہیں کرنا دگی کے حقائق سے قریب رہ کر انہوں نے افسانوی طرافت کو ایک منفرد قالب میں ڈھالا ہے جس سے بعد میں شوکت قحطانی اور دوسرے مزاج نگاروں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ شوخ اور چٹیل بھائی کا کردار ان کے کٹر شخصوں میں طرافت کا رنگ بھرتا ہے۔ خاتم اپنی نباتت اور طر جادری سے شوہر پر حاوی رہتی ہے۔ اس خطبہ سے نکلے اور اپنے وجود کو سوانے کے لئے جب شوہر ہاتھ پاؤں داتا ہے تو وہ اور یہ لوگ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں خاتم ہی میں نہیں، شرابی میں بھی ملتی ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی نے "قرآن اور پردہ" بھی کتاب بھی تصنیف کی ہے، جو ان کی تمام تحریروں سے الگ حیثیت کی حامل ہے اور جس میں تنبیہ کی کام نسا ہے۔

عظیم بیگ چغتائی دق کے مریض رہے تھے۔ ساری عمر اس مرض کے ساتھ رہے آخر میں ۱۹۳۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ملار موزی

(۱۸۹۶ء - ۱۹۵۴ء)

ان کا اصل نام صدیق ارشد تھا لیکن ملار موزی کے نام سے معروف ہوئے۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں بھوپال میں ہوئی لیکن ان کا اصل وطن مکہ تھا۔ دراصل ایک زمانے میں ان کے والد بچا کا مل سے بھوپال ہجرت کر گئے۔ چونکہ دونوں ہی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور تھے اس لئے انہیں اعلیٰ ملازمتیں ملتی رہیں۔ ملار موزی کی اہلیہ ان کی تعلیم ان ہی کی دیکھ ریکھ میں ہوئی۔ اردو، فارسی، انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ کا پڑھ کے درس دیتا تھا۔ ان کی علمی چاشنی بھالی۔ جب وہ مدر سے واپس آتے تھے تب ہی انہیں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ بے لوثی تھرو مضامین لکھتے رہے اور دنیا کے ادب میں اپنی ایک خاص جگہ بنائی۔

اردو میں "گلابی اردو" کے سرے سے موزی ملار موزی ہی سے عبارت ہیں۔ گویا ان کی حیثیت ایسی اردو کے موجد کی ہے۔ انہوں نے خود گلابی اردو کی وضاحت میں کی ہے کہ مکے کی سائنس یوں ہل لی جائے پہلے لعل ہو پھر قلم اور تب قلموں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح عربی سے اردو ترجموں کا آغاز پیدا ہو جاتا ہے جو لکھ آئیں ہوتا ہے۔ لیکن ہے کہ ان کی یہ بات درست ہے لیکن میرا خیال ہے کہ گلابی اردو کی ایسی سائنس، بہت جلد نکال دیتی ہے اور پڑھنے والا دوسرے میں بھتا ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس طرز کا موجد انہیں ہونا تھا۔ وہ تھے۔

ملار موزی کی تحریک آزادی سے کبھی وابستہ رہے تھے۔ سیاست سے چونکہ ان کی گہری دلچسپی تھی اس لئے سیاسی

مسائل کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے مضامین حکومت کے خلاف لکھتے شروع کئے۔ یہ مضامین اپنے تئیر اور اعتدال کی وجہ سے پسند بھی کئے جاتے تھے۔ ان میں حب الوطنی کا جوش بھرا ہوا تھا اور اپنے وقت کی چیز تھا۔ چند ایسی تحریروں سے عوام دلچسپی لے رہے تھے۔

ملازموزی کا یہ گاہے شعر بھی کہتے تھے، اچھے مقرر بھی تھے، ان کے اندر انتظامی صلاحیتیں بھی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے چند اخبارات میں قائم کیں۔ بیان کا طرز اختیار ہے۔

گوانی اردو کا ذکر کر رہے ہو چکا ہے۔ اسی نام سے انہوں نے ۱۹۲۱ء میں اپنی کتاب بھی شائع کی۔ یہ اس وقت کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ عوام نے اسے پسند کیا لیکن وہ اس قسم کی تحریکیں لکھ سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنی ڈگریوں کی اور سیاست کی طرف راجع ہو گئے۔ مقرر و مزاج ان کی شخصیت کا ایک حصہ تھا۔ ایسے عناصر ان کی تحریروں میں بار پانے لگے۔ طرافت کا رنگ جن پر چڑھا ہوتا۔ لہذا وہ مزاج نگاروں کی صف میں بھی آگئے۔ نور انجمن نقوی خود ملازموزی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:-

”خود غور فرماتے ہیں کہ میرے مضامین کی کوئی اہمیت ہے تو صرف اس لئے کہ میں حقیقت کا راسخ نہیں سمجھتا۔ حکومت کے مظالم، سماجی نا انصافی اور معاشرتی مصائب انہیں صاف نظر آتے ہیں اور وہ دھڑلے سے ان پر انگلی اٹھاتے بغیر نہیں رہتے۔ حالات انہیں مجبور کرتے ہیں کہ جو کچھ انہیں طرافت کی آڑ میں لکھیں۔ نتیجہ یہ کہ دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔“

ملازموزی کا انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا۔

پطرس بخاری

(۱۸۹۸ء۔ ۱۹۵۸ء)

ان کا پورا نام میر سید احمد شاہ بخاری تھا لیکن قلمی نام پطرس سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد سید احمد شاہ بخاری تھے۔ ان کے اسلامی نظریات سے بھر پور تھے۔ پطرس یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر بعض مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں میٹرک اور ۱۹۱۵ء میں انٹر میڈیٹ فیصلوں سے پاس کیا۔ ۱۹۱۷ء میں گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا۔ پہلے دیم انسٹی کی کرنا چاہا لیکن ارادہ ترک کر دیا اور ایم اے کے لئے انگریز ادب کا انتخاب کیا۔ ایم اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ ہو کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

پطرس نے ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ کالج کی میگزین ”نوادیا“ کی ادارت کی۔ اس کے استاد Peter Watkins نے ایک رسالہ ”سولی اینڈ ملری گزٹ“ نکالا تھا۔ اس میں دو مضمون بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں انگلینڈ اور کیمبرج میں یورپینی

کے سینئر اسکالرشپ پر بھی۔ ان کے اساتذہ میں کی اہم لوگ تھے۔ ان کے رجحانوں، ایلٹ آرٹیکل، ملٹریڈو فیرو۔ تعلیم سے فارغ ہونے والا اور دلچسپ آئے اور وہیں کے ایک کالج میں لکچرر ہوئے۔ پھر گورنمنٹ کالج لکھنؤ میں ہو گئے۔ ٹیکسٹ بک کے سکریٹری رہے اور سکھائی کی کارگزاریوں کی کئی اہم صلاحات دی جو نہیں مرتب کیں۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو میں نائب منظر نویس ہو گئے اور تین سال کے بعد کنٹرولر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن جلد ہی وہ گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہو گئے اور برائن کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ خدمت ۱۹۳۳ء تک انجام دی۔ جون ۱۹۵۲ء میں انعام احمد کے نواسہ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۵۳ء تک اسی عہدے پر رہے۔ ۱۹۳۸ء میں نیکیو میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔

واقع ہو کہ پطرس کو کثرت الطبقہ سے غایت دلچسپی تھی خصوصاً مسیروں سے۔ ترجمہ بھی کئے اور تنقید کی مضامین بھی لکھے۔ ان کی ایک حیثیت، دیگر تعلیم کی بھی ہے اور تحریکات کے باب میں ان کا نمایاں کام ہے۔ انہوں نے فیض احمد فیض کی ادارت میں نکلنے والے ”پاکستان ناموس“ کے چار ادارے لکھے تھے۔ برلن اور رسل کی کتاب جو بچوں کی ابتدائی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے، اس کا ترجمہ ۱۹۳۵ء میں کیا۔ ایف ایل برین کے ترجمے سے متعلق ایک بہار سدھار ہے یہ بھی ترجمہ ہے۔ پطرس کا انتقال ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں نیویارک میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

پطرس اپنی کتاب ”پطرس کے مضامین“ کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان کے مضامین کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر اس پر تنقید و تہلیل بھی اسی کتاب کے مضامین کے کچھ منظر میں کیا جا چکا ہے۔ اب جب کیا تہ شائع ہو گیا ہے تو ان کی تخلیقیت سے دلچسپیوں کا دائرہ عسوا وسیع بھر آتا ہے لیکن اب بھی ”پطرس کے مضامین“ ہی خیالی شناخت کا حامل ہو سکتے ہیں۔

در اصل پطرس کی صحت مزاج بہت چڑچڑی۔ وہ بات میں بات پیدا کرنے کا کر جاتے تھے اور واقعات اسی سلیط سے ابھرتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں خیالی کیفیت بننے جہانے کی ہے لیکن ایسی ہی اور طرافت میں ایک طرح کا طرز چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بت یہ ہوتی ہے کہ کثرت الطبقہ کی اس طرح تخلیق کی ہے کہ بننے بنانے کا موقع بھی فراہم ہوا اور نا ہوا ریلوں کی اطلاع بھی بچھپچھپے۔ ہر روز اعتراض نگار یہ کام کرتا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پطرس کے یہاں کہیں گراؤ کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ کہ خدا اور ملی کے تحت یہ کام کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں طرافت کی بنیاد ہی حقیقت ہے اور طرافت کے پہلو سے برآمد ہوتا ہے جو چھپا ہوا ہوتا ہے اور یہ کام نیکو نام ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ گودی پیدا کرنے کے لئے خواہ مخواہ کوئی خارجی معاونت کا سہارا نہیں لینے لیکن واقعات کی ترقیب اس طرح ہوتی ہے کہ مقررہ پوش ہی کسی کہیں نہ کہیں بھلا کر نظر آتا ہے لیکن ان کے مضمون ملامت ہوتی ہے جو روزانہ انہیں ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کے ایک طریق

سے انگریزی ہے اور یہ سسٹم خرد پطرس کا ابداع ہے۔

پطرس کی شہرت اور عظمت کی متعدد وجوہیں ہیں۔ لیکن ان کی لحاظ سے "پطرس کے مضامین" کو شاہکار مزاح (خبر) مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی ماضی شہرت کا باعث ہے۔ پطرس ایک مزاح نگار کی حیثیت سے سب سے اہم ہیں۔ یہ بات کئی قوتاً سامان ہے لیکن وہ کسی طرح دوسرے سے الگ ہیں اسے دلیل کے ساتھ واضح کرنا سامان نہیں۔ لیکن چند باتیں ایسی ہیں جن پر قوت کی جاسکتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اکثر مضامین میں واحد حکم (ایک کراہ) کی حیثیت سے موجود ہوتے ہیں اور مشاہدے کو تخلیقی ہوت عطا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح غالب اپنے کونتا ہا کر اجتماعی سزا شدہ کیف و کم کو نشان زد کرتا ہے۔ لیکن اس فن میں پطرس بھر مشاق نظر آتے ہیں اس کے لئے واقعات و حادثات کو سامنے لانے کے لئے بیز مبالغہ اور اثرات اظہار کرنے کے لئے وہ الفاظ کا اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان میں اثر سرنو جان آ جاتی ہے اور قیاسی (کمی کمی اس کی آفرینی) پیدا ہو جاتی ہے۔ حماس و ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ "سو بے جو گل آنگہ کلی" میں تو جو ان طالب علم کو اس کی ہدایت پر ہی سوئے سوئے اٹھانے کے رد میں میں تو جو ان کا سامان جو مشکل صورت پیدا کرتا ہے وہ یہ دیا ہے۔ پھر تو جو ان طالب علم کا ریاکار کہ سوئے ہی اٹھتا تو انا جان کا مشکور نظر ہوتا۔ ذہن کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح "کئے" میں کئے کا خوف پھر اس کی اپنی حاکم اور خاکست مضامین کا رنگ میں رہتا پھر کئے کا وہ سے پہلے "پلا میں زلف جان کی اگر لیتے تو ہم..... مصرعے کا مکمل رد چاہا عجیب صورت پیدا کرتا ہے۔ گویا پطرس آئینہ سچ نہیں پیدا کرنے میں ملای کی ملاحت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور شاعر ہی جھگڑتی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس میدان میں وہ جہاں اور یکساں تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ کم از کم میں سچی سمجھتا ہوں۔ ان کے دوسرے مضامین جیسے "باہل میں چہ تھا" "میں ایک میاں ہوں" "میرے پور کا پور" "مروج کی یاد میں" "سینما کا عشق" "اردو کی آخری کتاب" "آبیروں کی" "کامورو کا جھڑپ" "آبیروں کی" "پطرس کی ذکاوت، ہکاوت، تکیلیں، تکیلیں کا انداز، شاعرانہ ذہنی واقعات کو سامانیت میں بدل دینے کی قوت، آفرینی پیدا کرنے کی جلیلت، جامعیت اور اختصار، فکر اور تجسم، زیریں کا احساس ان تمام مضامین سے ہوتا ہے۔ مجھے تعلیم الدین احمد کی اس رائے سے اختلاف ہے کہ رشید احمد صدیقی کے یہاں انگریزی بہاؤ ہے اور پطرس کے یہاں اکادمک مرحلہ۔ دیکھتے ہیں۔

"پطرس میں دو بے ساختگی، دو آہ، دو جوش نہیں ہے جو رشید صاحب میں موجود ہے۔

پطرس کی افتاد بھی نہایت مشکل، محدود آسانی معلوم ہوتی ہے۔ رشید صاحب کی یہ ایک مثال

نقص و حسرت ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک انہی شان ہوتی ہے۔"

یہ رائے احتجاجی مقابلے کی ہے۔ یہ ایسی ہی تنقید ہے جو تعلیم صاحب، مسکری صاحب کے سلیطے میں کرتے رہے

ہیں۔ دراصل بات بالکل اپنی جگہ تھی ہے۔ پطرس کا وہاں انداز ہر جگہ نگری معلوم ہوتا ہے۔ کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ "اربر

کا کہیں" کا اکادمک ذہن پطرس کے کسی مضامین میں موجود نہیں۔ حالانکہ پطرس علمی اعتبار سے زیادہ ذاتی رجحان کے حامل تھے۔

پطرس کے مزاح میں ہرگز کا عنصر انجمنی ہوتا ہے کہ صرف بھر حماساں شخص ہی اسے محسوس کر سکتا ہے اور یہ قابل تعریف بات ہے۔

پطرس کے سزا دے دینا ہے تنقیدی مضامین، ادب لطیف سے متعلق مضامین، وغیرہ تخلیق مطالعہ چاہتے ہیں، جس کا یہاں موقع نہیں۔

پطرس کی بکھار دو ادب میں محفوظ ہے۔

شوکت قانوی

(۱۹۰۵ء۔ ۱۹۶۳ء)

شوکت قانوی ۲۲ جنوری ۱۹۰۵ء کو پندراہن ضلع، تھمر (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کا آبائی وطن ضلع مظفر گڑھ، قانہ بھون تھا۔ اسی مناسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ قانوی لکھتے تھے۔ ان کا تاریخی نام احمد علی تھا۔ لیکن مالک رام نے "تخیر احمد لکھا ہے۔ ان کے والد صدیقی احمد کا انتقال ۲۰ مارچ ۱۹۲۹ء میں ہو گیا تھا اس وقت ان کی عمر چودہ برس کی تھی۔ ان کی شادی کم عمری ہی میں آگئی تھی۔ ان کی دیکھ کا نام سعید و بنت سجاد حسین تھا۔

شوکت قانوی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی لیکن انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے بھوپال، بکھو، علی گڑھ میں رہے۔ انہوں نے علی گڑھ اسکول میں جب "اعلیٰ نصاب" پڑھا تو والد کا انتقال ہوا تھا جس سبب سے ان کی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے صحافتی زندگی کو اپنا لیا اور متعدد رسالوں میں لکھنے لگے۔ مثلاً "جشن ادب"، "ہجرتم"، "طوفان"، "سرچش"، "کا کا کا"، "اردو شہزاد" وغیرہ۔ بعض رسالوں کے یہ بانی و مدیر بھی تھے اور بعضوں کی ادارت اور ادارت میں شامل تھے۔ مجموعہ آل انڈیا ریلوے پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔ لاہور کی ایک فلم کمپنی سے بھی ان کی وابستگی رہی۔

شوکت قانوی ۱۹۵۷ء میں یورپ گئے اور وہاں ہوئے تو روزنامہ "جنگ" "کراچی کے مدیر بن گئے۔ ۱۹۶۰ء میں ان کا پہلا مزاحیہ افسانہ شائع ہوا اور ۱۹۶۲ء میں پہلا مجموعہ "مروج جسم" کے نام سے شائع ہوا۔

شوکت قانوی کھڑے سے لکھا کرتے تھے اور خوب پیچھے بھی تھے اس لئے ان کی مطوعات کی تعداد کافی ہے۔

بعضوں کی نشاندہی ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کی ہے جن کے ۱۲ اے سے ان کی زندگی کا خاکہ مرتب کیا ہے۔

فرمان فتح پوری نے "مروج جسم"، "ہجر جسم"، "دل بھیک"، "خام خاں"، "سوچا چاہا"، "گرگت"، "مجر خانوں"،

"شیطان کی ڈائری"، "توریت"، "مضامین شوکت"، "کچھ یادیں کچھ باتیں"، "مسکراہٹیں"، "ہرقی جسم"، "پنے خزانہ"،

"کھڑون"، "مروج کی چیز"، "کھی کھی"، "بار خاطر"، "نیلوفر"، "کلاس"، "سہراں"، "حاضری جی"، "جوڑ توڑ"، "سوانحی

رہل، "مولانا"، "غالب کے ادا سے"، "ساجی کو آج"، "ہزارہ"، "خدا خواست"، "کتیا"، "ماہ دولت"، "انتظارِ خدا"، "بی بی"، "بھانجی"، "اور"، "قائد" سب کا قصہ "کا ذکر کیا ہے۔ اس فہرست میں چند ناول بھی ہیں۔

شوکت قناد کی کاہنہ اعجازی افسانہ "سوریش ریل" ہے۔ اس سے پہلے بھی طالب علمی کے زمانے میں مضامین لکھتے رہے تھے۔ شوکت قناد کی سنی اپنی شہرت "ہمدرد" میں لکھے جانے والے حراجیہ کالموں سے حاصل کی۔ ان کے کالم کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ نتیجے میں وہ مسئلہ مزاج نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ افسانہ "سوریش ریل" نے انہیں مزاج شہرت بخشی۔ یہ حراجیہ افسانہ ۱۹۳۶ء کے "نورجگ خیال" میں شائع ہوا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں:-

"رسالہ نیرجگ خیال کا دور کے سالانہ ۱۹۳۶ء کے لئے ہم نے ایک حراجیہ افسانہ سوریش ریل کے نام سے لکھا۔ شائع ہونے کے بعد اب جسے دیکھتے رہی ہم کو بھلا لکھ رہا ہے۔ بہت سے مقامی حضرات ملنے آئے۔ متعدد رسالوں اور اخباروں نے اس کو نقل کیا۔ ہندی، انگریزی، بنگالی اور مراٹھی اخباروں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر فتح صاحب کوئی بزرگ ہیں انہوں نے اس کا انگریزی ترجمہ دلائیٹ کے "گلوب" نام کے کسی اخبار میں چھپوایا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی افسانے نے ہم کو مزاج نگاروں میں باضابطہ طریقہ پر شامل کر دیا۔ بلکہ اس دور کے بعض تذکرہ نویسوں نے صاحب حاف لکھ دیا ہے کہ شوکت قناد کی کی عقیدیت کا سنگ بنیاد ان کا افسانہ سوریش ریل ہے۔"

اردو کے ظرفیت نگاروں میں شوکت قناد کی اپنی ایک جگہ ہے۔ ان کے مضامین میں وہ گہرائی نہیں ملتی جو رشید احمد صدیقی یا پطرس یا کشمیر لال کیوں ہے۔ موصوف زیادہ گہرائی میں نہیں اترتے اور بالائی سطحوں پر رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ذہنی احساس ہوتا ہے کہ وہ کس بنیاد پر ہی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن اپنے اس عمل میں وہ جانے انجانے نامور ادا کو اس طرح سمیٹتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ کتنا کہاں ہے۔ ان کے ظرائفی افسانے مضامین کے دھڑکنے والے نیاں چارے دکھائی دے جاسکتے ہیں جنہیں چند معیاری کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کام ابھی تک نہیں ہوا ہے بہت تیز اور بہت زیادہ لکھنے والوں کا یہ مقدور ہوتا ہے کہ ان کی معیاری ٹھیکتاوت بھی انہوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ سودھی کیفیت شوکت قناد کی ہے یہاں بھی نمایاں ہے۔ کشمیر لال کی پوری تحریروں سے ایک نئی بات ثابت کرتے ہیں اور ان کی بازیافت میں تحقیق کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں جیڑاؤ کس بہت کام کرتے ہیں اور وہ اپنے علمی پس منظر سے اپنی تحریروں میں کافی نمبر لایا پیدا کر دیتے ہیں۔ پطرس کے احوال میں ان کے علم کے ساتھ ان کے مشاہیر کی ترویج ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔ شوکت قناد کی اپنے کلام کے یاد اور اس سطح کے خطرناک نہیں ہیں اور پچھلے زمانے کی سیر کی ذاتی ہے۔ "سوریش ریل" انہیں انہوں نے بہت حد تک دو معیار حاصل کر لیا تھا جو خطر مزاج کے بہترین لکھنے والوں کے یہاں موجود

ہے لیکن انہوں نے یہ صورت کار کا نام نہ رکھی۔ حالانکہ "سوریش ریل" میں ان کا سیاسی شعور بہت مزید ظہور ہوتا ہے۔ شوکت قناد کی قانونی نظام سے کچھ جاسکتا ہے۔ یہ اپنے دریاں رواں اسلوب میں جتنے بنیاد کے عمل کو بہت تیز کر دیتے ہیں اور یہی ان کی پہچان بھی ہے۔ ان کا انتقال ۱۳ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ہوا۔ عارضہ سرطان اور میں ہوا اور میاں صاحب اور میں رہی ہوئے۔ لیکن انور سید ان کے وفات کی تاریخ ۱۹۶۷ء درج کرتے ہیں۔

کشمیر لال کپور

(۱۹۱۰ء - ۱۹۸۰ء)

کشمیر لال کپور ذات کے کھتری تھے۔ ان کا آبائی پیشہ کارکاری تھا۔ انہوں نے اس کا اختیار کیا ہے کہ ایک ردا ہے۔ کے مطابق ان کی پیدائش ۲۲ جون ۱۹۱۰ء میں ہوئی اور دوسری روایت کے مطابق کپور ۱۹۱۱ء کو۔ ان کے والد لالہ جی رام کپور ضلع لائل پور کے گاؤں "چنگ" ۳۹۸ میں پیدا ہوئے۔ یہ پاکستانی شہر کراچیا سے باہر مل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کی اکثر آبادی بلوچ کی تھی۔ اس کے بارے میں کشمیر لال کپور کا خیال ہے کہ وہ لوگ نہایت خدا ترن اور انسان دوست تھے۔

کشمیر لال کپور کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ ان کے ایک استاد جھولی بھٹائی تھے۔ جن کی فارسی اور اردو کی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ موصوف نے انہیں گلستاں اور پوجاں جیسی اہم کتابیں پڑھائیں۔ کبھی کبھی قرآن کی آیات کا آسان ترجمہ بھی کر کے ان کی اہمیت واضح کرتے۔

کپور نے ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ اسکول کراچی سے میٹرک پاس کیا اور پورے پنجاب میں دوسری بار تکشن پر رہے۔ انٹر میڈیٹ ڈی ایف کالج بمبئی سے پاس کیا اور لی اے کی ڈگری ایم اے کی کالج لاہور سے حاصل کی۔ اس اطمینان میں وہ انگریزی اور سنسکرت کے مضامین میں اول رہے۔ ایم اے انگریزی کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں ان کے ایک استاد سید احمد شاد پطرس بخاری بھی تھے۔ بخاری کے اثرات ان پر دور رس رہے ہیں۔ جن کا ذکر انہوں نے کئی موقعوں پر کیا ہے۔ چونکہ بخاری خود مزاج نگار تھے۔ اس لئے کشمیر لال کپور کو بھی انہوں نے اس کی طرف راغب کیا۔ کپور نے مزاج کے حلقے میں بخاری کی ایک دانتے یونیٹ کی ہے۔

"جب کوئی چیز یا انسان زاویے کا رخ کی بجائے زاویہ منفرجہ یا زاویہ حادہ کی شکل اختیار کر لیتا

ہے تو وہ مزاج کا موضوع بن جاتا ہے۔ (نیز یہ کہ اردو مزاج کا ابھی پچھنا ہے اسے لڑکھن کی

مزل تک پہنچنے کے لئے کم از کم پچاس سال کا عمر مددگار ہے)"

گویا بخاری کی تحریک پر کپور مزاج نگاری کی طرف مائل ہوئے اور یہی ان کا ادبی طرہ اختیار تھا۔ جب ۱۹۴۲ء

میں یہ قہر اُن کے لئے تھا تو ان کی شادی پشادتی سے ہو گئی۔ ان کی ایلیہ ایک متوسط گھرانے کی خاتون تھیں جو قصبہ کوٹ موہن، ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتی تھیں۔

انہی اے کرنے کے بعد کنبھیا لال کیور کی پریشانیوں پر غور کریں۔ ملازمت کے حصول میں انھیں دشواری ہوئی۔ آخر فروری ۱۹۰۵ء کی کالج میں کچھ لکھنے کے بعد وہیں کے لیکن بڑے سال کے بعد انھیں کالج سے الگ ہونا پڑا۔ تب وہ نبیوشن کرنے لگے اور ایک سستے بورڈنگ ہاؤس میں اپنے رہنے کا انتظام کیا۔ اس دوران ان کی ملاقات کرشن چندر سے ہو گئی۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ کیور کو احساس تھا کہ بخاری کے بعد کرشن چندر علی وادریب ہیں جنہوں نے انھیں لکھنے کی ترغیب دی۔

کنبھیا لال کیور کا پہلا طریہ مضمون کرشن چندر کے المانے ”پہ تان“ کی پیروی ہے۔ جس کا عنوان موصوف نے ”تھکان“ رکھا تھا۔ لیکن یہ مضمون تک ہو گیا۔ کیور کہتے ہیں کہ کرشن چندر پر اس میں بہت چٹکی پڑی تھی۔ اس کے بعد وہ فروری ۱۹۰۵ء کی کالج لاہور میں پھر ملازم ہو گئے۔ تب انہوں نے دوسرا مضمون ”اخبار رچی“ لکھ کر کیا جھوٹے روزہ ”شیرازہ“ میں شائع ہوا۔ تیسرا مضمون ”پہنی شاعری“ ”رمال“ ”ادب لطیف“ کے سالانہ ۱۹۰۸ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ لیکن کیور کی شہرت ان مضامین کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ ۱۹۱۲ء میں ”ادب لطیف“ میں جب ان کا مضمون ”غالب ترقی پذیر شعرا کی مجلس“ میں ”شائع ہوا تو اس زمانے کے ادبا اور شعراء ان کی طرف ہنسنے لگے۔ اس مضمون کا بڑا شہرہ ہوا۔ اشاعت سے پہلے ”حافظ ارباب دوقی“ کی ایک نشست میں یہ پڑھا جا چکا تھا۔ کیور اس مضمون کو اپنی ادبی زندگی کا آغاز قرار دیتے ہیں اور یہ کچھ غلامی نہیں۔ پھر مکتب جدید لاہور سے ان کی پہلی تصنیف ”گنگ دشت“ شائع ہوئی۔ چھپتے ہی یہ تصنیف اہم لوگوں کی نگاہ میں آ گئی۔ انتظام مسین، عبادت بریلوی، غلام السیدین نے اسے خاص طریقے پر پسند کیا۔ کرشن چندر نے انگریزی میں اس پر ترجمہ کیا اور انھیں بھگو کا لقب عطا کیا۔ پھر تو ان کی مسلسل تصنیفات سامنے آتی رہیں۔ ”شیشہ فیض“ (۱۹۱۳ء)، ”چنگ و باب“ (۱۹۳۶ء)، ”نوک شمشیر“ (۱۹۳۹ء)، ”پال دو پر“ (۱۹۵۴ء)، ”نرم گرم“ (۱۹۵۵ء) اور ”گردگار داس“ (۱۹۶۰ء) شائع ہوئے۔

کنبھیا لال کیور کے بعض مضامین پر خاصی ہنگامہ آرائی ہوئی۔ ان کا ایک مضمون ”مہل زبان“ ”ادب لطیف“ میں شائع ہوا تو جیسے جیسے آگ لگ گئی۔ جنہیں زبان دانی کا دعویٰ تھا وہ کبیدہ خاطر ہوئے اور کیور کے خلاف سخت قسم کا احتجاج شروع ہوا۔ بعد تو یہ ہوئی کہ شاہد احمد دہلوی نے کفر کا فتویٰ بھی صادر کر دیا۔ لیکن کیور کب ہار مانتے دانتے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرا مضمون ”نے چہ داغے نے گئے“ لکھ دیا تو ان کے خلاف ایک طرح کی تحریک شروع ہو گئی اور انھیں طرح طرح کی (صلواتیں) دہائی جانے لگیں۔ ایک مضمون انہوں نے قیام پاکستان کے مطالبے کی مخالفت میں بھی لکھا تھا۔ اس پر تو حیدر بنگلہ ہوا اور انھیں تلک کر دینے کی دھمکی بھی دی جائے گی۔ لیکن کیور نے معافی مانگ لی اور معاملہ رفع

رفع ہو گیا اور انہوں نے مضمون کو تکف کر دینے کا وعدہ بھی کیا۔

تقسیم کے بعد کنبھیا لال کیور غیر روز پور آ گئے اور اپنی کالج دسکا میں پکچر ہو گئے۔ ان کے لئے یہ جگہ بے حد پریشان کن تھی۔ ایک طرح سے یہ نیم رگھناتی قصبہ تھا۔ لاہور کی یادیں انھیں تڑپاتی راتی تھیں لہذا سولہ سال تک وہ یہاں ملازمت کرتے رہے اور بھول خود جنت سے ہجرت کرنے کے بعد ہی جنم کو اپنا مسکن بنایا۔

طور حراج میں کنبھیا لال کیور کی بڑی انفرادی اور ممتاز جگہ ہے۔ مجھے تو اپنے کلاسیک لکھنے والوں میں ان کی کسی اور حراج نگاروں کا انتخاب کرنا پڑا تو میری نظر سب سے پہلے کنبھیا لال کیور پر پڑے گی۔ اس کے بعد پطرس پر، پھر دوسرے لوگ آئیں گے۔ میرے خیال میں ان سے بہتر ہی وہی لکھنے والا کوئی دوسرا سامنے نہیں آیا۔ دراصل انگریزی میں انھارویں صدی کا چھ حراج اور طریہ ادب ہے وہ پورا کا پورا ان کی نگاہ میں رہا تھا۔ انگریز کی اور یورپی زبانوں کے گہرے مطالعے نے انھیں یہ ترسکا دیا تھا کہ جس طرح فطری طور پر حراج پیدا کیا جاسکتا ہے۔ سراج کی آہواروں پر تو طر نگاروں اور مزاح نگاروں کی نظر آتی ہے لیکن دھتھی رنگوں پر کس طرح اٹلی رنگی جاسکتی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو طر و مزاح کے فن کو اس کے اصل ضد و حال میں دیکھ سکے۔ فن کوئی خود پر رو پوش رکھنا شہ آ ہے وہی اعلیٰ ادب ہے اگر سکتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ کنبھیا لال کیور اس لکھنے کو گھاسے تھے۔ لہذا ان کے یہاں ہنسنا پٹنا جیت میں گولگوئی لگا جیسی ہے بلکہ وہ ایک راز پر آرت ہے جسے لکھوں کے موافق برتاؤ سے حاصل کر لے یہ انھیں قدرت حاصل ہے اور وہ ایسے واقعات و کردار پیش کرتے ہیں جو سراج کی ناہوار یوں کو بے نقاب کرنے کی علامت بن جاتے ہیں۔ ان کا آرٹ لکھوں کے مکمل کا آرٹ نہیں بلکہ واقعات کو فطری ماحول عطا کر کے طر و مزاح کے کیف حاصل کرنے کا آرٹ ہے اور یہ صورت انھیں پیش ہوئی ہے۔

کنبھیا لال کیور کی زبان صاف ستھری اور شفاف ہے۔ وہ اپنی تحریر کو گنگ لکھ جاتے بلکہ ترسیل کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مزاحیہ ماحول بھی جیتی آتشا نظر آتا ہے۔ کنبھیا لال کیور کا انتقال ۱۹۸۰ء میں ہوا۔

رضا نقوی وائی

(۱۹۱۳ء - ۲۰۰۲ء)

رضا نقوی وائی کی طر پر حراجی شاعری ایک وسیع مظہر نامہ پیش کرتی ہے جس میں آج کے محقق، نقاد و شاعر، نگار، شاعر، افسانہ نگار، جڑ صاحب، غلامی، بڑ، پلید، لہیر، باہرین، اہانان، مشاعرہ، مکتو، ادب کا تب، اقتباساتی ادیب، کتو کی ادیب، مولوی، کامریڈ و غیرہ شدہ کیفیت میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ جن مشہور شعرا و شہو کا میں نے تذکرہ کیا ہے، ان میں اکثر شاعرانہ اعتبار سے جہاں اہم ہیں۔ وائی کی شاعری میں ان کا عصری منصب سمجھنا کیجئے تو صرف شاعری کی بنیاد پر ان کی انفرادیت مسلم معلوم ہوتی ہے۔ ان کی مٹھو نظم ”محقق“ اس امر پر دال ہے کہ ان کی رائے سے اتفاق کرنا اس

ظہار حاصل ہوتا ہے اس کا احساس کیا جاسکتا ہے۔ کامیاب مزاج نگار واقعات کا عرضی کی منزل تک بھی لے جاسکتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں۔ طوطا نے ایک ایک لفظ میں ڈنک بھردے ہیں۔ ظاہر ہے نشانہ چرکنا نہیں اور تکلف اور بے محسوس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ محقق کی رہنمائی ایک طرف اس کی صحت ثبات ایک طرف، لیکن نقطہ نظر طوطا کا ایک طرف کی صورت میں ابھرتا ہے اور محسوس سے داد وصول کر لیتا ہے۔ اس طرح طوطا کو زمرہ مزاج میں رکھنا، اسے مجرم کرنا، شعر و ادب کے لئے مصیبت گردانا اور اذیت خالق کرنے والا فرض کرنا ممکن ہے کسی شاعر کی اہمیت کو کندہ کر دے کہ وہ اپنی مصیبت میں ہوتا ہے، اگر کسی پر تنقید بوجہ نہ کرنے تو خالق کو ابھرنے اور شکایت اور اگر یہ کام سر انجام دے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے تو بھی شکایت۔ تخلیقی فنکار کا دھوکہ دیکھ کر نظر انداز کر دیں تو اور بات ہے ان سے کچھ کھسواتا نہ چاہیں تو یہ بڑی بات ہے لیکن اس کیلئے مصیبت یہ ہے کہ وہ کسی کثرت بحث سے آرام نہیں کر سکتا۔ پھر بھی وہ اسی کی نظم "ٹھانڈا" خود لکھا وہاں کو بہت پسند آئے گی کہ کہیں دربار بھیم اور کہیں آفتاب لکھنے کی دفاع قائم کرتی ہے، پھر شعر سے لطف اٹھائیے:

ان سے ملے آپ ہیں جو ہر شایا نظر فن
کاٹتی ہے دہریے سے آپ کے دوح فنی

جب کہ قسمت ہٹ دی تھی عالم ارواح میں
آپ کو رکھا گیا تھا زمرہ مزاج میں

ہاتھ غلطوار نے اک حشر برپا کر دیا
جو بھی زور میں آگیا اس کا مقابلہ کر دیا

جس سے ٹکڑے اس کی مٹی آپ نے کر دی بنیاد
جو گئے خوش جس سے دے دی اس کو شہرت کی کلید

آپ نے داغ غنی کو لیلی بخش کر دیا
آپ نے تک بند شاعر کو امام فن کہا

آئے جب علم بیاں کی معنوی تفصیل میں
صنعت انیم کی دم ہاندہ دی تعلیل میں

استعارے کو بھڑلے سے سنا یہ لکھ گئے
بڑی میں تنقید کی ظلت کو سایہ لکھ گئے

لے مشکل ہے کہ اس میں ایسے محقق کی تصویر نمایاں ہوتی ہے، جو شاید اردو کا سب سے بڑا محقق ہے وہ محقق جرنیل رہا۔ لیکن یہ نظم اپنے شعری محاسن کی وجہ سے یاد رکھی جائے گی۔ چند اشعار دیکھئے:

یہ جو اک حضرت چلے آتے ہیں گورستان سے

یہ نہ سمجھیں آپ ہیں بڑا اپنی جان سے

آپ کو قبروں سے الفت، عشق ویرانے سے ہے

آپ گھبراتے ہیں جتنے جاگتے انسان سے

ہیں برہم خود محقق آپ ہندوستان کے

آپ نے نقشے کئے ہیں مہر کے دہان کے

زیر تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے

کس قدر بوجہ ہے بے غے گھر میں مومن خان کے

بانجے بچ کر بانجے پر یا بانجے بچ کر سات پر

دارغ نے توڑا تھا دم زانو پہ سنی جان کے

دھن ہے یہ ثابت کریں دلی قبا مٹن کا وطن

اور سودا کے چچا بوجھ تھے انگشتان کے

آپ کو ہے والہانہ عشق مخلوقات سے

جیسے خانے کو الفت ہو اندھیری رات سے

کرم خوردہ اور بوسیدہ کتابوں کے ورق

دھونڈ کر لاتے ہیں آپ اس شہر اس دیہات سے

گر کسی نے لکھ دیا یہ میر کے دو ہاتھ تھے

آپ اس کو رو کریں گے اپنی حقیقات سے

آپ کی تحقیق یہ ہوگی کہ لولہا تھا غریب

اور اسے ثابت کریں گے اس کی کلیات سے

مشرقی باقدوں کے کچھ فقرے
پندرہ اقوال سربرجوں کے
کچھ ادھر کچھ ادھر سے لیتا ہوں
اور مضمون گھسیٹ دیتا ہوں

ابہام، ابہال، اشاریت یا تجریدیت جس طرح جدید ادب کا حصہ بنی ہے مذاق کا مضمون اس وقت ہی ملتی ہیں جب اس سے متعلق ادب تجرید نہ ہو اور اس کے عوامل سے بے خبر ہو چکر بھی ایسی فقریں لکھتے یا اصرار کرتے ہیں۔ لیکن یہ صورت جدیدیت کے علمی دائرے میں نہیں آتی۔ بحر بھی ایسے جہاز ادب پیدا ہوئے جنہوں نے اس ضمن میں حقیقی رول انجام دیا۔ نئی انہیں کوئی نہیں پڑھتا لیکن بعض انہیں فطرت پر جا رہے ہیں انہیں نے جدیدیت کی منطق کو مسلم کیا پھر اس کو عقلی یا نظری سطح پر لایا۔ ادبی استثنائی امکانات پیدا نہیں کرتے اور ایک جمہور کی سطح پر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔ بہر طور اعلیٰ لطف سے خالی نہیں ہے۔

لی انجی ڈی کی ڈگری کے حصول کے لئے اور باتوں کے علاوہ ادبی کا مضمون ہے کہ پچھلے محققین کی در ایک کتابوں سے تجرید وغیرہ نقل کر لی جائے مبادا کسی اور کا ہواس میں لفظی ترجمہ کر لی جائے۔ لیکن اصل کام گہراں کو خوش رکھنا ہے اس کا اہتمام کیا جائے اور اسے کبھی نہ بھولا جائے۔ چنانچہ:

شاعر کو فرض کیجئے شاکر و سحر تھا
یا ہم سفر و حلقہ جوشِ نظیر تھا

یوں ہی وطن بھی اس کا گھنٹیں فرض کیجئے
جو آئے ہی میں باپ کا نام اس کے دیجئے

یعنی کہ سچ میں ہوں جو ادب حل و عقد
جنگ جگہ کے سہوے کیجئے جوشِ انگو نند

کیوں مقرر صرف کیجئے اندیشہ جات میں
لی انجی ڈی لوگ کرتے ہیں اب بات بات میں

ہر فرق علم و جہل کا مہدوم ہو گیا
تکلیں جس نے خدشہ دہی مہدوم ہو گیا

جہاں وہی نے شعرا پر حملہ کیا ہے وہ ان کی جہانی بوجھی دینا معلوم ہوئی ہے جس کے ذریعے سے ہر کوئی

اس لفظ میں لفظ باقدوں کی کم علمی کی باتیں ایک طرف کی طرح پیش کی گئی ہیں۔ سچائی کی بھی صورت پیدا نہیں کی گئی
ہاں یہ ضرور کہا گیا کہ چونکہ ہر لفظ و تاثر و لہجہ و لہجہ سے دے یا کام ہو گئے تو عقل نقد شروع کیا۔ جتنے یہ بھی ٹھیک
ہے۔ خود باقدوں کو اپنے کم علم باقدوں سے کہہ ہے۔

تجربہ نگاری ہمارے یہاں خاصی بدنام رہی ہے۔ انہی وجہ یہ ہے کہ اکثر تجربہ نگار سبب انگاری سے کام لیتے
ہیں۔ رسائل کے مدیر کتابوں کی تعظیم میں کر دیتے ہیں جیسے ان پر تجربہ کوئی بھی کر سکا ہے۔ انہیں موضوع کے لحاظ سے
ادبوں کی تلاش کا جو حکم نہیں اٹھانا پڑتا ہے مبادا کی میں ساری منزلیں اور غور طے ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ بعض
تجربہ نگار سرداری کے چند سطروں پر بیاہر لکھ دئے جاتے ہیں۔ ایسے میں وہی اگر تجربہ نگاروں کو نکالنا چاہتے ہیں تو
غلط نہیں ہے۔ ایک تجربہ نگار کا ملید کیجئے:

وہ جو لوگ میں پچھو رہے ہیں کہ اب
آئیے میں بتاؤں کیا ہیں آپ
ایک گھنٹے میں دس کتابوں پر
ادب و نقد و علم کا کام
کرتے ہیں کب مطالعہ حضرت
میں کے بولے مطالعہ کیا
سائے رکھ کے اک وید کتاب
ماہر فن تجربہ ہیں آپ
آپ گھنٹے میں تجربے کو فر
سارے موضوعات آپ کے ہیں تمام
کیسے ملتی ہے اس قدر فرصت
چوہ کے لکھا تو تجربہ کیا

لیکن اس لفظ کا ترجمہ جدید ادب کے بعض پیلوں کی تحقیق بھی ہے فن تجرید، ابہام، مشرقی باقدوں کے
فقرے وغیرہ جیسے الفاظ ذہنی کو دوسری طرف موڑ دیتے ہیں اور اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ طرہ نگار کے شرک کی
فحش کس چیز سے بھرنے والی ہے:

فن تجربہ کا یہ فیض ہے
زور ابہام کا بڑا جب سے
اب تو ہر آراء کا یہ ہے دستور
ہوگی مقبول خاص و عام وہی
کسی موضوع پر ہر کوئی کتاب
تجربہ کے لئے جب آتی ہے
قرن تجربہ کا دکھا کے کمال
کچھ خیالات مثبت و مثالی
کار مشکل جو سبب و آساں ہے
بھرے فن کو فی جلا تب سے
بات جس دہی بھی ہو علم سے دور
سرا جیسے کے اسی پر آپ بھی
لظم ہو، نثر ہو کہ علم حساب
بیری عقل رکھ لاتی ہے
بہم الفاظ کا بچا کے جال
کچھ اشارات عقلی و فنی

دیا ہے۔ یہاں کے تمام ترقی پسندوں کے دوسرے عقیدوں سے نہ صرف نا آشنا ہیں بلکہ بے حس بھی ہیں۔ انہیں گھر بال بچوں اور زگار کسی چیز کی فکر نہیں۔ فلسفیان کا مقدر اور شعر کہان کا تکلف ہے۔ اس پر غور یہ ہے کہ وہ یہ بھی جانتے کہ آخر وہ یہ سب کچھ کیوں کر دے ہیں، انشاء مراد میں اپنے شعر سنانا اور اصولی کران کی زندگی کا نصب العین ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک الگ تھلک "شعرستان" بھی بناتے ہیں، جو کابل اور نابلوں کی مملکت ہے۔ "مطلوبات داعی" ۱۹۹۲ء میں "شعرستان" کے عنوان سے دو نظمیں درج ہیں ان میں چند کے عنوان اس طرح ہیں: "خریکہ شعرستان"، "تکبیل شعرستان"، "شعرستان سے ایک خط"، "شعرستان میں شاعروں کا جائزہ"، "شعرستان میں دستور سازی کی کوشش"، "شعرستان کی فیئلس"، "شعرستان میں انکس"، "شعرستان میں کیونریزی"، "شعرستان اور ہند"، "شعرستان میں مکمل انقلاب"، "شعرستان میں شاعروں کا افواہ وغیرہ۔ دراصل داعی کے یہاں شعرستان ایک ایسا پلٹے فارم ہے جس کے حوالے سے محض وہ شعر و شاعری کے رموز زیر بحث نہیں لاتے بلکہ اس سے وابستہ زندگی کی دوسری شقیں بھی ابھر جاتی ہیں اس طرح کہ شعرستان کے حوالے سے کوئی بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اور ان کی ناہمواریوں سے آشنا ہو سکتا۔

فرقت کا کوروی

(۱۹۱۳ء۔ ۱۹۷۳ء)

ان کا پورا نام غلام محمد تھا لیکن فرقت کا کوروی کے نام سے مشہور ہوئے۔ دراصل موصوف قصبہ کا کوروی کے رہنے والے تھے، جو بچہ لیا میں ہے۔ ان کے جد امجد بقول خود مولوی محمد حسن کا کوروی تھے۔ جن کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا۔ واضح ہو کہ یہ نعت کے بہت مشہور شاعر تھے۔ لیکن مالک رام سمجھتے ہیں کہ دراصل فرقت کی نانی جن کا نام نور الدین تھم تھا کہ وہ نکلے، ماسوں زاد بھائی تھے۔ ان کے والد شوکت علی تھے۔ ان کی والدہ کا نام احتشام النساء تھا۔ جو انہیں احمد عباس کی بہن تھیں۔ فرقت ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے لیکن مالک رام کا قیاس ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۱۰ء ہونا چاہئے۔ حالانکہ فرقت نے خود لکھا ہے کہ وہ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے حالات زندگی اپنے مجموعہ "کام" "ناروا" میں مختصر قلمبند کیے ہیں۔ فرقت اپنے باپ کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ ابتدائیں روایت کے مطابق اردو، فارسی، پریمی، دیگر مکرر نعت، اسکول، حسین آباد میں داخل ہوئے لیکن یہاں تعلیم کا سلسلہ جاری نہ ہو سکا اور وہ اس وقت کھٹوا مکے کے جب ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔ ابتدائیں انہوں نے بعض رسائل میں لکھنا شروع کیا جو چاہے پھر بھی حالت بہت خراب رہی۔ بچوں کو بچہ خانے کا کام شروع کیا لیکن اس سے تو اسکول کی فیس بھی ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہو سکیں۔ ایسے ہی ناگفت بہ حالات میں ۱۹۳۱ء میں انٹر پاس کیا تو رجب "حقیقت" کے نائب مدبہ ہو گئے۔ اسے خردگی کو بچوں میں بچا بھی کرتے تھے۔ چھٹی انہوں نے مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا تھا جس کا عنوان تھا "کف گل فروش" اب تک ان کی نظم کی پیاس بھی نہیں تھی بلکہ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے ندرستی سے لی اسے پاس کیا۔ پھر New Crescent

بقدر اس سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن یہ سالہ زیادہ انہیں چاہتا انہوں نے "معاذت" جاری کیا۔ اس کی بھی محدود سال سے زیادہ مدد ملی۔ پھر وہ ایک سوانحی کے کارخانہ میں چروا کر ہو گئے۔ جہاں سے انہیں ذہنی و تنہائی و تنہا پناہ اس کے بعد وہ نیو نیپالی میں کلرک ہو گئے۔ انہیں حالات میں کھٹوا پورہ سٹی سے ۱۹۳۵ء میں تاریخ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ یو پی حکومت کے پبلک ڈیپارٹمنٹ میں چاہتے تھے کہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہے۔ ۱۹۳۶ء میں حلیم کانی کا پورہ میں تاریخ پڑھانے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے اردو میں انکم اے کے اور علی گڑھ سے بی ایڈ کی سند لی۔ اس سے پہلے انھوں نے ایک اسکول میں ٹیچر ہونے اور آخری وقت تک یہیں ملازمت کرتے رہے۔ وہ ملازمت پر غور بھی نہیں رہے۔ عسرت کی زندگی بہت گزارتے رہے۔ شاعری کے وسیلے سے مختلف ماحولوں میں شریک ہوا کرتے۔ شب بیداری کی فورت آتی ہی دیتی۔ اس سلسلے میں مشاعرے پڑھتے پھرنا گئے تھے لیکن فریقین میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ ساخوانہ ۱۹ جنوری ۱۹۷۳ء کو ہوا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ لاش کس کی ہے۔ اس لئے کہ اسے شکل مرادے میں ڈھینے سے آرا لیا تھا۔ چارلس کی اسلامی انجمن نے انہیں گنج شہید الی میں دفن کر دیا۔

فرقت محفل ایک کالم نویس نہیں تھے۔ انہوں نے بطور مزاح کی دنیا کو بیچ کر چاہا۔ لیکن وہ ترقی پسند شخصیتوں سے بے پروا نہ رہتے تھے۔ لہذا فرقت اس پوری تحریک سے اور اس سے متعلقہ قواد کے گتہ ہیں ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ترقی پسندوں نے انہیں نظر انداز کر شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند انہیں کسی قسم کی کوئی اہمیت نہیں دیتے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ فرقت کے مزاح میں طنزی کی کا پہلو زیادہ نمایاں رہا ہے۔ وہ انسانی خرابیات کے تحت ایسے کالم لکھتے جو مقبول ہوں۔ لہذا ان کا کمال تکمیل پہنچتے۔ لیکن ان کی قریوں کا موازنہ یہ جانا ہے کہ وہ انہی مقصدیت کے ایک ہاشور قنار بھی رہے ہیں۔ بعض جگہ جہاں وہ طنح سے الگ ہوئے ہیں کہ ان کی طنحیہ کی حاصل قریوں پہلوڑی ہیں۔ ان کے اختراع میں یہ صورت زیادہ نمایاں ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی "کف گل فروش" کے مزاحیہ کالم کا نظریہ ان کا بچانے تو بطور مزاح کے ایک اہم شاعرین کے ابھرے ہیں۔ ان کی گفتگو "تصنیف کامل لحاظ ہے۔ ان کی کتابیں "ناروا" ۱۹۳۳ء میں "ناروا" ۱۹۳۶ء میں "کف گل فروش" ۱۹۵۵ء میں سامنے آئیں۔ ان کے علاوہ "مردوں کی لکھا خاک جیا کرتے ہیں"، "میدہ ودف"، "شرقی قریوں"، "مرد ادب میں طنز و مزاح"، "مزاحیہ شرح و بیان غالب"، "غالب نعت کے بغیر" اور "تدبیر" ان کی یادگار ہیں۔

کیا جا سکتا ہے کہ طنز و مزاح کی دفاعی جن شعرا سے وابستہ رہی ہے ان میں ایک نام کا کوروی کا بھی ہے۔ ان کے کچھ شعرا مرنے کے طور پر درج کرتا ہوں:

حسن اور عشق کی مل جل کے ہر ہو گئے

دمل آساں ہے بہر حال، مگر ہو گئے

گلا کا شعر ہے، محبوب بھی کہتے ہیں ہوا

ایسی حالت میں کوئی شیر و شکر ہو گئے

شیخ جی کھس مجھے جنت میں نہ جانے کیسے
اور پھر وہاں سے نکالے مجھے جیسے نیچے
پہنچا لوگوں نے حضور آپ پلٹ کیوں آئے
بولے وہاں بھی ہیں بونہی لوگ کچھ ایسے ویسے

فکرتو نسوی

(۱۹۱۸ء - ۱۹۸۷ء)

ان کا اصل نام نرائن تھا لیکن اسکول میں رام لال لکھایا گیا لیکن فکرتو نسوی کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد وحید رائے تھے۔ فکرتو نسوی ۷ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں شجاع آباد ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ (ضلع ذریعہ جاری حادیہ پاکستان) ان کے والد تجارت و شہرے تھے لیکن جوئے بازی کی عادت تھی جس سے گھر میں عمرت رہتی تھی اور گھر کی مالی حالت ہمیشہ خستہ رہی۔ ان کے والد کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوئے تھے۔ بڑے قریبی کے اسباب کی بنا پر بچہ۔

ابتدائی تعلیم کے بعد قوتیہ میں کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد میرمن کالج ملتان میں داخل ہوئے لیکن مالی مشکلات کی بنا پر تعلیم کو سلسلہ ختم ہوا اور اپنے والد کی دکان پر کام کرنے لگے لیکن اس میں دل نہ لگا، اقتصاد کی بد حالی کا کام لیا۔ مختلف قسم کے کام کئے۔ مثلاً ٹیچر، بٹلر، نوکی، تاجروں کی انجینی، دکانداروں کی ایڈیٹری وغیرہ۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۲ء تک قائم رہا۔

فکرتو نسوی بہت اسکول میں تھے تو نہیں کہنے لگے تھے اور اخباروں میں چھپتے تھے لیکن ۱۹۳۲ء میں "اردو دنیا" میں ان کی نظم "شہنائی" شائع ہوئی تو ان کی ادبی حیثیت نمایاں ہو گئی اس لئے کہ ملتان اخبار نے اسے اس سال کی بھرتی نظم قرار دیا۔ اس کے بعد وترقی پسند اور نئی تحریک کے ترجمان "ادب لطیف" وغیرہ میں شائع ہونے لگے۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے ممتاز شاعری کے اشتراک سے دو ماہی رسالہ "سویا" جاری کیا پھر "ادب لطیف" کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۳۷ء میں فکرتو وراثت وراثت کی بنا پر شاعری ترک کر دی اور نثر میں حراج اور طنز لکھنے لگے۔ ان کی سب سے پہلی نثری تصنیف "چاندوریا" ہے، ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ لسانات کے موضوع پر ہے اور انداز کی شکل میں ہے۔ انہوں نے لسانات پر ایک کتاب "ساتواں شاعر" شائع کیا۔ انہوں نے اپنی تصنیف کی جو تفصیلی پیش کی وہ اس طرح ہے:

تیرہم شخص (۱۹۵۳ء) پر ویلنسر جیو (۱۹۵۳ء)، ڈاکٹر ان الدین (۱۹۵۵ء) عدو خال (۱۹۵۵ء)، ساتواں شاعر (۱۹۵۶ء) ہم ہندوستانی (۱۹۵۶ء)، ۱۹۵۷ء، ۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۵۹ء، آخری کتاب (۱۹۶۰ء)، فکرتو نامہ (۱۹۶۲ء)، پانچ کے چھٹے (۱۹۶۴ء)، فکرتو نامی (۱۹۸۴ء)، فکرتو میں جیو (۱۹۸۳ء) میں "آپ جی" اور

فکرتو نسوی نے کالم نگاری بھی کی۔ ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامے بھی لکھے، جیو کے لئے بھی ڈرامے قلم بند کئے اور ایک ادبی مجلہ "رفیق" بھی جاری کیا جو بلند قیامت ہو گیا۔ روزنامہ "نیا زمانہ" میں کالم نگاری کی۔ ۱۹۵۳ء سے باضابطہ کیونٹ پارٹی آف انڈیا کے ممبر ہو گئے۔ یہ تمام امور خیر فکرتو نسوی نے "سمن کر" کے عنوان سے "آئینہ" نامی دہلی میں شائع کیا تھا، جو لیپ گنگ کی مرتب کتاب "مفتاب مضامین فکرتو نسوی" میں صفحہ ۱۳۳ سے صفحہ ۱۸۷ تک مچھا ہے۔

فکرتو نسوی ہمارے مزاحیہ نگاروں میں ادبی نگار دیکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں لکری جوت بھی ہوتی ہے جس میں طنز و مزاح کے تیر چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ زندگی کا کرب انہوں نے جس طرح جھیلایا ہے اور جس طرح حلایا: انصافوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے وہ سب ان کی تحقیقات کا حصہ ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے یہاں ادبی شان ہر جگہ نمایاں ہے۔ اخبار کے کالم بھی اس وصف سے عاری نہیں۔ انہوں نے سیاسی طنز کو بڑی خوبی سے برکت کی کوشش کی اور اس کی کامیابیوں کو بڑے خلوص کے ساتھ برتا ہے طنز و مزاح کا عنصر مزید دلکشی بخشا دیتا ہے۔ فکرتو نسوی کے سلیے میں لیپ گنگ لکھتے ہیں:-

"فکرتو نسوی کو اپنی زندگی میں بے شمار اعزازات ملے اور بے شمار ایسے اعزازات نہیں ملے جن کا وہ بیضیہ حق دار تھا۔ لیکن میرا یقین ہے کہ شاعری و سلسلہ کی زندگی یا ادب پر کوئی نمایاں فرق پیدا نہ کر سکتا تھا۔ اس کی اپنے قارئین میں بے پناہ مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ اس نے وہی زندگی کی جس کا وہ داستان گو بنا۔ بہت کم لوگوں کو یہ صلاحیت ملتی ہے کہ اس دنیا میں وہ گردہ و صرف دوسروں کے اندر جھانک سکیں بلکہ خود کو اس طرح بے نقاب کر سکیں کہ دین پر سے چڑی تنک اتر جائے۔ فکرتو نسوی بہت کم لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس نے اپنی آپ بیتی میں جس فکری، دماغی کی ہے شاید وہ کوئی دشمن بھی نہ کر سکتا تھا۔ آپ بیتی میں قربانیاں جو فکری جھوٹ کی ملاوٹ کا برا نہیں مانتا جاتا۔ لیکن لکھنے اس تسلیم و قبول کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس نے اپنے ایک مضمون "قبر سے واپسی" میں ایک ایسے جیسے کا ذکر کیا ہے جو اس کی فرضی موت کے بعد اس کی یاد میں کیا گیا۔ فکری دور بینی اور فکری آشنائی کی اس سے بھر گیا مثال دی جاسکتی ہے کہ فکری منتقلی موت کے بعد جو آتی جیسے ہوئے ان میں اکثر جیوں میں بھی احساس ہوا کہ لوگ وہی فکرتو نسوی کے ہیں جن کی امید فکرتو نسوی کے ہوئے تھا۔"

فکرتو نسوی نے یہاں طنز و مزاح کے صحافت میں انقلاب و مصائب و آفام، اختصار، مہاری اور کارکی وغیرہ پر فہم تھی توجہ دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ان کا تجربہ اور مقام و دلوں میں وہم ہو کر ایک نئی صورت پیدا کرتے ہیں۔ ان کا فن مختلف چیزوں میں معاملات و امور کے کاغذی فن ہے جس سے ان کے اسلوب کی شکل نکلتی ہے۔

ایک اور جیلو جڑنگر کے یہاں نمایاں نظر آتا ہے وہ ان کی اپنی ذات ہے۔ وہ اپنی ذات کو معاف نہیں کرتے اور اپنے حوالے سے دوسروں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمل سے ان کے یہاں ایک غمزہ خاص پیدا ہو گیا ہے جو اپنے آپ پر بیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کو کیسے معاف کر سکتا ہے۔ لہذا انکی غمزہ احساسی سماج کا احتساب میں جاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ طالب سے قریب ہو جاتے ہیں اور یہ ایک بڑی اہم بات ہے امان اللہ خاں شیرانی لکھتے ہیں:-

خود اپنی ذات اور اپنی رفیق حیات کو نشانہ بنا کر انہوں نے ایسے ایسے تیر و تشر چلائے ہیں جن

سے سماجی بدعنوانیاں اور بدعاشیوں کی بے انتہا الیاں تھلا گئیں۔"

فکرو نسوی کے انہم مقدمات میں چند کے نام تصدیق کر رہا ہوں:-

"یہودیوں کی خرید و بیع" "ار کے لئے کشتی کی ضرورت" "محلہ سودھار کشتی" "ہارنٹ گرفتاری" "مجھے

ایدارہ" "قبر سے راجی" "سیر اپنے بچہ" "موت" "خاکہ" "میر و میر و میر و میر"

فکرو نسوی کا انتقال ۱۹۸۸ء میں ہوا۔

حسین عظیم آبادی

(۱۹۲۸ء-)

ان کا اصل نام سیہ محمد حسین ہے۔ ان کے والد کا نام سیہ محمد رشید تھا۔ پیدائش ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں چند میں ہوئی۔

یہیں تعلیم بھی حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آئی اے اے اے اور ایم اے کے امتحانات چند یونیورسٹی سے پاس کئے۔

لیکن بہادر یونیورسٹی مظفر پور سے ۱۹۵۶ء میں بی اے کی ڈگری لی۔ اب تک صوبہ بہار کی کسی یونیورسٹی سے کسی کو بھی

بی اے کی ڈگری انگریزی میں نہیں دی گئی تھی۔ حسین صاحب کا یہ اعتبار ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے یہ ڈگری لی۔ تعلیم

کے حصول کے بعد دس دس دس سے وابستہ ہو گئے۔ مگر پھر یونیورسٹی میں رہے اور اس کے بعد صدر شعبہ کی حیثیت سے

سکندری ہوئے۔ ان کی تصنیفات ہتھ لیا تھیں میں کی کتابیں ہیں۔ مثلاً "بہار کے نور چراغ" "موت و موتی" "الطاف خاطر"۔

"صنف انتہا نیا اور چند انتہائے"۔

ڈاکٹر حسین یوں تو مختلف موضوعات پر لکھتے رہے لیکن ان کا اصل میدان انتہا ہے۔ ان میں ان کی حرجہ

کتاب بہت مشہور ہے اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں داخلہ نصاب میں ہے۔ دراصل حسین ان لوگوں

میں ہیں جنہوں نے انتہا کے اہتمام و تنظیم کی کوششیں کیں اور اس کے حدود متعین کرنے چاہے۔ وہ بڑے آقا اور دوسرے

لوگوں نے اس سلسلہ میں اہم کام کئے ہیں لیکن حسین کی کاوشیں تاریخی اعتبار سے مقدم ہے۔ انتہا کی ایک ایسی صنف

ہے جو آج بھی بحث طلب ہے۔ دوسرے امور کے علاوہ بطور مزاح سے اس کا کیا رشتہ ہے، عجیب و غریب صنفین سے اس کا کیا

تعلق ہے، دوسری صنفوں سے الگ اس کے اشتیاقات کیا ہیں، اس پر حسنین نے اچھی بحث کی ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ہے اس صنف کی جہوں میں اترنے کی کوشش کی جا رہی ہیں اور اس کی ستون کا سب سے مطالبات کے تحت تعین کیا جا رہا ہے۔ لیکن جس انداز سے حسنین نے اس صنف کو اعتبار کا درجہ دینے میں پہل کی وہ تاریخی واقعہ ہے جسکی بڑی پراگندہ ہوتی رہے گی۔

موصوف نے خود بھی انتہا کے کچھ ہیں اور ایک مجموعہ بھی طبع ہوا۔ لیکن متعلقہ مجموعے کے انتہا کیوں کا جائزہ

ابھی تک نہیں لیا جاسکا ہے۔ میں اس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ انتہا کی نگار کی حیثیت سے موصوف کی کوئی خاص جگہ نہیں۔ اس

لئے کہ بعض انکار جو بطور مزاح سے وابستہ ہیں انہوں نے اس فن کو بڑی جرات مندی ہے۔

حسین کے خاکے بھی اچھے ہیں۔ عظیم آباد کے بعض معروف (اور غیر معروف بھی) لوگوں کے خاکے دلچسپ

ہیں اور آج بھی قابل مطالعہ ہیں اس لئے "بہار کے نور چراغ" ایک اچھی کتاب ہے۔

سیہ محمد حسین نے فکرو نسوی پر تحقیق کی تھی۔ یہ سندی مقالہ شائع ہو چکا ہے اور انکی اعتبار سے اہم ہے۔

حسین صاحب نے چند افسانے بھی لکھے تھے۔ یہ صنف ان کی ابتدائی دلچسپی میں رہی تھی لیکن ان کے

افسانے زیادہ تر زمانی ہیں جن میں سماجی احوال کو ایک پارٹیشن پائے۔

سیہ محمد حسین کے اسلوب کے سلسلے میں کچھ لکھتے ہوئے نگاہیں محسوس ہوتی ہے۔ انہیں اپنے طور پر لفظوں کو

ایک خاص جہت سے استعمال کرنے میں شاید خاصا تلف آتا تھا لیکن انکی ترکیبیں بھی سامنے آتھیں کہ ٹھیک فخری کی تیغ

تک پہنچ جاتیں۔ ویسے تو ان کا کام آزاد کی ترانہ کی نگاہ میں رہتی تھی لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے وہ آزاد کا تتبع کر رہے

تھے۔ دراصل ان کا تھکنی زبان لفظوں کی حرمت کو مسلسل غریب لگا رہا تھا۔ پھر بھی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس افاق

ہے کہ اس پر نگاہ رکھی جائے۔

موصوف کی دفاع اسلام آباد میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں ہوئی۔ دراصل وہ اپنی سماجی آزادی کو دیکھنے کے لئے

وہاں گئے ہوئے تھے لیکن قلب کے مریض تھے چاک اس کا حملہ ہوا اور چاہر نہ ہو سکے۔ ہندوستان آتا قصبہ نہیں ہوا اور

وہیں دفن ہوئے۔ طویل عرصہ کی رقی نے وفات تاریخ کہا:

سوچا قصوں اصاف کی تاریخ

نالا ہاتھ کہ رقی ہم انتہا

جا کے خاموش ہوا دھڑلے سے دور

"خوشی فخر سچا حسین" آد

ان کا اصلی نام دادہ شفیق الرحمن ہے۔ دراصل ان کے اسلاف میں کچھ لوگ رہ چکے تھے جو انھوں نے لیکن انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ شفیق الرحمن کا تعلق اسی سلسلے سے ہے۔ ابتدائی اور ایف ایس سی میٹرک کی تعلیم کے بعد لاہور کے شاہ ایف ڈی روڈ میں کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے انگریزی میں ایف ایس کا امتحان پاس کر لیا۔ ۱۹۴۱ء میں ان کی پہلی کتاب ”کرشمیں“ شائع ہوئی۔ اس کتاب کا دیا چاہا ب اعتبار اعلیٰ نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے بعد انہوں نے فوجی ملازمت اختیار کر لی۔ ان دنوں فوج میں ڈاکٹر کی بڑی مانگ تھی۔

چونکہ ”کرشمیں“ بہت پسند کیا گیا اور شفیق الرحمن کی مسلسل بڑبڑائی ہوئی رہی تو ان کا حوصلہ اور بھی بڑھا اور ایک ایک سال کے وقفے سے ان کی متعدد کتابیں چھپتی رہیں۔ جیسے ”گلشن“، ”گہریں“، ”دو جزو“، ”ہاتھیں“ اور ”بچے تارے“۔ یہ سب کتابیں چھپتی رہیں اور ان کی شہرت کا حلقہ بڑھ گیا۔ اس حد تک کہ ان کی کتابوں کے مختلف ایڈیشن چھپ رہے ہیں۔ اس سے پہلے شفیق الرحمن نے ڈاکٹری کی ڈگری میں بھی اضافے کئے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ فوج کی طرف سے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے اور بہت سی ڈگریاں حاصل کیں۔

شفیق الرحمن کے ذہن و دماغ کو فطری مزاج کی طرف رافع کرنے میں ان کے ابتدائی مصاحبات نے خاصا رول ادا کیا ہے۔ انہوں نے اسکول کے زمانے میں انہما کی کہانیاں چھپی تھیں۔ ان کی کہانیوں کے اثرات ان کے ذہن میں مرقم رہے تھے۔ مزاج کے باب میں ان کے استاد ایک کنیڈین مصنف اسٹیفن کو با تھا تھا۔ اس کی کتاب وہ مسلسل پڑھتے رہے جس کی کتاب نے ان پر خاص اثر ڈالا۔

شفیق الرحمن نے بہت لکھا ہے لیکن ان کی زندگی جلد پر مبنی نہیں۔ ان کے ایک دوست محمد خالد اختر لکھتے ہیں کہ۔

”شفیق اصل نویسن نہیں ہے، جیسا کہ اس کی مثنوی ہے۔ ساخو درانی سے کئی ایک لوگ ان کو گار۔ اس نے آج تک کوئی چیز قلم برداشت یا ایک نصیحت میں نہیں لکھی۔ جب کسی چیز یا کہانی کے جراثیم اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں تو وہ اس پر انہی طرح سوچتا ہے۔ اپنے دوستوں سے مشوروں کی خاطر اس پر بحث کرتا ہے۔ اپنی کاپی کب کے میسوں میں رکھ داریں گے اس کے اکتان اور پلاٹ کے مختلف ممکنات سے سیادہ کر ڈالتا ہے۔ کئی کئی دفعہ وہ ایک شخص کی طرح اس آئینہ کی چگالی کرتا رہتا ہے اور جب تک اسے پورا اطمینان نہیں ہو جاتا ہے، وہ اصلی کہانی کا نقشہ شروع نہیں کرتا۔“

”بچے تارے“، ”دو جزو“ اور ”دو جزو“ کی انگریزی زبان میں دو تین سیٹیں کی مسلسل

سوج اور محنت کا نتیجہ ہیں۔ اکثر وہ ایک کہانی کو دو بار دو بار بار دیکھتے گا۔ اور اسے اشاعت کیلئے اس وقت تک نہ بھیجے گا جب تک اس کا ذہن رات جھیر (Artistic Conscience) اسے پریشان کرے گا۔ اسے اشاعت کے لئے بھیج دے گا۔ یہ اچھی چیز ہے۔ وہ ایک مسجد پر دست و پاؤں کا کارخانہ ہے۔ وہ اپنے بڑے ہونے والے کوسوں کے لئے فصل ادا کر رہا تھا۔“

شفیق الرحمن مزاج نگار بھی ہیں اور پیرا سٹ بھی۔ انہوں نے اس سلسلے کے کئی اعلیٰ مضامین لکھے ہیں۔ جن میں وہ بان کا عنصر بہت تیز ہے۔ ان کے چھ دنوں میں ”فدہ عاتم طائی“ بہت مشہور ہے۔ حاتم طائی کا عاشقانہ زندگی میں شفیق الرحمن کی اپنی محبت دیکھی جاسکتی ہے۔ شفیق نے ایک کیریکچر شیطان میرزا کے حوالے سے تخلیق کیا ہے جو اردو میں ڈنڈہ کرباروں کی ایک مثال ہے۔

شفیق الرحمن ہنگامی شعور کا تاج پوش ہے۔ لیکن ان کے یہاں عام آدمیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ خود ایک روحانی زندگی گزارنے والا شخص اخلاقی اقدار کا ایک اہم پاسور ہو کر ابھرا ہے اور اس کی تحریروں میں ان کے حفظ کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔

واقعہ ہو کہ اکثر اپنی تحریروں میں وہ اپنے کردار کی خوبیاں بھی اپنی ذات سے وابستہ کر کے ان کی تخلیق کرتے ہیں۔ اس کی واضح مثال ان کا شاہکار ناول ”برساتی“ ہے جس میں اعلیٰ درجے کی مثنوی خوب ملتی ہے۔

شفیق الرحمن اردو کے طرز پر اور حرا ادب میں ایک نئے طور کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں، لہذا ان کی ادبیت بہت صوفی کی جاتی رہے گی۔

یوسف ناظم

(۱۹۴۱ء)

یوسف ناظم کا اصل نام سید محمد یوسف ہے۔ ان کے والد سید محمد ایوب تھے۔ چلم کی پیدائش ۱۹۴۱ء جولائی (مہاراشٹر) میں ہوئی۔ ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔

یوسف ناظم سرکاری ملازمت سے یکدم ہٹ گئے تو کالم نویس اور مضمون نگاری کرنے لگے۔ انہوں نے فطری مزاج کی راہ اپنائی اور پہلا مجموعہ ”کیل (کم)“ ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ جب سے اب تک ان کی چار کتابیں (۴۴) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آخری کتاب جو حال میں شائع ہوئی ہے اس کا نام ”بڑے نام“ ہے۔ دوسری کتابوں میں ”فت نوٹ“، ”دیار ہے“، ”زیر غور“، ”ساتھ بھائی“، ”نقطہ“، ”البتہ“، ”آخر خیر“ اور ”الکلیات“ اہم ہیں۔ ان کے لئے بھی انہوں نے کتابیں لکھی ہیں جیسے ”پلک نہ مارو“، ”الف سے کی کہ“، ”مرفی کی چار کتابیں“، ”گاندھی جی ہندی آخریت میں“۔ یہ

تفصیلی "ہندوستان کے مصنفین اور شعرا" مرتبہ گوپی چند ہارگ اور عبد اللطیف اعظمی کے صفر ۱۳۹۳ء سے ماخوذ ہے۔

یوسف تاظم ایک ایسے شاعر ہیں جن کی تمام شاعریات اعلیٰ نظر سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کی عمر ۸۰ برس ہو چکی ہے۔ وہ گدڑو ساٹھ برسوں سے طرز و مزاج کے میدان میں ہیں لیکن اب تک ان کی تحریروں کی تازگی برقرار ہے۔

یوسف تاظم اپنی شرافت و خصوصیات اور زندگی کے لئے معروف ہیں۔ حکومت کے اعلیٰ عہدے پر رہے لیکن ان کے یہ اوصاف ذہنی نہ ہو سکے اور ان کی فطری مہویت انہیں لوگوں سے قریب کرتی رہی۔ سنجیدگی ان کی تمام تحریروں کا خاصہ ہے۔ جہاں طنز و لہجہ دکھاتے ہیں وہاں بھی ناصیت سنجیدگی برقرار رہتی ہے۔ ان کی تحریروں کے اندر کثرت کی تفہیم کے لئے ان کی سنجیدگی کے پردے اٹھانے پڑتے ہیں اس لئے کہ وہ جارحانہ اور تنبیہ کرتے بالظنون انھوں میں سماجی ہمارواریوں کی سطح تک پہنچتے ہیں اور اس دھرمندی سے کہ اس کا خاکہ اپنی معلوم نہیں ہوتا۔ طرز و مزاج کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں غور و فکر ہوتا ہے۔ قیاسی یا زاری ہو بلکہ اس کے حسن میں یہ ہے کہ کثرت نے پائے والے آہنچیت اس سے اس طرح محسوس کرتے کہ اس کی تکلف نادر باقی رہے۔ غایت جارحیت بہت پر اثر نہیں ہوتی لیکن اسی سطح کو آواز دیا کر پیش کیا جائے تو اس کا کیف الگ ہی ہوتا ہے۔ یوسف تاظم اس رویے آگاہ ہیں اور اپنی تحریروں کو ایسے ہی وصف سے متصف کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں جدوجہدات ملتے ہیں۔ ان کا بیان بھی ڈاکٹر تک نہیں ہوتا بلکہ لفظوں کی ترقیب و تہذیب سے واقعات نمودار ہوتے ہیں۔ جن میں طرز و مزاج کا عنصر زیر اثر ہوا کی طرح ہوتا ہے جن سے ایک خوشگوار انصاف برپا ہوتی ہے۔ لفظوں کی تہذیب و ترقیب کی بات آگئی ہے تو یوسف تاظم کے معاملے میں اور دگر بڑی کے جلالت کے نظام سے واقفیت ضروری ہے۔ دراصل وہ دیگر آف ان پیس کے استعمال کے بغیر حسن گوشت کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کے یہاں قول محال کی جو افراطی ہے اس کا احساس کیا جاسکتا ہے۔

یوسف تاظم جب خاکے لکھتے ہیں تب بھی ان کا طریقہ کار یکساں رہتا ہے۔ یہ خاکے کہ ان کے یہاں واقعات معلومات کا کوئی خزانہ نہیں معلوم ہوتے لیکن کردار کی تفہیم میں بعض واقعات کی تہذیب میں انہیں قابل مطالعہ بنا دیتی ہے۔ یوسف تاظم ہمارے طرز و مزاج کے چند اہم ادیبوں میں ایک ہیں جن کی جگہ ادب و تاریخ میں محفوظ ہے۔

مشتاق احمد یوسفی

مجھے انیسویں ہے کہ اسے معروف اور منفرد طرز و مزاج کہنے والے مشتاق احمد یوسفی کی زندگی کی تفصیل حاصل نہیں ہو سکی لیکن پروفیسر محمد حسن اپنے ایک مضمون "سیرت نگاروں کا حیدر" مشتاق احمد یوسفی میں چند نئے اس طرح لکھتے ہیں:-

"پیدائش ہندوستان کی ریاست اورا جستان کے علاقہ بارداڑ کی ہے جو بقول خود ان کے

ادیب راجیشاں اور سدی حسن کے لئے مشہور ہے۔ سن ۱۸۶۳ء کو ۶۵ کا ہوا جس سے

محققین ان کا سال پیدائش نکال سکتے ہیں (کیونکہ اپنی خود نوشت مزاج عمری اور گزشتہ لکھتے

کے بار چودہویں حالات زندگی کی تدوین میں کسی قسم کا تعاون کرنے سے بچنے کے ساتھ گریز اس میں اعلیٰ گزشتہ مسلم برہمنی میں ذہن تعلیم رہے اور اس کے باوجود جس مزاج بچا کے لئے آئے (ایم اے اور کالج کی بات دوسری تھی جس نے رشید احمد صدیقی کو پیدا کیا تھا) پاکستان بنا تو پہلے وہاں پھر لندن میں بقول ان کے کوچہ سوڈو خراسانی بینک کی ملازمت جس طرز و مزاج کی زندگی کے آپرضن کے بعد اب پھر بینک آف کریڈٹ ایڈز کا مرس لندن سے سبکدوشی حاصل کر کے پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ چار کتابیں کے مصنف ہیں جو چاروں کموشٹ شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکی ہیں "چرخ و گھم" "خاکہ بدیع" "اور گزشتہ" اور ایک کوئی اور اب تازہ تصنیف "آب گوہ"۔

لیکن ایک انداز میں انہوں نے اثرات قبول کرنے کے بارے میں کئی اشارے کئے ہیں۔ آصف خاں کی ایک سوال کے جواب میں کہ آپ نے جن مزاج نگاروں کا ابھی ذکر کیا تھا آپ ان میں سے کون لوگوں سے کافی قربت محسوس کرتے ہیں۔ بچائی لے جو بار دوسری باتوں کے علاوہ وضاحت کی کہ:-

"یہ جتنے نام میں نے آپ کو گوائے، جنرل مشتاق الرحمن، کرل محمد حسن، حمید حفیظی، ایم اے افغان، محمد طاہر اختر، سید حسین اور یوسف تاظم اور دوسرے اور پطرس اور رشید احمد صدیقی تو ظاہر ہے کہ سرپرست ہیں۔ تو یہ ایک بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہم ایسے ادیبوں سے مل سکیں جو اس میں یہ خاکہ نہیں پڑھنے کو لگا رہے یہ حضرات نہ ہوتے ہم جو خاکہ لکھ رہے ہیں وہ اس لئے لکھ رہے ہیں کہ یہ حضرات ہم سے پہلے یا ہمارے زبانی نے میں لکھ رہے تھے جہاں تک پسندیدہ کا تعلق تو وہ سب پسند ہیں لیکن پطرس آج بھی ایسا ہے کہ کبھی گاڑی انک جاتی ہے تو اس کا ایک صفحہ کھولتے ہیں تو وہ ان کی بہت سی گریں کھل جاتی ہیں اور اہم وہاں ہو جاتا ہے۔ یہ پطرس میں بات ہے لیکن ایک بات میں عرض کروں کہ یہ سوال محوم پھر کرتا ہے یہاں تک میرے اندر کا تعلق ہے وہ انگریزی مصنفین ہیں۔

سوال: اچھا مثلاً کون سے مصنف آپ کو پسند ہیں؟

یوسفی: مثلاً ایک نو لیکن جو بار آدم ہیں مزاج نگاری کے۔ سوکھت وہاں Humanist نہیں جتنے کہ Satinist ہیں۔ انھیں لی کا کہ پھر جارح کش اور ادھر مصنفین میں شعر جو اس اور پھر اتھولی پر جس میں ان سے میں انگریز لفظ ہی استعمال کیا جائے تو اس سے Influenced یا Influenced ہو تو ان کا نام ملوں گا۔ ایک زمانے میں ہوں۔ اگر پوچھا جائے کہ کس سے Influenced ہو تو ان کا نام ملوں گا۔ ایک زمانے میں

مجھ پر آڑیں ڈال بھی بہت سوار ہوا تھا اور کبھی کبھی مجھے اس بجز سے ضرور مایوسی ہوتی ہے کہ لوگ میری تحریروں میں حقیقی یا فرضی پر چھائیوں کبھی رشید احمد صدیقی کی یا کبھی پطرس کی ان کو دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن جو میرے اصلی مآخذ ہیں ان کی طرف آج تک کسی کی نظر نہیں گئی۔"

ان امور سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ایک طرف تو یہ نفی اردو کے طرز و مزاج کی روایت سے بخوبی آشنا ہیں بلکہ انکی روایات پر مبنی نظر بھی ہے تو دوسری طرف انگریزی کے معروف فنکاروں سے ان کے تعلق خاطر کا بھی پتہ چلتا ہے بلکہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی تحریر کی تازگی اور دلچسپی، حاصل فیض جہاٹس اور ڈرل جیسے فنکاروں کی بھی مرہون دست ہے۔ جنکو جہاٹس یٹیسس میں ایک تجربہ کر چکا تھا۔ زبان کے معاملے میں ایک دوسرا جہت انگریز بلکہ طشکی تجربہ پیش کشیں ایک سے سامنے آیا تھا۔ ڈرل نے جس طرح اپنی نرطونی انگڑیاں کھینچ کر انگریزی اور ہنس نظر میں پیش کیا تھا وہ بہت ہی اہم فنکارانہ قد و قامت کی چیز تھی۔ ایسے اسلوب سے یوتنی متاثر تھے بلکہ اثر کے حصول کے لئے وہ اپنے مطالعے کو کیسے کیف و کم سے آشنا کر سکتے تھے یہ صورت بھی سامنے آتی ہے اس لئے پطرس یا رشید احمد صدیقی یا کسی دوسرے طرز و مزاج نگار سے ان کا موازنہ بہت دور تک نہیں لے جائے گا۔ دراصل ان کا مزاج انڈر کرنت کے طور پر طر میں مہل ہو جاتا ہے دراصل ان کی اپنا استعمال یا مشق ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ زبان کے ایک خاص طریقے کے استعمال سے بھی ہوئے کار و تا ہے۔ یہی صورت غلط یا غلط سے ڈرل میں درج کرتا ہوں:

"چار پائی کے مختلف قسم گوارے ہیں۔ کھاتے کھاتے اڑن کھولہ کھتے، چھپر کھتے، کھرا، کھری، جھٹکا، چنگ، مانچ، مایا، مائی، چار پائی، نورانی، مسمی۔

ایکے راست ایسی ہی چار پائی پر گوارے کا اتفاق ہوا جس پر لیٹتے ہی اچھا بھلا آدمی نون خندوں (نہن) میں جاتا ہے۔ اقبال کے ایک مصرعے کی بدولت اور گل بیدار دی۔

"اصل انوں نے کسی ہندو عیسائی یا بدعت کا بیڑہ ہونے پر کبھی تعرض نہیں کیا۔ البتہ قصہ اور فرقت سے باہر دوسرے مسلم فرقے کا سرچاڑنے اور کفر کا فتویٰ دگانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

آج تک حقیر کی سمجھ میں آئی کہ کتنے ہیں

"اسی کے ساتھ کھٹکے ہوئے میں اس لئے شہ نہیں کہ کم سے کم وقت میں زیادہ دیر پیہ ہارنے کا اس سے زیادہ ساتھ کھٹکے طریقے ہنوز دریافت نہیں ہوا۔ لیکن یہ بات ہوا کہ کرکٹ اور رانی قلعی ساتھ کھٹکے ہیں۔"

"اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں باغیہ طریقے سے مزہ ایک جادو کھٹکی ہنر ہے جس کے لئے عمر بھر ریاضت کرنا پڑتا ہے۔"

"میں رانی صحت کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پانچری سے بچے لگا اور کھٹکے مشورہ کرتا رہے۔"

"اس کا کیا علاج کہ انسان کو موت بیک وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔"

"شبلی نے مرطبی کے خلاف جہاد کر کے ثابت کر دیا کہ غرض علی قد رت ہے ہر وہ جو اس کی قید نہیں۔"

"مثل مشہور ہے کہ سردی روٹی سے بنائی ہے یا روٹی سے لیکن اگر یہ اسباب پانچہ نہ ہوتے اور سردی زیادہ اور کاف ہو جاتا تو غریب غربا مجلس سنو کے انسانے پانچہ کر سوتے ہیں۔"

"مرحوم نے اپنے چنگ غلیس کے لئے کتنی بیویاں چھوڑی ہیں..... نیز موصوف اپنے خاندان سے شرماتے ہیں یا خاندان ان سے شرماتا ہے۔"

"بعض چار پائیاں اتنی چھل خور ہوتی ہیں کہ ذرا کرٹ ہلیں تو دوسری چار پائی والا کھ پڑتا ہوا بڑا کرکٹ ہنر ہے۔"

"مسلم کنگ مونس مرچر پور توں کی دہری کے لئے بے شہ یا شہور کتلیں ملتی ہیں جن کے مضامین عورتیں پڑھتی ہیں اور قصیروں سے مراد دی بیٹا لے ہیں۔"

"مسلمان ہمیشہ سے ایک عمل قوم رہے ہیں وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے راج کر کے کھاتے نہیں۔"

"جدید سائنس نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ مارے کے علاوہ جسم کا ہر حصہ صفا کھٹایا بڑھایا جاسکتا ہے۔"

"موسم ایسا جیسے کسی کے دل میں بغض بھرا ہوا۔"

"انسان خطائے نسواں کا پتلا ہے۔"

"مگر گھوڑا، گھوڑا، سوار، انگوٹھی کے پتھر کے معاملے میں وہ وسوسہ اور غم کے کاکل ٹھہر۔"

"کرانچی کی پانچ چیزوں کا ترکہ انکم اس دنیا میں جواب نہیں۔ بڑاؤ، بڑاوت، دریائی، قوادی، کالی اور مرد کا عشر۔"

"مسلمان سے کیوں کہ کلم ہے اس سے بچر ہے کسا سے قتل کر دیا جائے۔"

"ہجوم کی ضرورت ساری دنیا کو ہے گی اور کھٹکے ساری دنیا کھٹکے مذہب نہ اختیار کر لے اور یہ کھٹکے نہیں جو سنہ دیں گے۔"

"حقیقت نگاری کے پردے میں جتنی دوا ملو اتک کو اردو کھٹکیاں لکھنے والوں سے ملی، اتنی اپنے

شبیہ نگاہوں سے بھی نہ ملی ہوگی۔"

"طلب اور طواغیت ہمارے ہاں بد قسمتی سے لازم الملوم ہیں۔"

"سوئے اور بھڑکی بڑی تو صرف بد قسمتی اور بداد مسلم فساد میں اشتعال کی جاتی ہے۔"

"ایسا ٹکا ہوا مادہ تھا تو اور کاغذ پر شعر کو کی استاد ہی کہہ سکتا ہے۔"

دراصل یہ بھی ایک نئے طرز کے طعنے و مزاح نگار ہیں۔ یہ نسل مزاح میں اپنے اسیلوب سے سچے رہتے ہیں۔ اپنے آپ پر قس سکتے ہیں۔ اس طرح دوسروں کو ہنسنے دینے کے ساتھ خود احتسابی پر مائل کر سکتے ہیں۔ یوں تو وہ مزاح نگاروں کو قہقہے کہتے ہیں لیکن لازماً اس قومیت کے پیچھے سماجی قومیت ابھرتی ہے۔ "آپ تم" اور ان کی دوسری کتابیں ایسے تمام انکبادات کا پتہ لگاتی ہیں۔ مزاح نگاروں میں جو کیفیت انہوں نے پیدا کی نہ وہ طنز کے یہاں ہے نہ رشید احمد صدیقی کے یہاں۔ کبھی کبھی چند جملے میں اسے کام کی بات کہا جاتے ہیں کہ اس کی وضاحت کے لئے پوری ایک کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آل احمد سرور نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

"یہ نسل کی مزاح نگاری میں زندگی کے گونا گوں تجربے بات اور مشاہدات کے علاوہ اردو ادب اور

عالمی ادب کے مطالعے کے ذریعے انقوش ملتے ہیں۔ یہاں ہر پھرے نکی، ماضی میں غم، ماضی

کمال میں مسرت ہر طرح کے انسان ملتے ہیں۔ جو نکل ان سب سے بہرہ ور ہیں پیرا کر دیتے ہیں

ان کی سبک ان کی ہر نظر آتی ہے۔ ان کی کالی ان کا رجز، یہاں ٹیکسٹ بھی ہے۔ کہانیاں بھی

کنفیوٹس بھی اور مہاتما جی بھی۔ اور ان کا کام آزاد بھی جوش ملیح آبادی بھی۔ غلام محمد بھی اور

ایوب خاں بھی۔ یہ نسل تو ہمارے اشعار میں تصرف کر کے ان کے لطف میں نئے پہلو پیدا کر دیتے

ہیں۔ انہیں زبان پر بڑی قدرت ہے اور زبان کے دھوکہ کھاؤ کا خیال بھی۔ انہوں نے جہاں

بھانپا، پشتو، سندھی، بلوچی کے الفاظ کا اردو میں اضافہ کیا ہے وہاں گنگا جمنی اردو کے ایسے

نماوارت کا بھی جواب سننے میں نہیں آتے۔ حسن کو انہوں نے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ سراپا

نگاری میں وہ ہمارے بعض مشہور شخصیات کو یوں کو مات دے سکتے ہیں۔"

مشتاقی یہ نسل کا ادبی سفر ابھی چمکی جا رہی ہے۔

دلاور فگار

(۱۹۶۸ء — ۱۹۹۸ء)

ان کا اصل نام دلاور حسین تھا لیکن دلاور فگار کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش ۱۸ جولائی ۱۹۶۸ء

کوہاٹ میں ہوئی اور وفات ۲۳ جنوری ۱۹۹۸ء کو کراچی پاکستان میں۔

دلاور فگار نے ۱۹۵۳ء میں ملی گڑھ سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر معاشیات میں ایم اے ہوئے۔

دلاور فگار دلاور کے پاسو نظر نگار شاعری کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کا پتلا مجموعہ "جادوئے" کے نام سے

۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ لیکن یہ طویل شاعری کا مجموعہ نہیں تھا شاید وہ اب تک اپنی وہ سچیں نہیں کر پاتے تھے لیکن بعد کی

شاعری انہیں سماج کی ناہوار بوس اور اس کے دکھوں کی طرف لے گئی اور وہ نظر و مزاج کا پائے کی طرف مائل ہو گئے پھر

ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی حد تک زندگی کے پیچ و خم کی طرف متوجہ رہے تھے۔

طبیعت حسین قحی لہذا ان کے یہاں مکمل کیلئے کاغذ نہیں ہے۔ شعری اصناف سے باہر میں ان کے لئے کوشش کرتے ہیں کہ

ان کا کام رطب دریا سے پاک رہے۔ ان کے مجموعے "سب عمر بیاں" (۱۹۶۳ء) سے اب ان کی انشائیہ طبع کا اندازہ

ہوئے لگا تھا اور ان کے کام پر توجہ کی جانے لگی تھی۔ دوسرے مجموعے "شامت اعمال" (۱۹۶۹ء) اور "آداب عرض"

سے ان کی عظمت کا پھر پورا احساس ہوا اور انہوں نے بھی ان کی طرف توجہ کرنی شروع کی۔ اس کے بعد وہ جھٹکتے نہیں۔ ان

کے کئی مجموعے جو وضع سے آراستہ ہوئے مثلاً "مطلع عرض ہے" "خدا جھوٹ نہ بولائے" اور "انگلیاں دنگا رہی"۔

دراصل دلاور فگار ادبی راہ کو اپنا چاہتے تھے جو اکبر ال آبادی کی واضح راہ تھی۔ اسے پیچ نہیں کہہ سکتے ہیں

بلکہ محض اثرات قبول کرنے کی بات ہے۔ دلاور فگار بھی انگریزی الفاظ ایک خاص خود سے استعمال کرتے ہیں اور انہیں نیا

اور ماضی جتنے ہی ملی چاہتے تھے ان کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے مضامین اور ہیں اور اکبر ال آبادی کے اور لیکن دونوں کا فرق

حالات اور وقت کا فرق ہے۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ دلاور نے اکبر ال آبادی کا منصب حاصل کر لیا تھا۔ دراصل وہ

اپنے تیر کے خاتمے تھے اور ان تک پہنچنا شاید محال ہے۔ انور سید ان کے قلمی کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"دلاور فگار نے اس قسم کے ذہان کو دیکھا اور پتا تھا جب بھول غول بدھی حیدر، دو لوگ جو

بڑے عہدوں پر پاسو تھا یا کسی اور ادیب سے صاحبان آسائش میں شمار ہوئے لگے ہیں خود کو

صفت اول کے ادیبوں میں اکٹرا کر سنے کے لئے کوٹاں ہیں۔ لیکن دلاور فگار نہ بڑے افسر

تھے نہ صاحب دولت اور تھے لیکن ان کے پاس شاعری کی حیثیت ادبی میں متعارف ہوئے

اپنی اس حیثیت میں ہی صفت اول کے مزاج نگاروں میں شمار ہوئے اور دلچسپ بات یہ ہے

کہ معاشرے کی جس حقیقت کو بیشتر بڑے شعرا سمجھ و شاعری میں نہیں کرنے سے گریز کرتے

تھے، دلاور فگار نے اس حقیقت کا گریبان چاک کیا اور اپنی جھٹکتی بدلت سے اس حقیقت کو نہ

صرف نئے زاویوں سے منکشف کر دیا بلکہ اس حقیقت کی تازہ و زانی سے "پیراں لکھنا" بھی

روشن کر دیا۔ خوبہ میں حیدر نے ایک جگہ لکھا ہے: "کراچی میں مزید جامعہ ملی، سلیم احمد دلاور

فگار نے اپنی کتابوں کی تقریب رونمائی میں کوئی دلچسپی نہیں کی۔ وہ بیوقوف، احمق، بچا دیا جاتے

تھے۔ اپنا آہنگ (Rhythm) ٹوٹے ٹوٹے لکھ دیا جاتے تھے۔ مگر انہوں نے تو کلی اختیار کیا

”ان کی شاعری میں ان کی زندگی کا ہر صاف بھٹکتا ہے۔ ان کی طبیعت اور تصنیع اور تفکرات سے دار بھائی ہے۔ وہ منکسر الحواس اور دوستوں اور واقع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کام میں اپنے معاصر شعرا کی طرح وہ بھی ان کے بغیر چلے نہ سکتے تھے۔ ان کی مراد کی اور استعداد کی بھی وہ شاعروں میں سے ہوئے اظہار خوب ملایا کرتے ہیں۔ ان کی مراد کی اور استعداد کی ان بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت اچھے مصروف و متوجہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے ایک گمنام دوست سے اپنے بارے میں کچھ لکھنے کے بارے میں کہا ہے۔ ان کا حلقہ بہت اچھا ہے۔ انہیں عروض سے واقفیت ہے، زبان پر قدرت حاصل ہے اور فطری شاعر ہیں۔ آج اردو نظم میں انگریزی الفاظ کے برجستہ استعمال، بے حد کاری اور تصرف میں ایک معیار رکھتے ہیں۔ اراکی بات میں ایک بات کہہ جاتے ہیں بلکہ یہاں اوقات گئی ہوتی ہیں۔ اب ان کے بعض الفاظ پر ملاحظہ کرنا چاہئے۔ ان میں سے ایک خیر نامہ بھی ہے۔ وہ زندگی کے مشکل پہلو اجاگر کیا کرتے ہیں لیکن ایک نئی اور بالغ نظری کے ساتھ۔ ان کے شعر میں تہذیبی لہجہ ہے جو یہ بھی ہے اور پروردگار کی۔“

کرل محمد خاں

(۱۹۲۰ء)

ان کا تعلق ضلع جہلم کے سکارو کوستان علاقے سے ہے۔ ان کے باپ اور اجداد راحت پرست تھے۔ ساتھ ساتھ یہ گرتی بھی۔ یہ خان لوگ مجدد سرتورستہ وقت تھے۔ محمد خاں اپنے ہی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ساتھ چل اور وراثت کو اگر جتن نظر رکھا جائے تو اس خاندان کا کوئی شخص ادیب نہ تھا اس لئے اولی حیثیت سے وہ جو کچھ لکھی ہوئے وہ قلمی کی ہیں ہے۔ یہ سید ضمیر حفیظی لکھتے ہیں کہ:-

”ایک تو دہلی میں اور تھوڑا دیر بعد محمد خاں اکرم خاں وکم آہنڈا کے کافراندہ درویش آباد ہوا۔
..... کہتے ہیں جہاں جہاں وہ جہاں سے جوئے شیر کھینچ لائے تھوڑا دیر بعد تو لہگوں کے
نشین تہجد بالا کر کے رکھے۔ دشمن کا مان، ملت کی آبرو!

دوسرا محمد خاں وہ ہے کہ اس کا مراد سے پہچانی نام سے اس کے دشمن و لہجہ کی شادابی اور برائی کا انداز دیکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ یہ ادیب اور ان کا پروردگار محمد خاں ہے۔ یہ وہم و گھٹو کہ ہم دیکھتے ہیں جس مشرق، جہاں ان کا ہوا خوش دلی و گرم اشتیاق، منا و درویش جہاں

تاکہ اس نظر پرانی فضا سے بہت کچھ بھی ایک مثال قائم ہو سکے۔ وہ اپنی ذات میں ہم ہو کر صرف اپنے اندر کے شاعر کی آواز سننے لگے اور اپنی ذات کے ساتھ ہم کاری میں اسے خوب جانتے تھے کہ وہ ”سنگان، دنیا“ کو حواس باختہ انسان نظر آتے۔ حالانکہ جس محقق نظری سے وہ دنیا کو دیکھتے تھے اس نظر سے دنیا دار لوگ بے خبر غم تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ عام زندگی میں دلا اور نگار بڑی بڑی باتوں کو محسوس کرنے کے باوجود نظر انداز کر دیتے تھے لیکن ایک چھوٹی سی بات انہیں چھو جاتی تو اس کا بغیر معمولی اثر لیتے تھے۔“

یہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دلا اور نگار سامنے کی چیزوں سے بڑی باتیں پیدا کرتے ہیں اور اپنی حیثیت سے۔ یہ ان کا طرز اختیار ہے۔ وہ چیزوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سکر اور موضوع پھیل جاتا ہے اور اس میں نئی گہرائی مصروف پیدا ہو جاتی ہے۔ آج کرکٹ کے کھیل کی بڑی دھوم ہے اور مشاہیر اس کی بھی۔ اب دونوں کی صورتوں کا ادغام دیکھئے اور اس انضمام سے جوئی صورت پیدا ہو رہی ہے اس کا اندازہ لگائے:

دہاں ہے اہل بی ڈاٹو، یہاں یہ پتھر ہے
کہ حذیب سوت ہے یا نذر ہے
یہاں کچھ ایسے بھی کہتاں پائے جاتے ہیں
جو دن بناتے نہیں، ہٹ لگاتے جاتے ہیں
دہاں ریاض مسلسل سے کام چلتا ہے
یہاں گلے کے سہارے کلام چلتا ہے
وہاں جو لوگ ابازی ہیں، وقت کاٹتے ہیں
یہاں بھی کچھ متکاہر دماغ چلتے ہیں
وہاں ہے ایک ہی پختان پورنی نیم کی جان
یہاں ہر ایک پیسہ بیگنے خود پختان
مرے خیال کو اہل نظر کریں گے کچھ
کہ شاعری بھی ہے اک طرح کا کیا کرکٹ کچھ

”آداب عرض“ کے دیباچے میں عبداللہ دلی علی قادری ان کی شاعری کے سلسلے سے اس طرح رقم طراز ہیں:

کہ ان کا فن sum up ہے۔ میں اسی تقاس سے لکھتا ہوں کہ انہوں نے۔

شفیقہ مرحمت حمید یہ کالج بھی پالی سے وابستہ ہوئیں اور اردو کی پروفیسر اور صدر شعبہ بھی ہوئیں۔

بحیثیت ادیب ان کا نام معروف ہے۔ طنز و مزاح میں ان کا ایک خاص رنگ ہے جس کی وجہ سے ان کی شناخت ہوئی ہے۔ طنزیہ مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ ”نو آئی ہم بھی“ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا اس کے بعد ”ماٹھ نمبر“ بھی سامنے آیا۔ یہ دونوں کتابیں اہمیت کا باعث ہوئیں۔

تحقیق ایک حساس فنکار ہیں۔ سماج کی باتوں پر اس مختلف قسم کا اخصالی و غیرہ ان کے موضوعات رہے ہیں۔ زندگی کی بہت سی ایسی کیفیتیں جن سے آج آلودگی کا ایک خطرناک سانسہ ہوتا ہے وہ اسے ایک پیڑ کرنے میں لگتی سر ملے سے گذرتی ہیں اس طرح کہ مزاح بھی گھر جاتا ہے اور طنز کا کیف بھی۔

انسانی وجود و زندگی کے مطالعہ میں تحقیقی کا بھی پورا پورا جذبہ ہے۔ اس لئے کہ جتنے جتنے ادب نگاروں پر انگلیاں دھک دیتی ہیں۔ مگر ان کے یہاں فن ایسی صورت اختیار کرتا ہے جس میں زندگی کی جہیں اپنی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ اجاگر ہو جاتی ہیں۔

شفیقہ زبان پر خاص دسترس رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر کہیں بھی جو جھل نہیں ہوتی اور پڑھنے والے پر ایک خاص اثر چھوڑتی ہے۔

احمد جمال پاشا

(۱۹۳۶ء۔ ۱۹۸۶ء)

احمد جمال پاشا ۱۹۳۶ء میں ٹھٹھا (الہ آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار تھے۔ اس عہد سے بے شک درس ہوئے تو محنتوں میں بورڈ پاش اختیار کرنی۔ دیکھتے ہی ان کا تحقیقی عقیم تہا۔ ان کے اسلاف میں سے تعلق رکھتے تھے۔ احمد جمال پاشا کی شادی میوان میں ہوئی تو سب سے پہلے ان کا اسلام آباد سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں وہ دہلی کے فرانسس احجام سیر سے رہے۔ انہوں نے ”پیکو“ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا اور کتب سے بی اے کیا تھا۔ پیدائش ”قو“ اور ”ش“ کی ادبی خدمات کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھواؤ ڈی ایٹ کی ڈگری کی ایک عربی تک روزنامہ ”قومی تہا“ کے شعبہ ادارت سے منسلک رہے۔ احمد جمال پاشا کا انتقال ۲۹ ستمبر ۱۹۸۶ء میں چنڈی بولہ دل کا دورہ پڑا تھا۔ لاش میوان ادبی کمیٹی جہاں دفن ہوئے۔

احمد جمال پاشا طنز و مزاح کی دنیا میں معروف ہیں۔ عابد کمال کی بات ہے کہ احمد جمال پاشا کا مشاہیر و قوی اور سزا قہار اس سے کہیں زیادہ قوی اور سزا دہن کی وہ صلاحیتیں تھیں جنہیں مشاہیر کو خطرہ مزاح میں بدل دیتیں۔ پاشا کا مزاح صرف ادب تک محدود نہیں، وہ کبھی کبھی اسے علم کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ عابد کمال نے اپنے انتخاب میں جو اثر پر دیکھیں اور وہی لکھتے رہے۔ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ ان کے دس مضامین کا انتخاب کیا ہے سب سے مشہور مضمون ”ادب میں

مارشل لا“ ہے۔ جس کی وجہ سے احمد جمال پاشا نے ایک ممتاز مزاح نگار کی حیثیت سے اجماع سے دوسرے مضامین میں ”کوکر کا پکڑ“، ”ستم ایذا“، ”کرکٹ اور میں“، ”پکارا“، ”خود کا نام“ کے اسباب“، ”میں اور ایک تحقیقی اور تخلیقی مطالعہ“، ”کچھ کا خط پطرس کے نام“، ”شرافت کی تلاش میں“، ”میں زبان سے زبان“، ”نقل طیف کوئی“ اور ”تعلیم صاحب“ ہیں۔ یہ سارے مضامین اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں سامنے آچکی ہیں۔ ان میں ایک ”پتلیوں پر چمڑ کا ڈھ“ بھی ہے۔ اس کا مقدمہ ساقی انور نے ہی لکھا ہے۔ اس کے چند نکات ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

”احمد جمال پاشا اجتماعی مزاحیہ نگار ہیں، لیکن ان کا احتجاج جلیج نہیں ہے۔ مزاحیہ اور کتابے کے ساتھ ساتھ واقعات و حادثات کے شیریں کپسول میں بھی جوتا ہے۔“

احمد جمال پاشا اپنے احتجاج کو فن کی سطح پر لے جاتے ہیں، وہ نہ وہ گھٹیا اجتماعی ادب ہونے، فنکارانہ بن جاتے۔ سماج کے اندر دھکیلی ہوئی پراگندگی کا احساس کئے نہیں ہے۔ مگر ان کی کورانی پائوس کرتا، عجب تو عجب ہے، اخصال کے ہند ہے، لیکن ہم اپنی ذات کے خولی میں گم ہیں، ہمارے پاس آنکھیں ہیں لیکن بے نور، ہم معاشرے کی تمام تر گندگیوں کے ساتھ جی بیٹے کے عادی ہو چکے ہیں، ادیب خصوصاً طنز و مزاح سے وابستہ ادیب ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ واقعہ ہمارے دس الٹیں لے لے ایسے معاشرے میں ٹھونکنے جتا ہے، اس پر بھی آپ کی آنکھیں بند رہی رہیں تو فنکار کیا کر سکتا ہے۔“

احمد جمال پاشا جو چہرے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، حق کی جس کیفیت سے ہمیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں، ہم ان سے آگاہ اور آشنا ہو جاتے ہیں، ان کے اس فنکارانہ رویے سے کسی کا دل بھی نہیں دکھتا، پاشا اور ان کی دوسرے طنز و مزاح سے وابستہ ادیبوں میں حدفاصل بھی نہیں ہے۔ پاشا چاہے سب سے شہرہ چرے دکھائیں یا کسی واقعے کی سلا کا نہ صورت سامنے آئیں، قاری جتنے جتنے عیب دیکھ کر کچھ لیتا ہے، اب وہ ایسے معاملات سے جب بھی اپنے آپ کو الگ رکھے اور احکامات پر کمر بستہ نہ ہو، اس میں خالق کا کیا قصور۔

Ronald Knox نے طنز نگار کا ایسے بچے سے مماثل قرار دیا ہے جس کے ہاتھوں میں پانی بھری پستول ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس کا نشانہ اگر ٹھیک بھی ٹھیکہ تو ڈھکی کا کیا ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ہاتھوں میں جو پستول ہے وہ انتہائی گرم ہانی سے بھری ہوتی ہے اور جس پر نشانہ لگا دیا جاتا ہے وہ جلتی جلی جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے دھکی پھرے تو ہم اپنی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ پاتے لیکن جیسے مزاح ہونا تھا وہ مزاح ہو چکا ہے۔ پاشا کی Dilemma کا بھی یہی حال ہے، وہ جتنے جتنے ڈھکی کرتے ہیں، ڈھکی ہونے والا بھی ہوتا ہے لیکن اس کا جسم بھروسہ

ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسے ہی خریفہ کارکنوں کا Art lies in concealing کہتے ہیں۔ گویا احمد جمال پاشا بھاری مضہب سوسائٹی کے جری فہر ہیں، سماج کی آلودگیوں سے تیرا آتما ہیں، زندگی کے اعتقاد تصورات کے خلاف ممل آرا ہیں، معاشرے سے ان کے تمام صوب دھو ڈالنا چاہتے ہیں..... احمد جمال پاشا ایسے خواب دیکھتے ہیں، جن کی تعبیر ان کی نگاہیں میں حقیقتات ہیں، جن میں ہمارا سماج نکلا ہے، ایسے نکلے سماج سے ہم بھاری نہیں کر سکتے، اگر ازلہ نہیں کر سکتے تو ہم از کم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ پاشا کی غایت بھی یہی ہے اور ان کی فکر کا محور بھی یہی ہے، اور یہ کھل چنے بنانے کا کام تو چنگلوں سے بھی انجام پاتا ہے۔ لیکن احمد جمال پاشا کی فکر کی کلید چنے بنانے میں نہیں بلکہ معاشرے کے کردار پیلوں کی نشاندہی میں ہے..... معیاری طریقہ مزاحیہ تحریریں سنجیدگی سے آراستہ ہوتی ہیں، ان میں محصول تشریح نہیں ہوتا لیکن اردو کے کئی حرا نگار سفر سے بن جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نگارشات کا وزن اور وقار دوسرے سے محدود ہو جاتا ہے، پاشا اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کے مزاح میں کڑم جڑا رو چھپا ہوتا ہے۔ اب ذک کے اثر کو کوئی سہن کرے تو اور بات ہوئی، اسے بہر طور حتملاً چاہئے۔ پاشا کی ملی زہر میں بچھا ہوا تیر ہے جو بیوقوفانے پر مبنی ہے۔"

مجتبیٰ حسین

(۱۹۳۶ء۔)

مجتبیٰ حسین کے اسلاف کا پیشہ بے شری تھا۔ ان کے ایک بزرگ محمد حسین نے راجہ دھڑکری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ مجتبیٰ حسین ان ہی بزرگ کی اولاد ہیں۔ ویسے ان کے والد مولوی احمد حسین تھے۔ مختار روزگار میں حیدر آباد آگئے اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ عثمان آباد میں پیش کار کے عہدے پر رہے، پھر ان کا تالہ گلبرگ ہو گیا۔

مجتبیٰ حسین کی ولادت جنوبی ضلع گلبرگ میں ۵ مارچ ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کنڈا (آندھرا پردیش) سے میٹرک اور گلبرگ سے انٹر کیا۔ ۱۹۵۶ء میں مٹاپیہ یونیورسٹی سے بی اے ہوئے۔ پبلک ایڈمنسٹریشن میں ڈیپلوما حاصل کیا اور صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ روزنامہ "سیاست" سے گویا ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا لیکن ۱۹۶۳ء میں آندھرا پردیش کے نکلے اطلاعات، حارس میں ملازمت کی۔ ۱۹۶۴ء میں نگرال کشن کی شہرہ ریں سرق سے وطن آکر اہستہ ہو گئے۔ لیکن ۱۹۶۳ء سے ان سی ای آر ٹی میں منتقل ہو گئے۔ ان کا عہد وہاں کا وٹنسل کے جلی کشن ڈویژن میں اردو شعبہ کے ایڈیٹر کا تھا۔

مجتبیٰ حسین ابتدا ہی سے بہت فعال رہے۔ مختلف اداروں، انجمنوں کے مختلف اہم عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ۱۹۷۸ء میں وہ زمرہ دلائل حیدر آباد کے سربراہ بن گئے۔ مابینامہ "شکوہ"، "آج کل"، "پانچ" وغیرہ سے وابستہ رہے۔ کاؤنسل برائے علوم و فنون کے ایک رکن بھی ہوئے اور ان کی دوسرے اداروں سے وابستہ ہو کر اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ مجتبیٰ حسین کی شادی ۱۹۵۶ء میں اپنی بچا زاد بہن ناصرہ دیکھن سے ہوئی۔ ۱۹۸۰ء میں موصوف جاپان گئے۔ ۱۹۸۳ء میں لندن اور پھر کاسفر کیا۔ پھر پارک، واٹھن، شکاگو، کاناڈا، موریس، یو این کے گئے، جاتے جاتے ماسٹرس، سرقد، بخارا اور ماسکو نیز انجمنوں کی سیاحت کی، سعودی عرب کے مقدس مقامات کی بھی زیارت کی۔ ۱۹۸۹ء میں پاکستان گئے۔ ۱۹۹۱ء میں وہ ان سی ای آر ٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ لیکن مختلف رسائل میں کالم لکھنے کرتے رہے۔ ان کی ادبی نگارشات کی تفصیل یہ ہے:

مکتبہ برطرف (۱۹۶۸ء) قطع کلام (۱۹۶۹ء) قصہ مختصر (۱۹۷۲ء) بہر حال (۱۹۷۳ء) آدمی نامہ (۱۹۸۱ء) بلا آخر (۱۹۸۲ء) جاپان چل جاپان چلو (۱۹۸۳ء) انٹرفیو (۱۹۸۷ء) سوہو بھی آدمی (۱۹۸۷ء) چچہ و چچہ (۱۹۹۳ء) سفراتِ نکتہ (۱۹۹۵ء) آخر کار (۱۹۹۷ء) ہوئے ہم دوست (۱۹۹۹ء) میرا کالم (۱۹۹۹ء) مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (جلد اول) (۲۰۰۱ء) مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (جلد دوم) (۲۰۰۲ء) مجتبیٰ حسین کے سفر نامے (۲۰۰۳ء) جاپان (۱۹۸۰ء) پاپ (۱۹۸۳ء) مسقط (۱۹۹۵ء) سعودی عرب (۱۹۹۶ء) بروٹنی (۱۹۹۷ء) امریکہ (۲۰۰۰ء) مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم (۲۰۰۳ء) شیشہ و شیشہ و شاہ صدر جی کے کالموں کا انتخاب (۱۹۹۳ء) مہذب شدہ طلبیں (۱۹۷۵ء)۔

اس کے علاوہ مجتبیٰ حسین کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی، اردو، چھاپنی اور ہندوستان کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ حیدر آباد کے مشہور "شکوہ" نے ۳۸۸ صفحات پر مشتمل "مجتبیٰ حسین نمبر" شائع کر کے اس ممتاز نثر نگار کو فراج حسین پیش کیا۔ پروفیسر قلیل الرحمن نے "مجتبیٰ حسین کالنی" نام سے کتاب شائع کی۔ مشہور رسالہ "الفاظ" علی گڑھ نے بھی خصوصی گوشے شائع کیے۔

نگارشات کی تفصیل سے چاند زاد کا نام مشکل نہیں کہ مجتبیٰ حسین نے مختلف موضوعات پر حاد فرسائی کی۔ لیکن تمام تحریریں میں ان کا وٹ اور دوسرے صاف جھلکتا ہوا احساس ہوتا ہے کہ واقعتاً طور و طراقت ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ دراصل مجتبیٰ حسین کے تجربے اور مشاہدے میں زندگی کی نامواریاں، ہیئت مرکزی، حیثیت رکھتی ہیں ابتدا جب بھی وہ قلم اٹھاتے ہیں زندگی کے کتنے ہی نامواریاں پیلوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں لیکن وہ ہدایت سے کام نہیں لیتے بلکہ خطر و ملاح میں ایک خاص قسم کی تخلیقی پیدا کرتے ہیں۔ ایسی تخلیقی بھی ایک انداز رکھتے ہیں جو خاص چھنے والوں پر فورا مچاں ہو جاتی ہے۔ مجتبیٰ حسین بھی نامواریاں کو نشان زد کرنا چاہتے ہیں ان کی اصطلاح تو ان کے مد نظر ہے ہی لیکن وہ تہہ بہ تہہ جیتے ہیں یہ قلمی بلکہ ایک حساس دل کے راکب کا جو اشعار ہو سکتا ہے وہی سامنے ہوتا ہے۔ زمانے کی کئی اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے اور شاید یہ ہے کہ لیکن یہ بات بہت صاف طریقے سے کہا جاسکتی ہے کہ ان کی قلمی صورت کی نشاندہت بہر طور

محبوبی حسین عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کے مالک ہیں۔ ان کے نظریات کا علمی نے ان کے نظریات پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے جو حبیبی حسین کی تعلیم میں معاون ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے نظریات کے مختلف پہلوؤں پر ایک ایک کتاب لکھی جائے۔ دینی محققین حسین کا دینی سفر بھی شرم نہیں ہوئے۔